چونکا دینے والی خوفناک کہانیاں
ڈر
ڈائجسٹ
کراچی
اپریل 2014
پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام
www.paksociety.com

چونکا دینے والی خوفناک کہانیاں

ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ کراچی

جلد نمبر 15 شمارہ نمبر 7 اپریل 2014ء

ای میل ایڈریس: dardigest@yahoo.com

منیجنگ ایڈیٹر خالد علی

چیف ایڈیٹر آصف حسن

ایڈیٹر شاہد علی

بزنس ایگزیکٹو صفدر حسین

قیمت -/60 روپے

سالانہ قیمت -/1080 روپے

ادارہ کا کسی بھی رائٹر کے خیالات سے متفق ہونا ضروری نہیں۔ ڈر ڈائجسٹ میں چھپنے والی تمام کہانیاں فرضی ہوتی ہیں کسی کی ذات یا شخصیت سے مماثلت اتفاقیہ ہو سکتی ہے

ایڈیٹر و پبلشر آصف علی نے سٹی پریس تالپور روڈ کراچی سے چھپوا کر شائع کیا۔

ساجدہ راجا 111
آتش انتقام
نفسانی خواہشات کا پجاری شخص جب اس کی خواہش کی تکمیل نہ ہوئی تو وہ ہوش و حواس کھو بیٹھا
شائستہ سحر 129
سزاوار
خلق خدا کی باتوں کو جو لوگ جھٹلاتے ہیں، ایسی لوگوں کو لے رونگٹے کھڑے کرتی کہانی
ایم اے راحت 136
سنہری تابوت
شاہکار کہانیوں کے متلاشی لوگوں کے لیے عجوبے میں ڈالتی حیرت انگیز اور تحیر انگیز کہانی
ملک فہیم ارشاد 162
لرزا براندام
اپنے ہاتھوں اپنی موت کا سامان کرچلے، پڑھ کر دیکھیں ثبوت کہانی میں موجود ہے
آصفہ سراج 177
انجام حرص
جو لوگ اپنی لامحدود خواہشات پر کنٹرول نہیں کرپاتے ایسے لوگوں کے لیے سبق آموز کہانی
رضوان بھٹی 183
لذت
نفسانیت کی تکمیل اکثر انسان کو زندہ درگور کر کے نشان عبرت بنا دیتی ہے۔ تحیر انگیز کہانی
ایم الیاس 192
عشق ناگن
چاندزیب عباسی 222
موت کی وادی
خط وکتابت کا پتہ: ماہنامہ ڈرڈائجسٹ نورانی آرکیڈ نیوارد و بازار کراچی: 32744391
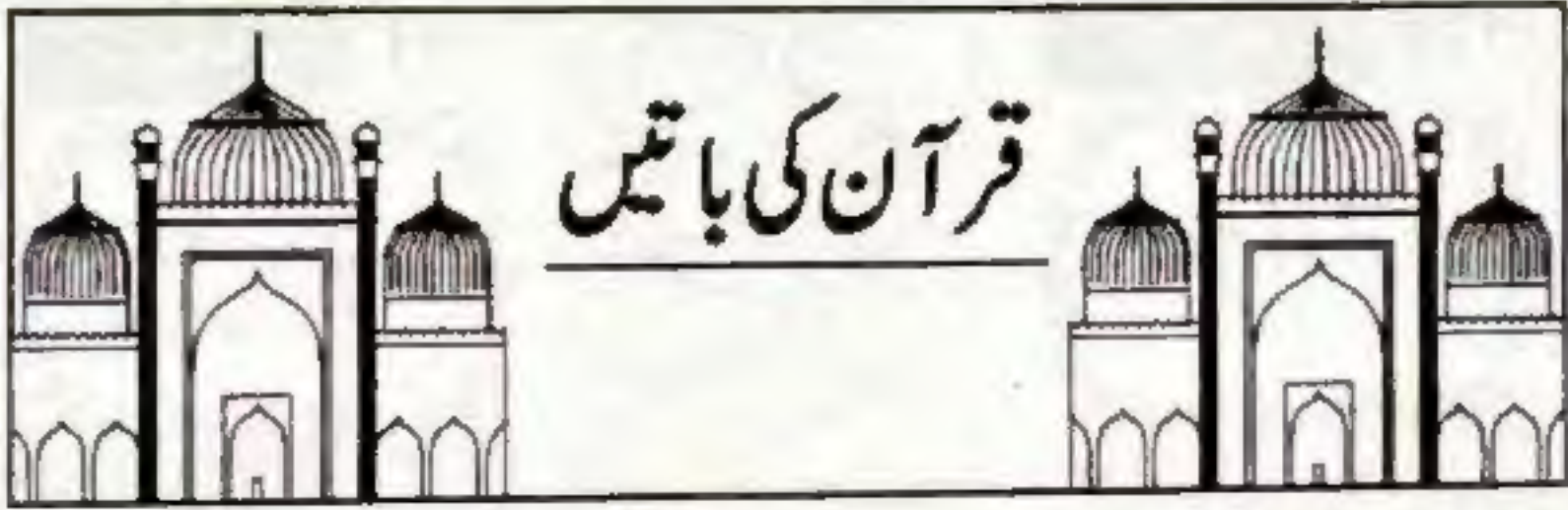
☆ اس نے انسان کو ایک ذرا سی بوند سے پیدا کیا اور دیکھتے دیکھتے صریحاً وہ ایک جھگڑالو ہستی بن گیا۔ اس نے جانور پیدا کیئے جن میں تمہارے لئے پوشاک بھی ہے اور خوراک بھی۔ اور طرح طرح کے دوسرے فائدے بھی۔ اور جب شام کو انہیں جنگل سے لاتے ہو اور جب صبح کو جنگل چرانے لے جاتے ہو تو ان سے تمہاری عزت وشان ہے اور دور دراز شہروں میں جہاں تم زحمت شاقہ کے بغیر پہنچ نہیں سکتے وہ تمہارے بوجھ اٹھا کر لے جاتے ہیں کچھ شک نہیں کہ تمہارا رب نہایت شفقت والا اور مہربان ہے اور اسی نے گھوڑے اور خچر اور گدھے پیدا کیئے تاکہ تم ان پر سوار ہو اور وہ تمہارے لئے رونق و زینت بھی ہیں اور وہ اور چیزیں بھی پیدا کرتا ہے جن کی تم کو خبر نہیں اور سیدھا رستہ تو اللہ تک جا پہنچتا ہے۔ اور بعض رستے ٹیڑھے ہیں وہ اس تک نہیں پہنچتے اور اگر وہ چاہتا تو تم سب کو سیدھے رستے پر چلا دیتا۔ وہی تو ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا جسے تم پیتے ہو اور اس سے درخت بھی شاداب ہوتے ہیں جن میں تم اپنے مویشیوں کو چراتے ہو۔ اسی پانی سے وہ تمہارے لئے کھیتی اور زیتون اور کھجور اور انگور (۔ اور بے شمار درخت) اگاتا ہے اور ہر طرح کے پھل پیدا کرتا ہے غور کرنے والوں کے لئے اس میں قدرت اللہ کی بڑی نشانی ہے اور اسی نے تمہارے لئے رات اور دن اور سورج اور چاند کو کام میں لگایا اور اسی کے حکم سے ستارے بھی کام میں لگے ہوئے ہیں۔ سمجھنے والوں کے لئے اس میں قدرت اللہ کی بہت سی نشانیاں ہیں اور جو طرح طرح کے رنگوں کی چیزیں اس نے زمین میں پیدا کیں سب تمہارے زیر فرمان کردیں۔ نصیحت کرنے والوں کے لئے اس میں نشانی ہے۔ اور وہی تو ہے جس نے دریا کو تمہارے اختیار میں کیا تاکہ اس میں سے تازہ گوشت کھاؤ۔ اور اس سے زیور موتی وغیرہ نکالو جسے تم پہنتے ہو۔ اور تم دیکھتے ہو کہ کشتیاں دریا میں پانی کو پھاڑتی چلی جاتی ہیں اور اس لئے بھی دریا کو تمہارے اختیار میں کیا کہ تم اللہ کے فضل سے معاش تلاش کرو تاکہ اس کا شکر کرو اور اسی نے زمین پر پہاڑ بنا کر رکھ دیئے کہ تم کو لے کر کہیں جھک نہ جائے اور نہریں اور رستے بنا دیئے تاکہ ایک مقام سے دوسرے مقام تک آسانی سے جا سکو اور راستوں میں نشانات بنا دیئے اور لوگ ستاروں سے بھی رستے معلوم کرتے ہیں تو جو اتنی مخلوقات پیدا کرے کیا وہ ویسا ہے جو کچھ بھی پیدا نہ کر سکے تو پھر تم غور کیوں نہیں کرتے اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو گن نہ سکو۔ بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ (سورۃ نحل 16 آیت 4 سے 18)

☆ ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے شب تاریک میں آگ جلائی جب آگ نے اس کے اردگرد کی چیزیں روشن کیں تو اللہ نے ان لوگوں کی روشنی زائل کردی اور ان کو اندھیروں میں چھوڑ دیا کہ کچھ نہیں دیکھتے یہ بہرے ہیں گونگے ہیں اندھے ہیں کہ کسی طرح سیدھے رستے کی طرف لوٹ ہی نہیں سکتے۔ ان کی مثال مینہ کی سی ہے کہ آسمان سے (برس رہا ہو اور) اس میں اندھیرے پر اندھیرا چھا رہا ہو اور بادل گرج رہا ہو اور بجلی کوند رہی ہو تو یہ کڑک سے ڈر کر موت کے خوف سے کانوں میں انگلیاں دے لیں اور خدا کافروں کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ قریب ہے کہ بجلی کی چمک ان کی آنکھوں کی بصارت کو اچک لے جائے۔ جب بجلی چمکتی اور ان پر روشنی ڈالتی ہے تو اس میں چل پڑتے ہیں اور جب اندھیرا ہو جاتا ہے تو کھڑے کے کھڑے رہ جاتے ہیں۔ اور اگر اللہ چاہتا تو ان کے کانوں کی شنوائی اور آنکھوں کی بینائی دونوں کو زائل کر دیتا۔ بلاشبہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 17 سے 20)

☆ مومنوں اپنے صدقات وخیرات احسان رکھنے اور ایذا دینے سے اس شخص کی طرح برباد نہ کر دینا جو لوگوں کو دکھاوے کے لئے مال خرچ کرتا ہے اور اللہ اور روز آخرت پر ایمان نہیں رکھتا تو اس کے مال کی مثال اس چٹان کی سی ہے جس پر تھوڑی سی مٹی پڑی ہو اور اس پر زور کا مینہ برس کر اسے صاف کر ڈالے۔ اسی طرح یہ ریاکار لوگ اپنے اعمال کا کچھ بھی صلہ حاصل نہیں کر سکیں گے۔ اور اللہ ایسے ناشکروں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔ اور جو لوگ اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اور خلوص نیت سے اپنا مال خرچ کرتے ہیں ان کی مثال ایک باغ کی سی ہے جو اونچی جگہ پر واقع ہو۔ جب اس پر مینہ پڑے تو دگنا پھل لائے اور اگر مینہ نہ بھی پڑے تو خیر پھوار ہی سہی اور اللہ تمہارے کاموں کو دیکھ رہا ہے۔ بھلا تم میں کوئی یہ چاہتا ہے کہ اس کا کھجوروں اور انگوروں کا باغ ہو جس میں نہریں بہہ رہی ہوں اور اس میں اس کے لئے ہر قسم کے میوے موجود ہوں اور اسے بڑھاپا آ پکڑے اور اس کے ننھے ننھے بچے بھی ہوں تو ناگہاں اس باغ پر آگ کا بھرا ہوا بگولا چلے اور وہ جل کر راکھ کا ڈھیر ہو جائے اس طرح اللہ تم سے اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان فرماتا ہے تاکہ تم سوچو اور سمجھو۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 264 سے 266)

☆ اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے اعمال کی مثال ایسی ہے جیسے میدان میں ریت کا پیاسا اسے پانی سمجھے۔ یہاں تک کہ جب اس کے پاس آئے تو اسے کچھ بھی نہ پائے۔ اور اللہ ہی کو اپنے پاس دیکھے تو وہ اسے اس کا حساب پورا پورا چکا دے اور اللہ جلد حساب کرنے والا ہے۔ یا ان کے اعمال کی مثال ایسی ہے جیسے دریائے عمیق میں اندھیرے جس پر لہر چڑھی چلی آتی ہو اور اس کے اوپر اور لہر آ رہی ہو اور اس کے اوپر بادل ہو۔ غرض اندھیرے ہی اندھیرے ہوں۔ ایک پر ایک چھایا ہوا جب اپنا ہاتھ نکالے تو کچھ نہ دیکھ سکے۔ اور جس کو اللہ روشنی نہ دے اس کو کہیں بھی روشنی نہیں مل سکتی۔ (سورۃ نور 24 آیت 39 سے 40)

(کتاب کا نام "قرآن مجید کے روشن موتی" بشکریہ شمع بک ایجنسی کراچی)

خطوط

شگفتہ ارم درانی پشاور سے۔ ڈر کی محفل میں تمام دوستو! ایڈیٹر صاحبان اور قارئین کرام کو میرا اسلام قبول ہو۔۔۔۔ ”ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ“ کی محفل میں ایک طویل عرصے کے بعد دوبارہ حاضر ہو رہی ہوں۔ امید ہے کہ ڈر کی پوری ٹیم خیر خیریت سے ہوگی۔ مجھے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی ہے کہ ڈر نے پچھلے 4,3 سالوں میں بہت شاندار کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ کہانیوں کا معیار شاندار اور قابل ستائش ہوگیا ہے۔ تمام لکھاری کافی محنت کر رہے ہیں۔ سب کے جذبے اور محنت کو سراہتے ہوئے میں تمام لکھاریوں سے ڈر کی ترقی کے لئے مزید لگن اور محنت سے لکھنے کی درخواست کرتی ہوں۔ اتنے عرصے بعد حاضر ہوئی ہوں لیکن خالی ہاتھ نہیں۔ میری ایک تحریر اور قلم پیش خدمت ہے، اصلاح کر کے شائع کردیجئے گا، آپ کی ممنون رہوں گی، امید ہے کہانی قارئین کو پسند آئے گی۔ ڈر کی ترقی کے لئے دعا گو۔۔۔۔!

☆☆ شگفتہ صاحبہ: ڈر ڈائجسٹ میں موسٹ ویلکم! ویری ویری تھینکس کہ آپ نے ڈر ڈائجسٹ کو کسی قابل سمجھتے ہوئے دوبارہ اہمیت دی اور اپنی کاوش ارسال کی، کہانی آئندہ شامل اشاعت ہوگی اور اب قوی امید ہے کہ آئندہ بلکہ ہر ماہ نوازش نامہ بھیجنا بھولیں گی نہیں۔ Thanks۔

ساحل دعا بخاری بصیر پور سے۔ سورج بادلوں کے عقب میں پنہاں تھا، اور بادل دھند کی اوٹ میں چھپے تھے۔ ہوائیں سرسراتی پھرتی تھیں۔ ایسے میں ڈر ہاتھ میں آیا تو دل کو عجب اپنائیت سی ہوئی۔ سب سے پہلے تو ہم ڈر ڈائجسٹ کے توسط نذیر بک ڈپو کے ”نذیر انکل“ کا شکریہ ادا کرنا چاہیں گے کہ وہ ہمارے لئے ہر ماہ اتنا ”تردد“ کرتے ہیں۔ یعنی ہمارے لیٹرز وغیرہ پوسٹ کرواتے ہیں۔ ورنہ ہم شاید اس تسلسل سے شامل نہ ہوسکیں۔ ”تھینکس نذیر انکل“ دوسری دلدل کے لئے شکریہ اور دعاؤں کے لئے جزاک اللہ۔۔۔۔! آپ کا لیٹر ملا تھا تو تبھی ہم نے لیٹر کے ہمراہ زرد گلاب ارسال کی تھی۔ ملی نہیں کیا؟ پلیز بتایئے گا۔ ساجدہ ورجبہ جی!! اگر عامر ملک اور دیگر لوگ ہماری حوصلہ افزائی کرتے ہیں تو یہ محض ذرہ نوازی ہے۔۔۔۔ ورنہ کہاں ہم۔۔۔۔ اور کہاں یہ مقام اللہ اللہ۔۔۔۔!“ درحقیقت ہماری تحریروں میں ایسا کچھ نہیں ہوتا جو پسندیدگی کی سند حاصل کرسکے۔ بہرحال حوصلہ افزائی کے لئے شکریہ کے ادھ کھلے گلابوں کا بوکے ان سب کے لئے جو ”ذرہ نواز“ ہیں۔ صبا اسلم اور آصف سراج کی تحریریں پسند آئیں۔ سالوں کا سفر ابھی پڑھی نہیں۔ مگر یقیناً اچھی ہوں گی، کیونکہ ساجدہ اچھا ہی لکھتی ہیں۔ ناصر محمود فرہاد! ویلڈن! آپ کا طرز تحریر ہمیں بہت پسند ہے۔ ایس امتیاز بھی اچھا لکھتے ہیں۔ ایس حبیب اور عامر ملک کی نئی تحریروں کا ویٹ ہے۔ بلقیس خان! 23 مارچ کو آپ کا برتھ ڈے ہے۔ ”ہیپی برتھ ڈے ٹو دو بیسٹ ویشز“ شرف الدین بھائی، آپ کی ٹانگ، غلام نبی بھائی آپ کا زخم اور محسن عزیز حلیم بھائی آپ کا کندھا کیسا ہے اب؟ اللہ رب برتر آپ کو اور تمام مسلمانوں کو شفائے کاملہ عطا فرمائے، ہر پریشانی دور کرے، اور ہر جائز خواہش پوری کرے۔ آمین۔۔۔۔ اب کے لئے اتنا ہی پھر حاضر ہوں گے۔ تب تک کے لئے۔ اللہ حافظ۔

☆☆ ساحل صاحبہ: نئی کہانی کے لئے ویری ویری تھینکس۔ عقلمندوں نے کہا ہے کہ انسان کا چام نہیں بلکہ کام پیارا ہوتا ہے۔ لہٰذا اچھی کارکردگی پر ہی کسی کو نوازا جاتا ہے، ڈر ڈائجسٹ کے رائٹر بہت اچھے ہیں مگر چند ایسا بھی کرتے ہیں کہ نقل شدہ یا پھر ڈبل پالیسی پر کہانی چھپوا لیتے ہیں، خیر ایسا ہونا نہیں چاہئے، امید ہے کہ آئندہ ماہ بھی بذریعہ خط ملاقات کرنا بھولیں گی نہیں۔ Thanks۔

سیدہ بی بسمل قلندر آباد ایبٹ آباد سے۔ محترم ایڈیٹر صاحب! میری طرف سے اہل ڈر اور تمام پڑھنے والوں کو سلام عقیدت، ڈر کا شمارہ ملتے ہی ڈر کی محفل میں اپنا عقیدت نامہ لکھنے بیٹھ گئی، گزشتہ ماہ غیر حاضری کی وجہ چند مصروفیات تھیں، مگر آپ نے بھی میری غزل شائع نہیں کی، آپ کے پاس جو موجود ہے، وجہ نہ جانے کیا ہے، مگر آپ ضرور اسے شائع کردیجئے گا، ایک غزل اور ایک کہانی بھیج رہی ہوں، قابل اشاعت ہوئی تو شائع کردیجئے گا، لازماً قابل اصلاح ہے، کیونکہ پہلی بار لکھی ہے کہانی اگر اشاعت کے قابل ہوئی تو بتادیجئے گا ورنہ ہمیں بتادیں ہم دوبارہ لکھنے کی کوشش نہ کریں، ڈر کے تمام سلسلے آب رواں کی طرح قارئین کی تشنگی خوب مٹا رہے ہیں۔ وقت کی رفتار تو تیز نہیں ہوئی بلکہ انسان کی رفتار تیز ہوگئی ہے، اس مشینی دور میں لوگ کتاب کم اور کمپیوٹر زیادہ

پڑھتے ہیں، نتیجتاً ادب کم کم دکھائی دیتا ہے خدارا کتابوں سے رشتہ توڑنے والو! جو کتاب ہمیں دکھائی پڑھائی سکھاتی ہے وہ اور کوئی مشین نہیں سکھا سکتی۔ مطالعہ انسان کو اہم قابل اور پرسکون زندگی گزارنا سکھاتا ہے، تمام رائٹرز اور قاری ڈر سے محبت کرتے ہیں اور جس سے انسان وابستہ ہوتا ہے اس کے لئے کبھی غلط سننا نہیں چاہتا، خیر دعاؤں کی طالب ہوں اور آئندہ ماہ بشرط زندگی رہی تو پھر حاضر ہوں گی۔ خدا حافظ۔

☆☆ سیدہ صاحبہ: خط لکھنے اور وقت کے مطابق دلی تجزیہ کے لئے شکریہ، آپ کی کہانی ابھی پڑھی نہیں، آپ اپنی غزل پر نظر ڈالئے گا، اتنے زیادہ الفاظ پر غزل مشتمل ہے کہ ۔۔۔ امید ہے اب آئندہ اشعار میں کم الفاظ استعمال کریں گی۔ شکریہ۔

عروج ماہین سرگودھا سے ہا ادب باملاحظہ ہوشیار ۔۔۔ عروج ماہین تشریف لا رہی ہیں۔ سلام کے بعد عرض ہے کہ مجھے ڈر ڈائجسٹ خلاف توقع 27 تاریخ کو مل گیا۔ حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹنے تو مطالعہ شروع کیا۔ ساجدہ راجا اور بلقیس خان کی بیسٹ کہانیاں رہیں۔ ایس امتیاز احمد بہت اچھا لکھتے ہیں۔ خطوط کی محفل میں گئے تو ساحل صاحب ہمیشہ کی طرح خود کو نمایاں کرنے کی کوشش میں نظر آ گئیں۔ ایس حبیب خان مجھے آپ کا رابطہ نمبر درکار ہے۔ دینا پسند کریں گی؟ افشاں رمضان، صبا رمضان کہاں غائب ہو یار؟ سنبل ماہین طٰہٰ ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے رہی ہیں۔ آپ ان کی کامیابی کے لئے دعا کیجئے گا۔ انوری رمضان جیسی ناراض گڑیا کو کیوں نہیں منایا جا سکا، اب تک؟ ایڈیٹر انکل! آپ کے رائٹرز کو نئے آنے والے کچھ بھی کہہ دیں اور آپ خاموش رہیں، پھر رائٹرز تو ناراض ہو جائیں گے ناں ۔۔۔ پھر ملاقات ہوگی۔ اوکے بائے ۔۔۔

☆☆ عروج صاحبہ: قلمی نوازش نامہ بھیجنے کے لئے ڈھیروں شکریہ قبول کریں، یہ حقیقت ہے کہ جب بھی کوئی نیا یا پرانا رائٹر ناراض ہوتا ہے تو ہمیں بہت افسوس اور دکھ پہنچتا ہے، اور ہماری کوشش ہوتی ہے کہ رائٹر حضرات غصہ تھوک کر اپنی ناراضگی بھلا دیں، تو اس عمل سے یقیناً خوشی پہنچتی ہے، اور ویسے بھی ڈر ڈائجسٹ سے جتنے بھی لوگ وابستہ ہیں وہ ایک فیملی کی حیثیت رکھتے ہیں تو کیا ہم سب کے گھروں میں آپس میں ہلکی پھلکی نوک جھونک نہیں ہوتی تو یقیناً سب کا اثبات میں جواب ہوگا، چند دن میں ناراضگی ختم ہو جاتی ہے۔ میں تمام ناراض رائٹروں سے مخاطب ہوں کہ پلیز! پلیز! اپنی ناراضگی کو بھول جائیں اور ہنسی خوشی ڈر میں اپنی تحریریں ارسال کریں، اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ڈر ڈائجسٹ اپنے تمام رائٹرز حضرات کی بہت قدر کرتا ہے تو بھلا ان کی ناراضگی کیسے برداشت کر سکتا ہے۔ امید ہے ناراض رائٹر حضرات سنجیدگی سے غور فرمائیں گے۔ شکریہ۔

عطیہ زاہرہ لاہور سے، السلام علیکم! امید کرتی ہوں، ڈر ڈائجسٹ کا تمام اسٹاف خیریت سے ہوگا۔ سب سے پہلے تو آپ کا بہت بہت شکریہ ۔۔۔ کہ آپ نے میری کہانی "خونی حربہ" کو مارچ کے پرچے میں جگہ دی اور ساتھ اعزازی پرچہ ارسال کیا۔ اب میں اپنی نئی کہانی "ڈرکولا کا سفر" اور ایک نظم ارسال کر رہی ہوں، امید کرتی ہوں آپ کو دونوں چیزیں اچھی لگیں گی۔ میں اس نظم کے لئے بھی شکر گزار ہوں جو مارچ میں شائع ہوئی۔ اب بس دعا ہے کہ میرا یہ نیا کام پسند آئے۔ اپنی رائے سے آگاہ کیجئے گا۔ اس دفعہ طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے پرچے کا مطالعہ نہ کر سکی۔ اس لئے تبصرہ ادھار رہا ۔۔۔ اگلی دفعہ ضرور تبصرہ کروں گی۔ اب اجازت دیں۔

☆☆ عطیہ صاحبہ: نئی کہانی ابھی پڑھی نہیں اور امید ہے کہ اچھی ہوگی۔ کہانی اچھی ہوتی ہے تو اپنی جگہ خود بخود بنا لیتی ہے۔ رائٹروں کو بس یہ خیال رکھنا چاہئے کہ موضوع ڈر ڈائجسٹ کی مناسبت سے ہو۔ امید ہے کہ حسب وعدہ آپ آئندہ ماہ مکمل تجزیہ ضرور ارسال کریں گی۔

سنبل طٰہٰ سرگودھا سے، تمام اسٹاف اور قارئین کو السلام علیکم اس بار شمارہ تھوڑا لیٹ ملا۔ مگر کہانیوں کی اعلیٰ معیار نے ساری کسر پوری کر دی، تمام تحاریر ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ شاعری کا معیار بھی کافی اونچا ہو گیا ہے۔ اب ساجدہ راجا ترقی کی جانب گامزن ہیں۔ ساجدہ جی! آپ چاہیں تو مجھ سے قلمی دوستی کر سکتی ہیں۔ مجھے اپنی رائے سے مطلع کر دیجئے گا۔ غلام نبی نوری ایک کہانی لکھ کر تھک گئے کیا؟ ہم آپ کی مزید کہانیاں پڑھنا چاہتے ہیں۔ ایڈیٹر انکل! پلیز میری کہانیاں شائع کر دیں۔ اگر آپ نے فوراً شائع نہ کیں تو میں آپ سے ناراض ہو جاؤں گی۔ انوری رمضان کے بغیر ڈر ڈائجسٹ ایسا لگتا ہے جیسے آسمان چاند کے بغیر جس پر ستارے تو بہت ہوتے ہیں مگر چاند نہیں ہوتا۔

☆☆ سنبل صاحبہ: خط لکھنے اور کہانیوں کی پسندیدگی کے لئے شکریہ، آپ کی کہانی بہت جلد شائع ہوگی۔ سنبل صاحبہ آپ ہی نہیں بلکہ ہم بھی انوری اور افشاں کو بہت یاد کرتے ہیں۔ امید ہے انوری اور افشاں رمضان اپنے ۔۔۔۔۔۔ کی دل شکنی نہیں کریں گی۔ پلیز!

انوری اور افشاں کم بیک......!!

کنول فیاض کراچی سے، سب سے پہلے محترم ایڈیٹر صاحب اور تمام ڈر کی ٹیم اور ڈر پڑھنے والوں کو سلام، اپنا خط ڈر کے صفحے پر دیکھ کر نہایت خوشی ہوئی۔ مگر تھوڑا غم بھی ہوا کہ میری کہانی اور غزل ابھی شائع نہیں ہوئی۔ کوئی بات نہیں...... مگر اب میری کہانی اور غزل ضرور شائع کیجئے گا۔ باقی کہانیوں میں "دوسری دلدل" "الٹا عمل" اور "پراسرار کوبرا" دل کو بھا گئی۔ اور سب سے زیادہ "شمائل" پسند آئی۔ کہانی کا اینڈ بہت پسند آیا، پڑھ کر دل رونے کو آ گیا، باقی سب کہانیاں اپنی اپنی جگہ نمبر ون تھیں۔

☆☆ کنول صاحبہ: خط لکھنے، کہانیوں کی تعریف اور آئندہ بھی ڈر ڈائجسٹ میں اپنی کاوشیں بھیجنے کے لئے شکریہ قبول کیجئے، کہانی کے صفحات مزید بڑھا دیں کیونکہ آپ کی کہانی بہت ہی چھوٹی ہے۔

آسماں شاہین مری سے، دن کا سپہ سالار لمحوں کی فوج کو لئے شام کی منزل کی جانب رواں دواں تھا۔ جب ڈر کا شمارہ میرے ہاتھ لگا۔ کہانیوں میں عثمان غنی کی سب سے بیسٹ رہی۔ ان کے لکھنے کا انداز بہت منفرد ہے۔ کیری آن بھیا۔ باقی کہانیاں بھی ٹھیک تھیں۔ عمران قریشی صاحب کا پاگلوں کے بارے میں تجربہ خاصا وسیع لگتا ہے۔ تمام شاعری بھی اپنی مثال آپ تھیں۔ ایڈیٹر صاحب! آپ کی توجہ ایک اہم مسئلے کی جانب مبذول کروانا چاہوں گی۔ ساحل دعا بخاری اپنی تحاریر کا ڈبل پوز کر رہی ہیں۔ ان کی تحریر "درتوبہ" آپ کے میگزین کے علاوہ ایک دوسرے ڈائجسٹ میں اسی نام سے شائع ہوئی ہے۔ حالانکہ ایک ہی کہانی دو جگہ ارسال کرنا اور چھپوانا کیا یہ درست ہے۔ ایسا کیوں؟ مذکورہ رائٹر دوسروں کی کہانیوں میں نقص ڈھونڈنے میں اتنا مگن رہی ہیں کہ انہیں اپنی غلطی کا احساس ہی نہیں ہو سکا۔ امید ہے کہ خط کا کوئی بھی حصہ حذف کئے بغیر پوری ایمانداری سے شائع کیا جائے گا۔ ڈر کی محفل میں اگلی شرکت، خط کے مکمل شائع ہونے پر منحصر ہے۔ فی امان اللہ۔

☆☆ آسماں صاحبہ: ڈر ڈائجسٹ میں خوش آمدید، امید ہے آپ کی تحریر پڑھ کر ساحل صاحبہ یقیناً مثبت جواب دیں گی۔ اور آپ بھی آئندہ ماہ نوازش نامہ بھیجنا نہ بھولیں گی نہیں۔

راحل بخاری بھیرہ پور سے، السلام علیکم! ڈر اس بار 23 کو ملا۔ ٹائٹل اچھا تھا، سب سے پہلے خطوط کی محفل میں حاضری دی اور اپنا خط پڑھ کر عجیب محسوس کیا۔ اگر آپ نے کٹنگ کرنی ہی تھی تو پورا جملہ تو کاٹتے...... یہ کیا کہ آدھا کاٹ دیا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے دوسری دلدل پڑھی اور پڑھ کر بے ساختہ دعا کو داد دی، حالانکہ جب اس نے لکھی تھی تو میں نے اس لئے نہیں پڑھی تھی کہ ایویں ہی ہوگی۔ اذان شبیر کا کردار مدتوں یاد رہنے والا ہے۔ بہر حال میری طرف سے مبارکباد قبول کرو سسٹر! ناگ کا انتقام پڑھ کر بے اختیار ناگ کو داد دی۔ شمائل پہلے بھی ایک پرچے میں شائع ہو چکی ہے۔ اور پراسرار کوبرا بھی ایک اور ڈائجسٹ میں شائع ہوئی ہے۔ اس بار دوسری دلدل کے بعد رسالے کی جان چڑیا گھر تھی۔ فرہاد بھائی! ساڈی طرفوں مبارکاں...... اس بار عامر بھائی کی اسٹوری نہیں تھی۔ عامر بھائی آپ میرے فیورٹ ہو۔ ایڈیٹر بھائی! آپ چاہیں تو پورا خط شائع کر دیں اور اگر چاہیں تو آدھا، آپ کی مرضی ہے...... آخر میں سب کو سلام......

☆☆ راحل صاحب: اب تو خوش ہو، کیونکہ پورا خط شائع ہو گیا۔ رہا نقل شدہ کہانی کا معاملہ تو یہ بہت سنگین ہے۔ ایسا کرنے والوں کو اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر غور کرنا چاہئے ایسا کرنے سے کوئی بات چھپتی نہیں اور اس طرح بھد بھی ہوتی ہے، امید ہے رائٹر حضرات مثبت سوچ اپنائیں گے۔ آپ کے خط کا انتظار رہے گا۔

ایس امتیاز احمد کراچی سے، امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا! ماہ رواں کا خوب صورت شمارہ ہمارے سامنے ہے۔ دلفریب ٹائٹل کے ساتھ تمام سلسلے خوب رہے۔ کافی اچھے رائٹرز لکھنے والے "ڈر" میں آ رہے ہیں۔ جو کہ بہت اچھی بات ہے، اسٹوریز اور غزلوں کا انتخاب لاجواب رہا۔ ہمارے آرٹیکلز لگانے کا شکریہ، ایمٹرز آپ کے پاس ہیں پلیز دیکھئے گا۔ ارسال خدمت ہیں۔

☆☆ امتیاز صاحب: فرمائش کے باوجود ہم بھی آپ کے قلمی تجزیہ سے...... خیر آپ کا خطرناک تجربہ شامل اشاعت ہے، امید ہے آپ آئندہ ماہ بھی اپنا تجزیہ بھیجنا بھولیں گے نہیں۔

عمران فائق کامل پور موسیٰ سے، السلام علیکم! پوری امید ہے کہ ڈر کی پوری ٹیم اور قارئین خیریت سے ہوں گے۔ رہی بات ڈر ڈائجسٹ کے تجزیہ کی......! اگر میں اتنے اعلیٰ شمارے کی شان و شوکت پر تبصرہ کروں تو سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ البتہ

شارٹ کٹ میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ ماہ مارچ کا "ڈر ڈائجسٹ" "الف" سے لے کر "ی" تک چمکتا دمکتا منظر پیش کرتا رہا۔ ٹائٹل بھی بہت زبردست تھا۔ "قرآن کی باتیں" پڑھ کر قلب مردہ میں پھر سے جان پڑ گئی۔ خطوط عمدہ تھے۔ تمام کہانیاں اعلیٰ تھیں۔ ڈر، خوف اور سسپنس سے بھرپور تھیں۔ شاعری کا انتخاب بھی بہت اچھا تھا۔

☆☆ فائق صاحب: رسالہ اور کہانیوں کی دل کی گہرائی سے تعریف کے لئے بہت بہت شکریہ، دراصل خطوط کے ذریعہ ایک دوسرے کے خیالات جان کر بڑی خوشی ہوتی ہے اور قوی امید ہے کہ آپ آئندہ بھی خوشی کے لئے خط ارسال کرتے رہیں گے۔

محمد اسلم جاوید فیصل آباد سے۔ السلام علیکم! آپ خیریت سے ہوں گے اور میں خداوند کریم سے نیک چاہتا ہوں، میری دعا ہے کہ خدا ڈر ڈائجسٹ کو کامیابی سے ہمکنار کرے۔ ڈر کے تمام سلسلے اپنی اپنی جگہ پر بہترین ہیں جیسے انگوٹھی میں نگینہ قرآن کی باتیں، قوس قزح اور غزلیں خوب سے خوب تر ہیں۔ تمام کہانیاں اپنی اپنی جگہ اچھی ہیں۔ اور خط شائع کرنے کا بہت شکریہ۔

☆☆ جاوید صاحب: واقعی جس والہانہ طریقے سے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ اسے پڑھ کر بہت ہی سرور ملتا ہے، ایک اچھے انسان کے لئے اچھی باتیں ہی زندگی کا سرمایہ ہوتی ہیں، خوشی اور خلوص کی بہت اہمیت ہے اور خوشی دولت سے خریدی نہیں جا سکتی۔

فرمان احمد نصیب کراچی سے۔ ڈر ڈائجسٹ کے محبتوں اور چاہتوں بھرے خطوط کی محفل میں، میں اپنے پہلے خط کے ساتھ حاضر ہوں۔ ڈر کی پوری ٹیم اور ادب کی اس خوب صورت دنیا سے تعلق رکھنے والے تمام لکھاری اور قاری کو میرا محبت بھرا اسلام قبول ہو۔ فروری 2014ء میں شائع ہونے والی میری پہلی کاوش "مددگار روح" کو پسند کرنے کے لئے میں آپ سب کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں، مارچ 2014ء کا شمارہ دیر سے ملا۔ سرورق اپنے فولڈنگ اسٹائل کے ساتھ اچھا لگا۔ قرآن کی باتیں بہترین سلسلہ ہے۔ کلام پاک کی برکتوں سے ڈر مزید ترقی کررہا ہے اور دن بدن اس کی شہرت اور مقبولیت بڑھتی جا رہی ہے۔ سب سے پہلے اپنی پسندیدہ رائٹر ساجدہ راجا کی "ریسٹ ہاؤس" پڑھی۔ عام موضوع کو نئے انداز میں پیش کرنا بھی ایک ہنر ہے۔ کہانی کو خوف اور سسپنس کے عناصر کے ساتھ ساتھ ایمان افروز اور سبق آموز مناظر کے ساتھ پیش کرنا ساجدہ بہن کا خاصہ ہے۔ آپ کے الفاظ کا چناؤ بھی لاجواب ہوتا ہے۔ بلقیس خان کی کہانی "کفن" کا میں کافی عرصے سے خطوط میں ذکر دیکھ چکا تھا۔ اس لئے مجھے بھی انتظار تھا۔ کہانی واقعی زبردست ہے۔ اچھا موضوع اور نیا انداز اچھا لگا۔ میں ڈر ڈائجسٹ کی ترقی کے لئے شب و روز دعا گو ہوں کہ یہ مزید ترقی کی منازل طے کرے۔

☆☆ فرمان صاحب: ڈر ڈائجسٹ میں خوش آمدید، کہانیوں کی دلی تعریف کے لئے اور پھر آئندہ بھی خلوص نامہ ارسال کرنے کے لئے ڈھیروں شکریہ قبول کریں، کہانی آئندہ شمارے میں ضرور شامل اشاعت ہوگی۔

شرف الدین جیلانی ٹنڈوالہ یار سے۔ السلام علیکم! مارچ کا ڈر حاضر مطالعہ ہے، امید ہے دیگر قارئین کے ذوق پر بھی پورا اترے گا۔ میں ادارے کا اور ڈر کے اراکین کا شکر گزار ہوں، جو ڈر کے تمام ساتھیوں کے غم و خوشی میں دعاؤں میں یاد رکھتے ہیں۔ رسالہ حسب معمول رواں دواں ہے، ساتھی بھرپور تحریریں بھیج رہے ہیں، بہت انجوائے کرتے ہیں، ساحل دعا بخاری صاحب بہت شکریہ کہ ہم آپ سب کی دعاؤں کے طفیل آخرت کے اکاؤنٹ میں اضافہ کرتے رہیں گے۔ ادارے کو پھر یاد دلاؤں ہم انتخاب پسند کے ذریعے ڈر میں شامل ہوتے ہیں، کیوں کہ میں ان پڑھ ہوں، ادارے کی مہربانی ہے کہ ہمیں سالوں سال سے مایوس نہیں کیا ہے بلکہ ڈر میں بھرپور جگہ ملتی ہے۔ سب کو دعائیں۔

☆☆ شرف الدین صاحب: آپ کی بھی بہت بہت مہربانی کہ آپ ہر ماہ، خوشی ڈر میں اپنی کاوشیں بھیجتے رہتے ہیں۔ آپ پڑھے لکھے نہیں تو کیا ہوا، آپ کی سوچ تو مثبت ہے ناں، اور دل میں خوف خدا، اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔

محمد شہزاد علی پور مظفر گڑھ سے۔ مارچ کا ڈر ڈائجسٹ پڑھ کر دلی خوشی ہوئی، تمام کہانیاں اپنی مثال آپ ہیں، ان کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ مجھے کہانیاں لکھنے اور پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ میں نے 2012ء میں سائنس کے ساتھ میٹرک پاس کی ہے، یہ میری پہلی کہانی ہے، اور مجھے قوی امید ہے کہ آپ کو پسند آئے گی اور پڑھنے والوں کو بھی اچھی لگے گی۔ میں نے بہت محنت سے کہانی لکھی ہے۔ اگر حوصلہ افزائی ہوئی تو آئندہ بھی کوشش کرتا رہوں گا۔ اس میں اصلاحی پہلو بھی یقیناً نکل سکتا ہے۔ اس کے لئے مودبانہ گزارش ہے کہ نظر ثانی کی جائے اور میرے حوصلے کو پست ہونے سے بچایا جائے۔ اچھی امید سے کہانی ارسال ہے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ امید پر دنیا قائم ہے۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ ڈر ڈائجسٹ مزید ترقی کرے۔

☆☆ شہزاد صاحب: ڈر ڈائجسٹ میں ویلکم، آپ کی کہانی بہت لیٹ موصول ہوئی ابھی پڑھی نہیں، اگر اچھی ہوئی، موضوع کے لحاظ سے تو اسے اصلاح کرکے ضرور شائع کردی جائے گی، آپ ہمت مرداں مدد خدا پر قائم رہیں تو یقیناً کامیابی آپ کے قدم چومے گی۔ آدمی لکھتے لکھتے ضرور لکھاری بن جاتا ہے۔ اپنی سوچ کو بروئے کار لایئے گا، نقل سے دور تو ضرور آپ کو خوشی ملے گی۔ آئندہ ماہ بھی آپ کے نوازش نامہ کا انتظار رہے گا۔

محمد رضوان قیوم راولپنڈی سے۔ السلام علیکم! میں خیریت سے ہوں، امید کرتا ہوں کہ آپ بھی خیریت سے ہوں گے۔ دیگر احوال یہ ہے کہ آپ کو ایک فریش اور منفرد پلاٹ پر مشتمل پراسرار نوعیت کی کہانی ارسال کر رہا ہوں۔ بہت عرصہ ہوا ہے، میری کوئی تحریر شائع نہیں ہوئی ہے۔ مہربانی کرکے اسے جلدی شائع کردیں، میرا ناول بھی آپ کے پاس کافی عرصہ سے پڑا ہوا ہے۔ اس پر بھی نظر کرم کریں، شکریہ۔

☆☆ رضوان صاحب۔ آپ کی کہانی اگلے شمارے میں شائع ہوگی۔ پہلے آپ اکثر چھوٹی چھوٹی کہانیاں ارسال کرتے تھے، لہٰذا وہ کہانیاں ہر ماہ یا دوسرے ماہ ضرور شائع ہوتی تھیں۔ محترم زیادہ بڑی اور ناول نما کہانی التوا کا شکار ہوجاتی ہے۔ آئندہ ماہ بھی خلوص نامہ کا انتظار رہے گا۔

ملک نعیم ارشاد ڈجکوٹ فیصل آباد سے۔ السلام علیکم! مارچ 2014ء کا شمارہ اس مرتبہ 20 تاریخ کو مارکیٹ سے خرید لیا۔ کیوں خریدا اس کی وجہ بھی بتائے دیتا ہوں، کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ اس دفعہ بھی بندہ ناچیز کی کہانی ڈر ڈائجسٹ کی زینت نہیں بنے گی اور ہوا بھی یہی جیسے ہی کہانیوں کی فہرست کا صفحہ پلٹا کہانی کہیں نظر نہیں آئی اور خطوط کے جواب نے پچھلے تین ماہ والا ہی جواب تھا کہ کہانی کمپوز ہو چکی ہے اور اس ماہ ضرور شائع ہوگی۔ خیر ایک ماہ کے انتظار کا وقت مزید بڑھ گیا۔ امید تو ہے اس دفعہ کہانی کمپوز ہو چکی ہے۔ اگلے ماہ ضرور شائع ہوگی، کے برعکس کہانی نظر آجائے۔ اب آتے ہیں شمارے کی طرف۔ ٹائٹل زبردست تھا۔ قرآن کی باتیں پڑھیں (بس اللہ تعالیٰ سے خاص دعا ہے کہ وہ ہمیں اپنے احکام پر چلنے کی توفیق دے، آمین) پہلی کہانی اماوس کے باسی زبردست تھی، اس کے علاوہ دیوی کی پجارن، سنہرا ناگ، برائی کا انجام، کفن اور وہ ۔ ہاؤس زبردست تھی، کچھ کہانیاں زیر مطالعہ ہیں، وہ بھی زبردست ہوں گی تو س قزح کے رنگ ہر دفعہ ہی اچھے ہوتے ہیں۔ کالا جادو کہانی آپ کو ارسال کر رہا ہوں (بمشکل) ڈر ڈائجسٹ کے صفحات کی زینت بنے، اس کے علاوہ بھی دھندلی رات، الجھن کہانیاں بھی پڑی ہیں، ان پر بھی نظر ثانی کریں، اور جلدی سے ڈر ڈائجسٹ کے صفحات میں جگہ دیں۔ امید اس مرتبہ مجھے ضرور خوشی ملے گی۔

☆☆ نعیم صاحب: چلئے خوش ہو جایئے، کہانی شامل اشاعت ہے، یاد رکھیں، صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے، آپ کی دیگر کہانیاں بھی ضرور شائع ہوں گی۔ اطمینان رکھیں، پلیز، آئندہ ماہ تجزیہ ارسال کرنا بھولئے گا نہیں۔

غلام نبی نوری کنڈیاں خاص سے۔ السلام علیکم! امید ہے تمام احباب خیریت سے ہوں گے اور اللہ تعالیٰ کے حفظ وامان میں ہوں گے۔ سب سے پہلے تو میں دل کی اتھاہ گہرائیوں سے تمام احباب، اسٹاف اور دیگر عملے کو سلام پیش کرتا ہوں۔ ڈر کا شمارہ فروری، بہت ہی لیٹ ملا، ٹائٹل سادہ مگر اچھا تھا۔ قرآن کی باتیں زبردست تھیں، خطوط کی محفل میں اعزی باری تو اپنا خط دیکھ کر بہت خوشی ہوئی، عدالتی مصروفیات کی بنا پر کچھ لکھ نہ سکا معذرت خواہ ہوں۔ رولو کا بیسٹ آف معذور رہی۔ دیگر کہانیاں ابھی زیر مطالعہ ہیں۔ امید ہے کہ اچھی ہوں گی۔ خطوط کی محفل میں تمام احباب کو سلام۔ آخر میں خالد بھائی سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ کیا بذریعہ ای میل کہانی بھیجی جا سکتی ہے؟ جواب کا انتظار ہے۔

☆☆ غلام نبی صاحب۔ اتنی مصروفیات کے باوجود آپ کا ڈر ڈائجسٹ سے لگاؤ قابل تحسین ہے، آپ اپنی کہانی بذریعہ ای میل بھیج سکتے ہیں، آئندہ ماہ بھی خلوص نامہ کا انتظار رہے گا۔

فیضان ملک رحیم یار خان سے۔ السلام علیکم، مارچ کا رسالہ فروری مل گیا تھا۔ پڑھ کر دلی خوشی ہوئی، کہانیوں میں دیوی کی پجارن، آسیبی کتاب، روح کی روداد اچھی تھیں۔ اس کے علاوہ بھی ڈر کی تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ میری دعا ہے کہ ڈر ڈائجسٹ دن رات ترقی کرے۔ دعا کیجئے گا کہ میں امتحان میں پاس ہو جاؤں۔

☆☆ فیضان صاحب: ہماری اور قارئین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو امتحان میں اچھے نمبروں سے کامیاب کرے، اور آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ ارسال کرنا بھولئے گا نہیں۔ اس کے لئے شکریہ قبول کیجئے۔

مدثر بخاری شہر سلطان سے، آداب۔ امید پر دنیا قائم ہے اسی مصداق ہم بھی قائم ہیں اور اسی امید کے سہارے ایک بار پھر آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ مارچ کا شمارہ ابھی ملا نہیں۔ لہٰذا بغیر تبصرہ ممکن نہیں۔ امید ہے بہت اچھا اور زبردست ہوگا۔۔۔۔ ہمارا ساتھ آپ کے ساتھ یونہی قائم رہے گا! مطلب یہ دوستی نہیں توڑی جائے گی! انشاءاللہ، ایک بات عرض خدمت ہے۔ مجھے بہت خوشی ہوتی ہے، میں ڈر کی طرف کوئی تحریر ارسال کرتا ہوں، اور یہ ہمہ وقت ہے۔ مطلب میری نئی تحریریں حاضر ہیں۔۔۔! اپنی تحریر شمر تماشا کا انتظار رہے گا۔ ویٹنگ لسٹ میں کسی نہ کسی تو ضرور ظاہر ہوگی۔ انشاءاللہ، میری کچھ تحریریں بھی آپ کے پاس موجود ہیں، ملک الموت، وہ کون تھی؟ ضرور نظر کرم فرمایئے گا۔ اور آخر میں پیارے پاکستان کے لئے پیار، خلوص اور دعا! خدا کرے میرے وطن کا ہر شہری رحمت خداوندی کے سائے تلے ترقی کے منازل طے کرے۔ اس ملک میں برداشت اور خلوص کی ضرورت ہے۔ ملکی سالمیت اور استحکام کے لئے اس قوم کو متحد ہو کر شرپسند عناصر کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ میری تحریر، خواب امن، اسی پوائنٹ کے گرد گھومتی ہے۔! دعا ہے کہ ڈر فیملی کے تمام رائٹرز، انتظامیہ، خوش آباد رہیں۔ گرم ہوا کا جھونکا تک ان کو نہ چھوئے، آمین۔

☆☆ مدثر صاحب: خوش ہو جایئے، شمر تماشا شامل اشاعت ہے اور دیگر کہانیاں بھی جلوہ گر ہوتی رہیں گی، لیکن آئندہ ماہ بھی بلکہ ہر ماہ خلوص نامہ بھیجنا بھولئے گا نہیں۔ Thanks۔

عرفان محمود بدین خر سے، پیارے ڈر کے تمام اسٹاف اور ڈر کے تمام قارئین کو عرفان محمود کی طرف سے السلام علیکم، مارچ 2014ء کا شمارہ میرے ہاتھ میں ہے جو کہ خوب صورت ٹائٹل کے ساتھ، سب سے پہلے قرآن کی باتیں پڑھیں، جتنا اس میں لکھا جاتا ہے۔ ہم مسلمان ہونے کے ناطے اس میں سے بہت کچھ جانتے ہیں اور ہمیں بھی معلوم ہے لیکن ہمارے ایمان کی کمزوری کہ عمل سے دور ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو قرآن وسنت پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہمیں برائی سے بچائے۔ خطوط کی محفل میں قدم رکھا۔ میری طرف سے اور تمام قارئین کی طرف سے بلقیس خان صاحبہ کو قرارداد پاکستان کے دن سالگرہ، بہت بہت مبارک ہو اور ساحل دعا بخاری یہ سب کیا ہے فروری کے شمارے میں اتنے شکوے اور مارچ کے شمارے میں سب کچھ اچھا اچھا یہ کیا بات ہوئی، یعنی جب آپ کا موڈ اچھا ہو تو سب بہتر ورنہ موڈ خراب تو اچھا بھی برا۔ میری معلومات کے مطابق ڈر نے ہمیشہ نئے رائٹروں کی حوصلہ افزائی کی ہے لیکن میں ہر نئے رائٹر سے یہ بات کہوں گا کہ آپ جو کہانی لکھیں۔ پہلے اسے اچھی طرح پڑھ لیں کہ جو آپ نے کہانی لکھی ہے وہ ان کہانیوں جیسی ہے جو آپ ڈر میں پڑھتے ہو اس کا انداز بیان ویسا ہے جو ڈر میں شائع ہونے والی کہانیوں کا ہوتا ہے۔ اگر ہو تو پھر اسے بھیجا جائے۔ اچھی کہانیاں اپنی جگہ خود بناتی ہیں۔ اسے سنوارنے کی ضرورت نہیں پڑتی اور تھوڑی بہت کی بیشی تو سب میں ہی رہ جاتی ہے۔ میری نظر میں ملک نعیم ارشاد صاحب زندہ دل انسان ہیں۔ اگر ملک نعیم ارشاد صاحب کا موبائل نمبر مل جائے تو بہت مہربانی ہوگی۔ کہانیوں میں "کماؤں کے باسی" "ٹونا" "خونی حربہ" "جن کا عکس" "ڈیتھ ہاؤس" "آسیبی کتاب" پسند آئیں۔ 2010ء کے بعد حاضر ہوا ہوں اور خط بھی بہت طویل ہو گیا ہے دونوں باتوں کے لئے معذرت، آئندہ ایسا نہیں ہوگا انشاءاللہ اب غیر حاضری نہیں ہوگی دعاؤں میں یاد رکھنا۔

☆☆ عرفان صاحب: ڈر ڈائجسٹ میں ایک مرتبہ پھر موسٹ ویلکم، خط لکھنے اور دل لگا دینے کہانیوں کی تعریف کے لئے شکریہ، اور حسب وعدہ آئندہ ماہ بھی خلوص نامہ کا شدت سے انتظار رہے گا۔

عمران رمضان کمبوہ الہ آباد سے، سر جی کیسے ہیں؟ امید کرتا ہوں ڈر ڈائجسٹ کی پوری ٹیم خیریت سے ہوگی! کئی ماہ تک مصروف ہونے کی وجہ سے نہیں لکھ سکا! لیکن پڑھنا نہیں چھوڑا اور آج پھر ڈر ڈائجسٹ کے لئے کچھ چیزیں لے کر حاضر ہوا ہوں، امید ہے آپ ضرور شامل اشاعت کریں گے۔ میں آصف شہزاد الہ آبادی سے التماس کرتا ہوں کہ آپ ڈر ڈائجسٹ میں شعر اور غزلیں تو لکھتے ہیں تو پلیز! آپ اپنی کوئی اسٹوری بھی لکھیں۔ ویسے میں آصف شہزاد الہ آبادی کو اپنا استاد مانتا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ ڈر ڈائجسٹ میں لکھنا پڑھنا بھیجنا سب کچھ انہی سے ہی سیکھا تھا، میں آصف شہزاد الہ آبادی کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں جن کی بدولت میں آج ڈر ڈائجسٹ میں شامل ہوں۔

☆☆ عمران صاحب: ایک مرتبہ پھر ڈر ڈائجسٹ میں خوش آمدید، امید ہے اب آپ طویل عرصہ غیر حاضر نہیں رہیں گے، چلئے دیکھتے ہیں کہ آصف شہزاد کے شاگرد اپنے استاد کی بات کہاں تک رکھتے ہیں، آئندہ ماہ بھی آپ کے نوازش نامہ کا انتظار رہے گا۔

☆☆☆

شہر تماشا

مدثر بخاری-شہر سلطان

نوجوان اپنے بستر پر بیٹھا حیرت زدہ تھا کہ اچانک بستر کے قریب ایک عورت کا ہیولہ نمودار ہوا اور وہ بڑھنے لگا اور پھر بڑھتے بڑھتے وہ ہیولہ نما عورت ایسی ہوگئی کہ نوجوان کا دل حلق میں آنے لگا اور پھر چشم زدن میں---

ذہن سے محو نہ ہونے والی ... ایک دلفریب اور من پسند پر تحیر اور حیرت انگیز روداد

گرمی کی حدت بڑھتی جارہی تھی دل تو چاہتا تھا کہ جسم کو مکمل طور پر ہر قسم کے کپڑوں سے آزاد کر کے تالاب میں جمپ لگا دوں ... !مگر یہ ممکن نہ تھا... ہم ایک معزز ٹیچر سے بھی اوپر کی چیز تھے، مطلب پروفیسر صاحب.... مگر انداز بیان، انداز چال، اور ڈریسنگ مکمل طور پر 80ء کی دہائی والی ....!

بدن ڈھانپنا اور گرمی سہنا، مجبوری تھی۔ ... بڑی بات تھی کہ ہم زندہ تھے !آج بس کے ذریعے گھر جانا پڑ رہا تھا.... بس اور وہ بھی 80ء کی دہائی والی بس !کھٹارا بس، ٹوٹی پھوٹی سیٹیں، جھٹکے اور بریکیں فیل ہوجانے کا خدشہ، 40 کلومیٹر کا فاصلہ، دو گھنٹوں میں کٹ جاتا.....ایک ہی کھٹارا بس تھی اور ہجوم اتنا کہ جیسے بابا بلھے شاہ کے سالانہ عرس پر حاضری دینے کے لئے زائرین.....!

ویسے اس ہجوم بیکراں میں ہم خود بھی شامل تھے..... ایک ذاتی فلسفہ پیش کرنا چاہوں گا..... ہم انسان کتنے عجیب ہیں۔ اپنے سوا دوسرے تمام لوگوں کو ہجوم کہتے ہیں..... حالانکہ ہم خود بھی ہجوم کا حصہ ہوتے ہیں.....!

آج پورے دس سال بعد.....ہم کھٹارا بس جس کے فرنٹ بورڈ پر رحمان طیارہ جلی حروف میں لکھا ہوا تھا خاصا چمک رہا تھا.....سوار ہونے کے لئے خاصی جدوجہد کر رہے تھے۔

لیکن... ہم دس سال کے لیے عرصے بعد اس رحمان طیارہ میں کیوں سفر کر رہے تھے... ؟

دراصل ہماری بائیک پیٹرول کی بندش کے باعث گھر پر ہی کھڑی ہے..... ملکی حالات نے ہمیں بھی دلبرداشتہ کر دیا ہے..... پیٹرول کی بندش ہمارے لئے دردناک عذاب سے کم نہ تھی۔ نہ حق ہمارے لئے بلکہ پوری عوام کے لئے کاروباری حضرات الگ پریشان، دفتری حضرات جو وقت کی پابندی کے مصداق ہر ممکن کوشش کے باوجود دفتر میں دیر سے پہنچے ہیں..... پروفیسرز اور عام ٹیچر ڈائس پر ٹھہرے تو نہالان چمن کو وقت کی پابندی کا لیکچر جھاڑ رہے ہوتے ہیں لیکن ذہن کے کسی کونے میں یہ سوچ مکڑی کے جالے کی مانند پھیلنا شروع ہو جاتی ہے کہ ملکی حالات اور پیٹرول کی قلت ان کے اس لیکچر کی دھجیاں اڑا دیتی ہے..... زندہ قومیں کب اور کیسے وجود میں آتی ہیں؟ جب تک ایک قوم وقت کی پابندی کرتی ہے اور اپنے تمام تر اصولوں کو رائج کر کے وقت کی نزاکت اور پابندی وقت کی

اہمیت کو اجاگر کرتی ہیں..... اور جب تک ایک قوم وقت کی قدر کرتی ہے تب تک زندہ و تابندہ رہتی ہیں۔

ہاں تو جناب......! آج ایک گھاٹر بس اور نجانے کتنے لوگ۔ اس بس کے بعد دوسری کوئی بس اڈے پر موجود نہ تھی......!

ہم بھی پرچہ جات کو ہاتھ میں اٹھائے اس ہجوم بیکراں کا حصہ بن گئے ...... سیٹی بج چکی تھی...... ڈرائیور، اسٹیئرنگ سنبھال چکا تھا۔

"او......! او کاکے...... چھت پہ چڑھ جا......!"

"او اسٹوڈنٹس...... بھائیو! —— چند لمحوں کا سفر ہے۔" "چھت پر چڑھ جاؤ" کوئی پائپ سے لٹکا ہوا تو کوئی دروازے میں اٹکا ہوا۔ ...کنڈیکٹر دھاڑے جا رہا ہے۔

اسٹوڈنٹس اس بلا کی گرمی میں پائیدان سے سیڑھیاں چڑھتے چھت پر جا پہنچے......!

ہم نے اپنا ہاتھ دروازے سے لگے پائیدان پر مضبوطی سے ٹکا دیا......بس نے اسٹارٹ لیا......ایک جھٹکا سا لگا...... ایک لمحے کو تو ایسا لگا جیسے ابھی ہاتھ چھوٹا......اور نیچے پکی سڑک کا خوف ناک ٹکراؤ......دل ہلکا ہونے لگا.. !

پھر ایک دعا جیسے میرے دماغ میں گونجی —— !

"خوش رہے بیٹا......! میری زندگی بھی تجھے لگ جائے......" ہم نے آج صبح ہی ایک نابینا عورت کو سڑک پار کرائی تھی۔ اور بدلے میں ایسی خوبصورت دعا ملی کہ نہ پوچھیے...... ! میں واقعی نیچے کو گرنے والا تھا کہ پھر وہ دعا میری زندگی بچا گئی۔

"صاحب جی...... یہ پیکٹ ہمیں پکڑا دیں...... اور اندر آجائیں......" کنڈیکٹر نے ہماری حالت دیکھی تو ہمدردانہ انداز سے بولا۔

"جی شکریہ بھائی...... ہم ٹھیک ہیں......" ہم نے دروازہ چھوڑ کر اندر گھستے ہوئے کہا......! اور آخر کار ہم بس میں گھس ہی گئے اور ایک طرف کھڑے ہو کر اپنی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش میں لگے رہے میرے سامنے سیٹ پر ایک لڑکی براجمان تھی۔

وہ لڑکی بار بار ہماری جانب دیکھ رہی تھی... !

خوبصورت کٹورہ آنکھوں جن میں ذہانت کی چمک واضح تھی۔ چہرے کے نچلے حصے کو بلیک نقاب نے چھپا رکھا تھا۔ انتہائی باریک بلیک کپڑا...... جس کے پیچھے سے لڑکی کا حسین چہرہ واضح طور پر تو نہیں البتہ کچھ نہ کچھ نظر آ رہا تھا عمر کے 25 سال معلوم ہوتے تھے ..... اوپر والے چہرے پر ایک چیز ... سحر انگیز تھی خوبصورت آنکھوں کے ساتھ .. انتہائی فراخ پیشانی —— !

خوبصورت لٹ ..... براؤن کلر کے بال ....

ایک سرکش لٹ...... جو بار بار اس کی پیشانی پر شتر بے مہار ہوتی تو وہ بار بار اسے سائیڈ پر ڈال دیتی......!

اس کے ساتھ والی سیٹ پر ایک بڑی بڑھیا موجود تھی...... میں اس لڑکی کے سامنے کھڑا جھول رہا تھا . جس اور انتہائی گرمی نے اندر کی گرمی بڑھا دی تھی . !

ہم جوان تھے......بس اسٹائل ذرا اولڈ تھا......

گاڑی اسٹاپ پر رکی ..... ! بہت سی سواریاں اتر گئیں . . کچھ مزید اندر گھس آئیں —— !

مرد حضرات چھت والے پائیدانوں سے لگے ہوئے تھے......!

پسینہ کچھ حد تک خشک ہو گیا تھا......!

بس چلتی تو سائیڈ شیشوں سے گرم لو اندر داخل ہوتی..... کبھی ٹھنڈی ہوا بھی اندر داخل ہوتی...... تو دوزخ میں جنت کا گمان ہوتا لیکن جونہی ٹھنڈی ہوا ختم ہوتی..... دوبارہ ماہی بے آب ہو جاتے۔ لیکن چھوڑیے گرمی کو......!

ہم اس حسین لڑکی کے بارے میں بتا رہے تھے .....

وہ ہمیں دیکھتی اور آنکھ بھر کر دیکھتی..... اس کی سحر زدہ آنکھوں میں ایک جادو تھا......!

کسی عورت نے مجھے آج تک اس حد تک آنکھ

بھر کے نہیں دیکھا تھا ہم اس نگاہ الفت کے قابل ہی کہاں تھے گاؤں کی لڑکیاں بھی ہم سے دور بھاگتی تھیں......ابظاہر! ہم میں کوئی خاص کوئی کمی نہ تھی مگر۔ جانے کیوں آج تک کسی دوشیزہ نے ہمیں لفٹ نہ کرائی شاید ہمارا حلیہ اور اندھاپن...... دیہات کی لڑکیاں، چشمے والے نوجوان سے کتراتی تھیں۔

کالج میں بھی ہمیں کوئی خاص اہمیت نہ ملی۔

یہاں بہت سی وجوہات کارفرما تھیں ایک تو یہ کہ ہم پینڈو تھے......

اونہہ...... بات کرنے کا طریقہ تک نہیں آتا تھا۔ !

ابھی 20 کلومیٹر کا سفر باقی تھا......بس مختلف اسٹاپوں پر مسافر اتارتی چڑھاتی منزل کو رواں دواں تھی......!

"استاد خانہ تالہ ...... سواری اتار دو......" کنڈیکٹر نے آواز دی......!

"ٹھیک ہے بشیر!......" ڈرائیور نے جواباً کہا۔

وہ لڑکی مجھے ابھی تک دیکھے جارہی تھی اس کی جادوئی ڈورے ڈالتی پرکشش آنکھوں کے تیر مجھے اپنے جسم میں چبھتے محسوس ہورہے تھے......!

میں نے بھی اپنی جگہ نہیں چھوڑی تھی...... وجہ وہی لڑکی اور اس کی آنکھیں تھیں...... اس کی آنکھیں قاتل دیدہ تھیں۔ ...جاذبی اور جادوئی ...!

میری زندگی کا یہ تجربہ انوکھا اور پہلا تھا......!اول کی دھڑکن تیز ہوگئی اور ٹانگیں تھرتھر کانپ رہی تھیں

"بیٹا...... کہاں تک جاؤں گی......" بڑھیا نے اس کٹورہ آنکھوں والی کو دیکھا...... اور پان چباتے پوچھنے لگی۔

"ہاں جی ...!شال پور، گاؤں جانا ہے......"

شال پور...... !یہ میرا اپنا گاؤں تھا...... گویا منزل ایک ہی تھی۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" بڑھیا نے میرے من کا سوال پوچھا۔

"ساحرہ......ساحرہ رضا... !"

"نام تو خوبصورت ہے......آنکھوں کی طرح سحرزدہ......"

"شال پور میں کوئی اپنا ہے کیا؟" بڑھیا نے مزید کریدا۔

"جی......میرے ماموں کا گھر ہے......گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے جارہی ہوں...... !

استانی ہوں پرائیویٹ اسکول میں۔ ...چھٹیاں ملیں تو سوچا گاؤں کی فضا کا مزہ اٹھاؤں!"

"تمہارا گھر والا بچے ساتھ نہیں جارہے کیا... ؟" بڑھیا بڑی باتونی اور جہاندیدہ نظر آرہی تھی۔ ...!

وہ مسترائی ...... چہرے پر لالی بکھری...... ہم عورتوں کا تجربہ نہیں رکھتے۔اور نہ ہی نفسیات سے متعلق کچھ جانتے ہیں......شفق سی پھوٹی......اندر کی خوشی باہر ابھری......وہ بولی۔

"ہاں جی...... !ابھی میری شادی نہیں ہوئی ..." وہ مسکرائی گئی اور اپنی آنکھوں کے تیر ہم پر ڈالتی چلی گئی

ایک بات اور......!گرمی اور تمازت نے دماغ تک جلا دیا ہے سوچیں بکھری جاتی ہیں... ...اور جو خاص بات لکھنی ہوتی ہے وہ پس پردہ رہ جاتی ہے......آپ کو بتاتا چلوں ......!اس کی آواز میں سحر تھا...... کھنکتی گڑیا سی... ... نیلے پانیوں کے دیس میں بجتی آبشار جیسی ......شبنم سی ملائم، شہد سے میٹھی......کانچ کے برتن کے ٹوٹنے سے بکھرنے والی آواز...... !

وہ نہ تو خزاں اور نہ ہی گرم موسم کی تمازت میں پگھلنے والی گڑیا ...

شکل و شباہت اور اعلیٰ انداز بیان سے وہ مجھے شہزادی لگی ...

کوہ قاف کی شہزادی......ایک حسین پری... ...

جس کے حسین پروں کو کاٹ دیا گیا ہو......!

وہ واقعی دلربا تھی......زندگی میں پہلی بار......کسی

حسینہ کے حسین سحر میں ڈوبے جارہے تھے...... دل تھا کہ لوٹ پوٹ ہوتا گیا......!

سفر تھا کہ لمحہ لمحہ حسین تر ہوتا جارہا تھا...... فضاء میں تمازت اور حسن موجود تھی مگر مجھے اس کا احساس تک نہ ہوا۔ شاعر لوگ واقعی ٹھیک کہتے ہے کہ اگر مشکل ترین سفر میں ایک حسین ہمسفر ہو تو سفر کی ہزار زحمتیں اور پریشانیاں انسانی جسم اور دماغ پر فرحت بخش اثر ڈالتے ہیں......!

آج سے پہلے کتابوں میں پڑھا......

لیکن خود پر بیتی تو محسوس ہوا کہ میں نے 30 سال یونہی آوارگی میں گزار دیئے لس نازک سے دور رہا...... آنکھوں کے کھیل سے بھی نا آشنا رہا...... زندگی میں مسائل ہی اتنے پیدا ہو گئے تھے کہ اس طرف سوچنے کا وقت ہی نہ ملا...... جب فراغت تھی اور کالج میں حوریاں ہمارے ساتھ رہیں...... مگر اس وقت کسی کالی میم نے بھی لفٹ نہ کرائی......!

آج تک شادی کا سوچا ہی نہ تھا......

ہم چار بھائی اور ایک بہن تھے......!

ہم نے ماسٹری شروع کی۔ بہن نے ایم ایس سی کے بعد پیا دیس سدھارا...... بھائی نے انجینئرنگ مکمل کی۔ کزن سے شادی کی سدوست علی ہمارا چھوٹا بھائی ڈاکٹریٹ کر رہا ہے...... باقی بہت چھوٹا......

ہماری تو نہ اپنی کوئی پسند تھی اور نہ ہی اماں کو ہمارے لئے کوئی رشتہ ملا......! 6 سال کی ماسٹری میں بہن کو روانہ کیا اچھا سا گھر بنایا...... پھر جو ہم قناعت پسند تھے اچانک روپے پیسے کی ریل پیل نے ائیر کنڈیشنڈ لگوایا......! چھوٹی کار لی...... قسطوں پر بائیک نکالی......!

زندگی چل رہی تھی...... مگر آج تو کچھ عجیب سا ہو گیا تھا......!

لڑکی ساحرہ رضا اچھے خاصے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی...... ٹھہراؤ اور اعلیٰ انداز...... بس کھٹارہ بس میں سفر کر رہی تھی...... یہاں بھی پیٹرول کی بندش آڑے آ گئی...... بریف کیس انتہائی قیمتی معلوم ہوتا تھا......!

"بیٹا...... میرا نام شیراں مائی ہووے...... شال پورے ہی ہوں......!" "شیراں جی......!"

"یہ تو خوشی کی بات ہے کہ آپ بھی شال پور جارہی ہیں۔ ایک سے دو بھلے......" وہ متانت سے بولی......!

ایک اسٹاپ پر گاڑی رکی۔ کچھ مسافر اتر گئے...... اور ہمیں بھی سیٹ میسر آئی۔ مسلسل کھڑا رہنے کی وجہ سے کمر کا درد ہونے لگا تھا...... سیٹ پر دم سے بیٹھنے کے بعد ہم نے سکھ کا سانس لیا...... گویا جھونکا بہار کا......!

ہماری اور ان کی سیٹ کے فاصلے نہایت مختصر تھے...... درمیان میں چند مسافروں نے بس کے پائیدان پکڑ رکھے تھے......!

قدرت کی مہربانی جانئے یا...... نوجوانوں کی عورتوں سے ہمدردی...... ساحرہ رضا جو اپنے بدن کی کنواری خوشبو کے باعث ہمارے دل و دماغ پر چھا چکی تھی...... اس کی سیٹ کے ساتھ کسی مرد نے ٹھہرنے کی جرأت نہ کی...... اور ہم کن انکھیوں سے اسے نگاہ الفت سے تکتے رہے......

"بیٹا...... شال کوٹ آنے ہی والا ہے دو اسٹاپ چھوڑ کے تیسرا اسٹاپ شال کوٹ ہے...... اکیلی ذات ہوں......! ماموں کے گھر تنہا جاؤں گی کیا......؟" بڑھیا نے سلسلہ کلام شروع کیا......!

"نہیں اماں جی......! میرا چھوٹا بھائی پہلے ہی ماموں کے ہاں ہے۔ فون پر رابطہ ہوا تھا...... وہ اڈے پر موجود ہوگا......! مجھے ریسیو کرے گا......" وہ ملائم آواز میں بولی......!

"یہ تو ٹھیک ہے بیٹا......! مجھے انگریزی نہیں آتی۔ راسیو کیا ہوتا ہے......"

دیہاتی بڑھیا کو بھلا انگریزی سے کیا مطلب...... شاید لفظ ریسیو، پر اس کا دماغ اٹک

کیا ۔ !

وہ ہنسی..... مگر دھیمے انداز میں..... ایک پیاری سی مسکراہٹ کے پیچھے دل نشین سادگی پنہاں تھی.....!

"ہاں ..... اریبیو، مطلب، لیٹا..... مطلب میرا بھائی اڈے پر مجھے لینے کے لئے آکر کھڑا ہوگا..." وہ بڑھیا کی سادگی پر مسکرا اٹھی ۔ اس کی مسکراہٹ نے میرا دل موہ لیا.....!

نسوانی کشش سے دور رہنے والا اکتا کس پروفیسر..... خشکی کا منبع بن گیا تھا..... آج تک کسی لڑکی نے مجھے اتنا متاثر نہ کیا تھا..... مسحور کن..... اس کی ہنسی نے دنیا جہان کے رنگ جیسے میرے دل کی ہر دھڑکن میں بکھیر دیئے تھے..... قوس قزح کے رنگ..... جن کو ایک نظر دیکھ لینے سے دل کی دھڑکن مچل اٹھتی ہے.....

میرا دل..... لمحہ لمحہ..... اس دلربا دوشیزہ کے سحر انگیز انداز میں ڈوبتا جارہا تھا..... پھر ایک نئی چیز واضح ہوئی.....!

اس نے ہینڈ بیگ کھولا..... او دوسرے لمحے اس کے پاس ایک انگوٹھی تھی..... زپ بند کرکے اس نے بیگ گود میں رکھا.....!

انگوٹھی دائیں ہاتھ میں رکھا.....!

وہ، نیلی چمکتی چار سے آٹھ کونوں والی پرکشش انگوٹھی تھی..... سونے کی کمال میں جڑا نگینہ سحر انگیز تھا..... مجھے ان پتھروں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی لیکن آج یہ نگینہ اس کے لمبے سفید ہاتھوں میں دیکھا تو ایک دم دل مچل اٹھا۔

کتنا خوبصورت نگینہ تھا ۔ !

"بیٹا..... یہ کونسا پتھر ہے۔ بڑا ہی خوبصورت ہووے ۔ !"

"ڈائمنڈ ۔ ۔ میرا مطلب ہے ہیرا..... میرے نام کے ساتھ جڑا ہے سفر میں پہن لیتی ہوں سارے منفی اثرات زائل ہوجاتے ہیں سفر آسانی سے کٹ جاتا ہے۔" وہ خاصے اعتماد سے بولی۔

"ہم تو ان پتھروں پر یقین ہی نہیں کرتے ۔ ویسے بھی ہمارا اللہ ہی کافی ہے..... مخلوق کے تمام تراچھے اور مصلحتوں بھرے میرا اللہ ہی کرتا ہے..... اعتقاد ہے اور بڑا پکا....." بڑھیا فلسفیانہ انداز میں خدائی کا فلسفہ بیان کرگئی.....

"ہاں جی..... خدا کا انکار بھلا کس کو ہوسکتا ہے..... وہ سب کا پالنہار ہے ہر جگہ ہے نظر نہیں آتا پر نظر میں رہتا ہے۔ خدا کی خدائی سے بھلا کون انکار کرسکتا ہے ۔ لیکن ماں جی ..... میرا تعلق شعبہ تاریخ سے ہے اگر تاریخ انسانیت کو پڑھا جائے اور گہرائی میں اتر کر پڑھا جائے تو ان پتھروں کی حقیقت بھی واضح ہوتی ہے۔" وہ مگن سے بولی۔

"یہ بھی ٹھیک ہووے ..... ہم تو بیٹا ان پڑھ لوگوں ۔ نہ تاریخ کا پتہ نہ دنیا کا پتہ ۔ جس طرح ہمارے بڑوں نے کہا ہم نے من وعن مان لیا....." بڑھیا سادگی سے بولی۔

ساحرہ کی دائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی میں ڈائمنڈ جو چند لمحہ پہلے خاصا چمک رہا تھا ۔ اس کی چندھیا دینے والی خاصیت نے مجھے جھنجھوڑ کے رکھ دیا تھا۔

لیکن پھر وہ کچھ ہوا..... کہ جس کا تصور بھی نہیں ہوسکتا.....

وہ ہیرا..... اچانک ہی اپنا رنگ بدلنے لگا.....

کالا سیاہ ۔ اس کے چاروں کونے مدھم پڑ گئے ۔ اندھیر نگر میں ڈوب سے گئے ۔ ہیرا کبھی اپنی اصلیت نہیں بدلتا ..... اصلی ڈائمنڈ رنگ بدلنے کی خاصیت قطعی نہیں رکھتا.....!

لیکن ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح میرے ذہن میں ابھرا۔ ہوسکتا ہے یہ اصلی ڈائمنڈ نہ ہو۔ آج کے جدید سائنسی دور میں اس قسم کی رنگ ایجاد کرنا بڑی بات نہیں تھی کہ جو گاہے بگاہے رنگ بدلے..... لیکن ساحرہ کی ایک بات نے میرے اس خیال کی تردید کردی۔

"یہ ہیرا میرے نام سے جڑا ہے سفر میں پہن لیتی ہوں۔ سارے منفی اثرات زائل ہو جاتے ہیں..... سفر آسانی سے کٹ جاتا ہے.....!"

اگر اس انداز سے سوچا جائے تو سائنسی انگوٹھی کا بھلا منفی اثرات زائل کرنے کا کیا انداز.....؟ اور میرا ذاتی خیال بھی یہی تھا کہ سائنس چاہے جتنی بھی ترقی کرلے قدرت کے کاموں میں دخل اندازی نہیں کی جاسکتی.....!

میں خاص طور پر اس رنگ بدلتی انگوٹھی کو دیکھ رہا تھا..... وہ رنگ بدل رہی تھی..... سفید سے بلیک.....! لیکن بڑے حیرت انگیز طور پر اس انگوٹھی، جسے آپ ڈیفرنٹ کلرڈ اسٹنڈ بھی کہہ سکتے ہیں رنگ بدل چکی تھی..... وہ کلر، زرد، اور شوخ زرد تھا، زرد رنگ بدلتا جا رہا تھا..... سرخ..... بالکل ڈوبتے سورج کی آخری سانسوں جیسا.....!

یہ میری نظر کا دھوکہ تھا یا واقعی میں کوئی کرشمہ.....

!میری محدود سوچ کو فل اسٹاپ سا لگ گیا۔

☆.....☆.....☆

"محترم.....! آپ کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے.....!"

"جی سر! آپ کی اسٹوڈنٹ ہوں، آپ کامرس کالج میں شعبہ اکنامکس سے منسلک ہیں آپ کا اسم گرامی....."

خاور رضا.....!" میں نے جواب دیا۔

"گریٹ.....!"

"آپ مجھے بار بار گھور رہی تھی.....!"

"جی..... میں آپ کو پہچان رہی تھی..... کے آپ کو کہاں دیکھا تھا.....!"

"بہت شکریہ..... آپ نے پہچان لیا.....

!شال کوٹ جا رہی ہیں.....!"

"جی! ماموں کے گھر.....! چھٹیاں ہوئی تو گاؤں کی سیر کا پلان بنایا.....!"

"ویری گڈ.....! اگر اس تمازت بھری گرمی میں ناران اور کالام کی سیر کی جاتی تو دماغی طور پر ریفریشمنٹ ہو جاتی ہے.....!"

"کاش.....! یہ سب ممکن ہوتا.....! چھوڑیئے سر.....! آپ بھی غالباً شال کوٹ کی طرف جا رہے ہیں.....!"

"بس.....! میرا اپنا گاؤں.....! پیٹرول کی قلت.....! مجبوری.....! مجھے آپ ایک بات بتا سکتی ہوں.....!"

"جی ضرور پوچھئے.....!"

"آپ میری اسٹوڈنٹ رہی ہیں..... کیا بتانا پسند کریں گی کہ کونسی کلاس میں....." کہاں اور کس سیشن میں..... کیونکہ میری ایک خاصیت رہی ہے کہ میں اپنے پیارے اسٹوڈنٹس کو کبھی نہیں بھول سکتا..... چاہے وہ اسٹوڈنٹ بہت لمبے عرصے بعد ملے..... مجھے اسٹوڈنٹ کا نام اور سیشن اچھی طرح یاد رہتا ہے.....! اور واقعی میری یہ خوبی تھی کہ میں کسی بھی صورت اپنے اسٹوڈنٹس کو نہیں بھول سکتا..... ! اور جہاں تک میری یادداشت ساتھ دیتی ہے کہ میری پروفیشنل ٹیچنگ لائف میں کسی بھی سیشن میں ساحرہ رضا کا نام نہیں رہا تھا.....!

"آپ سوچ رہے ہیں کہ میں کبھی آپ سے نہیں ملی..... ! اور نہ کبھی اسٹوڈنٹ رہی ہوں....."

"بالکل.....!"

"سر حضرت علیؓ کا قول ہے کہ جو تمہیں ایک لفظ بھی پڑھا دے وہ تمہارا استاد ہے۔" میری ایک کزن کامرس کالج میں پڑھتی ہے..... وہ آپ کے لیکچر ریکارڈ کرلیتی ہے جو میری بزنس لائف میں بہت سود مند رہتی ہے..... مطلب آپ کے لیکچرز کی وجہ سے میرا بزنس آسمان کی اونچائیوں تک جا پہنچا..... اس لئے میں آپ کو اپنا استاد مانتی ہوں....."

"بائی دے وے اس چیز کا بزنس ہے آپ کا.....؟"

"یہ میں آپ کو وقت پر بتاؤں گی.....! آپ

شال کوٹ میں ہوتے ہیں اور میں پورے ایک ماہ تک شال کوٹ میں رہوں گی... میں نے آپ سے اپنے بزنس کو مزید بہتر بنانے کے لئے تفصیلی میٹنگ کرنی ہے...!"

"لیکن ہماری میٹنگ کیسے ممکن ہو سکتی ہے......؟"

"ویری ایزی......! میرے ماموں نے آپ کو خود ہی انوائٹ کرنا ہے......! وہ بھی آپ کی صلاحیتوں کے گن گاتے نظر آتے ہیں۔"

"گڈ......کیا نام آپ کے ماموں کا......؟"

"ملک سجاد علی......!"

"لیکن میں اس نام سے ناواقف ہوں ہو سکتا ہے وہ بھی فزیکلی طور پر بالکل اس طرح واقف ہوں جس طرح آج میری اسٹوڈنٹ ہیں..." یہاں میں چونک گیا......!

کیونکہ ساحرہ رضا مجھے جانتی ضرور تھی لیکن صرف آواز تک......میرا چہرہ اس نے کہاں دیکھا......

"سر......! اب آپ ایک اور بات سوچ رہے ہیں کہ جب آپ نے مجھے صرف آواز تک سنا ہوا ہے تو پھر مشکل سے کیسے پہچان لیں گے۔" وہ میری سوچ کو جیسے پڑھ رہی تھی۔

"جی ضرور......لیکن آپ کو میرے دماغ کی سوچ کیسے سنائی دیتی ہے۔؟"

"سر......یہ سنائی نہیں دیتی بلکہ پڑھی جاتی ہے... سامنے والے کے ذہن کو پڑھ لینے کو ٹیلی پیتھی کہتے ہیں آپ کا جواب صرف اتنا سا ہے کہ آپ کی ایک تصویر میں نے دیکھی تھی تبھی تو آپ کو پہچان لیا" اس کا انداز پراسرار تھا

"گڈ......! مطلب آپ ٹیلی پیتھی سے واقف ہیں لیکن محترم میں اپنے ہوش و حواس میں ہوں جبکہ ٹیلی پیتھی میں مخالف انسان کو ٹرانس میں لے جا کر مخصوص انداز سے ٹرانسمٹ کیا جاتا ہے......جس سے اس کے دماغ کی طاقت ماند پڑ جاتی ہے اور اس کے بعد مطلوبہ مقاصد حاصل کیے جا سکتے ہیں......!"

"جی... ! اور اگر ٹیلی پیتھی میں مخالف کو ٹرانس کی صورت میں لیمن دے کر سیب کا کہا جائے تو ٹرانس شدہ بندہ اسے سیب ہی سمجھے گا اور اسے ذائقہ بھی سیب کا ہی آئے گا" وہ بولی۔

"لیکن میرے ساتھ تو ایسا نہیں ہوا......" میں نے کہا۔

وہ لڑکی واقعی پراسرار صلاحیتوں کی مالک تھی......!

میں نے اس ڈائمنڈ کے بارے میں پوچھا تو مسکرا اٹھی......!

"سر......! وقت آنے پر آپ کو سب کچھ بتا دوں گی...!"

شال کوٹ پہنچ کر میں خود ہی آپ سے ملاقات کروں گی......! لیکن ایک درخواست ہے کہ جونہی میرا پیغام آپ تک پہنچے آپ وقت ضائع کیے بغیر تشریف لے آئے گا......" اس کا انداز تحکمانہ تھا......

"ضرور! میں ہر صورت حاضر ہو جاؤں گا......لیکن...!"

"لیکن ویکن چھوڑیئے سر......! بس آپ میری یہ ہدایات پر عمل کرتے رہیے گا۔ میں کسی بھی جگہ کسی بھی بھیس میں آپ سے ملاقات کر سکتی ہوں......!"

"آپ مجھے الجھا رہی ہیں......!"

"الجھا ہی زندگی ہے! آج سے آپ کو ایک پلیٹ فارم سے کام کرنا ہوگا۔"

"کونسا پلیٹ فارم...؟ مجھے آپ کی باتیں سمجھ نہیں آ رہیں......!"

"ڈونٹ وری......! سب سمجھ آ جائے گا بس آپ کو جس طرح کہا جائے اسی طرح کیجیے......وقت آنے پر سب کچھ بتا دیا جائے گا......"

"شال کوٹ......! شال کوٹ..." کنڈیکٹر نے آواز لگائی!

"جی! ہمارا اسٹاپ آ گیا......! ویسے آپ کی

باتوں نے مجھے الجھا کے رکھ دیا ہے۔ !"

"کوئی بات نہیں سر۔۔۔ !ویسے اتنا بتانا کافی سمجھوں گی کہ خدا کے نیک انسانوں نے کائنات کے راز سے پردہ اٹھانے کے لئے تگ ودو کی۔۔۔ خدا کی خدائی اور اس کی طاقت کا اندازہ ہماری محدود عقلیں نہیں لگا سکتیں۔۔۔ جہاں خدا کی رحمانی قوتیں موجود ہیں وہاں شر کی طاغوتی طاقتیں بھی مقابلے میں آگئی ہیں۔۔۔ !آپ کو نیکی کا پیامبر چنا گیا ہے۔۔۔ !آپ کی ہر ممکن مدد بھی کی جائے گی۔۔۔ !لیکن۔۔۔ !"

"لیکن کیا۔۔۔؟" میں نے کہا۔

"لیکن آپ کو اندر سے مزید پختہ ہونا پڑے گا۔۔۔ پاک صاف رہیے وضو مکمل رکھیے حرام سے دور رہیں۔۔۔ گندخرابے سے کوسوں دور۔۔۔ !"

یہ اس کی پہلی ہدایات تھیں مطلب خیر اور شر کی طاقتوں کے درمیان جنگ کی طرف میرا پہلا قدم۔۔۔!

"تو کے مس ساحرہ۔۔۔ !بالکل ٹو میٹ تو۔۔۔ !آپ مجھے نیکی کے اس سفر میں ہر لمحہ اپنے ساتھ پائیں گی۔۔۔"

گاڑی رک چکی تھی۔۔۔ گاڑی سے نیچے اترتے وقت ساحرہ رضا نے ایک سرخ کارڈ میری طرف بڑھایا۔۔۔ بالکل بلینک (خالی)۔۔۔ ایک لفظ بھی ٹائپ نہیں تھا۔۔۔

"یہ میری نشانی ہے۔۔۔ !گھر جا کر اسے کھرچیے گا۔۔۔ جو لکھا ہو۔۔۔ اس پر عمل کیجیے گا۔۔۔"

گھر میں آ کر میں نے کارڈ کو کھرچا لکھا تھا۔

"آپ کی کلاس میں ایک لڑکا، کیلاش پڑھتا ہے، اسے قتل کر دیں۔۔۔ اس کی دائیں آنکھ میں سیاہ تل ہوگا۔۔۔!"

قتل تو میرے باپ دادا نے بھی نہیں کیا تھا۔۔۔ لیکن یہ الفاظ ایک قتل کرنے کا کہہ رہے تھے۔۔۔ وہ بھی ایک معصوم جوان کو۔۔۔!

کیلاش میری کلاس کا خوبصورت اور ذہین لڑکا تھا۔۔۔ ہر کلاس میں امتیازی نمبروں سے پاس ہونے والا معصوم صورت کیلاش کسی صورت بھی قتل کیے جانے کے قابل نہ تھا۔۔۔ لیکن ساحرہ رضا کے اس کارڈ نے میرے دماغ کی اندرونی کیفیت کو مکمل طور پر ہلا کر رکھ دیا تھا۔

ایک معصوم کا قتل۔۔۔ لیکن کس بنیاد پر؟ اس کا کوئی جواب میرے پاس موجود نہ تھا۔۔۔!

میری حالت خاصی پتلی تھی۔۔۔ !شوربے کی مانند۔۔۔ سوچ کی دھاریں مکمل طور پر مفلوج ہو چکی تھیں۔

شام کا وقت ہوگا۔۔۔ میں مغرب کی نماز ادا کرنے کے لئے مسجد کی جانب رواں دواں تھا۔۔۔

"بیٹا ڈرو نہیں۔۔۔ !تمہیں جو حکم ملا ہے اس پر عمل کرو۔۔۔ گھبراؤ مت۔۔۔ !یہ خنجر پکڑو۔۔۔ !یہ تمہارا ہتھیار ہوگا۔۔۔ جو کچھ بھی کہا جائے بس عمل کیے جاؤ۔"

میں مغرب کی نماز ادا کر کے گھر کی جانب لوٹ رہا تھا کہ ایک باریش بزرگ جن کی نورانی صورت میں بلا کی کشش پنہاں تھی۔۔۔ وہ مجھے گھر کی مغربی دیوار سے ملے۔۔۔ ان کے ہاتھ میں چمکتا ہوا خطرناک پھل والا تیز دھار خنجر تھا۔۔۔!

"یہ خنجر اسم اعظم سے تر بتر ہے، حفاظت کا ذمہ دار اور تمہارا ہتھیار بھی۔۔۔ الو پکڑو۔۔۔ اور کل تک یہ کام مکمل کر لو۔۔۔!"

"لیکن بزرگ۔۔۔ !محترم۔۔۔ !قتل تو جرم ہے۔۔۔ ایک معصوم بچے کا قتل۔۔۔ مطلب یہ ہوا کہ پوری انسانیت کا قتل۔۔۔" میں تڑپ اٹھا۔

"تمہاری بات ٹھیک ہے بیٹا۔۔۔ لیکن بعض اوقات جو دکھتا ہے وہ اصل میں نہیں ہوتا۔۔۔ وقت آنے پر سب بتا دیں گے۔۔۔"

"ٹھیک ہے بزرگ محترم۔۔۔!" میں نے حامی بھرتے ہوئے ان کے ہاتھ سے دھاری دار خنجر لے لیا۔۔۔!"

☆۔۔۔☆۔۔۔☆

"میں نے آپ سے کہا تھا کہ اندر سے مکمل طور پر پختہ پن پیدا کریں..... اپنا ایمان اور عقیدہ مضبوط کریں..... یہ راستے نیکی اور فلاح کا ہے ہم جو کچھ دیکھ رہے ہیں وہ آپ کی ظاہری آنکھ نہیں دیکھ سکتی....."

وہ ساحرہ رضا کی پرکشش سحرزدہ آواز تھی!

"کل تک یہ کام ہو جانا چاہئے..... گھبراؤ مت..... یہ منظر دیکھو اور پھر کوئی سوال ذہن میں آئے تو بلا جھجک پوچھ لینا.....!"

وہ ایک بند کمرہ تھا..... جس کی اندرونی ساخت کچھ اس انداز سے ڈیزائن کی گئی تھی کہ باہر کی ہر چیز سے بے خبر رہے۔

اندر گھپ اندھیرا تھا..... لیکن کمرہ باہر سے انتہائی جاذب نظر تھا..... خوبصورت کلر ڈیزائننگ اور دیدہ زیب نقش و نگار..... اول کو رونق بخشنے والا خوبصورت کمرہ باہر سے کوئی دلفریب جادوئی محل نظر آرہا تھا..... چھوٹا مگر خوبصورت.....

لیکن کمرہ جتنا اوپر سے خوبصورت نظر آتا تھا اتنا ہی اندر سے بھدا اور تاریک تھا..... کمرہ میں کہیں بھی کوئی روشنی نہ تھی.....!

پھر میں نے ایک ہیولہ دیکھا..... وہ ہیولہ منہ ہی منہ کچھ بولے جا رہا تھا..... اس کے بولنے کا انداز ہندو پجاری جیسا تھا..... میں نے لفظوں پر غور کرنا شروع کیا وہ واقعی ہندوؤں کا راگ الاپ رہا تھا.....

اس کی آواز لمحہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی

پھر میری نظر اس ہیولے کے چہرے پر پڑی..... کلوز کیمرے کی مانند..... میں نے اس چہرے کو دیکھا تو حیرت کا جھٹکا لگا..... اور پھر اس طرح رات گزر گئی۔

اگلی صبح جب کلاس میں کلاش نظر نہ آیا تو مجھے تشویش سی ہو گئی!

رول کال ہوسعد کی آواز نے مجھے چونکا دیا.....!

"سر..... آج کیلاش نہیں آیا.....! اسے فالج ہو گیا ہے.....!" ایک اسٹوڈنٹ بولا۔

"وہاٹ.....؟..... مگر کیسے..... کل تک تو ٹھیک ٹھاک تھا.....!"

"جی سر.....! اس کے پاپا نے مجھے بتایا تھا، وہ لوگ خاصے پریشان ہیں۔ سر اس کا بایاں بازو مکمل طور پر مفلوج ہو چکا ہے اس کا کوئی علاج نہیں.....! بے چارہ۔" "یہ ایک بری خبر تھی لیکن میرے پلان میں کوئی کمی نہ رہی..... ! چھٹی کے بعد میں اس کے کمرے میں تھا.....!

وہ آنسو بہائے جا رہا تھا.....

اس کا پھول سا چہرہ مرجھا چکا تھا..... آنکھیں ہیپاٹائٹس کے مریض کی مانند زرد..... ! بایاں بازو مکمل طور پر مفلوج ہو چکا تھا..... بائیں ٹانگ بھی توانائی سے محروم تھی..... میرے ساتھ چند طالب علم تھے جو کیلاش کی عیادت کیلئے میرے ساتھ ہو لئے تھے.....!

انہوں نے اپنی اپنی پسند سے فروٹس اور جوس لئے تھے..... کسی نے پھول لئے تھے.....! ان تمام لوگوں کی اس محبت نے کیلاش کے مرجھائے چہرے پر خوشی بکھیر دی تھی!

"تھینک یو..... سر..... بس آپ کی دعا چاہئے....."

سر آپ کی پرخلوص دعا چاہئے.....! میں ٹھیک ہو کر پڑھائی شروع کرنا چاہتا ہوں....."

اس کی ویران غمزدہ آنکھوں میں التجا تھی.....

لیکن اس کی آنکھوں میں مجھے کچھ محسوس ہوا..... ویران آنکھوں میں خواب تھے لیکن نہیں.....! میں آپ کو کیلاش کا ایک اور روپ دکھاتا ہوں.....!

"سر.....! میں شاید زندہ نہ بچوں..... لیکن میں تنہائی میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں.....!" وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن تنہائی میں.....!

میں نے اپنے ساتھ آئے ہوئے تمام

اسٹوڈنٹس کو باہر جانے کا کہا.....!

جب وہ باہر چلے گئے تو راز داری سے وہ بولا.....!

"سر.....! آپ میرے جسم کے اس حصے کو کاٹ کر دیں جو مردہ ہو چکا ہے.....!

آپ کو رات میں جو کچھ بھی دکھایا اور بتایا گیا تھا وہ میرا دل تھا..... جو باہر سے خوبصورت لیکن اس کے اندر اندھیرا اور ظلم و بربریت پنہاں ہے..... سر میں نے اپنی بیس سالہ زندگی میں تین قتل اور بے شمار....." وہ رو پڑا.....!

"اور بے شمار کیا.....؟"

"سر صنف نازک نے مجھے برباد کر کے رکھ دیا.....!

معافی اور درگزر کا دروازہ میری ذات کے لئے بند ہو چکا ہے.....؟"

"کاش.....! شرک کے علاوہ ہر گناہ تو بہ کرنے سے معاف ہو جاتا ہے.....!"

"نہیں سر..... میرا قتل باعث ثواب ہوگا....."

"لیکن تم میرے متعلق ان تمام باتوں سے کیسے باخبر ہو.....؟"

"سر میں یہ بھی نہیں بتا سکتا.....! آپ مجھے مکمل طور پر قتل نہیں کر سکتے..... ! کیونکہ مجھے روح سے آزاد کرنا مقصود نہیں بلکہ دل کی اندھیر نگری کو خنجر کی تیز دھار سے صاف کرنا ہے.....؟"

"یہ کیسے ممکن ہے.....؟" میں نے پوچھا۔

اس خنجر پر اسم اعظم کا ورد کیا گیا ہے یہ تیز دھار ضرور ہے لیکن انسانی جسم کو تکلیف نہیں ہوتی..... لطیف روح جسم کے اندر باقی رہ جائے اور روح کی کثافت ختم ہو جائے..... !"

وہ خوشگوار انداز میں بولا..... !

"مطلب یہ قتل تمہاری روح کی کثافت کو ختم کرنے کے لئے..... وہ شیطان جس کی تم پوجا کرتے ہو کی موت کا پیام....."

"جی سر.....! پوجا میں خود نہیں کرتا بلکہ زبردستی کروائی جاتی ہے..... لیکن اس نیک عمل کے بعد ایسا ہونا ممکن نہیں..... میں پہلے کی طرح نامل انسان بن جاؤں گا.....!"

"خدا کرے ایسا ہو.....! کیا تم مجھے یہ بتا سکتے ہو کہ یہ گمراہی کب اور کیسے ہوئی.....؟"

"سر.....! جہاں خدا کی خدائی اور طمانیت کا وجود ہے وہاں شیطانی کارندے بھی انسان کو گمراہ کرنے کی تاک میں رہتے ہیں..... میں نے قتل کیے..... !

خون بہا اور سزا کے طور پر خود کو قانون کے حوالے کیا لیکن پتہ نہیں کس طرح ورثاء نے مجھے ہر دفعہ معاف کر دیا.....!

صنف نازک سے زیادتی کے نتیجے میں جیل گیا لیکن رہا ہو گیا..... مقدمات کی فائل غائب ہو جاتی ..... پولیس کے ریکارڈ میں میرے خلاف کوئی ثبوت نہ پایا جاتا، یوں میں بری کر دیا جاتا..... میرے پیچھے کوئی سفارش یا پیسہ نہیں ہوتا تھا بلکہ چند غیبی طاقتیں معجزاتی طور پر میرا ساتھ دیتیں۔

میں پیدائشی طور پر مسلمان نہیں ہوں لیکن دل سے بھگوان ماننے کو تیار نہیں، ایسا بھگوان جو اپنی حفاظت نہیں کر سکتا میرے بھلا کس کام کا..... میں نے دل ہی دل میں کلمہ طیبہ پڑھنے کا ارادہ کیا لیکن میرے ساتھ ہر دفعہ برا ہوا۔ میں پکا سچا مسلمان بننا چاہتا تھا..... لیکن ایک انجانی طاقت مجھے اس پاک کلام سے دور رکھنے کی حتی المقدور کوشش کرتی تھی..... چند دنوں سے میرا دماغ اچانک گھوم جاتا ہے جو میں اپنی مرضی سے نہیں کرنا چاہتا ..... وہی سب کچھ میرے اندر موجود شیطان کرنے لگا..... ! میں پوجا پاٹ کرنے لگا..... حالانکہ میں ایسا نہیں چاہتا....."

"اوہ..... تو یہ مسئلہ ہے گویا یہ جو تمہارے والدین ہیں مگر اصلی نہیں ہیں.....؟"

"جی سر.....! میں بھارت سے ہوں.....!! ایک غیبی طاقت مجھے بتاتی ہے کہ بھارتی ماں کیر پاکستانی

حدود کی خلاف ورزی میں پکڑے گئے تھے.....! ان میں ایک جوڑا ایسا تھا جو نیا نیا شادی شدہ تھا میری ماں بھی انہیں میں شامل تھی۔ اس نے جیل میں ایک بچے کو جنم دیا... جیل انتظامیہ کے سپرنٹنڈنٹ سیٹھ ابرار احمد کے دوست تھے۔ سیٹھ صاحب کی شادی کو 20 سال گزر گئے تھے لیکن اولاد جیسی نعمت سے محروم ہی رہے...!

جیل سپرنٹنڈنٹ نے اس ہندو بچے کو ان کی گود میں ڈال دیا۔ میری ماں چیخی چلائی لیکن بات مک مکا پر ختم ہوچکی تھی بعدازاں سیٹھ صاحب نے میری حقیقی ماں سے معافی مانگی ان کی رہائی کا انتظام کروایا اور رہائی دلوانے میں انہوں نے اعلیٰ سطح پر ملاقاتیں کیں...!

انہیں اپنے محل نما گھر میں رکھا دن رات خدمت کی، میرا والد جو غریب ماہی گیر تھا.....اس بات پر راضی ہوگیا کہ ان کا بیٹا ہندو مذہب اختیار کرے گا اور جب وہ چاہیں گے اس سے ملنے آجایا کریں گے....!

لیکن خدا کو کچھ اور منظور تھا میرے والدین پاکستان میں ہی موت کا شکار ہوگئے نتیجتاً میں سیٹھ ابرار احمد کا اکلوتا جانشین بن گیا.....سیٹھ صاحب نے اپنی جائیداد کا کچھ حصہ میرے نام کیا اور ایک دن ایکسیڈنٹ میں مارے گئے.....!'' اس سے آگے وہ کچھ بول نہ سکا...!

''تمہاری کہانی میں حقیقت کم اور افسانہ نگاری زیادہ نظر آتی ہے۔ افسانے میں جھول ہو تو قاری ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں....''

''سر! میرا کہا ہوا ایک ایک لفظ سچ پر مبنی ہے.....!''

''اوکے.....! تم تیار ہو جاؤ..... مجھے اپنا کام کرنا ہے.....!'' جسے میں جلد از جلد انجام تک پہنچانا چاہتا تھا۔

☆...☆...☆

وہ میرا پہلا تجربہ تھا.....

ایک غلیظ اور خبیث روح کا قتل میرے لئے باعث سکون رہا۔ میرے اندر کی روح خاصی مضبوط ہونے لگی تھی۔

کیلاش مسلمان ہوگیا تھا.....اس کے گرد سیاہ طاغوتی طاقتوں کا حصار ٹوٹ کر تباہ ہوگیا تھا..... دل صاف اور پاک ہوگیا تھا..... یہ ایک خوش آئین عمل تھا...

لیکن حیرت انگیز طور پر بعد میں اس نے کبھی بھی اس موضوع پر بات نہیں کی تھی۔ نہ ہی اس کی آنکھوں میں میرے متعلق کوئی شبہ پیدا ہوا تھا اور نہ ہی کوئی چمک۔ ایسے لگتا جیسے وہ اپنی یادداشت جس میں اس کی تلخ یادیں وابستہ تھیں سے نجات حاصل کرچکا ہو۔ خیر میرا کام ہوگیا تھا وہ دوپہر کا وقت تھا تمازت اور آگ برسائے سورج نے ہر ذی روح کی روح تک جلادی تھی.....لوڈشیڈنگ کے عذاب کی وجہ سے یو پی ایس لگوایا تھا لیکن دیہاتوں میں لوڈشیڈنگ کا شیڈول 10 سے 16 گھنٹے تک جا پہنچا تھا.....لائٹ ہی نہ ہوتی تو یوپی ایس بھی نام تک محدود رہ گیا... میں اپنی زندگی میں پہلے کی طرح مصروف ہوگیا تھا... کیلاش کے واقعے کو دس دن گزر گئے تھے..... ان دنوں ریڈ کارڈ سے کوئی پیغام نہ ملا اور نہ ہی ساحرہ رضا کی خوبصورت آواز سنائی دی تھی... ! لیکن اس دوپہر میری جیب میں موجود ریڈ کارڈ میں ارتعاش کچھ اس طرح سے ہوا جیسے موبائل میں ارتعاش پیدا ہوتا ہے گویا کوئی پیغام ریسیو ہوا تھا...

میں نے کارڈ جیب سے نکالا..... ریڈ کارڈ کی اوپری سطح سیاہ لائنوں سے مزین تھی..... میں نے موٹر بائیک کی چابی نکالی اور لائنوں کو کھرچنا شروع کردیا.....!

''شمالی قبرستان میں ایک چھوٹی قبر.....!''

کتبہ.....! اصغر علی... !

تاریخ پیدائش..... یکم جنوری 2011ء.....!

وفات.....! 27 جون 2011ء.....!

ہدایات: قبر میں موجود بچہ ابھی زندہ ہے.....

فوراً اس کی مدد کو پہنچو......؟"

ریڈ کارڈ پر ابھرے اس پیغام نے میرے اندر نئی روح پھونک دی۔ یہ ایک نیکی کا کام تھا...... جو باعث ثواب تھا......!

میں نے اسی وقت تیاری باندھی...... شمالی قبرستان شال کوٹ کے غربی جانب بے کھوہ (کنواں) کے قریب تھا تقریباً 2 کلو میٹر پے کا راستہ تھا......! میں نے پیٹرول چیک کیا۔ شکر کہ پیٹرول کی بندش ختم ہوگئی تھی اور تنگی ٹل گئی۔ !

☆......☆......☆

27 جون 2011ء...... آج کی ہی تاریخ تھی گویا تازہ قبر ہوگی...... میڈیکل سائنس کی ترقی کے باوجود ایک زندہ بچے کو دفن کر دیا گیا تھا ضرور کوئی کھیل تھا......!

دشمنی بھی ہوسکتی تھی یا ڈاکٹر کی غلط تشخیص......!

کچھ بھی ممکن تھا......!

پہلا مرحلہ قبر تلاش کرنے کا تھا۔ !

اس معاملے میں گورکن میری مدد کر سکتا تھا۔

شمالی قبرستان کا گورکن چاچا فیض رسول، پرانا شناسا تھا...!

میں نے بائیک قبرستان سے باہر ہی کھڑی کی...!

گرمی انتہا کی تھی سورج کی تمازت لمحہ لمحہ بڑھتی جارہی تھی...... لیکن میرے اندر جانے ایسی طاقت کہاں سے آسائی تھی...... میں خود کو بلا ہلکا محسوس کر رہا تھا...... گرمی اور دھوپ سے نکلی...... ! گویا موسمی اثرات میرے وجود کے لئے کوئی خاص اثر نہ رکھتے تھے، میں جونہی قبرستان میں داخل ہونے لگا...... ایک بوڑھا میرے سامنے آگیا......!

"بیٹا...... یہ خاص کدال ہے...... قبر کو احتیاط سے کھولو۔ گورکن تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ یہ کام تم اپنے ہاتھوں سے کرو گے گورکن قبر دکھلا کر تمہاری مدد کرتا رہے گا......!"

"ٹھیک ہے بزرگ۔ جیسے آپ کا حکم......!" میں نے انتہائی احترام سے کدال لے لی وہ ہلکی پھلکی کدال تھی۔ اور انتہائی قیمتی......!

بزرگ مجھے دعا دیتے ہوئے آگے بڑھ گئے......!

قبر کو جتنی احتیاط سے کھولنی تھی ہم نے اس سے کہیں زیادہ احتیاط برتی......!

فیض رسول نے اس کام میں میری خاصی مدد کی تھی...... حیرت انگیز طور پر ہلکی پھلکی کدال نے یہ کام آسان تر کر دیا تھا......!

قبر کھولنے کے آخری مرحلے میں میرا خوف بڑھ گیا تھا۔

یہ فطری اثر تھا ہم انسان ہیں۔ دل بھی رکھتے ہیں خوف کا عنصر تو انسانی خمیر میں شامل ہی ہے...... پھر مجھے کفن چوروں کے پرانے قصے یاد آنے لگے......! وہ چور راتوں کو قبر کھودتے۔ اور خاموشی سے اپنا کام کر جاتے۔

"بیٹا۔ ڈرو مت۔ ہمارے ساتھ اللہ کی ذات ہے جو سب کا پالنہار ہے۔ ! جلدی نکالو اس زندہ بچے کو...... ورنہ بہت کچھ غلط بھی ہوسکتا ہے...... اور غلطی کی صورت میں نقصان ہمارا ہی ہے۔"

میں نے اسم اعظم پڑھ کر کفن پہنے اس چھوٹے بچے کو اٹھالیا...!

میں اور فیض رسول اس بچے کو اٹھا کر گورکن کے جھونپڑے میں آئے...!

بچہ واقعی زندہ تھا......! البتہ یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ یہ کومہ میں تھا یا کوئی اور مسئلہ...... ! بچے کی نبض چل رہی تھی لیکن بہت ہلکی...... چند لمحوں تک قبر نہ کھلتی تو شاید اس کی موت ہو جاتی......!

لیکن پھر ایک عجیب کام ہوا......!

وہ بچہ ہلنے جلنے لگا...... حرکت بڑھتی جارہی تھی۔ تیز اور تیز...!

مطلب وہ کومہ میں نہیں تھا......!

اچانک اس بچے نے اپنی ننھی منی سی آنکھیں کھول دیں......!

وہ رو نہیں رہا تھا بلکہ حیرانی سے مجھے دیکھے جا رہا تھا..!

گورکن ہینڈ پمپ کا ٹھنڈا تازہ پانی لے آیا۔

بچے کے منہ پر پانی ڈالنا شروع کیا ... پانی حلق میں اترتے ہی بچہ ہشاش بشاش نظر آنے لگا۔ ! مطلب ہمیں اس معاملے میں کسی قسم کی میڈیکل ایڈ نہ لی...... اور بغیر ڈاکٹر کے ہی مقصد حاصل ہو گیا......!

بچہ میری گود میں کھیل رہا تھا، شناسائی نہیں تھی لیکن بچہ اپنی دلفریب انداز سے کبھی میری داڑھی پر ہاتھ مارتا تو کبھی سر کے بال نوچ لیتا...... نرم و ملائم ہاتھوں میں زندگی کی رمق واپس لوٹ آئی تھی...... یہ ایک خوش آئند بات تھی۔ اگلا مرحلہ اس بچے کو اس کے گھر پہنچانا تھا لیکن مجھے اس بارے میں پیغام نہ ملا۔

''فیض رسول...... مجھے اس قبر کے بارے میں مکمل تفصیل سے بتاؤ...!''

''ضرور...... بیٹا یہ بچہ سادات کا ہے سید علی حسن شاہ کے صاحبزادے سید علی حسین کا بیٹا۔ ساتھ ماہ پہلے...... غالباً اسی رواں سال کے آغاز میں یہ بچہ پیدا ہوا۔ بستی کی عورتوں کے مطابق علی حسین شاہ کی بیوی بانجھ تھی ڈاکٹرز نے انکار کر دیا تھا۔ لیکن خدا کا کرشمہ کہ پورے بیس سال بعد اللہ نے یہ بچہ عطا کیا...... اصغر علی کی وفات نے سب کو نڈھال کر دیا تھا...... موت کی کوئی خاص وجہ بھی میرے علم میں نہیں۔ ہم تو بس حکم کے غلام ہیں، وہ سردار لوگ ہیں آل رسول سے ہیں۔ بڑے لوگ ہیں میں نے پوچھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی...!''

سیدھا سادہ گورکن اندر کی کہانی سے لاعلم تھا۔

''انکل میرے بابا مجھے گھر بلا رہے ہیں اور امی جان بھی...... آپ پلیز! مجھے میرے گھر تک پہنچا دیں......'' وہ 6 ماہ کا بچہ خود بخود بول اٹھا تھا..

وہ آواز جانی پہچانی تھی...... ساحرہ کی آواز کو میں کروڑوں میں پہچان سکتا تھا۔''

''لیکن...'' میں نے کچھ پوچھنا چاہا......

''لیکن ویکن کچھ نہیں......! آپ مجھے میرے گھر تک پہنچا دیں۔ اندر کی کہانی آپ کے علم میں نہیں لائی...... ضروری نہیں کہ ہر بات آپ تک پہنچائی جائے......''

اور پھر میں بچے کو لے کر اس کے گھر پہنچا۔

سید علی حسین شاہ نے میری بڑی آؤ بھگت کی۔

یہ سب پٹھان کے لئے بہت بڑا اعجزہ تھا، وہ خود سادات تھے اور میں تو ان کی جوتی کی حیثیت نہ رکھتا تھا......!

وہ میرا شکریہ ادا کرنے لگے۔

''آپ ہمارے لئے مسیحا ہو...... ہمارا کھویا ہوا بچہ ہمیں مل گیا

یہ سب اس ذلیل ڈاکٹر کی کارستانی ہے...... اس نے ہمارے بچے کو مردہ قرار دیا تھا......'' سید صاحب بولے۔

''کون تھا وہ ڈاکٹر......؟''

''شہر میں سب سے بڑا ڈاکٹر ہے...... ڈاکٹر مظہر علی..!''

میں نے اسی لمحے ریڈ کارڈ نکالا......!

ریڈ کارڈ پر ایک منظر روشن ہو گیا......!

اسپتال کے اندر مریضوں کا ہجوم تھا...... ساحرہ ہاتھ میں خنجر لئے ایک شخص پر جھکی ہوئی تھی......!

وہ غالباً کوئی بڑا ڈاکٹر ہی تھا گلے میں اسٹیتھو اسکوپ خاص علامت تھی۔

ڈاکٹر روم میں ساحرہ اور ڈاکٹر کے علاوہ کوئی تیسرا موجود نہ تھا۔

پھر ایک دم ساحرہ پر جنون طاری ہو گیا اس نے یکے بعد دیگر چار وار کئے پھر جیسے کیمرہ کلوز ہو گیا... کلوز اور اور کلوز...... روحانی پاور نے مجھے سسکتی ہوئی روح دکھلائی...... وہ مر رہا تھا۔ اور اس کی گردن لٹک گئی تھی ایک طرف۔ !

ساحرہ ایک دم قریب آئی..... اس لیے کارڈ میں اس کا چہرہ واضح اور میرے قریب تھا.....

"ایک موذی کا قتل باعث ثواب ہے..... ڈاکٹر مظہر الحق اپنے انجام کو پہنچ گیا ہے..... یہ زندہ بچوں کی تشخیص مردہ پن سے کرتا ہے..... بیرون ملک بچے سپلائی کرنا اس کا دھندہ تھا..... زندہ بچوں کو قبروں تک پہنچانا اور پھر وہاں سے بیرون ملک اسمگل.....!"

"لیکن دم گھٹنے سے موت واقع ہو جاتی ہے..... پھر بچہ کس طرح زندہ رہ پاتا ہے۔" میں نے دل ہی دل میں سوچا.....!

"میری سوچ کو پڑھ لینے والی ساحرہ نے جواب دیا۔

"وہ بچوں کے جسم میں ایسی ٹیوب بذریعہ منہ داخل کرتا ہے جو بچے کا دم نہیں گھٹنے دیتا..... ایک طرح سے آکسیجن Provide کرنے والی مشین پیٹ کے اندر سے اپنا کام کرتی ہے....."

"اوہ..... انتہائی خطرناک..... ! آپ کا NEXT پروگرام؟"

"میں یہاں سے کافی دور جا رہی ہوں اسمگل شدہ بچوں کو بازیاب کرانے"

"اور میرے لئے کیا حکم ہے.....؟"

"یہاں سے اجازت لو..... اور میرے دوسرے پیغام کا انتظار کرو....."

☆.....☆.....☆

آپ حیران ہو رہے..... اتنی حیرت آمیز بلکہ حیرت انگیز!" بوڑھا مسکرا اٹھا!

"ہاں جی..... حیرانی کی بات تو ہے..... آج کے دور میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں....."

"جی بیٹا..... بالکل موجود ہیں..... ان کو تم اپنی آنکھوں سے دیکھو گے..... اور اپنے ہاتھوں سے قلع قمع کرو گے....."

لیکن حضرت..... یہ سب کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے آج کا دور سائنسی اور جدید ایجادات کا ہے..... ہم 40 سال پہلے چاند پر قدم جما چکے ہیں مریخ کو بھی تسخیر کرنا چاہتے ہیں ہر شہر ہر گاؤں اور ہر گلی میں تعلیم کی شمع جلائی جا رہی ہے پرانی سوچیں بدلی جا رہی ہیں موبائل اور انٹرنیٹ نے زندگی میں تیزی پیدا کر دی ہے فاصلے سمٹ گئے ہیں..... روشنی نے اندر کے انسان کو خوبصورت بنا دیا ہے....." میں بولا.....!

"غلط فہمی ہے بیٹا.....! موبائل اور انٹرنیٹ کی ایجاد انسانی ترقی میں اہم کردار ادا ضرور کیا ہے ہم آج کی ترقی کو ضرور تسلیم کرتے ہیں لیکن ذرا تصویر کا دوسرا رخ بھی دیکھ لو..... پہلے زمانے کے لوگ پیپل کے درخت کے نیچے حقہ بھی پیتے جاتے تھے اور دنیا جہان کی باتوں سے لطف اندوز ہوتے تھے دل روشن تھے۔ آج ایئر کنڈیشنڈ روم میں بھی وہ روشنی اور تازگی نہیں جو نیم کے درخت تلے حاصل ہوتی تھی..... عورتیں باحیا اور باپردہ رہتی تھیں..... مغربی تہذیب اپنے دائرے میں محدود تھی..... چند ایک پاکستانی یورپ جاتے تو لوگ ان کے گرد حصار باندھ کر اپنے اپنے مطلب کے سوال پوچھتے تھے تب ہمارے ہاں الیکٹرانک میڈیا کافی سست رفتار تھا..... مغربی تہذیب مشرقی حسن کو اپنے جادو میں جکڑنے میں ناکام رہی تب تک ہم خود مضبوط رہے لیکن پھر..... جب الیکٹرانک اور نیٹ نے ہمارے ملک کا رخ کیا تو ہم اندر سے کمزور ہوتے گئے..... آج محفلیں تو جمتی ہی نہیں اور اگر کبھی کچھ گپ شپ کے لئے اکٹھے ہو بیٹھیں تو..... ہر شخص اپنا اپنا سیل فون نکالے پیغام رسانی کر رہا ہوتا ہے..... یا لیپ ٹاپ پر ای میل send کر رہا ہوتا ہے فاصلے اس لحاظ سے بڑھ گئے ہیں۔ بزرگ نے جی دار انداز میں تجزیہ نگاری کی

"جی..... واقعی ایسا ہے لیکن جہاں بہت سے مسائل پیدا ہوئے ہیں وہاں اس سہولت نے ہمارے مذہب کو بھی نئی راہیں عطا کی ہیں ڈش، کیبل اور انٹرنیٹ پر ہزاروں چینل آن ایئر ہیں بھی اپنے شعبے سے متعلق کام کئے جا رہے ہیں..... انیمز ڈرامے، فلمیں، مارننگ شوز، اور بہت کچھ..... اور اگر جائزہ

پیش کیے جا رہے ہیں تو ٹھیک ہے......"

"آپ ان ویب سائٹس کو چیک کریں جہاں اسلام، کو پورے دنیا میں پھیلایا جارہا ہے......" میں بولا

"ہم یہ نہیں کہتے کہ یہ ایجادات بذات خود بری ہیں ان کا استعمال اور غلط استعمال ہی اصل روگ ہے...... لیکن میرے بیٹے...... ذرا عقل پر زور دے کر خود جواب دو کہ ایک جوان بہن فون پر پیغام بھیج کر اپنے بوائے فرینڈ کو بلاتی ہے، ایک بھائی کی غیرت کیا گوارہ کرے گی؟ عقل پر ماتم کے سوا اور کچھ نہیں کہ بند کیبن میں کیا کچھ نہیں ہو رہا......!

"بلیو پرنٹ فلموں نے نوجوان نسل کو برباد کر دیا ہے"

"بے شک بابا لیکن یہ چیز ناسور کی طرح پھیل گئی ہے...... ہم اس کے خلاف کیا کچھ کر سکتے ہیں......"

"بہت کچھ...... تمہارے تصور سے بھی زیادہ...... ساحرہ جہاں گئی ہے وہاں سے آنے دو کارڈ پر پیغام جو بھی ملے حرکت میں آ جانا...... میری تمام تر دعائیں تمہارے ساتھ ہیں...... اور ایک بات اور سنو"

"جی......"

"رات تم نے اپنی کلاس کے ایک اسٹوڈنٹ کے اکنامکس کے پرچے میں نمبر اس کی محنت سے بہت کم لگائے ہیں...... اپنا فرض پورا کرنا ہمارا اولین مقصد ہے...... رول نمبر 73...... بہت لائق بچہ ہے نظر ثانی کر لینا"

مجھے بزرگ نے آج کے جدید دور کے بارے میں بریف کیا...... لیکن جدید موضوع کو ٹچ کرنے سے پہلے انہوں نے چند حیرت انگیز باتیں بتائیں......!

ان کے مطابق ضلع چکوال کے نواحی گاؤں میر تھی پور میں چند لوگ ایسے بھی ہیں جن کا اولین مقصد مردہ گوشت کھانا ہے یہ ان کی مرغوب غذا تھی۔ جیسے وہ مزے لے کر چباتے تھے آج کے دور میں اس قسم کے

مردہ خور انسانوں کا وجود ہونا حیرت ناک تھا۔ لیکن پھر اس خبر پر یقین کرنا بھی پڑا جب ٹی وی چینلز نے اسکی تصدیق کی..... چند ایک لوگ پکڑے گئے تھے جبکہ بابا فقیر علی جو مجھے ہر جگہ گائیڈ کرتے رہے تھے بتایا کہ ابھی ان کا گروپ زیر زمین چلا گیا ہے۔ جونہی یہ معاملہ دب جائے گا وہ اپنی مردہ خوری دوبارہ شروع کردیں گے.....!

ٹی وی پر ویڈیو کلپ چلا تھا جس کی چند جھلکیاں میں نے خود دیکھی تھیں..... اخبارات میں بھی ان کا خوب ذکر ہوا تھا..... وہ دونوں سگے بھائی تھے۔ دماغی طور پر ڈپریشن کا شکار تھے..... فرسٹ آف آل انہوں نے اپنی فیملی کو موت کے گھاٹ اتار کر مردہ خوری کا آغاز کیا..... ویڈیو میں مردہ گوشت کے بڑے بڑے دیگچے دکھائے گئے تھے..... بعد ازاں قبروں کی کھدائی اور لاشوں کی غیر موجودگی نے پولیس کو چوکنا کردیا اور تفتیش کا دائرہ کار وسیع ہوتے ہوئے ان مردہ خوروں تک جا پہنچا..... جس کے بعد یہ خبر نشر کی گئی..... مجرموں کو زیر حراست کرلیا گیا..... لیکن یہ تو تھی پرانی کہانی.....!

اندر کی کہانی کچھ اور تھی..... جو حیرت ناک تھی۔

فقیر علی نے مزید چند باتیں مجھے بتائیں جن کا ذکر وقتاً فوقتاً ہوتا رہے گا۔

☆.....☆.....☆

ہیلو..... ! کاشف اسپیکنگ.....'' میں نے فون اٹینڈ کرتے ہوئے کہا۔ !''

جناب پکڑا ہے یا شناختی کارڈ دکھانا پڑے گا.....'' دوسری طرف ساحرہ رضا کی سحرزدہ آواز ابھری وہ فریش محسوس ہورہی تھی...!

''محترمہ..... شناختی کارڈ تو 18 سال کی عمر میں بنتا ہے جبکہ ابھی آپ 16 کی ہیں مطلب چاہنے کے باوجود بھی آپ شناختی کارڈ نہیں دکھا سکتیں...'' میں نے جواباً کہا۔...!

''ہائیں.....اوہ کیسے.....؟'' وہ حیرانی سے بولی۔

''آج سے بہت سال پہلے ایک بوڑھی سے پوچھا گیا کہ محترمہ آپ کی عمر کتنی ہوگی؟ وہ جواباً مسکرا کر بولی...!

''یہی کوئی 16 سال..... حالانکہ محترمہ 50 کراس کرچکی تھیں''

''اوہ..... تو مطلب ہم 50 سال کے ہیں..... خیر آپ مذاق خوب کرتے ہیں.....! کامیڈی ایکٹنگ آپ کو شہرت دلاسکتی ہے''

''شکریہ.....! یہ آپ کا حسن ظن ہے ورنہ ہم اس قابل کہاں.....''

''کاشف صاحب! کارڈ چیک کریں اور نئے مشن پر نکلیں..... تیاری مکمل ہو۔ میں اور آپ اس مشن میں ساتھ ہوں گے.....''

''ویری نائس.....! یہ پہلا موقع ہوگا جب آپ میرے ساتھ مشن پر ہوں گی.....!''

''پلان کیا ہے؟''

''ریڈ کارڈ چیک کریں آپ کی سہولت کے لئے پیغام صاف الفاظ میں لکھا ہوگا''

''اوکے.....! پھر بہت جلد ملاقات ہوگی.....''

اس نے کہا۔ اس کے ساتھ ہی رابطہ منقطع ہوگیا.....

میں نے کارڈ چیک کیا..... الفاظ نمایاں تھے...

چکڑوال کے نواحی گاؤں میر تھی میں مردہ خوروں کے تمام گروپ کو راہ راست پر لانا ہے..... آج رات وہ تمام مردہ خور میر تھی کے قبرستان پر حملہ بول رہے ہیں ہمیں ان کو روکنا ہوگا

''آپ کی الماری میں VIP لاؤنج کی اعلیٰ سیٹوں کی ٹکٹس ہیں دو عدد ریڈن..... مختصر سامان کے ساتھ اور چکڑوال پہنچ جائیں...''

یہ پیغام واضح تھا، میں نے الماری کھولی وہاں VIP ٹکٹ موجود تھے۔ PIA کے خصوصی ٹکٹ.....

☆.....☆.....☆

کراچی ایئرپورٹ پر میری ملاقات فقیر علی شاہ سے ہوئی......!

"بیٹا کام خطرناک ہے جان کی بازی لگانے جارہے ہو۔ یہ جہاز تباہ ہوجائے گا لیکن تمہاری جان بچالی جائے گی۔!"

لیکن اگر آپ کو پہلے ہی علم ہے تو ہم تمام مسافروں کی جانیں بچ سکتی ہیں، ہم ان کو روک سکتے ہیں کہ وہ اس جہاز میں سفر نہ کریں...... یہ کئی زندگیوں کا سوال ہے۔" میں بولا۔

"قدرت کے کاموں میں دخل مت دو برخوردار...... اس جہاز میں جتنے لوگ سفر کررہے ہیں سوائے تمہارے سب کی عمریں ختم ہوچکی ہیں ملک الموت ان کی روح قبض کرنے کے لئے تیار ہے...... یہ میرے اللہ کا فیصلہ ہے اور اللہ کے فیصلے کوئی نہیں ٹال سکتا...."

"ٹھیک ہے شاہ جی...... ہم تو حکم کے غلام ہیں...... میرا دماغ حادثے کے بعد کا سوچ کر کام ہی نہیں کررہا ہے......" میں گھبرا گیا

"ساحرہ اور میں تمہارے ساتھ ہوں گے.

!تم پریشان مت ہو......!تم اس جہاز میں ایک بہت بڑے بزنس مین سے ملو! یہ دنیا دار بندہ ہے دین سے کوئی واسطہ نہیں البتہ اس کی عمر ختم ہونے کو ہے...... تم اس کو چند لمحوں تک دین کی باتیں بتاؤ گے...... اسے آخری لمحہ کلمہ طیبہ کا ورد کرواؤ گے...... کیونکہ ایک بار اس نے اپنی فیکٹری کے آغاز کے موقع پر اللہ کے نام پر بہت سارا روپیہ غریبوں کو دیا تھا...... اس کی نیکی کام آئے گی...... !!اگر اس کی موت کلمہ طیبہ پر ہوگی تو جنت کے فرشتے اس کا استقبال کریں گے۔"

وہ پُراسرار انداز سے بولے۔

"ٹھیک ہے باباجی......!مجھے دعا کے لئے کتنے وقت کی مہلت ملے گی...."

"پرواز کے 30 منٹ بعد یہ جہاز روشن پور کے گندے نالے میں گر کر تباہ ہوجائے گا...... نالے کا شگاف گہرا اور چوڑائی بہت زیادہ ہے لیکن تم کو ایک خراش تک نہیں آئے گی...."

"ٹھیک ہے سرکار...!جو حکم..."

میرے لئے اس قسم کا خطرناک تجربہ جان لیوا بھی ثابت ہوسکتا تھا لیکن اللہ کی نصرت اور اس کی مخلوق کی تسلیوں نے دل مزید بڑا کردیا ورنہ میں ایک کمزور دل والا انسان تھا جسے فقیر علی شاہ اور ساحرہ جیسے لوگوں نے بہادر اور دردمند بنادیا تھا عام حالات میں کبھی بھی موت کے طیارے پر سفر نہ کرتا لیکن یہ عام حالات نہ تھے۔ ہم خاص مشن پر تھے اور خاص مشن پر خاص باتیں خودبخود ہی وجود میں آجاتی ہیں۔

جہاز کے تمام مراحل بخوبی انجام پذیر ہوگئے...... اور میں بخیریت جہاز کی ریزرو سیٹ پر جا بیٹھا گو کہ اپنی زندگی میں پہلی بار جہاز کا سفر کررہا تھا لیکن راستے میں آنے والی تمام رکاوٹیں آٹے میں بال کی طرح نکلتی چلی گئیں۔

یہ VIP حصہ تھا۔ جہاز کے اس حصے میں پروٹوکول عام مسافروں کی نسبت بہت اعلیٰ ہوتا ہے...
چمکتی دمکتی ایئرہوسٹس آپ کو ہر بار پکارتی پھریں گی...
اس حصہ میں اعلیٰ شخصیات موجود تھیں۔

میں چند ایک ذکر کرنا چاہوں گا... کیونکہ میرے اس مشن سے ان کا تعلق بالواسطہ رہا تھا۔

میرے دائیں جانب سیٹ نمبر 435 پر ایک نوجوان کانوں میں ہینڈ فری لگائے بڑے مزے سے سونگ سن رہا تھا...... اس کی عمر تقریباً 24 سال ہوگی چہرے مہرے سے اعلیٰ خاندان کا نظر آتا تھا... ڈریسنگ قابل دید اور سب سے بڑھ کر اس کی گردن پر تل کا نشان...... یہ نشان میں نے ایک بار خواب میں دیکھا تھا... گردن پر یہ سیاہ تل کسی خاص نشان کی طرف اشارہ کرتا تھا...... خواب اچھی طرح یاد نہیں لیکن کہیں نہ کہیں اسکا تعلق میرے مشن سے ضرور تھا۔

بائیں جانب وہی بزنس مین براجمان ہیں جن کا ذکر فقیر علی شاہ نے ایئرپورٹ پر کیا تھا... شاہ

صاحب کی بتائی ہوئی تمام نشانیاں اس کے اندر موجود تھیں البتہ ایک نشانی باقی تھی!

وہ بزنس مین لیپ ٹاپ کھولے حساب کتاب میں لگا تھا۔ بے چارے کو کیا معلوم کہ اس کی اپنی زندگی کا حساب کتاب بھی گول ہونے والا تھا......

پرواز کے 30 منٹ بعد جہاز نے ایک نالے میں جا گرنا تھا...... لیکن اس سے پہلے مجھے فلسفیانہ دعا کرنا تھا......اور اس بزنس مین کو کلمہ پڑھنا تھا... !

فقیر علی شاہ کی ہدایت کے مطابق میں نے خوبصورت داڑھی سجائی تھی... جو میری شخصیت کی تعمیر میں پہلا قدم تھا۔

میں دل ہی دل میں اللہ کو یاد کیے جا رہا تھا......

پھر ایک عجیب پیغام آیا......!

ایئر ہوسٹس باری باری مشروبات دیتے ہوئے جب میری طرف آئی تو اس نے میرا گلاس مجھے تھمایا......

میری نظر گلاس کی سطح پر ٹھہری......گلاس کے اوپر والی سطح پر انگریزی الفاظ ابھرنے لگے۔

Don,t you worry ......Not Crashing

یہ الفاظ جہاز کی تباہی کی نفی کر رہے تھے...

گویا جہاز میں سوار مسافر بخیریت اپنی منزل کی طرف سوار رہیں گے...... یہ واقعی خوش آئند بات تھی۔

گلاس کے ریڈ کارڈ پر پیغام موصول ہونے لگا۔

دوسرا **Sentence** پر توجہ دو۔ تمہیں لکھڑی کوٹ پہنچنا ہے یہ جہاز ایک ماں کی دعا کی وجہ سے تباہی سے بچ نکلا ہے۔

یہ میسج میرے لئے کسی خوشخبری سے کم نہ تھا۔ میرا دل سکون میں آ گیا... بے چینی اور اضطراب ٹوٹ سے گئے۔ ایک بھاری پتھر اتر گیا...

میں نے اطمینان سے مشروب پیا......

میں نے دائیں جانب دیکھا......

تل کے نشان والا نوجوان قلم سے کچھ لکھ رہا تھا......

چند ہی لمحوں میں ایک چٹ میری طرف دیتے ہوئے بولا۔

"سر خصوصی الفاظ ہیں لکھڑی کوٹ سے آپ کی روانگی، میری کوہوگی وہاں آپ کو ایک مجذوب سید شاہ ملے گا......بس آپ اس کی ہدایات پر عمل کریں گے...... اللہ نگہبان......"

لکھڑی کوٹ کے شہر چکڑوال کے مصروف ترین ایئر پورٹ پر لینڈنگ کے بعد سیڑھی لگا دی گئی میں VIP لاؤنج میں جا بیٹھا...... لیکن سیڑھی اترتے وقت تل کے نشان والے نے مجھے ایک پستول دیا...... !پستول عام سا تھا۔

"یہ پسٹل تمہارے لئے بہت اہم ہے......اس مشن میں کامیابی سے ہمکنار کرے گا۔ اسم اعظم کا ورد جاری رکھنا۔ غلط سوچنا ختم کر دو......!"

چکڑوال میں میری پہلی مرتبہ آمد تھی۔ انتہائی مصروف سڑکیں۔ تجارتی مراکز آپ اس شہر کو بزنس سٹی کراچی جیسا سمجھ سکتے ہیں ایک اور شہر سیول جس کا رول ماڈل کراچی تھا۔ یا بجائے اس کے میں یہاں چکڑوال کا نقشہ بیان کروں آپ اسے مندرجہ بالا دو شہروں میں سے کسی ایک انتخاب کر لیں۔

موسم خوبصورت اور ساون کی آمد تھی...... گرمی کا زور ٹوٹ کر بہہ گیا۔ یہ پہاڑی علاقہ نہیں تھا لیکن یہاں کی سرزمین پتھریلی اور پانی آبشاروں سا میٹھا پانی جس میں برف جیسی ٹھنڈک کا لطیف احساس ہوتا یہ پانی میرے لئے آب حیات ثابت ہوا۔ اگلے واقعات سے پہلے اتنا بتا دوں کہ میری سوکھی ہڈیوں میں جان سی بھر آئی مسلز پھیلنے لگے چھاتی کسی پہلوان کی طرح بڑھ گئی...... آنکھوں میں چمک اتر آئی اور جب اس مشن سے واپسی ہونے لگی تو میرا لیز نمبر بھی خاصا کم ہو گیا تھا...... گرد لمبی بڑھی کہ میں چکڑوال کا دیوانہ ہو گیا......

اس سرزمین کی آب و ہوا میرے لئے جنت

بے نظیر ثابت ہوئی صحت مند جسم اور صحت مند دماغ کا حامل سوکھا سڑا کاشف علی خاصا جاذب نظر ہوگیا تھا..... چکڑوال کے مین روڈ کے چوراہے پر میرا انتخاب ٹلکڑی کوٹ تھا..... ٹیکسی والے سے کرایہ طے کرنے کے بعد مختصر سامان کے ساتھ سفر شروع ہوگیا مجھے فرنٹ سیٹ پر بیٹھنا پسند ہے آج بھی میں نے فرنٹ سیٹ پر بیٹھنا پسند کیا.....

ڈرائیور جی دار انسان تھا... سر پر بلوچی کیپ اور بڑی بڑی شلوار۔

"چلیں صاحب....."

"جی بالکل..." سفر کا آغاز خاموشی سے ہوا..... میں اس کالی گھٹا سے لطف اندوز ہو رہا تھا ساون کی آمد تھی..... یہ سڑک خاصی پکی تھی..... ڈرائیور کے مطابق حال ہی میں اس کی تعمیر ہوئی تھی.....

شہری حدود سے نکلتے ہی دیہاتی ایریا شروع ہوگیا..... دور دور تک سبزہ اور ہلکی ہلکی بارش کی آمد نے دل میں رونق برپا کردیا..... خوبصورت بوندا باندی نے میرے اندر کے جذبات ابھار دیے۔

ساحرہ کا شادابی چہرہ آنکھوں میں بس گیا تھا تیکھے نقوش والی وہ نیک سیرت دوشیزہ گر اس حسین سفر میں میری ہمسفر ہوتی تو تھوڑا بہت رومانس کے بارے میں سوچا جاسکتا تھا..... ویسے ساحرہ کول حسینہ تھی... میرے دل و دماغ پر چھا گئی تھی۔

نجانے جو کچھ میں سوچ رہا تھا...

اس پر..... اس ڈگر پر وہ بھی..... اس کا جواب مجھے Red Card سے ملا۔

"شکر ہے خدا کا... آج اتنے عرصے بعد رب کی رحمت ہوئی ہے..." ڈرائیور بولا۔ اس کا تلفظ پٹھانی تھا۔

"معاون خان..... گرمی نے جینا حرام کردیا تھا..."

"صاحب ٹلکڑی کوٹ میں کس کے پاس جارہے ہو....."

"سید شاہ..... ٹلکڑی کوٹ کے بہت بڑے بزرگ ہیں ان سے ملنے جارہا ہوں....."

"ٹلکڑی کوٹ کے سید شاہ... اللہ انہیں لمبی عمر دے..... صاحب وہ تو ہمارے مائی باپ ہیں..... بہت اونچے لوگ ہیں.....!"

"خان صاحب..... ایک بات تو بتاؤ....."

"جی صاحب..... پوچھیں..."

"میر گھی میں مردہ خوروں کی موجودگی... یہ واقعہ کس حد تک حقیقت پر مبنی ہے...؟"

میرے اس سوال نے اسے حیران کردیا لیکن یہ کوئی حیران کن واقعہ نہ تھا... کیونکہ وہاں کے تمام لوگ اس واقعہ سے پریشان زیادہ اور حیرانی کا اظہار کم کرتے تھے

"صاحب... یہ واقعہ حقیقت کے قریب ہے۔ ہم نے ان ذلیل انسانوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا..... فرعون جیسی شکل تھی ان کی.....!

"خان صاحب! پولیس لے گئی تھی ان کو تفتیش کے بعد کچھ پتہ چلا....."

"یہ تو جی اندر کی باتیں ہیں..... ویسے سید شاہ صاحب آپ کی بھرپور مدد کرسکتے ہیں..... صاحب جی..... آپ کسی ٹی وی چینل سے تو نہیں ہو؟"

"نہیں....."

"اپنی معلومات کے لئے پوچھ رہا ہوں.....! صاحب..... سید شاہ صاحب سے ہمارے حق میں دعا کرانا..... ہمارا ایک بیٹی ہے پیدائشی معذور ہے..... روزگار کے لئے ٹیکسی چلاتا ہے....." دعا کروانا کے ہمارا بیٹی ٹھیک ہوجائے.....!"

"ضرور خان صاحب! اللہ کی مدد سے سب ٹھیک ہوجائے گا...!"

ڈرائیور نے مجھے سید شاہ صاحب کے آستانے پر ڈراپ کیا۔

ڈرائیور سے فارغ ہونے کے بعد میں نے کال بیل کا بٹن دبا دیا..... زیادہ دیر انتظار کی زحمت نہ اٹھانی

پڑی......

ایک نوعمر بچہ گیٹ پر نمودار ہوا...
"اگر آپ کاشف علی صاحب ہیں تو بلا جھجک اندر آجائیں......بابا آپ کا انتظار فرمارہے ہیں......"
"جی......ویسے آپ کے لئے اطلاع کے میں ہی کاشف علی ہوں چلئے......"

جلد ہی میں نفیس قسم کے ڈرائنگ روم میں تھا......یہ حویلی بہت اولڈ سی تھی......اولڈ نقاشی......لیکن صفائی کا اعلیٰ انتظام۔

ڈرائنگ روم انتہائی نفیس......شاہ صاحب کے اعلیٰ ذوق کی عکاس......!

نوعمر بچے نے اپنا نام رضوان بتایا......

بچے نے مجھے لیموں بھا مشروب پیش کیا......

انتہائی لطیف شربت......میرے اندر جو بھڑک رہی آگ تھی یکدم بجھ سی گئی......میرے بدن کے انگ انگ میں ٹھنڈک کا لطیف احساس موجزن ہوگیا۔

دل جیسے گناہوں سے سیاہ ہوگیا تھا اب ایسا لگتا تھا جیسے دُھل گیا ہو......لیکن مجھے ابکائی آنے لگی......متلی بھرتے

"سر یہ ڈسٹ بن......لیمن جوس کی تاثیر ہے کہ اس کے پینے کے بعد الٹی آتی ہے......لیجیے!" میں نے مطمئن ہوکر قے کرلی......

بعد ازاں صاف ستھرا ہونے کے بعد اپنے جسم میں میں واضح تبدیلی محسوس کی......ہلکا پھلکا اور صاف ستھرا......ایسا محسوس ہوا جیسے میرے اندر مردہ انسان اپنی موت آپ مرگیا ہو......

میں مطمئن ہوکر صوفے پر بیٹھ گیا......

پھر میرے کارڈ پر پیغام موصول ہوا......

"تم ہمیں بہت پسند ہو......یہ ہے تمہارا جواب...اور اب تم یہاں سے نکلو......گیٹ سے باہر میں تمہارا انتظار کررہی ہوں..."

"اوکے!" میں فوراً ہی باہر آگیا......

"شاہ صاحب سے میری ملاقات کیوں نہیں کرائی گئی......؟"

"شاہ صاحب خصوصی عمل میں مصروف ہیں......"

"تو کیا پہلے سے ملاقات کا وقت طے نہیں تھا؟"

"ملاقات چھوڑیں ہمارے ہاں سب ایک دوسرے سے بغیر وقت لئے ملاقات کرتے ہیں..

جو کچھ بھی ہورہا ہے منصوبہ بندی سمجھ لو......شاہ صاحب کی دعائیں ہمارے ساتھ ہیں......اتنا کافی ہے......"

شام کے سائے پھیل رہے تھے جب ساحرہ اور میں میرٹھ جا پہنچے! یہاں ہماری ملاقات فقیر علی شاہ سے ہوئی

اس پورے واقعہ میں صرف ایک چیز میرے ذہن سے محو ہوگئی تھی کہ اسکول بچوں کا کیا بنا......؟

لیکن ساحرہ نے اپنی کامیابی کی خبر دی روحانی عمل نے دشمنوں کی تمام تر منصوبہ بندی خاک میں ملادی۔

یہ ایک کچا سا گھر تھا۔ جس کے مکین منظور خان تھے کوئی اولاد نہ تھی محنت مزدوری کرتے تھے...فقیر علی شاہ نے ہمیں اس گھر میں ٹھہرایا تھا۔

شام کے کھانے میں ساگ اور لسی کے ساتھ مکھن پیش کیا گیا......یہ خاصا لذیذ تھا۔ ہم نے جی بھر کر کھایا......اس گاؤں میں ہماری پہلی دعوت تھی......

میں اس مشن کے حوالے سے ایک خاص بات بتاؤں......اس مشن پر روانہ ہونے سے پہلے کوئی خاص منصوبہ بندی نہیں کی گئی......البتہ پستول کا حیرت انگیز استعمال بتادیا گیا

☆......☆......☆

یہاں تعفن تھا......سڑاند......اور مردہ گوشت کی بدبو......لاش کی بوٹی بوٹی کردی گئی تھی...جسم کے ہر حصے کو کاٹ کر خوب پکایا جارہا تھا۔......میں اور ساحرہ ریڈ کارڈ پر ویڈیو کلپ دیکھ رہے تھے......اس سے پہلے تین نقاب پوش قبرستان کے اندر سے برآمد ہوئے تھے اور ایک تازہ قبر کی طرف بڑھے......چند منٹوں کی

محنت سے انہوں نے تازہ لاش برآمد کی.....

حیرت انگیز طور پر وہ قبرستان کے اندر بھی روپوش ہوگئے فقیر علی شاہ اور سید شاہ کی آپس کی ملاقات نے یہ ظاہر کیا کہ ان کا ٹھکانہ زیرِ زمین ہے۔

ساحرہ اور میں رات کے پہلے حصے میں قبرستان کے شمالی دروازے پر موجود تھے یہاں میرے دل کی دھڑکن زوروں پر تھی..... لیکن اسم اعظم اور آسمانی قوت نے قوت سماعی اور گویائی میں اضافہ کردیا.....

دروازہ اندر سے کھلا ملا..... گویا قبرستان کے اندر داخل ہونا مشکل ثابت نہ ہوا گھپ اندھیرا لیکن میری بصارت نجانے کیونکر اور کیسے اتنی تیز ہوگئی کہ میں ہر چیز واضح طور پر دیکھ پارہا تھا..... حالانکہ میری گلاسز رات کو کام کرنا چھوڑ دیتی تھیں..... اس طرح قوت گویائی میں بھی اضافہ ہونے لگا۔ میں چاندنی کی ہلکی مدھم آواز سن پارہا تھا..... ہوا کی سیٹی نما آواز..... کشش ثقل کے وقت مختلف آوازوں کی شناخت..... مطلب چھوٹی سے چھوٹی آواز حساس کانوں تک پہنچتی رہی..... میری نظر تاحد نظر دیکھنے کے قابل ہوگئی یہ حد نظر عام انسان کی نسبت خاصی وسیع تھی.....

میں قدموں کی آواز بآسانی سن سکتا تھا.....

"السلام علیکم..... یا اہل القبور....." میں قبرستان میں داخل ہوتے وقت کہا..... ساحرہ مجھ سے دو قدم آگے تھی۔ وہ مجھ سے بات کرنے میں ہچکچا رہی تھی..... یہ حکمت عملی سمجھ لیجیے.....!

میں ریڈ کارڈ چیک کررہا تھا کیوں کہ اب بات چیت ریڈ کارڈ سے ممکن تھی.....!

"پسٹل ہاتھ میں رکھو..... ہمیں برگد کے درخت کے اندر تک جانا ہے..... میرے پیچھے چلے آؤ..... یہاں ان کا گروپ ہے..... حفاظت کے تحت یہ لوگ ادھر رہتے ہیں..... دن کو یہ مختلف علاقوں میں مجری اور رات کو زیرِ زمین رہائش پذیر رہتے ہیں"

میں ساحرہ کے پیچھے جارہا تھا..... خوف کا عنصر انسانی خمیر میں ڈال دیا گیا ہے۔ مجھے بھی خوف محسوس ہوا لیکن اسم اعظم کا ورد خوف دور کرنے میں مددگار ثابت ہوا۔

ہم برگد کے گھنے درخت کی جڑ تک پہنچ چکے تھے..... جڑوں کی مناسبت سے ایک مخصوص راستہ بنایا گیا تھا.....

ساحرہ نے مجھے جڑ کے اندر فائر کرنے کا کہا.....

میں نے ٹریگر دبا دیا..... لیزر لائٹ بلٹ نے جڑ تک جلادی..... جڑ جل کر خاک ہوگئی..... اندر ایک راستہ کھل گیا۔

ساحرہ نے دو ماسک نکالے..... یہ جدید ماؤتھ کور تھے میں نے انہیں چہرے پر چڑھا لیا..... تاکہ ہر قسم کی بدبو سے محفوظ رہ سکیں۔

وہ تعداد میں تین تھے ان کا ایک اور گروپ جنوبی قبرستان میں اپنے خطرناک عزائم کے ساتھ مختلف وارداتیں کرچکے تھے ہم نے ان تینوں کو اپنی گرفت میں کرلیا..... عارف، زاہد اور عابد..... تینوں مردہ خور تھے۔

ہم نے ان کو رسیوں سے باندھ دیا تھا.....

پھر وہ طوطے کی طرح اگلنا شروع ہوگئے تھے

"جی یہ ہماری پسندیدہ خوراک ہے ہم دن بھر مجری کرتے رہتے ہیں پھر جونہی کوئی لاش دفنائی جاتی ہے رات کو لاش نکال کر اس زیرِ زمین تہہ خانے میں لے آتے ہیں"

ہم گوشت کو آگ پر اچھی طرح پکا کر کھاتے ہیں نمک مرچ سمیت..... اوجی..... سب سے پہلے یہ کام جاسن نے کیا ذات کا چمار ہے۔ لیکن گھٹیا ذہنیت..... بیوی بچوں کو قتل کرکے آگ پر بھون کر کھا گیا

میری اس کے ساتھ دوستی تھی اس نے مجھے مردہ گوشت کھلایا..... مجھے بہت لذیذ لگا..... پھر ہم لوگوں نے باقاعدہ وارداتیں شروع کردیں، جاسن پکڑا گیا لیکن ہم بچ نکلے..... عارف خود بھی اس کا شکار ہوگیا

ہمارا دوسرا گروپ جنوبی قبرستان میں موجود ہے۔

جی یہاں غلام فرید کی موت ہوئی تھی..... ہم

آج رات اس کی لاش نکالنے والے تھے کہ تم لوگ آگئے.....“

”کاشف! آپ کیا کہتے ہیں... ؟“

”جی..... کیا مطلب.......؟“

”مطلب ان مجرموں کے بارے آپ کی کیا رائے ہے.....؟“ ساحرہ نے وضاحت سے کہا

”آپ ہیڈ آفس سے معلوم کریں.....! جو فیصلہ ہوگا بس عملدرآمد ہوگا.....“

”اوکے..... پانچ منٹ.......!“

فقیر علی شاہ اور سید شاہ کی روحانی طاقتوں نے مردہ خوروں کا دوسرا گروپ بھی ٹھکانے لگادیا، چکڑوال کے تھانہ انچارج ملک چاہت علی خان نے FIR درج کرلی..... چاہت علی دونوں بزرگوں کا خاص مرید تھا..... انصاف کی مکمل اپیل کے ساتھ ہم نے انہیں تھانہ میں ان کے حوالے کردیا..... سلاخوں کے پیچھے یہ تمام مردہ خور اپنی اس حرام خوری کی وجہ ڈپریشن بتاتے تھے. لیکن حالات اس کے برعکس تھے دونوں گروپوں کے تمام لوگوں نے انسانی مردہ گوشت میں خاص مزہ محسوس کیا تھا. اور اسی کی بھینٹ چڑھ گئے تھے..... یہ انوکھا مشن تو بخیریت انجام کو جا پہنچا لیکن ایک نیا مسئلہ کھڑا ہوگیا.......!

یہ مشن ساحرہ اور میں نے مکمل کیا ... لیکن اس میں ہمارا بہت نقصان نہ ہوا..... ہمارا ایک ساتھی ہمیشہ کے لئے ہم سے بچھڑ گیا۔

☆...☆...☆

چکڑوال کے نواحی گاؤں لالی کوٹ میں کسانوں کی آبادی تھی زیادہ تر لوگ زمینیں کاشت کرتے ہیں کھیتی باڑی ان کا خاندانی پیشہ ہے ان کسانوں میں ایک کا نام نوردین تھا نوردین نامی اس کسان کی ایک بیٹی تھی... اس کی بیٹی کسی عجیب وغریب بیماری کا شکار ہوگئی تھی..... اس کیس کی ابتداء کچھ یوں ہوئی۔

ساحرہ اور میری خوشی دیدنی تھی..... ہم نے بہت کم وقت میں مجرموں کو کیفر کردار تک جا پہنچایا تھا یہ ہماری بہت بڑی کامیابی تھی...

مشن مکمل ہونے کے ایک گھنٹہ بعد اپنے واپسی کا سفر باندھا..... یہاں سے چکڑوال تک کوئی گاڑی رکتے نہیں جاتے تھے..... کیونکہ لوگ شہر سے گاؤں آتے تھے اپنی گھروں میں ٹھہرادیتے..... اور اگلی صبح دوبارہ کاروبار کا آغاز کرتے۔

تانگے کا رواج بھی قریباً دی اینڈ ہی تھا .

شام کے سائے پھیل رہے تھے ساحرہ بھی میرے ہمراہ تھی. ہمیں کسی نہ کسی طرح چکڑوال پہنچنا تھا لیکن مسلسل کوشش کے باوجود ہمیں گاڑی نہ ملی......!

تھک ہار کر ہم ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے تھے ندی بہہ رہی تھی میں نے چلتے پانی سے وضو کیا ساحرہ نے بھی اپنے آپ کو فریش کیا۔

دور سورج ڈوبنے کو تھا سورج کی آخری سانسوں نے شام سہانی کردی تھی ... ندی میں میں زردی مائل عکس دلکش تھا.....

”پلان کا اگلا منصوبہ کیا ہے؟“ میں نے ساحرہ سے کہا۔

”مجھے پتہ تھا کہ گاڑی نہیں ملتی......“

”تو پھر مفت میں چکر لگواتی رہیں..... پہلے بتادیا ہوتا......“ میں برہم ہوا.

”ذرا سوچو ایک عام شخص بھی وہی کرتا جو ہم نے کیا ....“ اس نے دلیل دی۔

”ہاں یہ تو ہے، لیکن صلاحیتوں کا درست استعمال انسانی جذبات کی مثبت عکاسی ہے۔

عکاسی کو سائیڈ پہ رکھیں ہمیں آج رات نوردین کے ہاں ٹھہرنا ہے۔“

”نوردین... ؟“

”بس نوردین..... میری معلومات کے مطابق یہ علاقہ لالی کوٹ ہے یہاں گندم، اور چاول کی کاشت زیادہ ہوتی ہے..... کچھ لوگ سبزیاں بھی اگاتے ہیں... لوگوں کی اپنی زمینیں ہیں کبھی محنت مزدوری کرکے بچوں کا پیٹ پالتے ہیں ... انہی کسانوں میں

ایک کا نام نوردین ہے۔" اس نے وضاحت دی۔

"ویری گڈ..... محترمہ حالات حاضرہ سے بخوبی باخبر ہیں..... چلیے..... پھر دیر کس بات کی....."

"نہیں..... نوردین خود چل کر یہاں آئے گا.....!"

"واہ..... ساحرہ صاحبہ واہ..... یہ ہوئی ناں بات"

ہم اسی قسم کی باتوں میں مصروف تھے کہ ایک کم سن بچہ بھاگتا ہوا ہمارے قریب سے گزرا..... اس کے پیچھے سے کوئی بزرگ آدمی آوازیں لگاتا بھاگ رہا تھا۔ بچہ تو ہمیں کراس کر گیا لیکن وہ بزرگ آدمی ہانپتا کانپتا ہمارے قریب آ گیا..... شہری بابو اور ایک دوشیزہ کو دیکھ کر وہ بہت حیران ہوا پھر بولا..... "آپ لوگ کون ہو....." اور اتنی شام تک یہاں کیسے بیٹھے ہو.....؟" اس کے لہجے میں حیرانی تھی۔

"فقیر علی شاہ کو جانتے ہو نوردین....." ساحرہ نے پوچھا۔

وہ تو ہمارے مائی باپ ہیں.....! شاہ صاحب کافی عرصے سے ادھر نہیں آئے.....!" اس کی آواز میں جھوٹ پنہاں تھی.....!

سمجھ لیں وہ ادھر ہی ہیں..... نوردین ہم انہی کے لوگ ہیں..... شاہ صاحب کا خصوصی پیغام ہے کہ احکام خداوندی پر مضبوطی سے عمل کیا کرو....."

"جی حضور کا جیسے حکم..... آپ لوگ اگر آج میرے غریب خانے پر ٹھہر جائیں تو قسمت جاگ اٹھے گی"

"ہم ضرور چلیں گے لیکن آپ ہمارے ساتھ ایک وعدہ کرو....."

"جی کیسا وعدہ....."

"گھر میں جو پکا ہوگا ہم وہی کچھ کھائیں گے..... آپ ہمارے لئے خصوصی انتظام نہیں کرو گے.....!"

"مائی باپ۔ یہ تو ظلم ہوا..... شاہ صاحب کے خصوصی لوگ ہمارے غریب خانے پر تشریف لے آئیں اور ہم خدمت نہ کریں۔"

"تو پھر اجازت..... نوردین کے ہاں رات گزار لیں گے"

"نہ جی نہ..... اچھیں جو آپ کا حکم.....!" نوردین؟ تجسس میں پڑ گیا!

"پھر ٹھیک ہے....." ساحرہ نے کہا۔

وہ اچھی وضع قطع کا صاف ستھرا گھر تھا..... گاؤں کی ثقافت کا منہ بولتا ثبوت، ہاتھ والے پنکھے اور سونے والی چٹائی..... نوردین کے چار بچے تھے ایک بچی اور تین بیٹے.....!

بیٹے اسکول میں پڑھتے تھے جبکہ لڑکی کے بارے وہ خاموش ہو گیا۔ نوردین کی بیوی ڈھلتی عمر کی تھی دونوں کی شادی خاصی عمر میں ہوئی تھی محبت کی شادی تھی..... دونوں خاندانوں میں تنازعات رہے نوردین بوڑھا ہو گیا لیکن محبت کم نہ ہوئی۔ نوردین کی بیوی عالم مائی نے انتظار کیا..... اور پھر ایک دن دونوں کی محبت ایک ہو گئی.....! تنازعات ختم ہو گئے۔

30 ایکڑ زمین کا واحد مالک نوردین خوش وخرم تھا لیکن مجھے اس گھر میں داخل ہوتے ہی زوردار جھٹکے محسوس ہوئے تھے گرم ہوا کے تھپیڑوں نے میری روح تک جلادی تھی..... اس خوبصورت مکینوں کے گھر میں کچھ نہ کچھ عجیب ضرور تھا..... ساحرہ بالکل نارمل تھی۔ اس کے چہرے پر ناگواری قطعی نہ تھی۔

میں ان لوگوں کی مہمان نوازی سے خاصا مرعوب ہوا..... شہروں میں خدمت داری اور مہمان نوازی کا رواج نہیں رہا میں خود بھی گاؤں سے تعلق رکھتا ہوں لیکن میرے گاؤں میں بھی ایسا کچھ نہیں۔ ..چائے بوتل اور وہ بھی از راہ مروت۔ ..لیکن نوردین نے ہماری خوب خدمت اور خاطر تواضع کی۔ نوردین بھاگ بھاگ کر ہماری آؤ بھگت میں لگا تھا.....

چاند کی روشنی نے نوردین کے آنگن میں نور اتار دیا تھا..... ہمارے بستر صحن کے وسط میں لگائے

گئے تھے۔۔۔۔ جبکہ ساحرہ کا بستر نوردین کی بیوی کے ساتھ لگا دیا گیا۔۔۔۔ نوردین کے میرے ساتھ تھا۔۔۔۔

"چاچا جس کے پیچھے بھاگ رہے تھے ۔۔۔۔ وہ تمہارا بیٹا تھا۔۔۔؟"

"ہاں بیٹا۔۔۔ وہ بہت شرارتی ہے پر مجھے بہت پیارا ہے۔۔۔"

"چاچا۔۔۔ تمہارے 4 بچے ہیں۔۔۔ تین بیٹے اور ایک بیٹی۔۔۔!"

"ہاں بیٹا۔ تینوں لڑکے اسکول میں پڑھتے ہیں اور لڑکی۔۔۔"

لڑکی کے نام پر وہ خاموش ہو گیا۔۔۔ چپ چاپ چاند کو تکتا رہا۔۔۔ وہ خاموش تھا لیکن اس کی آنکھیں بولتی تھیں۔۔۔ ایک غم تھا۔۔۔ کرب تھا اس کی آنکھوں میں۔ ایسا کرب جس کو وہ لفظوں سے بیان نہ کر سکتا تھا۔۔۔ لیکن پھر نجانے اسے کیا سوجھی کہ اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے گھر سے ملحق ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گیا اندر مکمل اندھیرا تھا۔ اس نے ٹارچ جلائی۔ سفید روشنی میں مجھے ایک وجود بکھرا ہوا سمٹا سمٹایا نظر آیا وہ ایک لڑکی تھی۔ زمین پر لیٹی وہ لڑکی 12 سے 14 سال کے درمیان رہی ہوگی اس کا چہرہ عجیب تھا۔۔۔ انسانی چہرہ لیکن کالا سیاہ۔۔۔ ایک لمحے کو میں اس کا چہرہ دیکھ کر سہم گیا۔ لڑکی بے ہوش تھی۔

نوردین کی آنکھوں میں نمی تھی۔

"صاحب جی۔۔۔ اس پر کالا جادو ہوا ہے پچھلے دو سالوں سے یہ اس مرض میں مبتلا ہے ہر جگہ چیک اپ کرایا ہے مگر ڈاکٹر لاعلاج قرار دے چکے ہیں۔" وہ بولا۔

"یہ کالا جادو۔۔۔؟ مطلب آپ کو کیسے پتہ۔۔۔ کسی سے کوئی دشمنی یا رشتہ وغیرہ کے تنازعات میں لڑکی کی زندگی اجیرن بنائی گئی ہے۔" میں نے پوچھا۔

"ایسا ہی سمجھ لیں جی۔ میرا بھائی خیر دین کالا عمل کرتا ہے اس نے اپنے بیٹے کے لئے رشتہ مانگا تھا لڑکا کردار کا گھٹیا اور نشہ باز تھا کوئی مناسب روزگار بھی نہیں تھا جوان لڑکی کو نشئی کے حوالے کیسے کرتا۔۔۔" نوردین بولا۔

اچانک ریڈ کارڈ پر Signal موصول ہوا۔

"اس لڑکی کا علاج نیم کے درخت کی چھال سے ہوگا اس پر کوئی جادو نہیں۔۔۔"

یہ کوئی خاص مسئلہ نہ تھا نوردین اور میں نے مل کر نیم کا پرانا درخت تلاش کیا۔۔۔ اور پھر اس لڑکی کا علاج ہو گیا۔

☆۔۔۔☆۔۔۔☆

اگلی صبح ہماری واپسی تھی تبھی مجھے ساحرہ نے فقیر علی شاہ کی وفات کا بتایا، اس معزز بزرگ کی وفات پر دل خوب رویا۔

پھر میں کافی عرصہ تک ساحرہ سے رابطہ میں رہا زندگی روشن پر آ گئی۔۔۔ میں نے ساحرہ سے اظہار محبت بھی کیا جس کا اس نے مکمل جواب تو نہ دیا البتہ اتنا ضرور کہا کہ وہ آئے گی۔

پھر ایک دن ریڈ کارڈ اچانک کہیں کھو گیا۔۔۔

میں نے اسے ہر جگہ تلاش کیا اسے نہ ملنا تھا اور نہ ملا۔

اس تمام ذکر کو کافی عرصہ بیت گیا ہے ساحرہ آج بھی روپوش ہے۔۔۔ نجانے کہاں گم ہے۔۔۔ میں آج بھی اس کے پیار میں مچلتا رہتا ہوں، وہ میرے ساتھ تھی تو زندگی خوبصورت اور اپنی سی لگتی تھی اس نے مجھے اپنا احساس دیا تھا۔۔۔

میری آنکھیں آج بھی اس کے انتظار میں تڑپ رہی ہیں، مجھے ہر آنکھ میں ساحرہ، ہر خواب میں ساحرہ نظر آتی ہے، محبت روگ ہے جاناں، عجب نجوگ ہے جاناں۔۔۔

وہ شہر تماشہ نے جہاں رقص اور ڈھول کی تھاپ پر عشق ناچتا ہے اور دل اس الو کے عشق کا تماشا دیکھتا ہے، یہ رقص جانے کب تک عشق کی تھاپ کو تماشہ رہے گا۔ اس کا جواب اگر آپ کے پاس ہے تو ضرور دیجئے گا۔

☠

سفاکی

عطیہ زاہرہ ۔ لاہور

آئس کریم کھاتے ہی خوبرو حسینہ بے ہوش ہوکر کرسی سے نیچے گر پڑی، اس کے بعد نوجوان اٹھا اور پھر اس کے اندر حیوانیت نے سر اٹھایا اس کی آنکھوں میں انگارے بھر گئے، اس نے حسینہ کا بڑی بے رحمی سے گلا گھونٹ دیا اور پھر ......

ایسا ایسے ہولناک اور خوفناک حالات واقعات جسے پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہوجائیں گے

"**سیریل** کلرز" یہ دو الفاظ دنیا بھر میں خوف، دہشت اور موت کی علامت مانے جاتے ہیں۔ دنیا بھر میں سیریل کلنگ کے واقعات پر ریسرچ کرنے والے یورپی اور امریکی ماہرین نفسیات نے ان مجرموں کی وارداتوں اور طریقہ ہائے وارداتوں کے بارے میں کئی لرزہ خیز حقائق سامنے لائے ہیں۔

اگر دیکھا جائے تو زیادہ تر سیریل کلرز بچپن کے کسی ناخوشگوار واقعہ یا محرومی کے باعث معاشرے سے بدلہ لینے کی نیت سے مجرم بن گئے۔ کچھ سیریل کلرز نے اپنے یا کسی قریبی عزیز کے ساتھ ہونے والے مجرمانہ فعل کی مزاحمت میں قتل کی ایک جیسی وارداتوں کا سلسلہ شروع کردیا۔ کئی افراد کو لالچ، ہوس، جنسی وارداتوں، نشے کی عادت نے سیریل کلر بنادیا۔ طاقت اور کنٹرول حاصل کرنے کے لئے بھی کئی سیریل کلرز نے کم عمر لڑکیوں اور لڑکوں کو قتل کرنے کے جنونی پن کا آغاز کیا۔ ان مجرموں کے نفسیاتی تجزیے سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ وہ سیریل کلنگ کے دوران بچوں اور عورتوں کو اس لئے قتل کرتے تھے کہ وہ کم سے کم مزاحمت کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ تمام سیریل کلرز بنیادی طور پر کسی نہ کسی نفسیاتی بیماری میں مبتلا رہے۔ بعض کسی حادثے کا شکار ہوکر نفسیاتی مریض بنے اور کچھ بچپن میں کسی زیادتی کا شکار ہوکر عمر بھر احساس کمتری میں مبتلا رہے۔ اکثر

سیریل کلرز تمام شکاروں کو قتل کرنے کے لئے ایک جیسا طریقہ استعمال کرتے رہے، کوئی صرف لڑکیوں کو تو کوئی صرف لڑکوں کو قتل کرتا رہا، کوئی خنجر سے تو کوئی پستول سے تمام قتل کرتا رہا۔ ان کے علاوہ چھرا، ہتھوڑا، کلہاڑا، تو کہ استعمال کرنے والے گروہ اور مجرم بھی کئی ملکوں میں خوف کی علامت بنے رہے۔

بعض خطرناک مجرم اذیت پسند ہونے کے باعث اپنے شکار کو تڑپتا ہوا دیکھ کر خوش ہوتے، کچھ نے شہرت حاصل کرنے کے لئے سینکڑوں افراد کی جان لی، کچھ لاشوں کو دفنا دیتے، کچھ جلا دیتے، کچھ ٹکڑے کرتے اور کچھ لاش کو لٹکا کر خوش ہوتے۔

امریکی ایف بی آئی کے مطابق 1800ء سے 2010ء تک امریکہ میں 422 سیریل کلرز زیادہ تر اپنے شوہروں، بوائے فرینڈز، بچوں اور بوڑھے افراد کے قتل میں ملوث پائی گئیں۔

Aileen Wuornos نے سات افراد کو باری باری گولی مار کر قتل کیا تھا۔ الزبتھ باتھوری نے اپنے خاوند کی موت کے بعد اپنے چار ساتھیوں کے ساتھ مل کر 80 خواتین اور لڑکیوں کو قتل کیا، Vera Renz ایک ایسی سیریل کلر تھی، جس نے 20 ویں صدی کے آغاز میں کئی مردوں کو عشق کے جال میں پھانس کر قتل کیا، امیر گھرانے میں پیدا ہونے والی ویرا نے کئی شادیاں کیں، جب اس کے گھر کی تلاشی لی گئی تو مختلف کمروں سے 32 نوجوانوں کی لاشیں برآمد ہوئیں، اس کو عمر قید کی سزا سنائی گئی، تاہم وہ قید کے دوران دماغ کی شریان پھٹنے سے ہلاک ہوئی۔

☆......☆......☆

یوں تو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں جنات بنائے، انسان بنائے دیگر مخلوقات خلق کیں، شیطان کو قیامت تک آزاد کر دیا اور انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ دیا، لیکن پھر بھی انسان بدی کے راستے پر چلتے ہوئے شیطان بن جاتا ہے۔

دنیا میں سیریل کلنگ کی تاریخ کافی پرانی ہے، رومن بادشاہ نیرو کی والدہ نے ایک شاطر عورت Locusta کو شاہی خاندان کے اہم افراد کو قتل کرنے کا کہا تو اس عورت نے شاہی خاندان کے کئی افراد کو زہر دے کر قتل کرنے کی وارداتوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ جب اس کی وارداتوں کا پردہ چاک ہوا تو اسے سزائے موت دے دی گئی۔

لیکن اس کے علاوہ پوری دنیا میں سیریل کلنگ کرنے والے لوگوں میں سے جو لوگ پہلے دس نمبر میں آتے ہیں، جن میں سے پہلے نمبر پر Gilles-de-Rais ہے۔

چائلڈ Killer میں اس لئے پہلے نمبر پر ہے کہ اسے سیریل کلرز کا باپ کہا جاتا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے قتل کئے ہوئے بچوں کی کم سے کم تعداد 80 سے 200 اور زیادہ سے زیادہ 600 ہے۔ اس کا تعلق فرانس کے شاہی خاندان سے تھا۔ Rais فوج میں کیپٹن بھی رہ چکا تھا۔ 1404ء میں پیدا ہونے والے اس نواب زادے کا طریقہ واردات یہ تھا کہ وہ کم عمر لڑکوں کو میٹھی اشیا کھلانے کے بہانے اپنے محل میں بلاتا اور خاص طور پر ان میں سے اس بچے کو پسند کرتا۔ جس کی نیلی آنکھیں اور سنہری بال ہوتے، پھر وہ اس کے ساتھ زیادتی کرتا اور اس کے بعد اس کے جسم کو خنجر سے کاٹ کر اس کے خون سے غسل کرتا اور خون کے اڑتے چھینٹوں کو دیکھ کر خوش ہوتا اور جب بچہ مکمل طور پر مر جاتا تو وہ رونے لگتا اور محل کے چرچ میں جا کر معافی مانگتا۔ اس دوران محل کے نوکر خون کے دھبے دھو دیتے اور لاش کو جلا دیتے تھے۔ Rais کی اس حیوانیت کی وجہ سے اس کو سیریل کلنگ کی ہسٹری میں پہلے نمبر پر رکھا گیا ہے۔

دوسرے نمبر پر اس لسٹ میں Richard Trenton ہے جو کہ 1950ء میں امریکہ میں پیدا ہوا، اس نے سب سے پہلے کیلی فورنیا میں چھ لوگوں کا قتل کیا۔ ان لوگوں کا قتل کرنے کے بعد ان کا خون پی لیا اور جسم کے مختلف حصے کاٹ کاٹ کر کھا لئے۔ اسی وجہ سے اسے Vampire (ڈریکولا) اور Connibal (آدم خور) کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ اس آدم خور کا طریقہ واردات یہ تھا کہ وہ اپنے شکار کو پھانس کر اپنے گھر پر لاتا، وہاں اسے زہریلا کھانا کھلا کر یا گولی مار کر ہلاک کر دیتا اور اس کے بعد لاش کی بے حرمتی کرتا رہتا، اس کا پہلا شکار

Ambrose Griffin نامی ایک 51 سالہ بوڑھا تھا۔جس کو اس نے 29 دسمبر 1977ء کو گولی مار کر ہلاک کیا تھا۔اس طرح اس نے اپنی ہمسائی جو کہ 38 سال کی تھی ،اس کو گولی مار کر قتل کر دیا اور اس کے بعد اس کی لاش کی توہین کرتا رہا۔

تیسرا نام جو کہ ڈر کی علامت بنا وہ "Jeffrey Dahmer" ہے۔وہ 1960ء میں پیدا ہوا۔اس نے کم از کم سترہ آدمیوں اور بچوں کو قتل کیا،اور یہ تمام قتل اس نے 1978ء سے لے کر 1991ء کے درمیان کیے۔اس میں سے زیادہ تر قتل 1989ء سے 1991ء کے درمیان کیے گئے۔وہ سب سے پہلے اپنے شکار کے ساتھ غیر فطری تعلق قائم کرتا اور پھر اس کے بعد ان کو قتل کر کے ان کے تمام جسمانی اعضاء کو کاٹ کاٹ کر علیحدہ کرتا جاتا اور پھر پوری رغبت سے ان اعضا کو کھاتا۔اس کے اس فعل کی وجہ سے اسے بھی آدم خور کے نام سے تاریخ میں یاد کیا جاتا ہے۔

جرم کی اس لائن میں Albert Fish چوتھے نمبر پر ہے۔اس کو "خونی بھیڑیے" کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔Fish پر 100 بچوں کے ساتھ زیادتی اور اس کے بعد ان کے قتل کا شبہ کیا گیا تھا۔جب اسے گرفتار کیا گیا تو اس نے کہا،کہ اس نے صرف تین بچوں کو قتل کیا ہے۔عدالت نے اس کو جسمانی ٹرائل پر بھیج دیا تو وہاں اس نے مزید دو لوگوں کے قتل کا اعتراف کیا۔اس میں ایک Grace Budd نامی لڑکا بھی شامل تھا۔جب اس لڑکے کی ماں Fish سے ملنے کے لئے قید خانے میں آئی تو Fish نے بڑے فخریہ انداز میں اسے ان الفاظ میں اس کے بیٹے کو مارنے کا اقرار کیا۔"میں نے اسے کس کر اپنی بیلٹ کے ساتھ باندھ دیا اور اس کے بعد 8,8 انچ کے حساب سے اس کے جسم پر زخم لگانے لگا،یہاں تک کہ اس کے پورے جسم سے خون بہہ کر اس کی ٹانگوں کی طرف آنے لگا،پھر میں نے اس کے کان،ناک اور منہ کا آدھا حصہ کاٹا،اس کے بعد اس کی آنکھیں نکال دیں،اس کے بعد وہ مر گیا،تو میں نے اپنا چاقو اس کے پیٹ میں گھما دیا، اور اپنا منہ اس کے پیٹ میں ڈال دیا......" Fish کے اس خوفناک اقرار کے بعد ہر طرف ڈر کی لہر پھیل گئی تھی۔لوگ اس سے نفرت کا اظہار کرتے تھے۔لیکن وہ اپنے کیے پر خوش تھا۔

پانچویں نمبر پر Andrei Chikatilo ہے جو کہ سابق سوویت یونین اور موجودہ روس کا باشندہ تھا۔اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے 56 خواتین اور بچوں کو قتل کیا۔اس نے ان افراد کو 1978ء سے 1990ء کے دوران قتل کیا۔مقامی افراد اسے قصائی بھی کہتے ہیں، بچپن میں اس کی والدہ کو فوجیوں نے زیادتی کا نشانہ بنایا تھا۔جس کے بعد اس کا ایک بھائی پیدا ہوا،آندرے جب بڑا ہوا،تو وہ اسکول ٹیچر بن گیا۔اس نے سب سے پہلے اپنی ایک چودہ سالہ طالبہ پر حملہ کیا۔ایسے ہی ایک حملے کے بعد اسے اسکول سے نکال دیا گیا۔یہاں سے نکلا تو اس نے یہ جرائم مسلسل شروع کر دیئے،ان جرائم کی پاداش میں پولیس نے ایک دوسرے شخص کو گرفتار کر لیا اور عدالت نے اسے سزائے موت دے دی۔1990ء میں روسی پولیس نے اسے گرفتار کر لیا،اور 1993ء میں اس جنونی قاتل کو سزائے موت دے کر معاشرے کو اس خونی سے نجات دلائی۔

چھٹا خونی اس قطار میں "Joachim Kroll" ہے جو کہ 1933ء میں جرمنی میں پیدا ہوا اسے جرمن آدم خور کہا جاتا ہے۔اس نے آٹھ لوگوں کو قتل کرنے کا اعتراف کیا،لیکن بعد میں اس نے مزید پانچ افراد کے قتل کا بھی اقرار کیا۔اس خونی کو 3 جون 1976ء میں پولیس نے ایک چار سالہ لڑکی کے اغوا اور قتل کے جرم میں گرفتار کیا۔اس لڑکی کا نام "Marion Ketter" تھا۔پولیس جب اس کو گھر گھر تلاش کرتی پھر رہی تھی،اور اس کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا تو ایک دن ایک شخص پولیس کے پاس آیا اور اس نے پولیس کو بتایا کہ وہ فلاں بلڈنگ میں Kroll کا ہمسایہ ہے۔

جہاں Kroll کا فلیٹ ہے۔اس نے بتایا کہ ایک دن Kroll لکڑی کی مدد سے بلڈنگ کے بڑے نکاسی پائپ کو کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔جو کہ کافی دنوں سے بند تھا،اور

جب اس نے لکڑی کی مدد سے پائپ نالے میں سے کھینچ کر نکال لیا تو میں نے اس سے پوچھا۔ یہ کیا ہے؟ تو اس نے بڑی سادگی کے ساتھ جواب دیا۔ (Guts) "انتڑیاں"

ساتویں نمبر پر ایسے سیریل کلرز کا نام لیا جاتا ہے جو کہ امریکن تھا۔ اس کا نام "Dennis Rader" تھا۔ لیکن اسے "BTK Killer" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ وہ اپنے شکار کو اذیت دے دے کر مارتا تھا۔ اور خود اس کی اذیت سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ اس نے اپنی زیادہ تر وارداتیں 1974ء سے 1991ء کے درمیان میں کیں۔

آٹھویں نمبر پر ایک ایسے جنونی کو رکھا گیا ہے جو کہ Acid Both Murder مشہور ہے۔ وہ انگلینڈ کا رہائشی تھا۔ اس کا عہد 24 جولائی 1909ء سے 10 اگست 1949ء تک ہے۔ اس کی وارداتوں کا سلسلہ جب چاک ہوا تو اس نے اعتراف کیا کہ اس نے چھ قتل کئے ہیں۔ لیکن پولیس کو شک تھا کہ اس نے اس سے کئی گناہ زیادہ لوگوں کا قتل کیا ہے۔ لیکن اس شبے کے باوجود ثبوت اکٹھے کرنے والے ادارے کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، کیونکہ وہ اپنے شکار کو تیزاب سے نہلاتا تھا۔ جس سے ان کا نام و نشان تک باقی نہیں رہتا تھا۔

نویں نمبر پر جاوید اقبال جس کا تعلق پاکستان کے صوبہ پنجاب سے ہے۔ جاوید اقبال 8 اکتوبر 1956ء کو لاہور کے ایک تاجر کے گھرانے میں پیدا ہوا، تین بھائیوں اور دو بہنوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ اس نے اسلامیہ ہائی اسکول سے میٹرک کیا۔ وہ شہرت کا شیدائی تھا اور شہرت حاصل کرنے کے لئے وہ اکثر کوئی نہ کوئی طریقہ اختیار کرتا رہتا تھا۔ اس نے خود اپنے ایک انٹرویو میں بتایا ہے کہ اسے گھر سے بھاگے ہوئے دو لڑکوں نے تشدد کر کے قتل کرنے کی کوشش کی تاہم وہ بچ گیا۔ بعض ماہرین نفسیات کے مطابق اس کے سر پر لگنے والی چوٹوں سے وہ کچھ حد تک نفسیاتی مریض بن گیا تھا۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ لاہور کے علاقے شاد باغ میں، اسے ایک لڑکے سے زیادتی کرنے پر لوگوں نے پیٹا بھی تھا۔ جاوید اقبال نے 1999ء میں پولیس اور ایک اخبار کے ایڈیٹر کو خط لکھا کہ اس نے 100 آوارہ اور یتیم بچوں کو قتل کر دیا ہے۔ پولیس اس کو تلاش کر رہی تھی کہ اس دوران اس نے مقامی اخبار کے دفتر جا کر پولیس کو اپنی گرفتاری دے دی۔

جاوید اقبال کی رہائشی جگہ سے ایک ڈائری بھی ملی۔ جس پر ایک سو بچوں کے نام اور پتے لکھنے کے علاوہ ان کے جوتے، کپڑے اور تصاویر بھی پلاسٹک بیگ میں محفوظ تھیں۔ اس نے بتایا کہ "اس نے ان تمام بچوں کو قتل کر کے ان کے جسموں کے ٹکڑے تیزاب میں ڈال کر ختم کر دیے ہیں۔"

پولیس کو اس کے گھر سے خون کے دھبے اور ڈرموں میں تیزاب کے اندر انسانی جسموں کے ٹکڑے بھی ملے۔ عدالت نے جاوید اقبال کو سزائے موت سنائی۔ تاہم اپنی سالگرہ والے دن 18 اکتوبر 2001ء کو وہ اور اس کے ساتھ جرائم میں ساتھ رہنے والا احمد مردہ پائے گئے۔ پولیس کے مطابق ان دونوں نے خودکشی کر لی تھی تاہم اہم ذرائع کے مطابق پولیس نے ان دونوں کو خود پھندے پر لٹکا کر ہمیشہ کے لئے اس کے جرائم کی کہانی کا خاتمہ کر دیا تھا۔ جاوید اقبال کو لاہور کی کورٹ لکھپت جیل کے احاطے میں دفن کر دیا گیا۔

دسویں نمبر پر Heodore Robert کا نام لیا جاتا ہے۔ جو کہ U.S کی تاریخ میں آج بھی اپنی سیریل کلنگ کی وجہ سے دہشت کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ وہ بہت ہی خوبرو نوجوان تھا۔ وہ اپنے حسن سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لڑکیوں سے فلرٹ کرتا اور پھر انہیں بہلا پھسلا کر اپنے ٹھکانے پر لے جا کر قتل کر دیتا۔ اس نے تیس سے زائد جوان عورتوں کو قتل کیا۔ اس کا یہ دور 1974ء سے 1978ء تک کا ہے اور اس دوران وہ پورے ملک کے لئے ڈر کی علامت بن گیا تھا۔

☆......☆......☆

یہ تو وہ دس سیریل کلرز تھے۔ جو اپنی دہشت، اپنی سفاکی کی وجہ سے کرائم لیسٹ میں Top ten evil Serial Killer کہلاتے ہیں۔ اس کے لئے اگر

ہم مزید دیکھیں تو قرون وسطیٰ کے دور میں برطانیہ، جرمنی، ہنگری، اٹلی میں بھی سیریل کلنگ کرنے والے مجرموں کا ریکارڈ ملتا ہے اور 1820ء میں آئرش علاقے کے ولیم بورک اور ولیم ہیئر نے اسکاٹ لینڈ کے پندرہ افراد کو ایک ہی طریقے سے باری باری قتل کرکے لوگوں کو خوفزدہ کردیا۔ 1888ء میں جیک دی لاپر نے پانچ خواتین کو باری باری چاقو کے وار کرکے قتل کرکے سیریل کلنگ کو نہایت پراسرار اور خوفناک رنگ دیا۔ اس کے بعد یورپ اور امریکہ میں کئی سیریل کلرز سامنے آتے رہے۔

ہندوستان میں بھی ٹھگوں کے گروہ دو تین صدیوں تک سیریل کلنگ کی وارداتوں میں اپنی پگڑی یا رومال سے گلا گھونٹ کر ہزاروں افراد کو قتل کرچکے ہیں۔ ایک رپورٹ کے مطابق ٹھگوں کے گروہوں نے 15ویں سے 19ویں صدی تک پچاس ہزار سے دو لاکھ افراد کو گلا گھونٹ کر قتل کیا۔ ٹھگوں کے ایک معروف لیڈر بہرام ٹھگ نے تسلیم کیا تھا کہ اس نے 1890ء سے 1930ء کے دوران اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر 931 افراد کو مارا اور ان کا سامان لوٹ لیا، بہرام ٹھگ نے بتایا کہ اس نے 125 مسافروں کو اپنے ہاتھوں سے قتل کرکے لوٹا تھا۔ اس کے بعد انگریز فوج نے ان ٹھگوں کا ہندوستان سے خاتمہ کردیا۔

سیریل کلرز کا تاریخی حوالے سے ذکر کیا جائے۔ تو یہ طویل داستان ہے۔ لیکن ان میں ایسے بھی ہیں۔ جن کا نام لے کر آج بھی دوسرے کو خوفزدہ کیا جاتا ہے۔ ہم یہاں ایسی خوف کی علامتوں کا ذکر کررہے ہیں جو آج بھی دہشت زدہ کررہے ہیں۔

ایکواڈور اور کولمبیا میں 150 سے زائد بچوں کو قتل کرنے والا Daniel Camargo بھی 70 اور 80 کی دہائی کا ایک خطرناک جنونی قاتل تھا۔ وہ بارہ سالوں میں ڈیڑھ سو بچوں کو قتل کرکے "چائلڈ مرڈر" کے نام سے جانا گیا۔ 1936ء میں پیدا ہونے والا ڈینئل کی والدہ بچپن میں مرگئی تو اس کے والد نے دوسری شادی کرلی۔ سوتیلی والدہ اس سے شدید نفرت کرتی تھی، وہ اسے اکثر مارتی اور تذلیل کرنے کے لئے اسے لڑکیوں کا لباس پہنا کر سب کے سامنے کھڑا کردیتی، سوتیلی والدہ کے برے سلوک نے اسے عورتوں کا دشمن بنادیا۔ اس نے بڑا ہوکر اپنی سوتیلی ماں کے مظالم کا غصہ کم عمر بچیوں پر نکالنا شروع کردیا۔ اس دوران اسے ایک اٹھائیس سالہ خاتون Esperanza سے محبت ہوگئی۔ ان دونوں میں معاہدہ ہوگیا کہ ایسپرنزا اسے کم سن لڑکیاں لا کر دے گی۔ جس کے بدلے وہ اپنی محبوبہ کو گفٹ میں رقم دے سکا۔ ان دونوں کو چند لڑکیوں کے قتل کے بعد گرفتار کرکے جیل بھیج دیا گیا۔

اپنی چالاکی کی وجہ سے ڈینئل جیل سے بھاگنے میں کامیاب ہوگیا۔ وہ کولمبیا سے فرار ہوکر ایکواڈور چلا گیا۔ جہاں اسے کوئی نہیں جانتا تھا، یوں اس نے نئے سرے سے بچیوں کو اغوا کرکے قتل کرنا شروع کردیا۔ 1989ء میں وہ دوبارہ گرفتار ہوا، اس نے ڈیڑھ سو لڑکیوں کے قتل کا اعتراف کیا۔ تاہم 72 وارداتوں کے ثابت ہونے پر اسے سزا دی گئی، جیل میں قید کے دوران اس جنونی قاتل کو اس کے ہاتھوں قتل ہونے والی ایک لڑکی کے کزن نے نومبر 1994ء میں اس کو قتل کرکے اس کے جرائم کی کتاب ہمیشہ کے لئے بند کردی۔

مسلمان ممالک میں سے دیکھا جائے تو انڈونیشیا میں احمد سوراجی نے جادوئی طاقت حاصل کرنے کے لئے نوجوان لڑکیوں اور خواتین کو قتل کرنے کے سلسلے کا آغاز کیا۔ وہ اپنے شکار کا خون خود کو طاقتور بنانے کے لئے استعمال کرتا تھا۔ جب اسے گرفتار کیا گیا تو اس نے 80 سے زائد لڑکیوں کے قتل کا اعتراف کیا۔ پولیس ان میں سے 48 لڑکیوں کا ریکارڈ تلاش کرنے میں کامیاب ہوسکی۔ اسے سزائے موت سنائی گئی، 11 جولائی 2008ء کو احمد سوراجی کو فائرنگ اسکواڈ کے سامنے پیش کردیا گیا۔

پاکستان میں بھی کئی خطرناک سیریل کلرز نے سینکڑوں افراد کو قتل کیا۔ پاکستان میں ہتھوڑا گروپ اور چھر گروپ کے نام سے وارداتیں کرنے والے مجرموں نے بھی بے شمار افراد کو موت کی نیند سلاکر شہریوں کو خوفزدہ کئے رکھا۔

فیوچر

رفعت محمود۔ پنڈ ملھو راولپنڈی

اچانک جن کی آواز سنائی دی۔ "گھبرانے کی ضرورت نہیں میں عامل صاحب کا خادم ہوں، میں اب ہمیشہ محافظ بن کر تمہارے ساتھ رہوں گا، تمہارے جائز کام کروں گا، ناجائز کاموں کی مجھ سے توقع مت رکھنا۔"

ایک عجیب و غریب شاخسانہ جو کہ پڑھنے والوں کو ضرور حیرت میں ڈال دے گا۔ سبق آموز کہانی

"**شاہ بابا** یہ میری سہیلی فرزانہ ہے۔" ریحانہ نے تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"شاہ بابا ان کا ہاتھ غور سے دیکھیے اور ان کے فیوچر کے بارے میں بتائیں کہ کیسا ہوگا؟" شاہ بابا نے بڑی عجیب نظروں سے فرزانہ کی طرف دیکھا جیسے وہ کوئی خاص چیز ہو۔

"ادھر آ کر بیٹھیے۔" شاہ بابا نے اپنے تخت کے پاس پڑی ہوئی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

فرزانہ سہمی ہوئی کرسی پر آ کر بیٹھ گئی۔ یہ اس کی زندگی کا پہلا تجربہ تھا۔ اس لئے اس کا معصوم دل نامعلوم خوف کی لہروں میں ہچکولے کھا رہا تھا۔ وہ شاہ بابا کی نگاہوں کا مفہوم سمجھنے سے قاصر تھی۔

"ہاتھ دکھایئے۔" یہ کہہ کر شاہ بابا نے اس کے خیالات کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا۔

فرزانہ نے اپنا خوب صورت ہاتھ شاہ بابا کی طرف بڑھا دیا۔ "آپ بہت ذہین اور اچھے خیالات کی مالک ہیں

اور ہاں بہت جلد آپ کی شادی ہونے والی ہے۔"

تھوڑی دیر بعد غور سے ہاتھ کی لکیروں کو دیکھنے کے بعد شاہ بابا نے اپنے ہاتھ کی گرفت کو ڈھیلا کرتے ہوئے کہا۔

شاہ بابا کی اس بات سے فرزانہ غصہ میں آ گئی اور بے ساختہ بول اٹھی۔ "لیکن شاہ بابا میں تو پڑھائی کے بارے میں پوچھنے آئی تھی اور آپ تو کچھ اور ہی بتا رہے ہیں۔"

"ہاں..... ہاں سب لڑکیاں ایسا ہی کہتی ہیں۔ لیکن میں صرف پامسٹ ہی نہیں بلکہ ماہر نفسیات بھی ہوں۔" شاہ بابا نے فرزانہ کو مرعوب کرنے کی کوشش کی۔ "آپ اگر سب کچھ معلوم کرنا چاہتی ہیں تو کسی قسم کی شرم محسوس نہ کریں۔"

"عجیب طرح کا انسان ہے۔" فرزانہ دل ہی دل میں جھنجلا اٹھی۔ "پوچھو کچھ اور جواب کچھ اور دیتا ہے۔" اس نے غصہ سے ریحانہ کو گھورا جو اسے اس پیچھے ہوئے شاہ بابا کے پاس لے کر آئی تھی۔

"آپ ماہر نفسیات ہیں یا کچھ اور۔ لیکن میں یہ ضرور کہوں گی کہ میرے بارے میں آپ کا خیال بالکل غلط ہے۔ میں نے اس سال۔ ایم ایس سی کا امتحان دیا ہے، میں اپنی کامیابی کے متعلق پوچھنا چاہتی ہوں۔" فرزانہ نے برہم ہوتے ہوئے کہا۔

"ارے واہ۔" شاہ بابا نے ہنس کر کہا۔ "آپ تو ایک دم ہی ناراض ہو گئیں، آپ جو کچھ پوچھنا چاہتی ہیں۔ وہ بھی بتائے دیتا ہوں۔"

"شکریہ۔" فرزانہ نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"اچھا ریحانہ تم اپنی سناؤ، کیسے گزر رہی ہے۔" شاہ بابا نے بات کا رخ بدلتے ہوئے پوچھا۔

"کیا بتاؤں شاہ بابا۔" ریحانہ نے افسردگی سے کہا۔

"میں بہت پریشان ہوں۔"

"کیوں تمہارے شوہر کی تمہارے ساتھ بدتمیزی اب بھی جو پہلے تھی ویسے ہی ہے۔"

"اس میں تو ذرا برابر فرق نہیں آیا بلکہ روز بروز اضافہ ہی ہوا ہے ان کے ہر روز طعنے تو میرے لئے وبال جان بنتے جا رہے ہیں۔ جو تعویذ آپ نے دیا تھا اس نے بھی ابھی تک اپنا کوئی اثر نہیں دکھایا۔"

"تعویذ کا عمل تو اکیس دن بعد شروع ہوگا۔" شاہ بابا نے بات بتاتے ہوئے کہا۔

"لیکن شاہ بابا اس روز تو آپ نے چودہ دن کا کہا تھا۔" ریحانہ نے یاد دہانی کروائی۔

"ہاں لیکن بعض سخت طبیعتیں اثر قبول کرنے میں زیادہ وقت لیتی ہیں۔" وہ ایک ہلکی سی ہنسی ہنس کر بولے۔

"شاہ بابا اکیس دن بھی گزر جائیں گے۔" ریحانہ نے مایوسی سے کہا۔

"لیکن یہ تو بتاؤ اضافہ کیا ہوا ہے ممکن ہے کوئی دوسرا تعویذ ہی دینا پڑے۔"

"ایک بات ہو تو بتاؤں بھی۔ میں تو ان کی ایک ایک حرکت پر کڑھتی ہوں۔ کہیں جانا ہو تو گھنٹوں گالیوں کی بوچھاڑ ہوتی ہے۔ کسی ایک بات پر ٹھہرتے ہی نہیں ہیں۔ بات بات پر بدلتے رہتے ہیں، دفتر سے آئیں گے تو پلنگ پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں گے۔ میں بار بار کہتی رہتی ہوں۔

وسیم کھانا تیار ہے۔ اٹھیے اور کھا لیجئے۔ لیکن وہ کوئی جواب نہیں دیتے۔

وہ یہ چاہتے ہیں کہ میں ایک فرمانبردار بیوی بن کر رہوں وہ جو حکم دیں فوراً مان لوں، اگر کبھی میری نند سے لڑائی ہو جائے تو خواہ مخواہ شور مچانا شروع کر دیتے ہیں، طعنے تو انہیں ایسے ایسے یاد ہیں کہ کوئی ساس بھی نہ دے سکے اب تو یہ شور بھی ہونے لگا ہے کہ میں انہیں گاڑی پر دفتر چھوڑ کر آیا کروں اس طرح ڈرائیور کا پیسہ بچ جائے گا۔ کفایت شعاری میں وہ عورتوں سے بھی ماہر ہیں۔

اگر گھر میں کوئی برتن ٹوٹ جائے تو قیامت ہی آ جاتی ہے۔ ان کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ میں اپنے والدین کی دولت سے انہیں عیش کرواؤں۔ جب بازار جاؤں تو ان کے لئے کوئی نہ کوئی گفٹ خرید کر ضرور لاؤں۔ اور جب انہیں پسند نہ آئے تو ہاتھ جوڑ کر معافی مانگوں۔

اب آپ ہی بتائیے شاہ بابا جب وہ سب کچھ جو میں لے کر آتی ہوں تو انہیں ناپسند ہوتا ہے۔ ایسے مرد کے بارے میں آپ ہی مجھے بتائیے کہ میں کیا کہوں۔ ہوتا تو یہ

چاہئے تھا کہ وہ میرے ناز اٹھاتے لیکن وہ تو اپنے ہی بارے میں سوچتے ہیں میری پسند ناپسند کی ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہے۔"

"ریحانہ" شاہ بابا نے اس کی باتوں سے متاثر ہو کر کہا۔ "یہ سب بدلتے ہوئے حالات کا اثر ہے۔ تم نے بھی اس چیز کو نوٹ کیا ہے کہ آج کل مردوں میں نسوانیت بڑی تیزی سے سرایت کر رہی ہے اور یہی وہ مہلک مرض ہے جو کسی وقت بھی قوم کی تباہی کا باعث بن سکتا ہے۔"

"شاہ بابا نسوانیت کی بھی آپ نے ایک خوب بات کہی مجھے تو وسیم نے اس روز حیرت میں ڈال دیا تھا جس روز میری بچی گڑیا کی سالگرہ تھی۔ ہم نے مہمانوں کو ایک بڑے ہوٹل میں دعوت کے لئے بلایا تھا اور ایک ڈرامہ اسٹیج پر کرنے کے لئے فنکاروں کو بلایا تھا۔

جب ڈرامہ شروع ہوا تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ وسیم ایک خوب صورت دوشیزہ کا پارٹ بڑی کامیابی سے ادا کر رہے تھے۔ اور جب انہوں نے ڈسکو کی دھن پر ڈانس کیا تو مارے شرم کے میں زمین میں گڑی جا رہی تھی۔

لیکن میری تمام سہیلیاں قسمت پر رشک کر رہی تھیں اور میری خوش قسمتی پر مبارکباد دے رہی تھیں کہ مجھے ایک ایسا شوہر ملا جو ایک ڈانسر بھی ہے۔"

"میرے خیال میں ماحول کی تبدیلی کا اثر اعصاب پر بھی ہوتا ہے۔ آپ نے بھی ایسی بہت سی خبریں پڑھی ہوں گی اور اب تو سنا ہے کہ سائنس کے اس دور میں امریکہ میں ایک ایسی مشین ایجاد ہونے والی ہے جو مردوں کو عورتیں اور عورتیں کو مرد بنانے کی طاقت رکھتی ہوگی۔ لیکن میرے خیال میں تو ایسی مشینری کی ایجاد پر غور کرنا بے سود ہے۔" شاہ بابا نے معنی خیز مسکراہٹ سے کہا۔ "یہ چیز تو مستقبل قریب میں خود بخود ہونے لگے گی، ابھی پچھلے دنوں میں نے ایک اخبار میں پڑھا تھا کہ ایک مقامی کالج کی لڑکی لڑکا بن گئی ہے اور چالیس سال بعد تو پتا نہیں کیا ہو جائے گا۔ ویسے بھی یہ آخرت کی نشانیاں ہیں۔

ہم قرآن مجید کے احکام کی پیروی نہیں کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں قرآن مجید کو پڑھ کر اس سے رہنمائی

حاصل کرنے کو کہا ہے۔ ہم مسلمان دین سے دن بدن دور ہو رہے ہیں۔

فرقہ واریت عروج پر ہے۔ شیطان ہم پر حاوی ہو رہا ہے، ہم میں برداشت کا مادہ ختم ہو رہا ہے۔ اس مادہ پرستی کے دور میں کوئی کسی کا نہیں ہے سب پیسہ پیسہ کر رہے ہیں، حالانکہ یہ پیسے تو یہیں ہی رہ جائے گا، صرف انسان کے عمل ہی آخرت میں کام آئیں گے، دنیا ایک فریب ہے، جو تم نے پہن لیا اور کھالیا وہی تمہارا اپنا ہے باقی تمہارا کچھ بھی نہیں ہے، یہ دنیا ایک مقام فنا ہے۔ قیامت کی یہ سب نشانیاں نہیں ہیں تو اور کیا ہے۔"

"ایسا وقت آنے سے پہلے خدا ہمیں تو اس دنیا سے اٹھالے۔" ریحانہ نے افسردگی سے کہا۔

ایک کونے میں بیٹھی ہوئی فرزانہ، ریحانہ کی بے نقاب زندگی پر غور کر رہی تھی۔ نجانے کتنے مسکراتے ہوئے چہرے اس کی بے بسی کا مذاق اڑا رہے تھے۔ ہر آنکھ اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

"اچھا شاہ بابا اب میں چلتی ہوں۔ پھر کبھی آؤں گی۔" ریحانہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ارے کچھ دیر تو بیٹھو۔" شاہ بابا نے مسکرا کر کہا۔ "اور ہاں یہ تعویذ فرزانہ کو دے دو اللہ کے فضل و کرم سے امتحان میں یہ ضرور کامیاب ہوگی۔"

ریحانہ اور فرزانہ وہ کراماتی تعویذ لے کر گھر آگئیں، فرزانہ نے اس تعویذ کو بازو پر رکھ لیا وہ جمعرات کی پہلی تاریخ تھی۔

رات کے تین بجے اچانک اس کی آنکھ کھل گئی، کمرے کا ماحول بدلا ہوا تھا۔ کمرے میں خوشبو ہی خوشبو رچی ہوئی تھی ایک کونے میں ایک لمبا تڑنگا زرق برق شہزادوں کے لباس میں ملبوس انسان کھڑا تھا۔

"ک...... کون ہو تم؟" فرزانہ نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

"گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ میں شاہ بابا کا خادم ہوں، مجھے شاہ جنات کہتے ہیں۔ میں اب ہمیشہ محافظ بن کر تمہارے ساتھ رہوں گا۔ تمہارے جائز کام کروں گا۔ ناجائز کاموں کی مجھ سے توقع مت رکھنا۔"

"مگر مجھے تو کوئی کام نہیں کروانا۔" میں حوصلے سے بولی۔

"لیکن مجھے نگرانی کرنی ہے، اور ہاں سات دن بعد تمہارا رزلٹ آرہا ہے۔ تمہیں ایک بڑی خوشی ملنے والی ہے۔" یہ کہہ کر وہ جن غائب ہوگیا۔

سات دن بعد جب رزلٹ آیا تو میں صوبے بھر میں اول پوزیشن لے کر کامیاب ہوئی تھی۔ میری خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی، پاؤں زمین پر نہ ٹک رہے تھے۔ اپنے پرائے سب رشتہ دار مجھے مبارکباد دے رہے تھے، امی ابو نے پارٹی کا اہتمام کروایا، پارٹی میں شاہ بابا بھی آئے اور انہوں نے میری کامیابی پر مبارکباد دی۔

یوں ہی وقت اپنی مخصوص رفتار سے چلتا رہا۔ میں جس کام میں ہاتھ ڈالتی کامیاب ہو کر نکلتی۔ مجھے ایسا لگتا جیسے کوئی غیبی قوت میری مدد کر رہی ہو۔ اس روز میں شاہ بابا سے ملی تو انہیں سب کچھ بتایا۔

"فرزانہ" وہ دھیرے سے بولے "ان غیبی چیزوں کا ذکر کسی سے نہیں کرتے۔ بس خاموش رہتے ہیں۔"

میں شاہ بابا کی بات سن کر خاموش ہوگئی، ان ہی باتوں میں ایک سال کا عرصہ گزر گیا۔ مجھے شاہ بابا نے اپنے موکل کے ذریعے اپنی گرفت میں جکڑ لیا اور پھر نہ چاہتے ہوئے بھی میری اور شاہ بابا کی شادی ہوگئی۔

شادی کیا تھی، یہ میں ہی جانتی ہوں ان کی عمر اور میری عمر میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ مگر انہوں نے شادی کے بعد مجھے کسی چیز کی کمی کا احساس نہیں ہونے دیا۔

آج ان واقعات کو گزرے کئی سال ہو چکے ہیں۔ میرے چار بچے ہیں، میں اپنے بچوں کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی کے دن گزار رہی ہوں۔

شاہ بابا فوت ہو چکے ہیں ان کے مرید اب بھی میرے پاس آتے ہیں اور شاہ بابا کی یادوں کو تازہ کرتے ہیں۔

پراسرار بستی

عامر ملک۔ راولپنڈی

تیز دوڑتی پولیس کی گاڑی کو اچانک حادثہ پیش آیا، وہ الٹ گئی اس میں سوار سارے پولیس والے زخمی ہوگئے مگر گاڑی میں سوار مجرم ہتھکڑی سمیت غائب تھا لیکن پھر اچانک ایک دل دہلاتا منظر رونما ہوا.....

لفظ لفظ سطر سطر حقیقت سے آشکار کرتی، دل کو منور کرتی اپنی نوعیت کی اچھوتی کہانی

میرے گاؤں کی مسجد اکثر ویران ہی رہتی تھی۔ جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ گاؤں کے ننانوے فیصد لوگ جاہل اور ان پڑھ تھے جس وجہ سے وہ آپس میں بھی اتفاق سے نہ رہتے تھے۔ لڑائی جھگڑے آئے دن کا معمول تھا۔ اس لئے گاؤں میں دو گروپ بن گئے تھے۔ جس وجہ سے گاؤں کی مسجد میں کسی امام کو نہ ٹھہرنے دیتے تھے۔ امام صاحب جس پارٹی کو پسند نہ آتے وہ ان کی مخالفت شروع کر دیتے۔ بالآخر امام صاحب ان جھگڑوں سے جان بچا کر چلے جاتے۔ یہی وجہ تھی کہ مسجد اکثر ویران ہی رہتی۔ امام مسجد کی غیر موجودگی میں کوئی اذان بھی نہ دیتا۔ کوئی اکا دکا آدمی مسجد میں اکیلے ہی نماز پڑھ لیتا۔

میں جب چودہ سال کا ہوا تو میں مسجد میں چلا جاتا اور اذان دینی شروع کر دیتا۔ اور پھر اکیلے ہی نماز پڑھ کر لوٹ آتا۔ ہمارے گاؤں سے تین میل کے فاصلے

پر ایک گاؤں سنجر پور تھا۔ جہاں پر لڑکوں کا اسکول تھا۔ میں اکیلا ہی اپنے گاؤں سے سنجر پور پڑھنے کے لئے جاتا تھا۔ مجھے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ ہمارے اسکول کے دینیات کے استاد مولوی شفیق صاحب مجھے بہت اچھے لگتے تھے۔ دین کی باتیں میں نے ان ہی سے سیکھی تھیں۔ اسی لئے مجھے مسجد جانے اذان دینے اور نماز پڑھنے کا شوق زیادہ ہی ہو گیا تھا۔

ابا جان فوج میں حوالدار تھے۔ جب وہ ریٹائر ہو کر گاؤں آئے تو انہوں نے زمینداری شروع کر دی۔ ابا جان پکے نمازی اور پرہیزگار انسان تھے۔ ان کا گاؤں میں کسی پارٹی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ مسجد کی ویرانی دیکھ کر وہ بہت ہی رنجیدہ سے ہو گئے۔ لہٰذا انہوں نے امام مسجد کی تلاش شروع کر دی۔ وہ کسی ایسے پختہ ایمان والے امام مسجد کو لانا چاہتے تھے۔ جو گاؤں والوں کے جھگڑوں میں نہ پڑے۔ بلکہ لوگوں میں اتفاق پیدا کرے۔ اور ان کو دینی تعلیم دے کر مسجد میں آنے اور باقاعدگی سے نماز پڑھنے کی ترغیب دے اور لوگوں کے دلوں کی کدورتیں ختم کرے۔ اور اس گاؤں کا ماحول تبدیل کر دے۔

بالآخر ابا جان ایک ایسے ہی امام مسجد کو لانے میں کامیاب ہو گئے۔ مولوی امیر افضل صاحب کی شخصیت ہی بہت رعب دار تھی۔ کالی ریشمی داڑھی اور نورانی چہرہ ان کی شرافت اور قابلیت کی گواہی دے رہے تھے۔ وہ شادی شدہ اور بال بچے دار تھے۔ وہ کسی دور کے گاؤں کے رہنے والے تھے اور کبھی کبھار بچوں سے ملنے جاتے رہتے تھے۔ ان کی رہائش اور کھانے پینے کا خرچ بھی ابا جان نے اپنے ذمہ لے لیا تھا۔ اس لئے اس گاؤں کے کسی فرد یا گروپ نے ان پر اعتراض نہ کیا۔ امام صاحب کے آ جانے سے مسجد کی رونقیں لوٹ آ گئیں۔ اب پانچوں وقت اذان ہوتی اور باجماعت نماز بھی ادا کی جاتی۔

آہستہ آہستہ نمازیوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ روزانہ صبح کی نماز کے بعد امام صاحب درس قرآن دیتے اور نماز پڑھنے کے ساتھ ساتھ اللہ کے احکام کی پابندی کرنے کی بھی تاکید کرتے۔ مجھے مولوی امیر افضل صاحب بہت ہی اچھے لگتے تھے اور وہ بھی مجھ سے اس لئے بہت پیار کرتے تھے کہ میں نماز باقاعدگی سے پڑھتا تھا۔ ان سے روزانہ سپارہ بھی پڑھتا تھا۔ جبکہ گاؤں کا اور کوئی میرا ہم عمر لڑکا نماز پڑھنے کے لئے مسجد نہ آتا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں ان کے پاس بیٹھا رہوں اور ان کی میٹھی میٹھی باتیں سنتا رہوں۔ گاؤں کے لوگ آہستہ آہستہ ان کے اعلیٰ کردار کے گرویدہ ہو گئے۔ اور ان کی بات ماننے لگے۔ مگر گاؤں کا ایک خاندان جو نمبردار کا خاندان تھا۔ اس گھر کا کوئی بھی فرد مسجد میں نماز پڑھنے نہ آتا تھا۔

نمبردار فتح خان کو اپنی دولت اور بہت بڑی جائیداد کا غرور تھا۔ اس لئے وہ کسی کی پرواہ نہ کرتا تھا۔ وہ سارا خاندان ہی دین اور نماز روزے سے کوسوں دور تھا۔ اس لئے وہ امام صاحب کو کوئی اہمیت نہ دیتے تھے اور اکثر وہ ان کے خلاف باتیں کرتے رہتے تھے۔ جس کی امام صاحب کو کوئی پرواہ نہ تھی۔ وہ لوگوں کی زبانی فتح خان کے خاندان کے کسی فرد کی اپنی ذات کے بارے میں کوئی حق بات بھی سنتے تو بھی کہتے کہ ”اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت نصیب فرمائے۔“

خیر چند ماہ وہ ہمارے ہی گھر میں ٹھہرے اس کے بعد گاؤں والوں نے مسجد کے ساتھ ان کی رہائش کے لئے ایک کمرہ بنا دیا تو امام صاحب اس میں چلے گئے پھر بھی ان کا کھانا ہمارے ہی گھر سے جاتا تھا۔ میں ان کو کھانا پہنچانے کی ڈیوٹی بڑی خوشی سے انجام دیتا تھا۔ کبھی کبھار وہ ہمارے گھر آ کر کھانا کھا لیتے۔ امام صاحب دم درود بھی کرتے تھے۔ گاؤں میں کسی چھوٹے بچے کو کوئی تکلیف ہو جاتی تو وہ امام صاحب کے پاس لے جاتے۔ وہ دم ڈالتے اور تعویذ دیتے تو بچوں کی تکلیف دور ہو جاتی۔ ان کے دم میں شفا تھی۔ آہستہ آہستہ گاؤں کے دیگر لوگ بھی ان سے دم کروانے اور تعویذ لینے کے لئے آنے لگے یوں ان کا وقار اور عزت بڑھ گئی اور لوگ ان کا کچھ زیادہ ہی احترام کرنے لگے۔ امام صاحب سادگی اور شرافت کا نمونہ تھے۔ میری یہ کوشش اور خواہش بن گئی کہ میں ان کے نقش قدم پر چل کر ان جیسا ہی بن جاؤں۔ ان کی زبان۔ قرأت اور اذان

دینے کے انداز میں ایک مٹھاس، تاثیر اور کشش تھی۔

وہ گرمیوں کے دن اور راتیں تھیں۔ اس دور میں ہمارے گاؤں میں بجلی کی سہولت نہ تھی۔ اس لئے لوگ صحن یا مکان کی چھت پر سوتے تھے۔ ایک رات ابا جان کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی تو انہوں نے مجھے امام صاحب کے پاس بھیجا کہ میں ان کو بلا لاؤں۔ میں ان کے ڈیرہ کی طرف گیا تو میں نے امام صاحب کو وہاں نہ پایا۔ کمرہ کی باہر سے کنڈی لگی ہوئی تھی اور ان کا بستر خالی پڑا تھا۔ میں کافی دیر ان کا انتظار کرتا رہا۔ مگر وہ نظر نہ آئے، میں ناکام گھر لوٹ آیا اور ابا جان کو بتایا کہ امام صاحب اپنے گھر میں موجود نہیں ہیں۔ ہم دونوں کو پریشانی لاحق ہوگئی کہ وہ کہاں چلے گئے ہیں۔

خدانخواستہ ان کے ساتھ کوئی حادثہ تو نہیں ہوگیا...... کچھ دیر بعد میں پھر ان کی رہائش کی طرف گیا۔ مگر وہ اب بھی موجود نہ تھے۔ میں واپس گھر لوٹنے ہی والا تھا کہ ان کو میں نے ایک گلی سے واپس مسجد کی طرف آتے دیکھا...... میں فوراً ان کی طرف لپکا تو وہ مجھے دیکھ کر پریشان ہوگئے اور فکر مند لہجے میں بولے۔

"کیوں غلام علی!...... خیریت تو ہے ناں؟"

میں نے انہیں ابا جان کی تکلیف کا بتایا تو وہ میرے ساتھ میرے گھر آگئے۔ انہوں نے ابا جان کو دم ڈالنا شروع کردیا اور جب ان کی طبیعت بہتر ہوگئی تو وہ لوٹ گئے۔ میں صبح کی نماز کے بعد مسجد میں ہی ٹھہر گیا۔ جب سب لوگ نماز پڑھ کر چلے گئے تو میں نے ان سے پوچھا کہ وہ رات کو کہاں گئے تھے؟

"میں تو ہر رات کو پہاڑ کی طرف جاتا ہوں۔" وہ بڑے اطمینان سے بولے۔

"پہاڑ کی طرف...... مگر کیوں......؟" وہاں تو خوفناک قسم کے جانور رہتے ہیں۔" میں نے گھبرائے ہوئے انداز میں پوچھا۔

"میں چلہ کاٹنے کے لئے ایک پہاڑ کی غار میں جاتا ہوں۔" وہ اسی انداز میں بولے۔

"وہاں آپ کو ڈر نہیں لگتا۔ جنگلی جانوروں سے۔ وہاں تو دن کو بھی کوئی ان کے خوف کی وجہ سے نہیں جاتا مگر آپ رات کو وہاں جاتے ہیں۔" میں نے حیرت بھرے انداز میں کہا۔ اور پھر مجھے بڑے پیار سے سمجھانے لگے کہ جنات کو قابو کرنے اور عامل بننے کے لئے وہ کئی دنوں سے "چلہ کشی" کر رہے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کا پاک کلام پڑھ کر ایک حصار قائم کر لیتے ہیں اور جب تک وہ اس میں رہتے ہیں۔ کوئی خوفناک جانور، چرند، پرند اور حشرات اس حصار کے اندر نہیں آتے۔"

میں نے ان سے اس چلہ کے بارے میں مزید معلومات لیں تو پتہ چلا کہ وہ جنات کو اپنے تابع کر کے ان سے کوئی غلط کام نہیں لیں گے بلکہ ان کو لوگوں کی بھلائی کے لئے استعمال کریں گے...... مجھے اس کام میں دلچسپی پیدا ہوگئی اور میں روزانہ ہی ان سے اسی بارے میں باتیں کرتا رہتا۔ یوں میری معلومات میں اضافہ ہوا تو مجھے بھی اس کا شوق پیدا ہوگیا...... اور ایک روز میں نے امام صاحب سے اپنی اس خواہش کا اظہار کر ڈالا کہ "میں بھی چلہ کاٹوں گا۔"

میری خواہش جان کر وہ مسکرائے اور پیار بھرے انداز میں کہنے لگے۔

"غلام علی! بیٹا...... ابھی تمہاری عمر کم ہے...... اور تمہارا علم بھی...... جب وقت آئے گا تو میں اس سلسلہ میں تمہاری پوری مدد کروں گا۔" انہوں نے مجھے مطمئن کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے استاد جی!...... مگر ایک رات کے لئے تو مجھے ساتھ لے چلیں۔"

کئی دن کی مسلسل درخواست اور ضد کے بعد وہ مجھے ایک رات کو اپنے ساتھ لے جانے پر رضامند ہوگئے۔

چاند کی آخری تاریخیں تھیں۔ موسم بدل رہا تھا۔ ہوا میں ہلکی سی خنکی تھی۔ رات ساڑھے نو بجے کا وقت تھا۔ میں گھر والوں کو بتائے بغیر امام صاحب کے ساتھ پہاڑوں کی طرف جا رہا تھا۔ آسمان زیادہ صاف نہ تھا۔ اس لئے مدھم سی چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ پہاڑ کے دامن میں کافی علاقہ جنگل نما تھا۔ جہاں سے جنگلی جانوروں کی آوازیں آرہی تھیں۔ امام صاحب ہلکی آواز میں قرآنی آیات کا ورد

کررہے تھے۔ میں ان کا بایاں ہاتھ پکڑے ان کے ہمراہ چل رہا تھا۔ مگر میں بہت ہی خوفزدہ بھی تھا۔ میں لرزتی ہوئی زبان سے آیت الکرسی پڑھ رہا تھا۔ جنگل سے اوپر پہاڑ پر چڑھ کر ہم ایک غار نما جگہ میں جا پہنچے۔۔۔ وہاں امام صاحب نے ایک لکڑی کے ٹکڑے سے زمین پر ایک بڑا سا گول دائرہ مارک کیا اور پھر اس دائرہ میں بیٹھ کر چلہ کشی شروع کردی۔ مجھے انہوں نے ہر صورت میں خاموش رہنے کی تاکید کی تھی۔ اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اگر میں اس دائرہ سے باہر نکلا تو جنگلی جانور مجھے نہ چھوڑیں گے۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ غار کے نیچے کچھ فاصلے پر جنگلی جانور جمع ہونا شروع ہوگئے۔ جن میں گیدڑ، بھیڑیا کے علاوہ سانپ بھی تھے۔ میں ان کو دیکھ کر تھر تھر کانپنے لگا۔ اور پھر میں نے آنکھیں بند کرلیں اور امام صاحب کی پیٹھ سے لگ کر بیٹھ گیا اور منہ بھی پیچھے کی طرف کرلیا۔۔۔ وہ جانور چنگھاڑتے رہے۔۔۔ طرح طرح کی آوازیں آتی رہیں۔ ان میں کچھ آوازیں ایسی بھی تھیں۔ جو میں نے اس سے پہلے کبھی نہ سنی تھیں۔ جانوروں کی آوازیں ختم ہوئیں تو چڑیلوں کی آمد ہوئی اور وہ بھی طرح طرح کی آوازیں ہمیں ڈرانے کے لئے نکالتی رہیں۔ میں نے خوف کے مارے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور آنکھیں بھی بند کرلیں۔ تین گھنٹے گزر گئے۔۔۔ تو یوں لگا جیسے طوفان تھم گیا ہو۔ آوازیں آنی بند ہوگئیں۔ جانور وغیرہ بھی لوٹ گئے۔

امام صاحب کا اس رات کا کام ختم ہوگیا تو ہم واپس لوٹ آئے۔ میں نے واپسی پر عہد کرلیا کہ کبھی دوبارہ امام صاحب کے ہمراہ نہ جاؤں گا۔ چلہ کاٹنے کی خواہش بھی دم توڑ گئی۔ گھر پہنچا تو بخار نے آلیا۔ دو دن اور دو راتیں میں بخار میں پھنکتا رہا۔ امام صاحب مجھ پر دم کرتے رہے اور بالآخر میں صحت یاب ہوگیا۔

امام صاحب کا پہاڑ والا چلہ مکمل ہوگیا تو اس کے بعد انہوں نے ایک تالاب میں رات کو تین گھنٹے کھڑے ہوکر ایک اور چلہ مکمل کیا۔ تو وہ عامل بن گئے۔ انہوں نے جو کچھ حاصل کرنا چاہا تھا۔ وہ ان کو حاصل ہوگیا۔ میں ان کے ساتھ چلہ تو مکمل نہ کرسکا۔ مگر انہوں نے کچھ ایسا کلام سکھادیا کہ اس کو پڑھنے سے کوئی موذی سانپ۔۔۔۔ جانور۔۔۔ چرند پرند۔۔۔ میرے نزدیک نہ آتے تھے۔

گاؤں کے لوگوں کو بھی معلوم ہوگیا تھا کہ امام صاحب چلہ کاٹ کر ایک بڑے عامل بن گئے ہیں۔ اب ان کا احترام اور وقار میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔ مگر نمبردار کا خاندان پھر بھی ان کی کسی خوبی کا معترف نہ تھا۔ بلاوجہ تنقید ان کا وطیرہ تھا۔ جو وہ آئے دن کرتے رہتے تھے۔

امام صاحب کے پاس اب دور دور سے بھی وہ لوگ آتے۔ جن پر کالا جادو یا کوئی اور عمل کیا گیا ہو۔ امام صاحب بے لوث اور بلا معاوضہ ہر ایک کا مسئلہ حل کرتے اور لوگوں کی دعائیں لیتے تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ جنات کی ایک جماعت ان کی تابع ہے۔ وہ ان سے مدد لے کر مسائل حل کرواتے اور ان کے بگڑے کام سنوارتے ہیں۔۔۔ امام صاحب کے ساتھ رہ کر میں نے جہاں کچھ دم درود اور تعویذ لکھ کر دینے سیکھ لئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اذان دینا۔۔۔ تکبیر کہنا بھی سیکھ لیا۔ میں نے داڑھی بھی رکھ لی تھی۔ تب امام صاحب نے مجھے اپنا نائب مقرر کردیا۔ اور میں ان کی غیر حاضری میں امامت کے فرائض بھی سرانجام دینے لگا۔ مگر یہ موقع بھی کبھار ہی ملتا تھا۔

جب بھی امام صاحب اپنے آبائی گھر جاتے یا کسی ایسے مریض کو دیکھنے اور اس کا علاج کرنے کے لئے کسی دور دراز کے گاؤں جاتے اور انہیں رات وہاں گزارنا پڑ جاتی۔ میں امام صاحب کی پیروی کرکے ان کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتا تھا۔

ایک مرتبہ ان کو جنات کی جماعت ایک ماہ کے لئے کسی ایسے علاقے میں لے گئی۔ جہاں کے لوگ ہمارے گاؤں والوں سے بڑھ کر جاہل اور ان پڑھ تھے۔ امام صاحب نے ان لوگوں کو زندگی کا مفہوم سمجھایا اور اللہ اور اس کے رسولؐ کے فرمان کے مطابق زندگی گزارنا سکھایا۔ پھر یہ سلسلہ چلتا رہا۔ امام صاحب بھی کبھار ایسے دوروں پر جاتے اور میں ان کی عدم موجودگی میں مسجد کا سارا انتظام سنبھالتا اور نماز بھی پڑھاتا۔ میں یہ ڈیوٹی جس انداز سے سرانجام دے رہا تھا کہ گاؤں کے لوگ مطمئن

تھے۔ سوائے نمبردار کے گھرانے کے۔ ان کو اپنی دولت پر گھمنڈ تھا۔ جس بنا پر وہ ہر غریب کو نظر انداز کردیتے۔ اور اللہ کا شکر بھی ادا نہ کرتے۔

☆......☆......☆

نمبردار فتح خان کے دو بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں۔ چھوٹی بیٹی شمیم کے علاوہ سب شادی شدہ تھے۔ شمیم چھوٹی ہونے کی وجہ سے صرف لاڈلی ہی نہ تھی بلکہ وہ حسن میں دوسری بہنوں سے بڑھ کر تھی۔ اس کے حسن کے چرچے ارد گرد کے دیہاتوں میں بھی تھے۔ لہٰذا نمبردار نے اس کی منگنی ایک دوسرے گاؤں کے نمبردار کے بیٹے سے کردی تھی، پھر بھی اس کے چاہنے والے بے شمار تھے۔ مگر شمیم گاؤں کے ہی ایک لڑکے فیصل سے محبت کرتی تھی۔ جس کا علم گاؤں کے چند لوگوں کو ہی تھا۔ جن میں...... میں بھی شامل تھا۔ نمبردار کا سارا خاندان اس سے لاعلم تھا...... فیصل سے میری تھوڑی بہت دوستی تھی۔ وہ مجھے اپنے دل کی بات بتاتا تھا۔ فیصل اور شمیم ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔

ایک رات شمیم اپنی حویلی سے نکلی اور فیصل کے ہمراہ بھاگ گئی۔ صبح ہوئی تو نمبردار کی حویلی میں کہرام مچ گیا۔ شمیم کی تلاش میں بندے ادھر ادھر دوڑائے گئے مگر شمیم کا نام ونشان نہ ملا کہ وہ کہاں چلی گئی ہے۔ فیصل بھی گاؤں سے غائب تھا۔ جن لوگوں کو فیصل اور شمیم کی محبت کا علم تھا۔ ان کو یہ یقین تھا کہ شمیم کو فیصل ہی بھگا کر لے گیا ہے۔ مگر نمبردار نے اس حقیقت کو جھٹلا دیا اور شمیم کی گمشدگی کا سارا ملبہ امام صاحب پر ڈال دیا کہ امام صاحب نے ہی اس کی بیٹی کو اغوا کرادیا ہے۔ گاؤں کے لوگوں کو منع کرنے کے باوجود اس نے تھانے جا کر امام صاحب کے خلاف پرچہ کٹوادیا۔ پولیس ہمارے گاؤں آگئی۔ اور امام صاحب کو گرفتار کرکے تھانے لے جانے لگی۔ میں نے اور گاؤں کے کافی لوگوں نے اس کے خلاف احتجاج کیا۔ مگر ہماری ایک نہ سنی گئی۔

پولیس کی گاڑی روانہ ہوئی تو امام صاحب نے ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہا تو میری آنکھیں بھر آئیں اور میں سسکیاں لے کر رونے لگا۔ گاؤں کے لوگ بھی اداس ہوگئے...... اور پھر ہم مشورہ کرنے لگے کہ امام صاحب کی ضمانت کا بندوبست کیسے کیا جائے۔ جب نمبردار کو علم ہوا کہ ہم امام صاحب کی ضمانت کا ارادہ کررہے ہیں تو اس نے ہمیں دھمکی دی کہ اگر کسی نے امام صاحب کی ضمانت کرائی تو وہ اس کو جینے نہ دے گا۔ نمبردار کے ڈر اور خوف سے ہم لوگ خاموش ہوگئے۔ مجھے یہ تو یقین تھا کہ امام صاحب بے گناہ ہیں۔ نمبردار نے خواہ مخواہ ان پر بہتان باندھا ہے اور مجھے یہ بھی یقین تھا کہ امام صاحب باعزت طور پر واپس لوٹ آئیں گے۔

مگر ایسا نہ ہوا۔ امام صاحب لوٹ کر نہ آئے۔

ہمیں دوسرے دن معلوم ہوا کہ پولیس کی گاڑی کو راستے میں حادثہ پیش آگیا تھا۔ اور وہ ایک چھوٹے سے پل سے نیچے جا گری تھی۔ جس کے نتیجے میں ایک پولیس والا ہلاک اور باقی زخمی ہوگئے تھے۔ مگر امام صاحب کا کچھ پتہ نہ تھا کہ وہ کہاں چلے گئے ہیں۔ زندہ ہیں...... زخمی ہیں...... یا...... مگر وہ کسی بھی حالت میں جائے حادثہ پر نہ پائے گئے تھے۔ مجھے یہ یقین تھا کہ ان کو جنات نے بچالیا ہوگا۔ مگر اب وہ کہاں ہیں؟ یہ کسی کو معلوم نہ تھا۔

یوں ہی دن ہفتے، مہینے اور پھر سال گزر گئے۔ امام صاحب کا کچھ پتہ نہ چلا...... کہ وہ زندہ ہیں یا نہیں...... میں نے اپنے طور پر ان کو بہت تلاش کیا۔ مگر ان کے بارے میں کچھ نہ جان سکا۔ تو تھک ہار کر خاموش ہوگیا۔

اسی دوران شمیم اور فیصل کو شہر کی پولیس نے شک کی بنا پر گرفتار کرلیا۔ اور علاقے کے تھانے کے حوالے کردیا...... ان دونوں نے نکاح کرلیا تھا۔ اور اب شمیم امید سے تھی۔ پولیس والوں نے نمبردار اور فیصل کے گھر والوں سے رقم لے کر راضی نامہ کروادیا۔ مگر نمبردار نے دل سے ان کو معاف نہ کیا تھا۔ اس نے ایک روز غصے میں آکر شمیم اور فیصل دونوں کو گولیوں سے بھون ڈالا اور خود تھانے جاکر گرفتاری دے دی۔

حوالات میں ہی اس پر پاگل پن کا دورہ پڑا۔ وہ پاگل ہوگیا۔ اسے پاگل خانے بھیج دیا گیا...... جہاں وہ کچھ عرصہ بعد زندگی سے ناطہ توڑ گیا...... اس کی موت

کے بعد وراثت کی تقسیم پر بہن بھائیوں میں جھگڑے شروع ہوگئے اور وہ ایک دوسرے کے جانی دشمن بن گئے۔ یوں نمبردار کی حویلی تقسیم ہو کر اجڑ گئی اور اس خاندان کے سارے ٹھاٹھ باٹھ ختم ہوگئے۔ عزت اور وقار خاک میں مل گیا...... یہ سب کچھ یقیناً امام صاحب کی بددعا کا ہی اثر تھا کیونکہ ان پر ناحق الزام لگایا گیا تھا۔

☆......☆......☆

جب امام صاحب کا کوئی پتہ اور خبر نہ ملی تو میں نے مسجد کی امامت چھوڑ دی۔ اور ادھر ادھر بھٹکنے لگا۔ کیونکہ مجھے کسی پل چین نہ آرہا تھا۔ امام صاحب کی یاد بہت ستاتی تھی۔ ایک روز میں یوں ہی پھرتا ہوا اس اسکول کی طرف چلا گیا۔ جہاں میں پڑھتا رہا تھا۔ میں جب وہاں پہنچا تو اسکول کے باہر شور مچا ہوا تھا۔ پتہ چلا کہ ایک لڑکے کو جن کا دورہ پڑ گیا ہے۔ استاد اور لڑکے حیران کن نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ لڑکا ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ کوئی کہتا تھا دیکھو تو کسی اسے کسی سانپ نے ڈس لیا ہوگا۔ کوئی کہتا لڑکا خوب صورت ہے۔ شاید کوئی پری عاشق ہوگئی ہے کوئی مرگی بتاتا۔

بہر حال کافی جتن کیے گئے مگر اس لڑکے کو کہیں سے افاقہ نہ ہوا۔ ایک بزرگ کا وہاں سے گزر ہوا۔ تو انہوں نے کہا۔ "یہاں سے تقریباً 40,35 میل دور شمال مغرب کی طرف ایک پرانے زمانے کے کسی راجا کا محل ہے (جسے سندھی زبان میں جندو خان کی ماڑی کہتے ہیں) وہاں ایک اللہ لوک انسان ہے کوئی وہاں جا کر ان سے تعویذ لے کر اس لڑکے کے گلے میں ڈال دے تو ضرور آرام آجائے گا۔" میں نے ان بزرگوں کی بات غور سے سنی اور صحیح راستہ معلوم کیا۔

میں نے ایک اور لڑکے کو ساتھ لیا اور اس لڑکے کے لئے تعویذ لانے چل پڑا۔ مجھے یاد ہے وہ رمضان کا مہینہ تھا اور میں نے روزہ بھی رکھا ہوا تھا۔ مگر اس لڑکے کی تکلیف مجھ سے نہ دیکھی گئی تو میں ماڑی جندو خان کی طرف چل پڑا۔ میں اور میرا ساتھی کرامت بیٹے شہید کے بڑے قبرستان کے بڑے بڑے خوفناک درختوں کے جھنڈ سے ہوتے ہوئے کچے پکے راستوں پر چلے جارہے تھے۔ شام تک ہم نے تقریباً آدھا فاصلہ طے کرلیا تھا۔ رات ہم نے ایک چرواہے کے گھر گزری۔ روزہ بھی وہاں ہی افطار کیا تھا۔ اور پھر سحری کے وقت جوار کی روٹی اچار کے ساتھ کھا کر روزہ رکھا اور منہ اندھیرے ہم اپنے سفر کو روانہ ہوگئے۔ دس بجے ہم نے کافی سفر طے کرلیا تھا۔

دوپہر ہم نے ایک غریب کسان کے کنویں پر درخت کی گھنی چھاؤں میں سو کر گزار دی۔ ڈھائی بجے اٹھ کر کنویں کے ٹھنڈے پانی سے نہائے۔ نماز پڑھی اور پھر چل دیئے۔ اب ہم میدانی علاقے کو چھوڑ کر ایسے راستے پر چل رہے تھے جسے سندھی زبان میں ڈھورا کہتے ہیں۔ یہ دریائے سندھ کی پرانی گزرگاہ تھی۔ جو اونچی اونچی خاردار جھاڑیوں کی وجہ سے جنگل کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ اس لئے صحیح راستے کا تعین مشکل تھا۔ اس لئے ہم روایتی اور جنگلی رواج کے مطابق ناک کی سیدھ پر قیاس کے مطابق جھاڑیوں کو پھلانگتے چلے جارہے تھے۔ ایک انجانا سا خوف دل میں لئے بس اپنی دھن میں جارہے تھے۔ سورج اپنی منزل کی طرف تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ ہم بھی اس کوشش میں ہانپتے کانپتے چلے جارہے تھے کہ مغرب سے قبل کسی مناسب جگہ پہنچ جائیں تاکہ روزہ افطار کرسکیں اور جنگل کی دہشت سے بھی نکل جائیں۔ ہم آپس میں باتیں بھی کررہے تھے۔

ابھی کوئی تین میل کا سفر طے کیا ہوگا کہ جس پگڈنڈی پر ہم جارہے تھے اس پر سامنے سے ایک کتیا اپنے بچوں کے ساتھ ہماری طرف آرہی تھی اس کی آنکھیں خونخوار بھیڑیے کی مانند تھیں۔ اس نے ہمیں دیکھا تو دور سے ہی غرانے لگی...... ہم نے مٹی کے ڈھیلے اٹھا کر اس کی طرف ہاتھ لہرائے تو وہ ٹوٹ کر ہماری طرف دوڑی۔ تو ہم نے مجبوراً وہ راستہ چھوڑ کر مزید ڈھلان کی طرف جھاڑیوں میں جانے لگے تو وہ رک گئی۔ اور ہم راستہ بدل کر آگے نکل گئے۔ دو دن کی مسافت نے ہمارا بدن چور چور کر ڈالا تھا کرامت کا مارے پیاس کے برا حال تھا۔ کئی بار اس نے روزہ توڑنے کا ارادہ کیا تو میں نے اسے اپنے بڑوں کی باتیں سنائیں کہ روزہ توڑنے کی کتنی بڑی سزا ہے کہ ایک تو

رکو نہیں سکتے اور سانو روزے گلے پڑیں گے...... خیر اسی طرح افسردگی کی حالت میں میرا ساتھ تو دے رہا تھا۔

شام کے سائے ڈھلنے شروع ہو گئے تھے اور سرمئی سا اندھیرا پھیلنے لگا تھا شاید مغرب کا وقت ہونے میں ابھی کچھ دیر باقی تھی۔ ہم کانٹوں اور سرکنڈوں کے بیچ میں سے گزر رہے تھے کہ ایک بار پھر ایک آفت کا سامنا کرنا پڑا۔ کرامت ایکدم چیخا اور کانپنے لگا۔ میں نے اس سے وجہ پوچھی تو اس نے سامنے کی طرف اشارہ کیا...... کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بہت بڑا سانپ اپنا پھن پھیلائے آہستہ آہستہ ہماری طرف بڑھ رہا ہے۔

میں سانپ وغیرہ سے ڈرنے والا نہ تھا کیونکہ امام صاحب نے سانپوں اور دیگر موذی جانوروں کو باندھ دینے والی آیات مجھے یاد اور عنایت فرمائی تھیں اور اس کے ساتھ ساتھ میں نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ سندھ کے علاقے کا کالا ناگ کبھی بھی اپنے حریف پر حملہ کرنے میں پہل نہیں کرتا جب تک کہ اس کو پہلے نہ چھیڑا جائے...... یہ تجربہ کئی مرتبہ دیکھا جا چکا تھا۔ خیر ایک بار پھر ہمیں راستہ تبدیل کرنا پڑا۔ کرامت کا مارے خوف اور دہشت کے برا حال تھا۔

بہرحال جب میں نے اسے بتایا کہ میں نے اللہ تعالیٰ کے پاک کلام سے اسے باندھ دیا ہے۔ اب وہ ایک قدم آگے نہیں آئے گا۔ تو اس کی جان میں جان آئی۔ اور ہم نے سفر جاری رکھا۔ کوئی آدھا گھنٹہ گزرنے کے بعد ہمیں اذان کی آواز سنائی دی۔ جو کچھ دور سے آ رہی تھی۔ ہم نے ادھر ادھر نظر دوڑائی تو ہمیں ایک چشمہ نظر آیا۔ ہم فوراً وہاں پہنچے اور اس کا ٹھنڈا اور میٹھا پانی پی کر روزہ افطار کیا۔ یوں جسم میں جان آئی تو ہم اس طرف بڑھنے لگے جدھر سے اذان کی آواز آئی تھی۔

ہم تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے مسجد کے قریب پہنچ گئے۔ مسجد کی ایک منڈیر پر ایک دیا جل رہا تھا۔ نمازی مغرب کی نماز پڑھ کر جا چکے تھے۔ مسجد کے باہر ایک نلکا نظر آیا۔ ہم نے وہاں پر وضو کیا اور نماز ادا کرنے کے لئے اندر داخل ہو گئے۔ اندر بھی ایک دیا جل رہا تھا...... وہ مسجد بہت پرانی لگ رہی تھی۔ جس کی دیواریں ٹوٹ پھوٹ چکی تھیں۔ لگتا تھا کہ کسی زمانے میں یہ جامع مسجد رہی ہوگی۔ اس کا دالان بہت بڑا تھا۔ درمیان میں ایک چھوٹا سا حوض تھا جو سوکھا پڑا تھا۔ ہم ان چیزوں کو نظر انداز کر کے نماز پڑھنے لگے۔ نماز پڑھنے کے بعد ہم پر غنودگی سی طاری ہو گئی اور ہم نے آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ ایک کھٹکا سا ہوا۔ اور اس کے ساتھ ہی مجھے ایک جانی پہچانی آواز سنائی دی۔

"غلام علی! تم آ گئے...... میں تمہارا انتظار کر رہا تھا۔"

میں نے آنکھیں کھولیں تو میں نے دیکھا۔ میرے سامنے سفید لباس میں ملبوس میرے استاد محترم امام صاحب ہاتھوں میں کھجوروں کی ایک چنگیری لئے کھڑے تھے...... میں فوراً اٹھا...... اور دوڑ کر ان سے لپٹ گیا...... اور پھر دیوانہ وار ان کے ہاتھ چومنے لگا۔ انہوں نے مجھے گلے سے لگایا اور پیار کیا۔ اور پھر کرامت کو بھی اسی انداز میں ملے۔ انہوں نے ہمیں کھجوریں کھانے کو کہا تو ہم نے جی بھر کر تازہ اور میٹھی کھجوریں کھائیں۔ تو طبیعت ہشاش بشاش ہو گئی۔ امام صاحب کا گھر کہیں مسجد کے قریب ہی تھا۔ اس لئے وہ یہ کہہ کر کہ میں تمہارے لئے کھانا لاتا ہوں باہر نکل گئے۔ وہ تھوڑی ہی دیر بعد واپس لوٹ آئے۔ وہ باجرے کی روٹیاں اور مرغی کا سالن لائے تھے......

ہم نے جی بھر کر کھانا کھایا...... ہم کھانا کھا چکے تو وہ برتن لے کر باہر نکل گئے...... وہ پھر عشاء کے وقت آئے اور مجھے اذان دینے کو کہا میں نے اذان دی اور پھر انہوں نے جماعت کرائی۔ میں حیران تھا کہ مسجد میں ہم دونوں کے علاوہ اور کوئی بھی نمازی نہ تھا۔ میں نے نماز ادا کرنے کے بعد ان سے اس بارے میں بات کرنا چاہی تو وہ کہنے لگے۔

"غلام علی!...... اس وقت تم لوگ مسجد میں ہی آرام کرو۔ کیونکہ تم لوگ تھکے ہوئے ہو۔ میں تمہارے ذہن میں جنم لینے والے سوالات کے جواب تمہیں کل دوں گا۔"

"یہ کہہ کر وہ مسجد سے باہر چلے گئے۔ میں اور کرامت مسجد میں ہی سو گئے۔ سحری کے وقت بھی امام

صاحب ہمارے لئے کھانا لائے انہوں نے بھی سحری ہمارے ساتھ ہی کی۔ میں نے ہی فجر کی اذان دی۔ فجر کی نماز میں بھی ہم تینوں کے علاوہ کوئی اور انسان نہ تھا۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد امام صاحب کہنے لگے۔

"غلام علی! تمہیں ابھی میرے پاس ہی رہنا ہے...... میں کرامت کو تعویذ دے کر بھیج دیتا ہوں کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ تم لوگ کس کام کے لئے آئے ہو۔"

پھر انہوں نے ایک تعویذ لکھ کر کرامت کو دیا اور کہا کہ "یہ اس لڑکے کے گلے میں ڈال دینا۔ جس پر دورہ پڑتا ہے۔ میں تمہیں اکیلا نہیں بھیجوں گا۔ بلکہ تمہارے ہمراہ ایک خاص بندہ بھی ہوگا۔ جو تمہیں تمہارے گاؤں چھوڑ کر آئے گا۔"

کرامت مطمئن ہو کر تعویذ لے کر روانہ ہو گیا۔ تو امام صاحب مجھ سے مخاطب ہوئے اور کہنے لگے "غلام علی ... یہاں تمہیں میں نے ہی بلوایا ہے۔ کیونکہ تم میرے بغیر بہت اداس تھے۔ میں تم سے بے خبر نہ تھا۔ مجھے تمہاری تنہائی اور بے چینی کا احساس تھا۔ تبھی تو تمہیں میں نے یہاں بلایا ہے۔ تم یقیناً یہ جاننے کے لئے بے تاب ہو گے کہ میں پولیس کی گاڑی کے حادثے میں کیسے بچ کر یہاں آ گیا......؟

جب پولیس والوں نے مجھے گرفتار کیا تو مجھے یہ یقین تھا کہ بے گناہ ہونے کی بنا میں، میں بچ جاؤں گا اور یہ لوگ مجھے تھانے پہنچنے سے پہلے ہی رہا کر دیں گے۔ پھر ایسا ہی ہوا۔ ان لوگوں نے تو مجھے رہا نہ کیا...... مگر میرے موکلات نے مجھے ان سے بچا لیا۔ تمہیں معلوم ہی ہوگا کہ پولیس وین کو حادثہ پیش آ گیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ ان لوگوں کا کیا بنا...... مگر میرے موکلات مجھے وہاں سے بچا کر اس بستی اور اس مسجد میں لے آئے۔ اور مجھے بتایا کہ "آپ کو ویسے بھی ہم نے یہاں ہی لے کر آنا تھا کیونکہ یہ بستی ویران اور برباد ہو چکی ہے۔ مسجد بھی اجڑ رہی ہے۔ آپ نے اس بستی میں مسجد کو آباد کرنا ہے۔" میں نے بھی جب اس مسجد اور بستی کی ویرانی دیکھی تو میں بہت ہی دکھی ہو گیا اور پھر یہاں ہی رہنے کا فیصلہ کر لیا۔"

امام صاحب مجھے مسجد سے باہر لے آئے اور انہوں نے بستی کا دورہ کرایا۔ تو بستی کی ویرانی دیکھ کر میں دکھی نہیں بلکہ خوف زدہ ہو گیا۔ گھروں کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ جن پر دیمک لگی ہوئی تھی۔ جابجا جنگلی جانوروں کے قدموں کے نشانات تھے۔ کئی مکانات منہدم ہو چکے تھے۔ بس کھنڈرات کے نشانات باقی تھے۔ کئی گھروں کی دیواریں جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھیں۔ کوٹھریوں اور صحن میں گھاس پھوس اور جھاڑیاں اگ آئی تھیں۔ جن کو دیکھ کر وحشت سی ہونے لگی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ بستی بھوت پریتوں کا مسکن ہے۔ جابجا چمگادڑ لٹکے ہوئے تھے۔ ابابیلوں کا شور کان برداشت نہیں کر پا رہے تھے۔ کئی گھروں میں سانپوں کا مسکن بنا ہوا تھا۔ درختوں پر اژدھے لٹکے ہوئے تھے۔ جن کو دیکھ کر میں سکتے میں آ جاتا۔

امام صاحب مجھے تسلی دیتے اور بتاتے۔ "یہاں دن دیہاڑے جنات اور بدروحیں ناچتی اور شور مچاتی رہتی ہیں۔ رات کے اندھیرے میں چڑیلیں چیختی اور چلاتی ہیں... روتی اور جھگڑتی ہیں...... اردگرد کے دیہاتوں کے لوگ اس طرف آنے سے خوف کھاتے ہیں اور کانوں کو ہاتھ لگاتے ہیں۔ مگر میں یہاں اکیلا رہ رہا ہوں۔ میرا چلہ میرے کام آ رہا ہے۔ کوئی چیز مجھے نقصان نہیں پہنچاتی۔ تکلیف نہیں دیتی۔"

امام صاحب اور بھی بہت کچھ بتاتے رہے مگر میں اتنا خوفزدہ ہو گیا تھا کہ اب ان کی کوئی بات میرے پلے نہیں پڑ رہی تھی۔ مسجد کے ساتھ ہی ان کا کمرہ تھا۔ وہاں پہنچ کر میں نے سکھ کا سانس لیا اور پھر امام صاحب سے پوچھا۔

"اردگرد کی بستیاں صحیح سلامت ہیں۔ مگر یہ بستی کیوں برباد ہوئی؟"

"ہاں غلام علی!...... مجھے بتایا گیا تھا کہ یہ بستی بھی کبھی صحیح سلامت تھی۔ اور ان تمام بستیوں سے بڑی تھی۔ اردگرد کے لوگ یہاں خریداری کرنے آتے تھے۔ اس وقت ہندوستان کی تقسیم نہیں ہوئی۔ یہاں مسلمان اور ہندو مل کر اتفاق اور پیار محبت سے رہتے تھے۔ ایک دوسرے کے گھروں میں آنا جانا۔ دکھ سکھ میں شریک

ہوتا...... سب ہی اچھا تھا۔ بستی کی فضا خوشگوار تھی۔ امن اور خلوص کا دور دورہ تھا۔ ارد گرد کے دیہاتوں کا لوگوں کے لئے یہ ایک ماڈل بستی تھی۔

غزالہ...... بستی کے ایک شخص فضل کریم کی بیٹی تھی۔ فضل کریم درزی کا کام کرتا تھا۔ اور ماہر کاریگر مانا جاتا تھا۔ وہ مردانہ ہی نہیں زنانہ کپڑے بھی سیتا تھا۔ غزالہ بہت ہی خوب صورت اور جوان تھی۔ معمولی پڑھی لکھی تھی۔ وہ ایک ہندو لڑکے راجندر کمار سے محبت کرتی تھی۔ دونوں چوری چھپے ملتے بھی رہتے تھے۔ غزالہ محبت کے معاملہ میں مخلص اور سنجیدہ تھی اور راجندر کو دل و جان سے چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ راجندر مسلمان ہوجائے تو وہ اس سے شادی کرلے گی راجندر نے اس کو یقین دلایا تھا کہ وہ اس کی خاطر مسلمان ہوجائے گا۔ مگر راجندر کے من میں کھوٹ تھا۔ وہ غزالہ سے سچی محبت نہیں کرتا تھا۔ اس کی محبت ہوس آلودہ تھی۔ مگر غزالہ کو اس کا احساس نہ تھا۔ وہ راجندر کو اپنے من کا دیوتا مان چکی تھی۔

راجندر نے نہ جانے اس پر کیا جادو کرڈالا تھا کہ وہ آنکھیں بند کرکے راجندر کی ہر بات مانتی تھی۔ راجندر مندر کے پجاری کا بیٹا تھا۔ ایک روز وہ غزالہ کو اپنی محبت کا جھانسہ دے کر مندر میں لے گیا اس وقت مندر میں کوئی نہ تھا۔ راجندر نے وہاں مندر میں ہی غزالہ کو بے آبرو کرڈالا۔ غزالہ بہت روئی تڑپی مگر راجندر نے اس کی ایک نہ سنی۔ غزالہ لٹی پٹی گھر آئی اور گھر والوں کو اپنے لٹنے کی داستان سنائی اور اس کے ساتھ ہی اس نے زہر کھا کر خودکشی کرلی۔

بستی میں جب یہ خبر پھیلی تو مسلمانوں کے جذبات بھڑک اٹھے نوبت نعرہ بازی...... ہاتھا پائی سے بڑھ کر دنگا فساد پر آگئی۔ کئی لوگ زخمی ہوگئے اور بات تھانے تک جا پہنچی۔ تھانیدار ایک ہندو جسی لال تھا۔ اس نے ہندوؤں کی ہی حمایت کرنی تھی۔ کئی مسلمان نوجوان کو گرفتار کرکے حوالات میں بند کردیا گیا۔ بالآخر راضی نامہ پر بات ختم ہوگئی۔ فضل کریم یہ دکھ برداشت نہ کرسکا اور زندگی سے ناطہ توڑ گیا۔ فضل کریم کی موت پر مسلمانوں کو بہت ہی دکھ ہوا۔ مگر اس بار انہوں نے صبر سے کام لیا۔

راجندر کمار خوف کے مارے بستی چھوڑ کر شہر میں اپنے رشتہ داروں کے پاس چلا گیا۔ کیونکہ اسے ڈر تھا کہ مسلمان اس کو اس کے جرم اور ظلم کی سزا ضرور دیں گے۔

شاہ جہاں...... غزالہ کا پھوپی زاد تھا۔ وہ غزالہ کو پسند کرتا تھا۔ اور غزالہ کی شادی بھی اسی سے ہونی تھی یہ فیصلہ ان کے والدین نے بہت عرصہ پہلے کرلیا تھا۔ اس لئے اب شاہ جہاں کو کسی پل بھی چین نہ تھا۔ اسے غزالہ کی بے حرمتی برداشت نہ ہورہی تھی۔ اوپر سے ماموں کی موت نے اسے آتش فشاں بنادیا۔ وہ ہندوؤں اور خاص کا راجندر کمار سے بدلہ لینے کی ترکیبیں سوچنے لگا۔ اس نے بظاہر کسی ردعمل کا اظہار نہ کیا اور خاموشی سے اپنے منصوبہ پر عمل کرنے لگا......

ارجنا...... ایک ہندو سیٹھ شام کی بیٹی تھی۔ حسن اور رعنائی میں وہ ثانی نہ رکھتی تھی۔ ادھر شاہ جہاں بھی کم نہ تھا۔ وہ مردانہ وجاہت کا نمونہ تھا۔ شاہ جہاں نے ارجنا کا قرب کسی نہ کسی طریقے سے حاصل کرلیا۔ وہ ماضی کو بھول کر ایک دوسرے کی محبت کا دم بھرنے لگے۔ ارجنا...... دل و جان سے شاہ جہاں کو چاہتی تھی۔ مگر شاہ جہاں تو صرف اس سے بدلہ لینا چاہتا تھا۔ غزالہ کی موت اور رسوائی کا بدلہ...... انتقام اور نفرت نے شاہ جہاں کو اندھا کرڈالا۔ وہ اچھائی اور بھلائی کی تمیز بھلا بیٹھا۔ وہ یہ بھی بھول گیا کہ وہ مسلمان ہے۔ اس کی منگیتر کو مندر میں بے آبرو کیا گیا تھا...... تو وہ ارجنا کو مسجد تک لے آیا......

کیونکہ ارجنا نے اس سے کہا تھا کہ وہ اس کی خاطر مسلمان ہونے کو تیار ہے۔ وہ مسجد تک آئی بھی اسی نیت سے تھی۔ مگر شاہ جہاں کے من میں کھوٹ تھا۔ وہ ارجنا کو مسجد کے اندر لاکر اس کے ساتھ وہی سلوک کرنا چاہتا تھا جو غزالہ کے ساتھ راجندر نے کیا تھا۔

اس کا انتقام اسے اس مقام تک لے آیا تھا کہ وہ مسجد کا تقدس بھول گیا۔ مگر وہ یہ بھول گیا تھا کہ مسجد تو خدا کا گھر ہے۔ وہ خدا جو اس زمین کے ذرے ذرے کی حرکت سے واقف ہے۔ وہ کسی کا محتاج اور عاجز نہیں ہے۔ وہ کبیر ہے۔ وہ رحمان ہے رحیم ہے مگر وہ جبار اور قہار بھی ہے......

www.paksociety.com

وہ بھلا یہ کیسے برداشت کرتا کہ کوئی حقیر سا انسان اس کے گھر کی بے حرمتی کرے...... قہر خداوندی کو جوش آیا...... ارجنا اور شاہ جہاں کے قدم مسجد کے دروازے کے سامنے رک گئے یوں لگا جیسے وہ پتھر کے ہوگئے ہوں۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے...... زوردار ہوا چلی۔ جس نے طوفان کی شکل اختیار کرلی۔ پل بھر میں آسمان سیاہ بادلوں سے بھر گیا۔ اور پھر خدا کا قہر یوں ٹوٹا کہ جیسے قیامت آگئی ہو۔ پوری بستی اس کی لپیٹ میں آگئی۔ ہر چیز الٹ پلٹ گئی سب کچھ تباہ و برباد ہوگیا۔ وہ ایسا مٹی ریت کنکروں اور سرکنڈوں کا طوفان تھا۔ جس نے کوئی ذی روح بھی زندہ نہ بچنے دیا۔ سانس لینے والی چیز ناپید ہوگئی۔ وہ قیامت بھی یا زلزلہ...... سوائے اس مسجد کے کوئی بھی عمارت سلامت نہ رہی۔ مسجد بھی زخمی ہوئی...... کچھ عرصہ تو اردگرد کی بستیوں کے لوگ بربادی کی یہ تصویر دیکھنے کے لئے آتے رہے۔ مگر پھر آہستہ آہستہ لوگوں نے ادھر کا رخ کرنا چھوڑ دیا۔ کیونکہ یہاں اب بدروحوں کا راج ہوگیا تھا۔ حشرات الارض اور جنگلی جانوروں نے یہاں کا بسیرا کیا تو لوگ یہاں آنے سے خوف کھانے لگے۔ اب کوئی بھول کر بھی ادھر نہیں آتا......

کئی برس تک اس مسجد میں اذان کی آواز نہ گونجی تھی۔ کیونکہ لوگ بستی کی طرف نہ آتے تھے تو مسجد کون آتا۔ چونکہ مسجد اللہ کا گھر ہے۔ اس لئے اس کی حفاظت بھی وہی کررہا تھا۔ مسجد میں کسی جنگلی جانور، چرند، پرند...... جنات اور چڑیلوں نے بسیرا نہ کیا۔ کیونکہ رات کو مسجد کے وقت مسجد کے اندر تلاوت کی آواز آتی تھی...... کبھی رونے اور سسکیاں لینے کی آواز بھی آجاتی...... میں بھی اس راز کو نہیں سمجھ سکا۔ مگر جب میں نے یہاں آکر بسیرا کیا اور یہاں رہنے کی ٹھان لی اور مسجد میں پانچ وقت اذان کی آواز گونجنے لگی...... تو پھر مسجد کے اندر سے تلاوت کی آواز بند ہوگئی کیونکہ اب میں خود تلاوت اونچی آواز میں کرتا ہوں۔ اب کسی کے رونے اور سسکنے کی آواز بھی نہیں آتی۔ مجھے نہیں معلوم ہوسکا کہ وہ رونے اور سسکنے والے کون تھے۔ کیا وہ سسکیاں ارجنا اور شاہ جہاں کی تھیں یا پھر فرشتوں کی...... میں یہ نہیں جان سکا

میں اب دن رات اس مسجد کو آباد کرنے میں کوشاں ہوں۔ میرے موکل میرے ہمراہ ہیں۔ وہ میرا ساتھ دیتے ہیں۔ میرا خیال رکھتے ہیں...... میں اب اس ویران بستی میں بلا خوف و خطر گھومتا ہوں۔ مجھے کوئی بھی چیز نقصان نہیں پہنچاتی۔ یہ تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے۔ میں اب اردگرد کے دیہاتوں کی طرف جاتا ہوں۔ اور لوگوں کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ آئیں اور مسجد اور بستی کو آباد کریں...... مگر لوگ اس طرف آنے سے خوف کھاتے ہیں...... غلام علی! اب تم آگئے ہو تو اب ہم دونوں مل کر اس نیک کام کا آغاز نئے سرے سے کریں گے۔ پہلے ہم مسجد آباد کریں گے۔ مسجد آباد ہوگئی تو بستی بھی آباد ہوجائے گی۔"

امام صاحب نے بات ختم کی۔ تو میں نے ان سے کہا۔

"آپ فکر نہ کریں...... استاد جی!...... میں اب یہیں رہوں گا۔ آپ کے پاس اور آپ کے ساتھ قدم ملا کر چلوں گا۔ ہم اللہ کا گھر آباد کرکے رہیں گے۔ اب یہی ہماری زندگی کا مشن ہوگا۔"

امام صاحب نے مجھے گلے لگا لیا۔ تو مجھے یوں لگا کہ میرے جسم سے ڈر اور خوف کا نام و نشان مٹ گیا ہے۔ میں ان کے اعلیٰ علمی اور روحانی کردار کا اور بھی قائل ہوگیا......

برسوں بیت گئے ہیں۔ امام صاحب کا مشن کامیاب جارہا ہے۔ لوگ بستی میں آکر آباد ہونے لگے ہیں کھیتوں میں ہل چلنے لگے ہیں۔ فصلیں لہلہانے لگی ہیں۔ اور مسجد میں نمازیوں کی تعداد بھی بڑھنے لگی ہے۔ زندگی کی رعنائیاں لوٹنے لگی ہیں...... مگر ایک کمی بڑی شدت سے محسوس ہوتی ہے کہ میرے استاد محترم امام مسجد امیر افضل اب اس دنیا میں نہیں رہے...... مگر وہ اب بھی میری رہنمائی اور مدد کرتے رہتے ہیں۔

خطرناک تجربہ

ایس امتیاز احمد۔ کراچی

ڈاکٹر کی آواز سنائی دی میں سچ کہہ رہا ہوں، تم مرچکے تھے میں نے تمہیں پھر سے زندگی دی ہے، دیکھو تمہارے جسم پر ابھی بھی کفن موجود ہے اور جب مریض کی نظر کفن پر پڑی تو اچانک

حیرت انگیز تحیر انگیز عقل و شعور کو حیرت کے سمندر میں غوطہ زن سائنس فکشن کہانی

ڈاکٹر نان نے مسکرا کر شیلی کا ماورشن پر دیکھا۔ اب وہ ایک ریسٹورنٹ میں داخل ہو رہا تھا۔

اس کا نام تجربہ نمبر 34 تھا۔ ڈاکٹر نان اپنے 33 تجربوں میں ناکام رہا تھا لیکن اس وقت وہ خوش تھا کیونکہ یہ پہلا تجربہ تھا جو کامیاب ہوا تھا۔

ڈاکٹر نان ایک بہت بڑا زولوجسٹ تھا اور پچھلے پچاس برسوں سے اس بات پر تجربہ کر رہا تھا کہ انسان مرنے کے بعد زندہ ہوسکتا ہے۔ اس نے 33 مرے ہوئے انسانوں پر تجربہ کیا تھا لیکن کامیاب نہ ہوسکا تھا۔

پہلی بار تو لاش جل کر کوئلہ ہوگئی تھی۔ اور ڈاکٹر کی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ اس کے ہاتھ اور چہرہ بری طرح جل گئے تھے۔ اس کے دوستوں نے اسی وقت کہا تھا "یہ ایک احمقانہ خیال ہے اور اسے اس خیال کو چھوڑ دینا چاہئے۔"

لیکن وہ نہ مانا تھا۔ دوسری، تیسری اور چوتھی بار لاشیں ہوا میں تحلیل ہو کر رہ گئی تھیں۔ لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری تھی۔

22 ویں بار تو اسے بالکل تازہ لاش مل گئی تھی۔ یہ اس کی خوب صورت سیکریٹری کا جسم تھا جو ایک حادثہ میں مرگئی تھی۔

ڈاکٹر اس کی لاش فوراً تجربہ گاہ میں لایا۔ اس نے بہت دل لگا کر بہت سوچ سمجھ کر اس پر تجربہ شروع کیا۔

لیکن لاش میں صرف تھوڑی دیر حرکت ہوئی تھی اور پھر ختم۔

پھر ڈاکٹر بالکل ناامید ہو گیا تھا لیکن تجربے کرتا رہا تھا لیکن بات اس سے آگے نہ بڑھ سکی تھی کہ لاش میں حرکت ہوتی اور اس کے آگے کچھ نہیں..... وہ شاید ارادہ ترک کر دیتا لیکن اتفاق سے اس کے چھوٹے بیٹے کا موت میں انتقال ہو گیا اور ڈاکٹر کو اسے زندہ کرنے کا خبط سوار ہو گیا۔

وہ لڑکے کی لاش کو تجربہ گاہ میں اٹھا لایا۔ لوگوں نے اسے بہت روکا اور اسے سمجھایا کہ اس طرح لاش کی بے حرمتی ہوتی ہے۔

اس کے ایک دوست نے کہا..... "تم پاگل ہو چکے ہو۔"

"مجھے پاگل ہی رہنے دو۔"

"ہم لوگ تم سے ملنا جلنا چھوڑ دیں گے۔"

"چھوڑ دو۔"

"تمہیں کامیابی کبھی نصیب نہ ہوگی۔"

"ہوگی اور ضرور ہوگی ایک دن آئے گا جب تم لوگ مانو گے۔" یہ سن کر اس کے دوست خاموش ہو گئے۔

اس نے بیٹے کی لاش پر تجربہ شروع کیا۔ متواتر تین دنوں تک وہ تجربہ کرتا رہا۔ اور آخر میں وہ اچھل پڑا۔

لاش میں حرکت ہوئی۔ اور پھر اس نے آنکھ کھول کر اس کی طرف دیکھا اور بڑی نحیف آواز میں اس نے کہا۔ "ڈیڈی..... ڈیڈی۔"

ڈاکٹر نان خوشی سے پاگل ہو گیا اور اپنے بیٹے سے لپٹ گیا اور یہی اس سے غلطی ہوئی۔

وہ لاش سے لپٹا رہ گیا تھا کہ اس کی چیخیں بلند ہوئی تھیں۔ اس کی چیخ سن کر اس کا فرسٹ اسسٹنٹ اندر داخل ہوا۔ ڈاکٹر بے ہوش ہو چکا تھا۔ اسسٹنٹ نے جلدی سے بٹن دبا کر لاش میں دوڑتی ہوئی بجلی ختم کر دی اور ڈاکٹر کو ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔

ڈاکٹر جب ہوش میں آیا تو اس کا سارا جسم جیسے شل ہو گیا تھا۔ اس نے آنکھیں کھول کر کہا۔

"میرا تجربہ.....؟"

"سر! وہ کامیاب نہ ہو سکا۔"

"کیا کہتے ہو، میں نے خود اپنے کانوں سے اپنے بیٹے کی آواز سنی تھی۔"

"لیکن سر....."

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"آپ کو میں نے لاش سے لپٹے ہوئے دیکھا تھا لہٰذا میں نے کنکشن آف کر دیا تھا۔ اور پھر ....."

"واٹ نان سنس تو کیا پھر وہ مر چکا تھا؟"

"جی ہاں۔ پھر اس کی لاش کوئلے میں تبدیل ہو چکی تھی۔"

"اوہ، یونو!!" ڈاکٹر نے کراہ کر کہا اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

ڈاکٹر کو صحت یاب ہونے میں آٹھ ماہ لگے تھے۔

لیکن تندرست ہونے کے بعد اسے ایک لاش پھر مل گئی۔

اور اس نے اپنا تجربہ پھر سے دہرایا۔

اور اس بار لوگوں نے سمجھا کہ واقعی وہ کامیاب ہو گیا ہے۔ کیونکہ لاش زندہ ہو گئی تھی۔ اس نے لوگوں سے گفتگو بھی کی تھی۔ بہت سی باتیں کی تھیں۔ لیکن تیسرے دن وہ بھی ختم ہو گئی تھی۔

33 تجربوں میں ناکام ہونے کے بعد بھی ڈاکٹر ناامید نہیں ہوا تھا۔ اب اسے یقین ہو چکا تھا کہ وہ کامیاب ہوگا۔ اور ضرور کامیاب ہوگا۔ لیکن اب 34 ویں تجربے کے لئے اسے لاش نہیں مل رہی تھی۔

کوئی بھی تیار نہیں تھا کہ وہ اپنے کسی عزیز کی لاش کو ڈاکٹر کے تجربے کی بھینٹ چڑھا دیں۔

شاید ڈاکٹر کو کوئی لاش مل ہی جاتی لیکن ایک دن حکومت کی طرف سے ایک کاغذ ملا جس میں تحریر تھا۔

"ڈاکٹر نان کو معلوم ہونا چاہئے کہ اب وہ کوئی تجربہ نہیں کریں گے اور اگر انہوں نے کوئی تجربہ کیا تو حکومت کی نظر میں وہ مجرم قرار دیے جائیں گے۔"

ڈاکٹر نان پریشان ہوگیا اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس نے بہت کوشش کی لیکن حکومت کی طرف سے اسے تجربہ کرنے کی اجازت نہ ملی۔

پھر وہ بہت بے چین رہنے لگا۔ بسا اوقات وہ اپنے بال مٹھیوں میں جکڑ لیتا اور زور زور سے چیخنے لگتا۔

چھ ماہ کے اندر ہی اس کے اسسٹنٹ اسے چھوڑ کر چلے گئے، لوگوں نے اسے پاگل کا خطاب دے دیا۔

اور اب وہ اپنی کوٹھی میں اکیلا رہ گیا تھا۔ ہر وقت وہ یہی سوچتا رہتا کہ اپنے تجربے کو کس طرح پورا کرے، بغیر لاش کے وہ کوئی تجربہ نہیں کرسکتا تھا۔ اور لاش کیا اب تو زندہ بھی اس کے پاس نہیں پھٹکتے تھے۔

ایک جاڑے کی سرد رات کو وہ گھر سے باہر نکل پڑا۔ اس کے ہاتھوں میں کدال اور پھاوڑا تھا۔ اس کے قدم ایک قبرستان کی طرف اٹھ رہے تھے۔

وہ بہت خاموشی سے قبرستان میں داخل ہوا۔ ایک قبر کے قریب پہنچا پھر اس کی کدال ایک قبر پر پڑ رہی تھی۔

وہ ساری رات قبر کھودتا رہا۔ تقریباً تین بجے اس نے قبر کھود لی۔ اور قبر کے اندر داخل ہوگیا۔ اس نے بغیر دیکھے قبر سے لاش نکالی، کاندھے پر ڈال کر وہ بھاگتا ہوا اپنی کوٹھی پہنچا اور لاش تجربہ گاہ میں رکھ دی۔ وہ بہت تھک چکا تھا اس کی سانس پھول گئی تھی۔ سارا بدن درد کر رہا تھا۔ ہاتھ پیر بے قابو ہو رہے تھے۔ وہ کرسی پر بیٹھا ہوا پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان لاش کو دیکھتا رہا، باوجود اس کے کہ وہ بہت تھک گیا تھا اس نے اپنا تجربہ اسی وقت شروع کردیا

وہ اٹھا اور اس نے ایک بٹن دبا دیا۔ سارے کمرے میں الٹرا کی ریز دوڑنے لگی۔ پھر اس نے لاش کو اٹھا کر اسٹریچر پر ڈال دیا۔ بیس منٹ تک وہ لاش دیکھتا رہا۔

اچانک لاش میں حرکت شروع ہوئی۔ وہ جلدی سے میز کی طرف بڑھا۔ لاش کے ہونٹ پھڑک رہے تھے۔ وہ جلدی سے گھوم کر دوسری میز پر آیا۔ جلدی جلدی چند فلاسکوں میں پڑی ہوئی دواؤں کو اس نے ایک گلاس میں ڈالا۔ ایک گاڑھا ہلکے نیلے رنگ کا سیال تیار ہوگیا تھا۔

وہ گلاس لئے ہوئے حرکت کرتی ہوئی لاش کی طرف بڑھا۔ اور دوسرے لمحے اس نے گلاس لاش کے پھڑکتے ہوئے ہونٹوں سے لگا دیا۔ چند لمحوں میں گلاس خالی ہوگیا۔

اب وہ گھڑی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"آٹھویں منٹ پر وہ لاش پر جھک گیا۔ لاش نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ اور اس کے ہونٹوں سے نکلا تھا۔

"میں...... کہاں ہوں؟"

"گھبرانے کی ضرورت نہیں تم ڈاکٹر نان کی تجربہ گاہ میں ہو۔" ڈاکٹر بولا۔

"لیکن...... لیکن...... میں......" لاش کی آواز سنائی دی۔

"ہاں تم مر چکے تھے، میں نے تمہیں پھر سے زندہ کیا ہے۔" ڈاکٹر کی آواز مسرت سے کپکپا رہی تھی۔

"ک...... ک...... کیا......؟"

"میں سچ کہہ رہا ہوں تم مر چکے تھے، میں نے تمہیں پھر سے زندگی دی ہے یقین کرو دیکھو تمہارے جسم پر ابھی تک کفن موجود ہے۔"

زندہ ہونے والے نے اپنے کفن کی جانب دیکھا اور ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا، وہ ڈاکٹر کو حیرت سے دیکھ رہا تھا، اچانک اس نے کہا۔

"آ...... آپ کون ہیں؟"

"میں ڈاکٹر نان ہوں۔"

"اس وقت کیا بجا ہے؟"

"اس وقت دن کے ساڑھے دس بجے ہیں۔" ڈاکٹر نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اب زندہ ہونے والے کی نظریں کمرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اچانک اس کی نظریں ایک جگہ پر رک گئیں اس کی نظریں کیلنڈر پر لگی ہوئی تھیں۔

کیلنڈر پر 2036ء تحریر تھا۔ زندہ ہونے والے مردے نے مڑ کر ڈاکٹر کی طرف دیکھا اور پھر انگلی اٹھا کر

کیلنڈر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ی۔۔۔۔ یہ کیلنڈر۔۔۔؟"

"ہاں یہ 2036ء آج 21 نومبر ہے۔" ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا۔ "تم کب مرے تھے؟"

"میرا خیال ہے 1938ء میں۔" زندہ ہونے والے نے سوچتے ہوئے کہا۔

"اوہ ڈاکٹر میں باہر کی دنیا دیکھنا چاہتا ہوں۔ دنیا میں اتنے دنوں میں کیا تبدیلیاں ہوگی ہیں۔ اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں اپنے گھر جانا چاہتا ہوں۔"

"ضرور جاؤ۔ لیکن اس بات کا خیال رکھنا کہ تم کسی سے نہیں کہو گے کہ تم پھر سے زندہ کئے گئے ہو۔"

"یس ڈاکٹر!"

"اور ہاں! تم کو واپس لوٹ کر یہیں آنا ہے۔ رات میں تم کو یہیں رہنا ہے۔"

"آپ مطمئن رہیں ڈاکٹر!"

"تم جاسکتے ہو۔ لیکن ٹھہرو! جانے سے پہلے لباس تبدیل کرلو۔" اور پھر تجربہ نمبر 34 کمرے سے باہر نکل گیا۔

تجربہ نمبر 34 کے باہر نکلتے ہی ڈاکٹر نے ٹیلی کاما ویژن آن کردیا تھا۔ اور اس کی حرکات وسکنات کو دیکھ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے اپنی نظریں پھر ٹیلی کاماویژن پر جمادیں۔

تجربہ نمبر 34 ڈاکٹر کی کوٹھی سے نکل کر سڑک پر آ گیا تھا۔ سڑک پر اسے کسی قسم کا ٹریفک نظر نہیں آیا تھا۔ اور اسے اس پر تعجب ہوا تھا وہ پیدل ہی چل پڑا تھا۔ ابھی وہ چند ہی قدم چلا تھا کہ ایک آدمی نے اس کے قریب آ کر کہا۔

"آپ کو کہاں جانا ہے؟"

"کیوں؟ آپ سے کیا مطلب؟"

"جناب آپ جس سڑک پر کھڑے ہیں یہ میری ہے۔"

"کیا بکتے ہو؟ سڑک بھی کسی کی ہوتی ہے؟"

"دن میں زیادہ شراب پی کر باہر نہیں نکلنا چاہئے جناب۔" سڑک والے نے اس کو گھور کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا بکواس ہے! کیا تم سمجھتے ہو کہ میں نے شراب پی ہے۔ مجھے تو لگ رہا ہے خود تم نے پی ہے۔"

شاید ان دونوں میں جھگڑا ہو جاتا۔ لیکن اس وقت ڈاکٹر نان نے اپنے ٹیلی الفافون پر سڑک والے سے گفتگو کر کے معاملہ رفع دفع کردیا تھا۔

ڈاکٹر نان سے گفتگو کرنے کے بعد سڑک والے نے تجربہ نمبر 34 کو گھور کر دیکھا اور ایک بٹن دبادیا تھا اور تجربہ نمبر 34 کے حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب اس نے سڑک کو دوڑتے ہوئے دیکھا۔ سڑک دوڑ رہی تھی۔ اور وہ چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ بازار کھلے ہوئے تھے لیکن دکانوں پر کوئی آدمی موجود نہیں تھا۔ لوگ آتے تھے، بٹن دبا کر کاغذ مشین میں رکھ دیتے تھے اور چلے جاتے تھے۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے لیکن وہ دیکھتا جا رہا تھا۔ اچانک اسے ایک ریسٹورنٹ نظر آیا۔ اور اس نے سڑک والے سے سڑک روکنے کو کہا۔ سڑک رک گئی تھی۔

اسے بہت زور سے بھوک لگی تھی۔ وہ ریسٹورنٹ میں داخل ہوگیا تھا۔ اور اب کیبن میں داخل ہوا۔ اور ویٹر نے مینو اس کی طرف بڑھا دیا۔

"تجربہ نمبر 34 نے مینو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"واٹ نان سنس! یہ کیا ہے؟"

"مینو!" ویٹر نے گھبرا کر کہا۔

"یہ مینو ہے یا کسی دوا کمپنی کا اشتہار، یہ وٹامن کامپلیکس کاربوہائیڈریٹ الفاپروٹین یہ سب کیا ہے؟"

"سر! یہ سب کھانے کی چیزیں ہیں۔"

"کیا؟ کہیں تم پاگل تو نہیں ہوگئے ہو۔ جاؤ کھانے میں روغن جوش ایک پلیٹ اور ایک پلیٹ چکن فرائی لاؤ۔"

"سر! میں نے تو ان کھانوں کا نام آج تک نہیں سنا، ہمارے یہاں مینو میں یہ کھانے نہیں ہیں۔"

"کیا بکتے ہو؟"

"سر! میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔"

"اوہ!! ارے بےوقوف میں کھانا منگا رہا ہوں۔"

"سر! کھانے میں وہی مل سکتا ہے جو مینو میں ہے۔"

"اچھا جاؤ مٹن وٹامن ایک پلیٹ، ویسٹ کاربو

"ہائیڈریٹ لے آؤ۔" ویٹر چلا گیا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ویٹر کتنا بے وقوف ہے کہ وہ کھانا نہیں سمجھتا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا تھا۔ اور آنکھیں بند کئے بیٹھا ہوا تھا۔

اچانک ایک تیز قسم کی خوشبو اس نے محسوس کی اور آنکھیں کھول دیں۔ سامنے 19,18 سال کی ایک لڑکی کھڑی ہوئی تھی۔ پہلی نظر میں اسے ایسا لگا جیسے اس کے جسم پر ایک بھی کپڑا نہیں ہے۔ وہ بالکل عریاں تھی، اس کے جسم کا ہر حصہ اس کے سامنے تھا۔ اس کی بھرپور جوانی اس کے سامنے تھی۔ صرف چار گرہ کپڑا اس نے اپنی کمر کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ اس کی بھرپور جوانی دعوت دے رہی تھی۔

اس نے شرما کر آنکھیں بند کرلیں۔ "کیا میں بیٹھ سکتی ہوں؟"

"آں....." اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

"میں نے کہا اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں بیٹھ جاؤں۔"

"ضرور، ضرور۔"

"وہ بیٹھ گئی اس نے مسکرا کر اس کی جانب دیکھا اور بولی۔" آپ بہت خوب صورت ہیں۔ مرا جی چاہتا ہے کہ آپ میرا ایک بوسہ لیں پلیز! کس می۔"

"کیا؟"

"ہاں..... کیا حرج ہے آپ جیسے خوب صورت آدمی کا ایک بوسہ ہی مجھے سکون بخشے گا۔"

"سنئے مس! میں اس طرح کی گفتگو پسند نہیں کرتا۔"

"آپ ناراض کیوں ہورہے ہیں، خیر جانے دیجئے۔" اس نے اداس ہوکر کہا۔ دونوں چند لمحوں تک خاموش رہے۔

"تجربہ نمبر 34 کی عجیب حالت تھی۔ سامنے ایک خوب صورت جوان جسم تھا جو بار بار اس سے کہہ رہا تھا کہ مجھے اپنی بانہوں میں لے لو۔ اتنا بھینچو کہ میرے نس نس میں درد کی لہر اٹھنے لگے۔ لیکن وہ اپنے آپ کو قابو میں کئے ہوئے تھا۔

"کیا میرا جسم خوب صورت نہیں؟ کیا میرا سینہ ٹھوس نہیں ذرا چھو کر دیکھئے۔" اچانک لڑکی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

تجربہ نمبر 34 نے نظریں اٹھا کر دیکھا، لڑکی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ "پلیز! مجھے اپنے سینے سے لگالو ورنہ میں مرجاؤں گی۔" لڑکی بولی۔

"ذرا ادھر دیکھو۔" لڑکی نے اپنی ایک انگلی بائیں والی میز کی طرف اٹھائی اور تجربہ نمبر 34 کی نظریں اس طرف اٹھ گئیں۔ وہاں ایک مرد اور ایک عورت بڑے اطمینان سے بوس و کنار میں مشغول تھے۔ اس نے گھبرا کر جلدی سے اپنی نظریں پھیرلیں۔

لڑکی نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولی۔ "تم اتنا گھبرا کیوں رہے ہو؟" اور پھر اس نے تجربہ نمبر 34 کا ہاتھ اپنی سفید دھلی ہوئی کلائیوں پر رکھ دیا۔

تجربہ نمبر 34 نے جلدی سے گھبرا کر اپنا ہاتھ ہٹالیا لیکن اسے یہ احساس ضرور ہوگیا تھا کہ لڑکی عریاں نہیں ہے کیونکہ اس نے محسوس کیا تھا کہ ہاتھ گرم گوشت پر نہیں کپڑے پر پڑا تھا۔

"اوہ.....!" اس نے آنکھیں بند کرلیں..... "اتنا پتلا لباس! اس کے زمانے میں تو نائیلون کو ہی بہت پتلا سمجھا جاتا تھا۔" اس نے سوچا۔

"ڈارلنگ.....!" لڑکی کی آواز کانوں میں آئی "..... آؤ....." اور پھر لڑکی نے اپنے بغل میں ہاتھ ڈالا۔ دوسرے ہی لمحے وہ جھلی نما کپڑا بھی اس کے جسم پر نہیں تھا وہ اس کی طرف بڑھی۔

"ڈاکٹر!" تجربہ نمبر 34 زور سے چلایا..... "میں زندہ نہیں رہنا چاہتا مجھے زندگی کی ضرورت نہیں..... ڈاکٹر! ڈاکٹر!"

اور ڈاکٹر نے گھبرا کر اپنی آنکھیں کھول دیں۔ کرسی پر بیٹھے ہی بیٹھے اس نے دیکھا۔ اسٹریچر پر پڑی ہوئی وہ لاش بھی کوئلے میں تبدیل ہوچکی تھی۔

تحریر: اے وحید

قسط نمبر: 107

وہ واقعی پراسرار قوتوں کا مالک تھا، اس کی حیرت انگیز اور جادوئی کرشمہ سازیاں آپ کو دنگ کردیں گی

گزشتہ قسط کا خلاصہ

دوسری رات وکیل صاحب اپنے کمرے میں اکیلے محوخواب تھے کہ انہیں نظر آیا، ایک نسوانی سایہ نمودار ہوا اور ان کے پہلو میں آ کر بیٹھ گیا اور پھر اس کی آواز سنائی دی۔ وکیل حیدر علی تم کس قدر کٹھور دل کے مالک ہو، تمہارے دل میں جذبہ چاہت نہیں، تمہیں کسی کی پرواہ نہیں، تم اپنے گاؤں میں آ کر آرام و سکون سے رات دن گزار تے ہو، تمہیں میری ذرہ برابر بھی پرواہ نہیں، تمہیں میں ادھر ادھر تلاش کرتی رہی اور پھر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر تمہارے پاس چلی آئی۔ وکیل صاحب تم خود ہی بتاؤ کہ میں کیا کرتی تمہاری جدائی مجھ سے برداشت نہ ہوئی، میرا دل مجھے کچوکے لگانے لگا تو میں نے اپنے دل سے کہا، ارے پگلا دل کیوں گھبرا رہا ہے وکیل صاحب ہمیشہ کے لئے تھوڑی گئے ہیں، بس تین چار دن کی تو بات ہے، وہ آ جائیں گے، تو اس قدر بے قرار کیوں ہو رہا ہے۔ میری اتنی باتیں سن کر بھی میرے دل کو چین نہ آیا تو پھر میں اپنے دل کے آگے بے بس ہو گئی اور سرپٹ بھاگتی ہوئی تمہارے پاس آ گئی، اور اب کان کھول کر سن لو، جب مجھے سکون نہیں تو تم بھلا کیسے سکون سے رہ سکتے ہو، یہ تو سراسر ظلم و زیادتی ہے لہٰذا تمہیں بھی سکون نہیں ملنا چاہئے، اور یہ بولتے اس سائے نے وکیل صاحب کی گردن دبوچ لی اور پھر وکیل صاحب کی تکلیف ناقابل برداشت ہو گئی، وہ بستر پر تڑپنے لگے، اور پھر ان کی فلک شگاف چیخ نے پورے گھر والوں کا سکون تہہ و بالا کر دیا، سب کے سب فوراً ان کے کمرے میں جمع ہو گئے اور پھر آگے بڑھ کر ان کی بیوی نے وکیل صاحب کو جھنجھوڑ ڈالا۔ وکیل صاحب ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے، اور ہونقوں کی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سب کو دیکھنے لگے، وہ اپنی اندرونی کیفیت اور اصل مسئلہ کسی کو بتا بھی نہیں سکتے تھے، لہٰذا انہوں نے یہ کہہ کر سب کو ٹال دیا کہ دراصل میں ایک بھیانک خواب دیکھ رہا تھا۔ وکیل صاحب کی بات سن کر گھر والے مطمئن ہو گئے، خیر دوسرے دن وکیل صاحب کام کا بہانہ کر کے فوراً دلی آئے اور جلدی سے حکیم وقار کے مطب میں پہنچ گئے، اور حکیم وقار کے کمرے میں گئے۔ وکیل صاحب کو دیکھ کر حکیم وقار بولے۔ ”وکیل صاحب تشریف رکھیں، وکیل صاحب کرسی پر بیٹھ گئے اور بولے۔ حکیم صاحب کیا بتاؤں میں آج کل حال سے بے حال ہو گیا ہوں۔ ایسا لگتا ہے کہ کوئی بھٹکی ہوئی روح میرے پیچھے پڑ گئی ہے اس لئے میں آپ کے پاس آیا ہوں۔ وکیل صاحب کی بات سن کر حکیم وقار بولے۔ وکیل صاحب آپ گھبرائیں نہیں، اللہ نے چاہا تو آپ کی تکلیف بہت جلد ختم ہو جائے گی، میں آپ کو حکیم کامل کے پاس لے چلتا ہوں، کیونکہ حکیم کامل ہی روحانی علاج کرتے ہیں۔ یہ بول کر حکیم وقار اٹھے اور وکیل صاحب کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے اور پھر دو کمروں سے گزر کر ایک کمرے میں پہنچے، سامنے اپنی کرسی پر رولوکا براجمان تھا۔ (اب آگے پڑھیں)

حکیم وقار پر نظر پڑتے ہی رولوکا فوراً اپنی کرسی سے اٹھا اور مسکراتے ہوئے حکیم وقار کی طرف مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیا اور پھر بولا۔ ”حکیم صاحب کسی سے مجھے اپنے کمرے میں بلوا لیا ہوتا۔“

حکیم وقار بولے۔ ”حکیم صاحب یہ وکیل حیدر علی ہیں، آپ کو یاد ہوگا، کچھ دن پہلے یہ تشریف لائے تھے اور آج پھر تشریف لائے تو میں آپ کی خدمت میں انہیں لے آیا۔ بقول ان کے آج کل ان کی پریشانیاں کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی ہیں۔ آپ ان سے باتیں کریں، اب میں چلتا ہوں، مریض میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔“ اور یہ بول کر حکیم وقار دوبارہ اپنے کمرے میں چلے گئے۔

حیدر علی آگے بڑھے اور رولوکا سے مصافحہ کیا۔ اس کے بعد رولوکا بولا۔ ”وکیل صاحب تشریف رکھیں اور پھر اس کے بعد ذاکر سے بھی رولوکا نے مصافحہ کیا اور اسے

بھی کرسی پر بیٹھنے کے لئے کہا۔ تو ذاکر بھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور یک ٹک رولوکا کی طرف دیکھنے لگا۔

"ابھی بھی ذاکر کچھ سمجھنے سے قاصر تھا کہ وکیل صاحب کسی حکیم کے پاس کیوں آئے ہیں جبکہ وکیل صاحب کا مسئلہ تو روحانی ہے۔ وکیل صاحب کو تو کسی عامل کے پاس جانا چاہئے تھا۔

وکیل صاحب کی حالت ابھی بھی بہت غیر ہو رہی تھی اور بار بار وکیل صاحب اپنا دایاں ہاتھ اپنے گلے پر پھیر رہے تھے۔ اس کیفیت کو رولوکا نے بھانپ لیا اور پھر آواز دے کر ملازم سے ایک گلاس ٹھنڈا پانی منگا کر وکیل صاحب کو دیا اور بولا۔ "وکیل صاحب آپ پانی پئیں۔"

وکیل صاحب نے جھٹ رولوکا کے ہاتھ سے پانی کا گلاس لیا اور فوراً پورا گلاس پی گئے۔ پانی پینے کے بعد وکیل صاحب نے ایک بہت لمبا سانس لیا اور اپنے ماتھے پر ہاتھ پھیرا۔ اس دوران ذاکر بالکل خاموش بیٹھا کبھی وکیل صاحب اور کبھی رولوکا پر اپنی نظریں مرکوز کر دیتا تھا۔

پانی پینے کے بعد چند منٹ بعد وکیل صاحب کی طبیعت کچھ نارمل ہوئی تو مسکراتے ہوئے رولوکا مخاطب ہوا، وکیل صاحب سے۔ "وکیل صاحب اور سنائیں کیا پریشانی لاحق ہو گئی ہے، میں نے تو اندازہ لگایا ہے کہ آپ واقعی اندرونی طور پر کچھ زیادہ پریشان ہیں۔

اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کہ آپ پہلے بھی تشریف لائے تھے۔ اور حکیم وقار نے آپ کو سکون کی کچھ دوائیں دی تھیں اور دو تین دن بعد آپ کو بلایا بھی تھا لیکن لگتا ہے کہ یقیناً آپ مصروف ہو گئے ہوں گے۔ ویسے آپ کا پیشہ بھی زیادہ مصروفیت والا ہے، ہر کیس کے لئے زیادہ چھان پھٹک کرنی پڑتی ہے۔

"خیر آپ جس مقصد کے لئے آئے ہیں تو کھل کر بتائیں کہ اصل مسئلہ کیا درپیش ہے؟"

رولوکا کی بات سن کر وکیل صاحب نے ایک لمبا سانس لیا۔ اپنی دونوں آنکھیں بند کر لیں اور اپنا سر اوپر کو اٹھایا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اپنے حالات کی کڑیاں ملا رہے ہوں اور سرا ڈھونڈ رہے ہوں کہ بات کہاں سے شروع کروں۔

خیر انہوں نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور رولوکا کی طرف دیکھتے ہوئے گویا ہوئے۔ "حکیم صاحب واقعی آپ نے صحیح اندازہ لگایا ہے کہ میں حقیقت میں آج کل اپنے حال سے بے حال ہو رہا ہوں۔ میرا دن اور رات کا چین سکون غارت ہو کر رہ گیا ہے۔ دن تو خیر جیسے تیسے گزر ہی جاتا ہے۔ مگر رات ہوتے ہی بس یہ سمجھیں کہ میں انگاروں پر لوٹنے لگتا ہوں۔

رات گزرنے کے بعد جب مجھے ہوش آتا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ واقعی میں موت کے منہ سے واپس آیا ہوں۔ بس یہ سمجھیں کہ رات میں میرے پورے جسم سے جیسے میری روح نکل جاتی ہے اور میں بے سدھ کوئی بھی حرکت کئے بنا اپنے کمرے میں بستر پر پڑا رہتا ہوں ہول دہلا دینے والے خوفناک، حیرت ناک اور جسم سے جان نکالنے والے منظر رونما ہوتے ہیں کہ اسے بیان کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں۔

کوئی بھٹکی ہوئی روح ہے جو کہ میرے پیچھے پڑ گئی ہے۔ وہ کسی صورت بھی مجھے چین نہیں لینے دیتی، رات بھر اس کی وجہ سے میں اذیت میں رہتا ہوں، وہ اکثر کہتی ہے بلند آواز سے، میں اس کی واضح الفاظ سنتا ہوں۔ اس کے الفاظ ہیں۔

"وکیل حیدر علی! کیا تمہاری زندگی کا خاتمہ کر دیا جائے، مگر تمہارا جواب نفی میں ہوگا کیوں کہ تم مرنا نہیں چاہتے، لیکن یاد رکھو کہ اب تمہاری زندگی کی ہر رات ناقابل برداشت اذیت ناک ہوگی، تم چین اور سکون کے لئے ترسو گے، مگر تمہیں سکون نہیں ملے گا، وہ دن دور نہیں کہ تم خود اپنی موت کے طلبگار ہو گے، تم گڑگڑا کر موت مانگو گے مگر موت تم سے اتنی دور چلی جائے گی کہ تم تصور تک نہیں کر سکتے، تم دھوکے باز ہو، تم نے نہ جانے کتنے معصوم، بے کس اور مجبور لوگوں کی زندگی میں زہر گھول دیا ہے۔ تم چند ٹکے کے لئے لوگوں کو اذیت ناک حالات سے دوچار کر دیتے ہو۔ کیا تمہیں یاد ہے کہ تم نے چند ہزار کے لئے کتنے لوگوں کو موت کے منہ میں

دھکیل دیا، تمہاری کرنی اور کرتوت سے نہ جانے کتنے لوگ سسک سسک کر موت سے ہمکنار ہوگئے، اور کتنے ایسے ہیں جو کہ زندہ در گور ہو چکے ہیں۔

وکیل حیدر علی ابھی تو تمہارے ساتھ کچھ بھی نہیں ہوا۔ اب آہستہ آہستہ جن حالات سے تم دوچار ہوگے تم اس کا تصور بھی نہیں کرسکتے، تم نے دھوکہ دہی سے جو دولت اکٹھی کی ہے وہی دولت تمہارے پورے جسم میں انگارہ بھر دے گی، تمہاری رگوں میں دوڑتا ہوا خون گرم پگھلا ہوا سیسہ بن جائے گا، تم مرنا چاہو گے مگر موت تمہارے سامنے کھڑی قہقہہ لگاتی رہے گی۔ تم اپنے عبرت ناک انجام کے لئے ہر وقت تیار رہو۔ ہر آنے والی رات تمہارے لئے قیامت سے بھی بدتر ہوگی۔"

اور یہ بول کر وکیل صاحب نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام کر بیٹھ گئے۔

وکیل صاحب کی ساری باتیں سن کر رولو کا بولا۔

"وکیل صاحب جو باتیں آپ بتا رہے ہیں، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ واقعی کوئی بھری ہوئی روح ہاتھ دھو کر آپ کے پیچھے پڑ گئی ہے، اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ وہ آپ کو مار دے، بلکہ وہ چاہتی ہے کہ آپ ہر وقت ہر پل اذیت سے دوچار رہیں۔

مگر جو بات غور طلب ہے وہ یہ ہے کہ وہ ایسا کیوں کررہی ہے؟ ان تمام باتوں کے پس پشت اصل بات کیا ہے؟ جس کے لئے وہ آپ کو اذیت دے رہی ہے۔

اور جہاں تک میں نے آپ کی باتوں سے اندازہ کیا ہے کہ آپ سے دانستہ یا نادانستگی میں کوئی فعل ایسا سرزد ہوا ہے جس کی وجہ سے کوئی اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے، اور یہ غلطی یقیناً وکالت سے مطابقت رکھتی ہے۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وکیل صاحبان اپنے کیس کو جیتنے کے لئے بڑھ چڑھ کر دلائل دیتے ہیں اور ثابت کرتے ہیں کہ میرا موکل ہر صورت میں بے قصور ہے، چاہے وہ موکل قصوروار ہی کیوں نہ ہو، جس کے پاس کثیر دولت ہوتی ہے وہ جیت جاتا ہے، اپنی دولت کے بل بوتے پر، یہاں تک کہ دولت سے گواہوں کو خرید لیتا ہے، یا پھر بسا اوقات گواہوں کو اتنا مجبور کردیا جاتا ہے کہ گواہ اپنے بیانات بدل دیتے ہیں، یا پھر گواہ اپنی جان چھڑا لیتا ہے، یا پھر کبھی کبھار گواہ کو راستے سے ہٹا دیا جاتا ہے یعنی زندگی سے اس کا پتا صاف کردیا جاتا ہے۔

خیر جو ہونا تھا وہ تو ہوگیا، اب یہ دیکھنا ہے کہ وہ روح کیا چاہتی ہے، وہ آپ کے پیچھے کیوں پڑی ہے، اس کے ساتھ کیا زیادتی ہوئی ہے کہ وہ اس قدر غضبناک ہوگئی ہے؟

جب تک اس کی مرضی سامنے نہیں آتی اس وقت تک کوئی حتمی فیصلہ ممکن نہیں۔ اس مسئلے کے خاتمہ کے لئے یقیناً آپ کو چند دن انتظار کرنا ہوگا۔

میں آج رات اس روح سے رابطہ کرکے معلوم کرتا ہوں کہ وہ کون ہے؟ آپ کی ذات سے اس کا کیا واسطہ ہے؟ اور کس صورت میں وہ آپ کی ذات سے دور ہوگی اور یہ بے حد ضروری ہے کہ اصل بات سامنے آئے اور اس مسئلے کے خاتمہ کے لئے کون سا قدم اٹھایا جائے۔

کہیں ایسا نہ ہو کہ اصل بات جانے بغیر کوئی قدم اٹھایا جائے جس سے وہ مزید برہم ہوکر کوئی انتہائی قدم اٹھالے اور آپ کو ناقابل تلافی نقصان ہوجائے۔ آپ گھبرائیں نہیں، دل کو مضبوط رکھیں، میں آج ہی رات اس سے رابطہ کروں گا تاکہ حقیقت کھل کر سامنے آئے۔

ہاں اتنا میں ضرور کردوں گا کہ آج کی رات وہ آپ کے قریب نہ آئے اور آپ پرسکون نیند سو سکیں، یہ میرا آپ سے وعدہ ہے، آپ اپنے فلیٹ کا پتا لکھ کر دے جائیں۔

اور ہاں ایک بات اور ذہن میں رکھیں کہ جو حقیقت سامنے آئے گی اور جن حالات سے وہ دوچار ہے اس کے تدارک کے لئے آپ ابھی سے ذہنی طور پر تیار رہیں، خیر یہ بات بھی اٹل ہے کہ میں اسے آپ کے ساتھ زیادتی نہیں کرنے دوں گا، اور میری کوشش ہوگی کہ افہام و تفہیم سے اذیت ناک مسئلہ حل ہوجائے، وہ بھی مطمئن ہوکر اپنی راہ لے اور آپ بھی پرسکون رہیں۔"

رولوکا یہاں تک بول کر خاموش ہوگیا۔

وکیل صاحب نے پھر ایک لمبا سانس کھینچا اور بولے۔ "حکیم صاحب میں آپ کی ہدایات پر عمل کروں گا، پلیز! جتنی جلدی ہوسکے میری جان اس سے چھڑادیں، کہیں ایسا نہ ہوجائے کہ خوف کی وجہ سے میرا ہارٹ اٹیک ہوجائے، کیونکہ جب وہ سامنے آتی ہے اور جیسے خوفناک منظر رونما ہوتے ہیں وہ بہت ہی جان لیوا ہوتے ہیں۔"

پھر رولوکا گویا ہوا۔ "اچھا آپ چند منٹ خاموش رہیں اور مجھ سے مخاطب نہیں ہونا۔" یہ بول کر رولوکا اپنی گردن جھکا کر بیٹھ گیا۔ چند منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ رولوکا کی گردن دائیں بائیں اور آگے کو ہلنے لگی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ کسی نادیدہ قوت سے معروف گفتگو ہے۔

زیادہ تر رولوکا کی گردن آگے ہی آگے ہلتی رہی۔ پھر چند منٹ اور گزرے کہ اس کی گردن متواتر صرف اوپر نیچے ہلتی رہی۔ اس کے بعد رولوکا خاموش ہوگیا اور پھر اس نے اپنی آنکھیں کھول کر وکیل صاحب کو بغور دیکھا۔

"وکیل صاحب آپ بے فکر ہوکر اپنے گھر جائیں، کسی قسم کا بھی خوف اپنے ذہن میں نہ لائیں، گھر جاکر آرام کریں، کھائیں پئیں اور پرسکون رہیں، ابھی سے لے کر کل تک یعنی جب تک آپ میرے پاس آئیں گے، اس وقت تک وہ آپ کے قریب بھی نہیں آئے گی، مگر ہر صورت میں آپ نے کل میرے پاس آنا ہے، چاہے آندھی آئے یا طوفان آپ نے آنا ہے...... اور اگر نہیں آئے تو حالات کے ذمہ دار آپ خود ہوں گے۔ میں صرف کل تک اسے آپ کے پاس آنے سے روکوں گا، کل جب آپ میرے پاس آئیں گے تو کل اور بات ہوگی۔ اب آپ تشریف لے جائیں اور ہاں یہ جو صاحب ہیں انہیں بھی آج آپ اپنے قریب ہی رکھئے گا تاکہ آپ گپ شپ کرتے رہیں اور ڈھارس رہے۔" رولوکا بولا۔

"جی حکیم صاحب! میں انہیں آج رات اپنے پاس ہی روک لوں گا ویسے یہ میرے ساتھ ہی ہوتے ہیں ان کا نام ذاکر ہے۔ ٹھیک ہے حکیم صاحب اب میں چلتا ہوں اور کل اس ٹائم آپ کی خدمت میں حاضر ہوجاؤں گا۔" یہ بول کر وکیل صاحب نے رولوکا سے مصافحہ کیا، وکیل صاحب کے بعد ذاکر نے بھی رولوکا سے مصافحہ کیا اور پھر دونوں رولوکا کے کمرے سے نکلتے چلے گئے۔

خیر دن ڈھل گیا اور رات ہوگئی۔ رولوکا اپنے تمام کام سے فارغ ہوکر اپنے کمرے میں آیا اور کمرے کی لائٹ بجھا کر اپنے بستر پر بیٹھ کر منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنے لگا۔ چند منٹ ہی گزرے تھے کہ اچانک کمرے کے ایک کونے میں دودھیا رنگ کا دھواں اٹھنے لگا، دھواں بہت گاڑھا تھا، پھر اس دھوئیں نے ایک وجود کا روپ دھار لیا، وہ نسوانی وجود تھا۔

رولوکا نے اس وجود سے کوئی آدھا گھنٹہ تک باتیں کرتا رہا، پھر بولا۔ "اچھا اب تم، جاؤ، کل رات میں، میں پھر تمہیں تکلیف دوں گا، میری بھی خواہش ہے کہ جلدازجلد یہ مسئلہ نمٹ جائے اور تمہیں بھی سکون ملے۔" یہ بول کر رولوکا خاموش ہوگیا اور پھر پلک جھپکتے ہی وہ وجود ہوا میں تحلیل ہوکر غائب ہوگیا۔ اس کے بعد رولوکا اپنے بستر پر لیٹ گیا اور حالات کے متعلق سوچنے لگا اور پھر اسی طرح نیند کی وادی میں پہنچ گیا۔

دوسرے دن حسب وعدہ وکیل حیدر علی اور ان کا ساتھی ذاکر دونوں رولوکا کے سامنے حاضر ہوگئے۔ رولوکا نے دونوں کو اپنے سامنے بیٹھایا اور وکیل صاحب سے مخاطب ہوا۔ "وکیل صاحب اور سنائیں کل رات میں وہ روح آپ کے پاس تو نہیں آئی۔"

وکیل صاحب بولے۔ "حکیم صاحب کل کی رات بہت آرام سکون سے گزری، ذاکر بھی میرے ساتھ ہی تھا، رات کافی دیر تک ہم باتیں کرتے رہے، اس کے بعد ہمیں نیند آگئی، مگر رات کے کسی پہر بھی اس کا کوئی شائبہ تک نظر نہیں آیا۔ آپ کا بہت بہت شکریہ، میں آپ کا یہ احسان پوری زندگی مانتا رہوں گا،

کہ آپ نے اس روح سے میری جان چھڑا دی۔ اب میرے لئے کیا حکم ہے؟"

رولوکا بولا۔ "وکیل صاحب آپ بے فکر ہو کر گھر جائیں، میں آج مغرب کے بعد آپ کے فلیٹ میں حاضر ہو جاؤں گا اور آپ کے سامنے اس روح سے باتیں ہوں گی اور حتیٰ الامکان میری کوشش ہوگی کہ آج رات ہی اس روح سے آپ کی جان ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوٹ جائے۔ اب آپ لوگ جاسکتے ہیں۔"

یہ سن کر وکیل صاحب بولے۔ "ٹھیک ہے حکیم صاحب اب ہم چلتے ہیں اور ہاں یاد آیا...... کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ شام میں، میں ذاکر کو گاڑی لے کر بھیج دوں تاکہ آپ گاڑی میں تشریف لے آئیں، اگر آپ خود آئے تو آپ کو آنے میں تکلیف ہوگی۔"

"وکیل صاحب آپ بے فکر رہیں۔ میری فکر نہ کریں میں آجاؤں گا۔" رولوکا بولا۔

اور پھر دونوں نے رولوکا سے مصافحہ کیا اور وہاں سے چلے آئے۔

دن گزر گیا اور پھر رات کا اندھیرا ہر سو مسلط ہو گیا۔ مغرب کے بعد رولوکا اپنے کمرے میں موجود تھا، اس نے اپنی آنکھیں بند کیں اور وکیل حیدر علی کے فلیٹ کا تصور کیا...... اور پھر پلک جھپکتے ہی رولوکا حیدر علی کے فلیٹ کے دروازے کے سامنے موجود تھا، پھر اس نے دروازے پر دستک دی۔

اور پھر چند لمحے ہی گئے ہوں کہ دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والا ذاکر تھا۔ رولوکا کو دیکھ کر وہ اچنبھے میں پڑ گیا کہ اتنے میں وکیل صاحب بھی آگئے اور رولوکا کو دیکھ کر عجیب کشمکش میں پڑ گئے کہ "حکیم صاحب یہاں تک پہنچے تو کیسے، بغیر کسی گاڑی کے، وہ بھی اس وقت۔" خیر جلدی سے رولوکا کو کمرے میں بیٹھایا اور وکیل صاحب نے رولوکا سے پوچھا۔ "حکیم صاحب آپ کے لئے چائے یا کافی لاؤں۔"

وکیل صاحب کی بات سن کر رولوکا بولا۔ "آپ کی بڑی مہربانی، مجھے اس وقت کسی چیز کی ضرورت نہیں، آپ آرام سے بیٹھیں۔ وقت بہت کم ہے اور مجھے اہم کام کرنا ہے۔" رولوکا کی بات سن کر وکیل صاحب اور ذاکر دونوں ہی اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ رولوکا بھی ایک طرف بیٹھ چکا تھا۔ پھر رولوکا بولا۔ "وکیل صاحب کمرے کی لائٹ بجھا دیں اور کسی بھی حالت میں آپ دونوں اپنی اپنی جگہ پر بیٹھے رہئے گا اور نہ ہی کوئی بات کریں گے، تھوڑی دیر میں وہ روح حاضر ہوگی، میں اس سے سوال جواب کروں گا اور آپ دونوں نے خاموش رہنا ہے۔"

دروازہ اور کھڑکیاں بند تھیں، کمرے میں مکمل اندھیرا تھا، رولوکا اپنی جگہ بیٹھا منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ رہا تھا، کوئی چھ سات منٹ گزرے ہوں گے کہ کمرے میں اچانک زبردست ہوا کا ایک جھونکا آیا، اس کے فوراً بعد ایک نسوانی آواز سنائی دی۔

"محترم عامل صاحب! آپ کی خواہش کے مطابق میں حاضر ہوں...... اور میرا نام روزی ہے۔"

روزی نام سننا تھا کہ ذاکر اور وکیل صاحب اپنی اپنی جگہ سے جیسے اچھل پڑے۔ وکیل صاحب تو ایسے ہوگئے تھے کہ جیسے کاٹو تو ان کے جسم میں لہو نہیں، اگر رولوکا نے منع نہیں کیا ہوتا تو شاید وکیل اور ذاکر دونوں اپنی جگہ سے اٹھتے اور کمرے سے فوراً بھاگ کھڑے ہوتے۔

کمرے کے ایک کونے میں دودھیا رنگ کا ایک نسوانی وجود کھڑا تھا اور اس کی آنکھوں کی جگہ ایسا لگتا تھا کہ جیسے دو انگارے دہکے ہوں۔

رولوکا کی آواز سنائی دی۔ "روزی تم یہ بتاؤ کہ وکیل حیدر علی سے تمہاری کیا ذاتی دشمنی ہے، تم کیوں ان کے پیچھے پڑی ہو، اور انہیں خوفناک طریقے سے اذیت دے رہی ہو، امید ہے تم بغیر کسی لاگ لپٹی کے صاف صاف بتاؤ گی۔"

اس روح کی آواز کمرے میں گونجی۔ "محترم عامل صاحب، یہ وکیل نہیں بلکہ وکیل کی شکل میں ظالم بھیڑیا ہے، اس کے دل میں کسی کے لئے ہمدردی نہیں سوائے

اپنے مفاد کے۔

میری اپنی کہانی تو بہت طویل ہے۔ میں نے کسی کو دھوکہ نہیں دیا، کسی سے فراڈ کر کے اس کی جائیداد یا دولت ہڑپ نہیں کی، یہ ضرور ہے کہ میں نے کئی عمر رسیدہ لوگوں سے شادی کی اور پھر وہ عمر رسیدہ میرے شوہر تھوڑے عرصے میں مر گئے۔ میری جوانی کا راز ایک غولو نامی دھوبی تھا، اس نے اپنے عمل سے مجھے جوان بنائے رکھا اور اس کے عوض میں اسے وقتاً فوقتاً بھاری رقم دیتی تھی۔ میں نے جو کیا وہ جائز کیا۔ میرے کئی شوہر مرے اور پھر ان کی جائیداد، مکان بینک بیلنس میرے نام ہو گئے۔

مگر اس وکیل نے میرے گرد دھوکہ دہی کا مضبوط جال بچھایا اور اس کے ساتھ اس منصوبے میں اس کے دو ساتھی شامل تھے، ایک گل خان اور دوسرا یہ جو اس کمرے میں بیٹھا ہے جس کا نام ذاکر ہے، اس وکیل نے مجھے محبت اور چاہت کا جھانسہ دے کر منصوبے کے تحت میرے نام کی ساری جائیداد اور بینک بیلنس اپنے نام کرا لے اور پھر انہی دنوں اس دھوبی غولو کا انتقال ہو گیا۔

اس کے انتقال کے بعد میری صحت اور جوانی ریت کی طرح بکھر گئی۔ اور میری موت واقع ہو گئی، میری لاش کئی دنوں تک بے یار و مددگار فلیٹ میں پڑی رہی، مگر اس وکیل کو مجھ پر ذرہ برابر بھی رحم نہیں آیا۔

عامل صاحب میں آپ کو منصف بناتی ہوں، آپ برائے مہربانی فیصلہ کریں کہ کیا اس وکیل نے میرے ساتھ انسانیت کا سلوک کیا، تو کیا اس کے اس سلوک کے بدلے مجھے کیا کرنا چاہئے تھا۔

میں اسے ہر صورت میں تڑپا تڑپا کر ماروں گی، یہ موت کے لئے گڑگڑائے گا، مگر موت اس کے قریب نہیں آئے گی اور اس کے ساتھ اس کے دونوں ساتھیوں کا بھی عبرت ناک انجام ہوگا۔

عامل صاحب اب آپ برائے مہربانی خود فیصلہ کریں اور اس سے معلوم کریں، کہ جو کچھ میں نے بتایا ہے کیا اس میں کسی قسم کا بھی مبالغہ ہے۔" اور یہ بول کر وہ روح خاموش ہو کر رولوکا کی طرف یک ٹک دیکھنے لگی۔

وکیل حیدر علی اور ذاکر اپنی اپنی جگہ سر جھکائے بیٹھے تھے ان کے انداز سے واضح طور پر شرمندگی ظاہر ہو رہی تھی۔ رولوکا نے وکیل حیدر علی سے وضاحت چاہی تو وکیل نے تمام باتوں کا اعتراف کر لیا اور بولا۔

"میں بہت شرمندہ ہوں اور معافی کا خواست گار ہوں، عامل صاحب آپ کا جو فیصلہ ہوگا میں اسے من و عن تسلیم کروں گا۔ میں ایک بار پھر اپنی غلطی کی روزی سے معافی مانگتا ہوں۔"

رولوکا بولا۔ "روزی تم انہیں معاف کر دو، اور معاف کرنے والے کو دنیا کا خالق و مالک بہت پسند کرتا ہے، مالک کی نظر میں بہادر وہ ہے جو اپنے دشمنوں سے بدلہ نہ لے اور دشمنوں کو صدق دل سے معاف کر دے۔ ان تمام باتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے اب تم خود ہی فیصلہ کرو تاکہ تمہیں بھی سکون ملے، تم بھٹکنے سے بچ جاؤ اور اپنی اصلی منزل پر پہنچ جاؤ۔"

پھر روزی کی آواز سنائی دی۔ "عامل صاحب میں چاہتی ہوں کہ یہ وکیل میری تمام جائیداد، مکان دکان اور بینک بیلنس واپس کر دے، اور یہ تمام چیزیں آپ کے سپرد کر دے، ایک ایک پائی یہ واپس کرے گا۔ اس کے بعد ان تمام جائیداد کو فروخت کر کے اور بینک میں جو بھی رقم ہے وہ تمام رقم آپ تین حصوں میں تقسیم کریں گے۔ ایک حصہ مسلمان، یتیم خانے میں دیں گے، دوسرا حصہ ہندوؤں کے اناتھ آشرم میں اور تیسرا حصہ عیسائیوں کے اولڈ ایج ہاؤس میں دیں گے، میں اس میں خوش ہوں، آپ جلد از جلد یہ کام نمٹا دیں، میری خوشی کی خواہش اب میں جا رہی ہوں۔" اور یہ بول کر روزی کی روح غائب ہو گئی۔ اور پھر وکیل حیدر علی نے وہی کچھ کیا جس کے لئے روزی کی روح نے کہا تھا تمام رقم رولوکا کے حوالے کر دی تو رولوکا نے وکیل حیدر علی کو گواہ بنا کر ساری رقم ان تینوں جگہ پر دے دی

جس کے لئے روزی کو اس نے کہا تھا۔

اور اس طرح وکیل حیدر علی کی جان روزی کی روح سے چھوٹ گئی۔ ذاکر، گل خان اور وکیل حیدر علی نے رولوکا کا بہت بہت شکریہ ادا کیا۔

☆...☆...☆

رولوکا حکیم وقار کے سامنے بیٹھا تھا اور مختلف موضوع پر باتیں ہو رہی تھیں، حکیم وقار کے سامنے ایک موٹی سی کتاب پڑی تھی، حکیم وقار رولوکا کے آنے سے پہلے اس کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے، اس کتاب کو دیکھ کر رولوکا بولا۔ ”لگتا ہے یہ کوئی اہم کتاب ہے، جس کا آپ مطالعہ کر رہے ہیں۔

کیا آپ اس کتاب میں درج کہانی مجھے بھی سنانا پسند کریں گے، اور کس موضوع پر یہ کتاب لکھی گئی ہے؟“

رولوکا کی بات سن کر حکیم وقار مسکرائے اور گویا ہوئے۔

”حکیم صاحب اس کتاب کا نام ہے ”گل عشق“ یہ دو محبت کرنے والوں کی داستان ہے، جنہوں نے ایک دوسرے کی چاہت میں اپنی جان دے دی، مصنف لکھتا ہے کہ یہ بالکل حقیقت پر مبنی ہے اور حقیقت میں ایسا ہوا تھا۔

”آپ سنیں میں داستان شروع کرتا ہوں۔“ حکیم وقار نے کہا۔ اور رولوکا کو داستان ”گل عشق“ سنانے لگے۔

وادی سندھ جو کہ صدیوں سے موجود ہے اس ضلع ٹھٹھہ کا علاقہ، جہاں ہر طرف بے برگ و بار پہاڑیاں اور پتھریلے چٹیل میدان نظر آتے ہیں، چند سو سال پیشتر یہ سرزمین ایسی بنجر، اتنی بے آب و گیاہ نہیں تھی، اس وقت یہ ایک حسین اور سرسبز وادی تھی۔ دریا اس وادی کے بیچوں بیچ گزرتا تھا۔ اور دریا کے دونوں جانب تاحد نظر تک لہلہاتے کھیت اور پھلوں سے لدے باغات نظر آتے تھے۔ اس دور میں وہ وادی سلطنت بھنبھور کے نام سے مشہور تھی، اور اس سلطنت کی فرمانروائی دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔

اس سلطنت میں کئی چھوٹے بڑے شہر شامل تھے۔ جہاں دور دور سے تاجروں اور سوداگروں کے قافلے آتے اور اپنا سامان تجارت بیچ کر خوش و خرم اپنے ملکوں کو واپس جاتے تھے۔ وادی بھنبھور انواع واقسام کے پھلوں، میووں کے علاوہ نہایت عمدہ قسم کے ملبوسات کی وجہ سے بھی مشہور تھی، اور ملکوں ملکوں سے لوگ ان کی خرید کے لئے یہاں آتے تھے، شہروں کے علاوہ ان گنت دیہات دریا کے دونوں طرف کوسوں دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ ان دیہاتوں اور شہروں کے لوگ طاقتور اور وجیہ تھے۔ اور یہاں کی عورتیں بے حد حسین اور خوش جمال تھیں۔ سرخ و سپید رنگت، اور لمبے سیاہ بالوں والی الہڑ دوشیزائیں، جب بھنبھور کے روایتی لباس میں شہر کے بازاروں میں نکلتیں تو لوگ انہیں دیکھتے رہ جاتے۔ اور سرسبز کھیتوں کی منڈیروں پر اٹھلاتی ہوئی حسین الہڑ مٹیاروں کو دیکھ کر تو لوگ سحرزدہ سے رہ جاتے تھے۔ لمبی لمبی چوٹیوں کی شکل میں گندھے ہوئے سیاہ بال بڑی بڑی روشن آنکھیں اور سرخ یاقوتی ہونٹ، سیندور ملے میدے کی سی رنگت اور سندھ کے روایتی سرخ لباس میں ملبوس ان کا بھرا گداز جسم دیکھنے والوں کی نگاہوں میں کھب کر رہ جاتا تھا، الغرض بھنبھور میں اس وقت ہر سمت حسن ہی حسن تھا۔ ہر شے خوبصورت اور بے مثل تھی۔ خوشحالی اور امن وامان کے اس سنہرے دور میں وادی بھنبھور پر جس بادشاہ کی حکمرانی تھی۔ اس کا نام آدم جام تھا۔ ہندوستان کی دوسری ریاستوں کے حکمرانوں اور راجاؤں کے برعکس یہ بادشاہ نہ تو عیاش اور ہوس پرست تھا، نہ ہی ظالم اور غیر منصف مزاج بلکہ اس کی رحم دلی، منصف مزاجی اور غریب پروری کے چرچے زبان زد خاص وعام تھے، رعایا اپنے محبوب بادشاہ کی پرستار تھی اور آدم جام بھی اپنی رعایا کے ہر فرد سے یکساں محبت کرتا تھا، بھنبھور کے لوگ فخر سے اپنے بادشاہ کی دلیری، دوراندیشی اور عدل وانصاف کا تذکرہ کیا کرتے تھے۔

بادشاہ آدم جام ایک خوب صورت محل میں رہتا تھا، مگر اس محل کے دروازے ہر غریب اور امیر کے لئے شب و روز کھلے رہتے تھے، بادشاہ ہر روز اس محل کے وسیع دیوان خانے میں اپنا دربار سجاتا تھا۔ جس میں اس کے وزیر اور دیگر علاقوں کے امیر اور دانشور بھی شامل ہوتے تھے۔ قدرت نے آدم جام کو بے شمار دولت اور ان گنت خزانوں کا مالک بنایا تھا۔ مگر وہ اس دولت کو اپنی ذاتی عیاشیوں پر صرف کرنے کی بجائے، عوام کی فلاح و بہبود پر خرچ کرتا تھا، دن بھر ان گنت ضرورت مند لوگ اس کے دربار میں حاضری دیتے اور اپنی مرادیں پا کر خوش و خرم واپس جاتے تھے۔

بادشاہ آدم جام بظاہر بہت خوش و خرم رہتا تھا اور اپنی رعایا کے مسائل حل کرنے میں مگن رہتا تھا، لیکن اس کی بے پناہ دولت اور زر و جواہر کے خانوں کے باوجود ایک غم ایسا تھا جو آدم جام کو اندر ہی اندر کھائے جارہا تھا۔ آدم جام اب عمر کے اس مرحلے میں تھا، جب اولاد کی خواہش ہر شخص کے دل میں شدت سے پیدا ہوتی ہے۔ آدم جام کی جوانی ڈھل چکی تھی، مگر وہ ابھی تک اولاد کی نعمت سے محروم تھا، اکثر تنہائی میں بیٹھ کر وہ پہروں اسی فکر میں غلطاں رہتا کہ آخر اس وسیع و عریض سلطنت اور اس کی بے پناہ دولت کا وارث کون ہوگا؟ اس کے مرنے کے بعد اس رعایا کا، جو اسے اپنی اولاد ہی کی طرح عزیز ہے، کون خیال رکھے گا۔ آخر وہ یہ تخت و تاج، یہ محل اور سلطنت کسے سونپ کر جائے گا۔

کبھی کبھی ملکہ اسے یوں فکر مند اور اداس دیکھ کر اس کی دل جوئی کی کوشش کرتی اور اس سے پوچھتی کہ آخر اس کی پریشانی کی وجہ کیا ہے، بادشاہ آدم جام پہلے تو بہت عرصے سے ٹالتا رہا۔ مگر آخر ایک بار جب ملکہ نے بہت اصرار کیا، تو آدم جام نے اسے بتا ہی دیا کہ اسے کون سا غم ہے، اس کی بات سن کر ملکہ بھی خاموش ہوگئی۔ اس کی حسین آنکھوں میں ایک دکھ کا سایہ سا لہرا گیا، مگر بادشاہ کی اس پریشانی کا اس کے پاس بھی کوئی حل نہ تھا۔

آدم جام کا وزیراعظم ایک بہت زیرک، بہت دور اندیش شخص تھا۔ بادشاہ اس پر بے انتہا اعتماد کرتا تھا اور اسے یقین تھا کہ دنیا کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں، جسے وہ حل نہ کرسکتا ہو، کئی مرتبہ اس نے ارادہ کیا کہ وہ وزیراعظم سے اس پریشانی کا تذکرہ کرے، مگر ہر بار اس نے یہ ارادہ ملتوی کردیا۔

آخر ایک دن جب دربار برخاست ہوگیا تو وزیراعظم نے خود ہی بصد ادب بادشاہ سے پوچھ لیا کہ "وہ کچھ دنوں سے پریشان اور فکرمند ہیں۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟" بادشاہ نے اسے اپنے غم سے آگاہ کیا تو ایک لمحے کے لئے وہ سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر اس نے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ وہ کسی بزرگ، کسی ولی اللہ کے آستانے پر جاکر اللہ سے اولاد کے لئے دعائیں مانگیں۔ اللہ کے ان نیک بندوں کی دعاؤں میں بڑا اثر ہوتا ہے۔ بادشاہ نے اس کی بات گرہ سے باندھ لی اور فقیروں مولویوں کے آستانوں پر حاضری دینے لگا۔

سندھ کی سرزمین کو صدیوں سے یہ فخر حاصل تھا کہ اللہ کے بے شمار برگزیدہ بندوں اور ولیوں نے اس سرزمین کے مختلف حصوں میں قیام کیا، اور خلق خدا کو رشد و ہدایت کا درس دیتے رہے۔ بادشاہ آدم جام ان بزرگوں کے مزاروں پر جاکر اللہ سے گڑگڑا کر یہ دعائیں مانگنے لگا کہ پروردگار اسے اولاد سے نواز دے، تاکہ اس کے تخت و تاج کا وارث پیدا ہو اور اس کی نسل آگے بڑھے۔ دن مہینوں میں بدلے اور مہینے برس بن گئے۔ مگر آدم جام کے معمول میں کوئی فرق نہ آیا۔ اسے جہاں بھی کسی بزرگ، کسی ولی، کسی پیر فقیر کے آستانے کا علم ہوتا وہ فوراً پہنچ جاتا اور اللہ کے ان محبوب بندوں کی وساطت سے اپنی گود بھرنے کی دعائیں مانگتا رہتا۔ آخر اللہ تعالیٰ کو اس کی حالت پر رحم آگیا اور اس کی دعا نے قبولیت پائی۔

جب ملکہ نے آدم جام کو بتایا کہ وہ امید سے ہے تو اسے یقین نہ آیا۔ مگر جب ملکہ نے پورے وثوق

سے اس غیر متوقع بات کا یقین دلایا تو بادشاہ دیوانہ ہوگیا۔ سب سے پہلے تو وہ اللہ کے حضور شکر گزاری سے سجدہ ریز ہوا۔ پھر اس نے پوری سلطنت میں جشن کا اعلان کیا اور رعایا کے لئے اپنے خزانوں کے منہ کھول دیئے۔ لوگ دور دور سے اپنی حاجتیں لے کر آتے اور بادشاہ آدم جام کے محل سے بامراد لوٹتے۔ بھنبھور کے لوگ اپنے محبوب فرمانروا کی خوشی میں پوری طرح شریک تھے، اور اس بات پر مطمئن تھے کہ اب ان کا مستقبل کے بادشاہ کا پیدا ہونے کی امید ہوگئی ہے۔

اس زمانے میں یہ دستور تھا کہ ہر بادشاہ کے دربار میں شاہی نجومیوں اور جوتشیوں کی ایک جماعت ضرور ہوتی تھی، اور بادشاہ ہر کام سے پہلے انہیں یہ حکم دیتا تھا کہ ستاروں کا حساب لگا کر وہ اس کام کے انجام سے آگاہ کریں۔ یہ نجومی جو ستاروں کے علم اور فال ورمل میں کامل مہارت رکھتے تھے، ان کا حساب ہمیشہ درست ثابت ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی بات اور ان کے مشورے کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔

چند ہفتے گزرنے کے بعد جب یہ بات یقینی ہوگئی کہ ملکہ کی گود واقعتاً ہری ہونے والی ہے، تو بادشاہ نے نجومیوں اور شاہی جوتشیوں کو بلایا اور حکم دیا کہ ہونے والے بچے کی پوری زندگی کا زائچہ تیار کریں اور یہ بتائیں کہ اس کے ہاں شہزادہ جنم لے گا یا شہزادی۔

شاہی نجومیوں نے بادشاہ سے سات دن کی مہلت مانگی اور اپنے اپنے خلوت کدوں میں جا کر ستاروں کے حساب میں مستغرق ہوگئے۔ سات روز کے بعد جب وہ سب دربار میں حاضر ہوئے تو خاصے فکرمند اور سہمے ہوئے سے تھے۔ ادھر بادشاہ بھی اپنے ہونے والے بچے کے بارے میں جاننے کے لئے بہت بے چین تھا، نجومی دربار میں آئے تو اس نے نہایت بے تابی سے پوچھا کہ ان کا حساب کیا کہتا ہے بادشاہ کی بات سن کر نجومی خاموش رہے اور متذبذب نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ آخر بادشاہ نے سخت لہجے میں پوچھا تو سب سے بڑا نجومی اٹھ کھڑا ہوا اور ہچکچاتے ہوئے مودب لہجے میں بولا۔

"جہاں پناہ، ہمیں افسوس ہے کہ ہم آپ کے لئے کوئی اچھی خبر نہیں لائے۔"

"کیا مطلب؟" بادشاہ نے قدرے کرخت لہجے میں کہا۔

"کھل کر بتاؤ کہ تم نے کیا حساب کتاب لگایا ہے۔"

نجومی نے ایک بار پھر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور سہمے ہوئے انداز میں بولا۔ "حضور ہم سب نے ہونے والے بچے کے بارے میں جو حساب لگایا ہے، اور ستاروں کی چال سے جو زائچہ تیار کیا ہے، اس کی رو سے آپ کے ہاں ایک نہایت حسین وجمیل بچی پیدا ہوگی مگر افسوس کہ وہ بچی بڑی ہوکر آپ کے لئے باعث ذلت ورسوائی ثابت ہوگی، اور اس کا انجام بھی بہت عبرت ناک ہوگا۔" یہ کہہ کر وہ ایک لمحے کو رکا، پھر التجائیہ انداز میں بولا۔

"جہاں پناہ!! اگر آپ اپنی نیک نامی اور شہرت برقرار رکھنا چاہتے ہیں، تو آپ کو چاہئے کہ اس بچی کو پیدا ہوتے ہی موت کے گھاٹ اتار دیں، اور اگر ایسا نہ ہوسکا تو ہمیں ڈر ہے کہ آپ اپنی رعایا کی نظروں میں کہیں بدنام اور بے وقار نہ ہوجائیں۔"

بادشاہ آدم جام نجومی کی یہ بات سن کر سکتے میں آگیا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ برسوں کی منت اور مرادوں کے بعد اس کا گل آرزو، بار آور ہونے والا ہے، تو اس شجر نو شگفتہ کو تناور درخت کی صورت میں دیکھنا بھی اس کی قسمت میں نہیں ہے، مگر وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ نجومیوں کی بات غلط نہیں ہوسکتی۔ اس سے پہلے بھی ان کا حساب سو فیصد درست ثابت ہوا تھا، اور بے شمار مرتبہ ان کی کہی ہوئی باتیں بالکل حقیقت کی صورت میں ظاہر ہوچکی تھیں۔

اس دن سے بادشاہ فکرمند رہنے لگا، پہلے تو وہ اولاد کی تمنا کے غم میں گھل رہا تھا، لیکن اب اسی اولاد سے نجات حاصل کرنے کی فکر نے اس کا سکون چھین رکھا

تھا، اس اولاد کی خاطر اس نے کتنی دعائیں مانگی تھیں ، جانے کہاں کہاں کی خاک چھانی تھی، کتنے دنوں کا سکھ چین اور کتنی طویل راتوں کی نیند اس نے اس ایک خوشی کے انتظار میں گنوادی تھیں۔ اب کہ اس کی مراد پوری ہونے والی تھی تو وہ پہلے سے بھی زیادہ بے سکون، بے چین رہنے لگا تھا، ایک طرف اولاد کی آرزو اس کے دل میں چٹکیاں لیتی تھی، تو دوسری طرف اسے اس وسیع وعریض سلطنت، اس نیک نامی اور شہرت کا خیال تھا، جو برسوں کی جدوجہد کے بعد اس نے حاصل کی تھی۔

بہت سوچ بچار کے بعد بالآخر اس نے فیصلہ کرلیا کہ اولاد تو پھر بھی پیدا ہو سکتی ہے، بلکہ عین ممکن ہے کہ آئندہ اس کے ہاں کوئی شہزادہ کوئی ولی عہد جنم لے لیکن وہ عزت اور نیک نامی جس کے لئے اس نے زندگی بتادی تھی، کسی قیمت پرداؤ پر نہیں لگائی جاسکتی تھی۔ اس نے دل ہی دل میں طے کرلیا کہ وہ بچے کی پیدائش تک انتظار کرے گا۔

اگر نجومیوں کے کہنے کے مطابق واقعی لڑکی پیدا ہوئی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی باقی پیشین گوئیاں درست ثابت ہوں گی۔ لہٰذا وہ اس لڑکی کو بلا تاخیر موت کی نیند سلادے گا۔

چند ماہ کے بعد بالآخر وہ دن بھی آن پہنچا، جب اس کے ہاں بچے کی ولادت ہونے والی تھی۔ ملکہ زنان خانے میں تھی، جہاں خادمائیں اور دائیاں اس کے اردگرد موجود تھیں، اور ادھر بادشاہ آدم جام بے چینی سے اپنی خواب گاہ میں ٹہل رہا تھا، وہ دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہا تھا کہ خدا کرے نجومیوں کی بات غلط ثابت ہو، اور اس کے ہاں لڑکا پیدا ہو۔ اگر ایسا ہوگیا تو اسے ہر فکر سے نجات مل جائے گی، اور دوہری خوشی نصیب ہوگی، ایک تو یہ کہ اس کا ولی عہد، اس کے تخت وتاج کا وارث نصیب ہوگا۔ اس کے علاوہ وہ ایک خون ناحق سے بچ جائے گا۔ وہ اسی فکر میں مبتلا تھا۔

اچانک زنان خانے سے بچے کے رونے کی آواز سنائی دی۔ بادشاہ فوراً اپنی خواب گاہ سے نکلا اور محل کے طویل برآمدے میں آگیا۔ چند لمحوں کے بعد زنان خانے سے ایک کنیز آئی اور آدم جام کو یہ خبر سنائی کہ "آپ ایک حسین وجمیل بچی کے باپ بن گئے ہیں۔"

بادشاہ پر یہ خبر بجلی بن کر ٹوٹ پڑی۔ اس کے سارے خواب بکھر گئے اور اس کی امیدوں کے سارے ایوان زمین بوس ہوگئے، اگر نجومیوں نے اسے بچی کے زائچے کے بارے میں نہ بتایا ہوتا تو وہ یہ خبر سنتے ہی نہال ہوجاتا اور کنیز کو منہ مانگا انعام دیتا۔ آخر اس اولاد کے لئے ہی تو اس نے اتنی مصیبت اٹھائی تھی، اتنے دور دراز کے سفر کئے تھے، اتنے بے شمار بزرگوں کے آستانوں پر حاضری دی تھی۔ اس اولاد کی خاطر تو اس نے شب وروز اپنے پروردگار سے دعائیں مانگیں تھیں۔

بچی کی پیدائش کی خبر سن کر بادشاہ کے دل میں شفقت پدری کا ایک جذبہ ابھرا اور اس کا جی چاہا کہ وہ فوراً زنان خانے میں جائے، اس ننھی بچی کو دیکھے جو اس کا خون تھی۔ اس کی برسوں کی آرزوؤں کا ثمر تھی۔ اسے سینے سے لگائے اور پیار کرے، مگر اگلے ہی لمحے اسے نجومیوں کی کہی ہوئی باتیں یاد آئیں جنہوں نے کہا تھا کہ یہ بچی بڑی ہوکر اس کے لئے ذلت ورسوائی کا سبب بنے گی۔

یہ خیال آتے ہی شفقت اور محبت کا جو جذبہ ایک لمحے کے لئے اس کے وجود کی گہرائیوں سے ابھرا تھا دم توڑ گیا اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے گھر میں کسی ناگن نے جنم لیا ہے، جو عنقریب اس کی نیک نامی، اس کی عزت اور اس کے تخت وتاج کی شہرت کو ڈسنے والی تھی۔

یہ خیال آتے ہی آدم جام نے اپنے دل میں سے ابھرنے والے اس نومولود جذبے کا گلا گھونٹ دیا اور دل ہی دل میں یہ منصوبہ بنانے لگا کہ وہ کس طرح اس منحوس بچی سے چھٹکارا حاصل کرے۔ یہ ایک نہایت مشکل مرحلہ تھا، ایک ایسا کام تھا جس میں وہ کسی کو شریک بھی نہیں بنا سکتا تھا۔ اس لئے کہ اس کے دربار کا ہر شخص، اس کے اہلکار اور امراء حتیٰ کہ اس کی رعایا کا ایک ایک

فرد اسے ایک رحم دل، ایک منصف مزاج، ایک عادل حکمران کے طور پر جانتا تھا، اگر کسی کو یہ پتہ چل جائے کہ یہ شخص اتنا سنگدل ہو سکتا ہے کہ اپنے ہاتھوں اپنی ہی اولاد کو ختم کرنے والا ہے تو شاید اس کے عدل و انصاف پر پھر کسی کو اعتبار نہ آ سکے گا، بہت سوچ بچار کے بعد اس نے طے کیا کہ وہ وزیراعظم سے مشورہ کرلے۔ اس لئے کہ وہی ایک ایسا شخص تھا، جو اس بات سے آگاہ تھا کہ نجومیوں نے اس بچی کے لئے کیا زائچہ بنایا تھا۔ اسے یہ بھی علم تھا کہ اس بچی کا زندہ رہنا، بادشاہ کے لئے کس قدر ذلت اور مشکلات کا باعث بنے گا۔ یقیناً وہ کوئی صحیح مشورہ دے گا۔

یہ خیال آتے ہی بادشاہ نے وزیراعظم کو طلب کیا اور اسے اپنی اس پریشانی سے آگاہ کیا۔ وزیراعظم اس کی بات سن کر سوچ میں ڈوب گیا پھر آداب بجالانے کے بعد بولا۔

"جہاں پناہ، اس معاملے پر میں نے پہلے بھی بہت غور کیا ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جب سے نجومیوں نے اس بچی کا زائچہ تیار کیا ہے، میں اسی الجھن میں گرفتار ہوں، ایک امید تھی کہ شاید نجومیوں کا حساب غلط ہو جائے لیکن بچی کی پیدائش نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ غلط نہیں کہہ رہے تھے، ان کی آدھی پیشین گوئی درست ثابت ہو چکی ہے، اور اب ان کی دوسری باتوں پر یقین نہ کرنے کا ہمارے پاس کوئی جواز نہیں ہے۔ جہاں تک میرا ذہن کام کرتا ہے، آپ کو ان نجومیوں کی ہدایت پر عمل کرنا ہوگا، اور اس بچی کو موت کے گھاٹ اتارنا ہوگا۔ ورنہ آپ جانتے ہیں یہ بچی بڑی ہو کر آپ کے لئے باعث ذلت ثابت ہوگی۔"

"لیکن وزیر میں اپنے دل کا کیا کروں، اپنے جذبۂ پدری کو کہاں لے جاؤں۔ تم تو جانتے ہو، میں نے کبھی کسی پر ظلم نہیں کیا۔ حتیٰ کہ اپنی رعایا کے ادنیٰ سے ادنیٰ فرد کی معمولی تکلیف پر بھی میرا دل تڑپ اٹھتا ہے۔ یہ تو پھر میری اولاد ہے میرا خون ہے، میری کئی برسوں کی دعاؤں کا ثمر، میری آرزو اور میرا جگر گوشہ ہے۔ میں اسے کیسے ہلاک کر دوں۔"

وزیر نے سر جھکا لیا اور ایک بار پھر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد اس نے سر اٹھایا تو اس کی آنکھوں میں امید کی چمک تھی۔ اس کے چہرے پر اطمینان کا تاثر تھا۔

"وزیراعظم، کیا کوئی ترکیب سمجھ میں آئی؟" بادشاہ کے لہجے میں بے چینی تھی۔

وزیراعظم نے اثبات میں سر ہلایا اور ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہنے لگا۔ "حضور ایک ایسی ترکیب میرے ذہن میں آئی ہے جس پر عمل کر کے نہ صرف آپ اس بچی سے ہمیشہ کے لئے چھٹکارا پالیں گے، بلکہ آپ ایک خونِ ناحق سے بھی بچ جائیں گے، اور آپ کا جذبۂ پدری بھی مجروح نہیں ہوگا۔"

"وہ کیا ترکیب ہے وزیراعظم؟" بادشاہ نے تیزی سے پوچھا۔

"جہاں پناہ، میرا خیال ہے آپ اپنی بچی کو قتل نہ کریں بلکہ اسے کسی صندوق میں بند کر کے دریا میں بہا دیں۔ پھر قسمت کا دھارا اسے جہاں چاہے لے جائے۔ اگر موت اس کا مقدر ہوگی تو وہ راستے میں ہلاک ہو جائے گی، یا مچھلیوں کی خوراک بن جائے گی، لیکن اگر خدا نے اسے زندہ رکھنا ہوا تو وہ اس وقت ہماری مملکت سے بہت دور چلی جائے گی، وہاں اگر کسی نے اسے دریا سے نکال لیا اور وہ پل کر جوان بھی ہو گئی تو کسی کو کیا خبر کہ وہ آپ کی بچی ہے۔ تب اگر وہ باعث ذلت بھی ہوگی تو آپ کی نیک نامی کو اس سے کوئی خطرہ نہ ہوگا۔"

وزیراعظم کی بات سن کر بادشاہ کے دل میں قدرے اطمینان ہوا۔ وہ ایک بار پھر وزیر کی ذہانت اور دور اندیشی کا قائل ہو گیا، اس نے واقعی ایک ایسی ترکیب سجھائی تھی، جس پر عمل کرنے سے نہ تو اس کے ضمیر پر ہی کوئی بوجھ ہوگا اور نہ ہی وہ کسی کے ناحق خون سے اپنے ہاتھ رنگے گا۔

بادشاہ نے اسی وقت ایک نہایت ماہر بڑھئی کو بلوایا

اور اسے ایک ایسا بے مثال صندوق تیار کرنے کا حکم دیا، جس میں ہوا کا گزر بھی ہو۔ مگر پانی اس کے اندر نہ جا سکے۔ اس کے علاوہ اس صندوق کے اندرونی حصوں میں ایسے خفیہ خانے اور درازیں ہوں جن میں زر و جواہر اور قیمتی سامان بحفاظت رہ سکے۔

بڑھئی نے بادشاہ کو یقین دلایا کہ وہ اس کی خواہش کے مطابق صندوق چند روز میں تیار کر دے گا۔ بادشاہ نے بڑھئی کو اس کی ضرورت کی تمام اشیاء مہیا کر دیں اور ساتھ ہی تاکید کی کہ وہ اس راز کو اپنے سینے میں محفوظ رکھے اور کبھی کسی کو یہ پتا نہ چل سکے کہ اس نے بادشاہ کے حکم پر ایسا صندوق بنایا تھا۔ بڑھئی نے بادشاہ کو یقین دلایا اور پورے انہماک سے اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

چند ہی روز کے بعد اس نے بادشاہ کی خواہش کے مطابق صندوق تیار کر دیا۔ بادشاہ نے صندوق کا معائنہ کیا تو وہ واقعی اس کے منصوبے کے لئے انتہائی موزوں تھا۔ صندوق کے اندرونی حصے میں ایک نرم گدا چھپا کیا گیا تھا، جس کے اوپر مخمل چڑھا ہوا تھا۔ ڈھکنے کے ساتھ بہت سے خانے اور درازیں بنی ہوئی تھیں، جن میں قیمتی چیزیں رکھ کر انہیں مقفل کیا جا سکتا تھا۔ صندوق اتنا کشادہ تھا کہ ایک بچی باحفاظت اس میں سما سکتی تھی۔ بادشاہ بڑھئی کے کام سے بہت خوش ہوا اور اس کو انعام و اکرام دے کر رخصت کر دیا۔

صندوق کی تیاری کے بعد بادشاہ اگرچہ کسی قدر مطمئن ہو گیا تھا لیکن ابھی سب سے کٹھن مرحلہ باقی تھا۔ اس کا جذبۂ پدری اور خون کی کشش بار بار اسے اس سفاکانہ اقدام سے روک رہی تھی۔

مگر ہر بار جب اس کا ارادہ ڈانواں ڈول ہونے لگتا تو نجومیوں کی کہی ہوئی باتیں اس کے کانوں میں گونجنے لگتیں اور اس کے ارادے میں مزید پختگی آ جاتی۔

جس روز صندوق تیار ہوا اسی روز بادشاہ نے اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنانے کا فیصلہ کر لیا اور رات ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ حسب معمول اس نے دربار میں شرکت کی۔ فریادیوں کی فریادیں سنیں اور رعایا کے مسائل حل کیے۔ شام گئے جب دربار برخاست ہو گیا تمام امراء اور وزراء رخصت ہو گئے تو بادشاہ دربار سے نکلا اور تھکے تھکے مضطرب قدموں سے محل کی طرف بڑھ گیا۔

شام کے بعد کا اداس، بے رنگ اندھیرا چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ سائیں سائیں کرتی ہوئی ہوا میں سسکیاں سنائی دے رہی تھیں، اور ایک عجیب سا اضطراب، ایک شدید بے چینی آدم جام کے رگ و پے میں سمائی ہوئی تھی۔ اس کے قدم من من بھر کے ہو رہے تھے اور محل تک کا فاصلہ ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔

ادھر آدم جام کی حسین ملکہ بے چینی سے اپنے سرتاج کی آمد کی منتظر تھی، جب سے بچی نے جنم لیا تھا، آدم جام ایک بار بھی حرم سرا میں نہیں آیا تھا۔ ملکہ یہی سمجھ رہی تھی کہ وہ اپنی شہزادی کی ولادت پر جشن کے انتظامات میں مصروف ہوگا، اور رعایا میں انعام و اکرام بانٹنے میں محو ہوگا۔ اسے کیا خبر کہ وہ تو ہمیشہ کے لئے اس ننھی سی معصوم ہستی سے چھٹکارا پانے کے منصوبے بنا رہا ہے جو اس وقت اس کے پہلو میں لیٹی ہوئی انگوٹھا چوس رہی تھی اور بھولی بھالی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

بادشاہ آدم جام حرم سرا میں داخل ہوا تو ایک لمحے کے لئے ٹھٹک کر رک گیا۔ ملکہ اسے دیکھتے ہی بے اختیار مسہری سے اٹھی اور بازو پھیلائے اس کی طرف بڑھی۔ بادشاہ نے کسی قدر حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ بچی کی ولادت کے باوجود ملکہ کے حسن و جمال میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ بلکہ اس کا چہرہ پہلے سے دلفریب اور پرکشش ہو چکا تھا۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی۔ ممتا کی چمک۔ اب وہ ایک بچی کی ماں بن چکی تھی ممتا کا لازوال جذبہ اور ماں ہونے کا پرغرور احساس شادابی بن کر اس کے سراپے میں سما چکا تھا۔

"میں تو بہت دیر سے آپ کی منتظر تھی سرتاج۔"

ملکہ یہ کہتے ہوئے آدم جام کے قدموں کی طرف جھک گئی۔ مگر اس نے اپنی محبوب بیوی کو دونوں بازوؤں سے تھام کر اٹھایا اپنے سینے میں بھر لیا بہت دیر تک اس کے مضبوط بازو ملکہ کے حسین جسم کا گداز محسوس کرتے

رہے اور وہ اس کے بدن کی حرارت محسوس کرتا رہا پھر آہستگی کے ساتھ اس نے ملکہ کو خود سے الگ کیا اور دونوں شانوں سے تھام کر مسہری پر بیٹھا دیا۔ اس کے بعد وہ بھی اس کے قریب بیٹھ گیا اور پلٹ کر اپنی بچی کی طرف دیکھنے لگا۔

جونہی اس کی نظر اس ننھی سی معصوم جان پر پڑی وہ اسے دیکھتا رہ گیا ایسی حسین بچی اس نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں ایک حسین چمک تھی۔ اس کے ننھے ننھے سرخ ہونٹ ادھ کھلے تھے اور وہ ٹک ٹک کر آدم جام کی طرف دیکھ رہی تھی، ایک لمحے کے لئے اس کے جی میں آیا کہ وہ اسے اٹھا کر اپنے سینے سے لگائے اور جی بھر کر پیار کرے مگر اس لمحے جب نجومیوں کی باتیں اسے یاد آئیں تو اسے یوں لگا جیسے اس کے سامنے ایک زہریلی ناگن، ننھی سی بچی کے روپ میں پڑی ہوئی ہے۔ جو آن واحد میں اس کی عزت اور شہرت کو ڈسنے والی ہے۔ بادشاہ نے نگاہیں بچی کے چہرے سے ہٹائیں اور ملکہ کی طرف دیکھنے لگا۔ شاید ملکہ نے اس کے دلی اضطراب اور اس کی نگاہوں کے بدلتے ہوئے تاثرات کو محسوس کر لیا تھا۔ اس نے آہستگی سے آدم جام کا ہاتھ تھاما اور بولی۔ "کیا بات ہے سرتاج آپ بچی کو دیکھ کر خوش نہیں ہوئے۔"

ملکہ کی بات سن کر آدم جام چند لمحے خاموش سر جھکائے بیٹھا رہا۔ پھر سر اٹھا کر اس نے ملکہ کی طرف دیکھا اور ہچکچاتے ہوئے اسے ان تمام حالات سے آگاہ کر دیا، جواب تک پیش آئے تھے۔ نجومیوں کے زائچے سے لے کر صندوق کی تیاری تک کے بارے میں اس نے تفصیل سے ملکہ کو بتایا اور پھر خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

ملکہ کئی لمحوں تک حیرت زدہ، بے یقین نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر دھیرے دھیرے اس کی آنکھیں نم آلود ہو گئیں۔ اس نے ممتا بھری نگاہوں سے بچی کی طرف دیکھا۔ اور پھر تقریباً چیختے ہوئے بولی۔"

"نہیں میرے سرتاج یہ سب جھوٹ ہے یہ تمام باتیں نجومیوں کے ذہن کی اختراع ہیں۔ ان کے اوہام ہیں، یہ ننھی سی معصوم جان بھلا آپ کے لئے کیوں کر خطرے کا باعث ہو سکتی ہے، یہ تو اللہ نے ہماری برسوں کی دعاؤں کا صلہ دیا ہے، یہ تو ہم دونوں کی لازوال محبت کی نشانی ہے، ہمارے جگر کا ٹکڑا ہے۔ آپ نجومیوں کی باتوں پر دھیان نہ دیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ بچی آپ کی شہرت میں اضافے کا سبب بنے گی۔" یہ کہتے کہتے ملکہ کی آواز رندھ گئی، اور آنسو اس کے حسین رخساروں پر بہنے لگے۔ آنسوؤں کی دھند میں اس نے آدم جام کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر وہی سنجیدگی طاری تھی۔ اور اس کی آنکھوں میں وہی فیصلہ کن ٹھہراؤ تھا۔

ملکہ ان نگاہوں کو اچھی طرح سمجھتی تھی۔ اسے پتہ چل گیا تھا کہ بادشاہ نے جو ارادہ کر لیا ہے، اس پر ضرور عمل کرے گا، لیکن آخری امید کے ساتھ اس نے اپنے شوہر کے قدموں کو تھام لیا اور بھنچی آواز میں بولی۔

"خدا کے لئے سرتاج، مجھے اس نعمت سے محروم نہ کیجئے۔ آپ کو کیا خبر میں نے اس کی خاطر کتنی راتیں جاگ کر گزاری ہیں کتنی ان گنت ساعتیں اس کے انتظار میں بسر کی ہیں۔ ابھی تو یہ معصوم چہرہ دیکھ کر میرا جی بھی نہیں بھرا۔ ابھی تو میں ممتا کے اس لازوال جذبے سے آشنا ہوئی ہوں، جو ہر عورت کی معراج ہوتا ہے' میں یہ صدمہ کیسے برداشت کروں گی کہ میری یہ معصوم بچی اتنی جلدی مجھ سے جدا ہو جائے، یقین کیجئے سرتاج یہ صدمہ میری برداشت سے باہر ہے۔ آپ ایک مرد ہیں اور آپ ایک ماں کے دل کی حالت کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ مگر میں اب اپنی اس لخت جگر کے بغیر زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ میں مر جاؤں گی سرتاج... میں مر جاؤں گی۔"

ایک لحظہ کے لئے آدم جام کے ارادے میں لغزش پیدا ہو گئی، مگر جلد ہی اس نے خود پر قابو پا لیا۔ وہ یہ اندازہ کر سکتا تھا کہ اس کی ملکہ کے دل کی حالت اس وقت کیا ہو گی۔ بلکہ خود اس کا اپنا دل بھی آنے والے

حادثے سے لرز رہا تھا۔ مگر اسے ہر قیمت پر یہ کٹھن کام سرانجام دینا تھا۔ اگر وہ اس وقت اپنے دل کے ہاتھوں اپنے جذبہ محبت کے ہاتھوں شکست کھا گیا تو شاید عمر بھر پچھتانا پڑے اور اسے اس وقتی جذبے کی قیمت اپنی عزت اور نیک نامی کی بربادی کی صورت میں ادا کرنی پڑے۔ نہیں وہ اپنے اس جذباتی ابال سے مات نہیں کھائے گا۔ اسے اپنا دل پتھر کا بنالینا ہوگا۔ اور یہ کڑوا گھونٹ پینا ہی ہوگا۔ اپنی برسوں کی محنت سے بنائی ہوئی عزت اور شہرت کو وہ یوں برباد نہیں ہونے دے گا۔ اپنی ذی حشم سلطنت اور نامور بادشاہت کو وہ یوں لوگوں کی تضحیک کا نشانہ نہیں بننے دے گا۔

یہ سوچتے ہوئے آدم جام نے آگے بڑھ کر بچی کو اٹھایا اور زنان خانے سے باہر کی طرف چل دیا، ملکہ اس کے پیروں سے لپٹ گئی اور اسے خدا اور رسول کے واسطے دیتے ہوئے اپنی محبت کا واسطہ دیتے ہوئے اس ظالمانہ اقدام سے باز رکھنے کی التجائیں کرنے لگی۔

مگر آدم جام نے اپنے کان اور آنکھ بند کرلیے تھے، اسے نہ تو ملکہ کا تڑپنا نظر آرہا تھا اور نہ ہی اس کی ممتا کی پکار سنائی دے رہی تھی۔ دل کڑا کرکے آخر وہ حرم سرا سے نکلا اور محل کے اس حصے میں پہنچ گیا جہاں اس نے صندوق رکھا ہوا تھا، اس کی اندرونی دروازوں اور خانوں میں اس نے پہلے ہی قیمتی زر و جواہر اور کچھ ریشم و اطلس کے ملبوسات رکھ دیئے تھے۔ تاکہ اگر یہ بچی زندہ بچ جائے اور کسی خدا ترس شخص کے ہاتھ یہ صندوق لگ جائے تو یہ دولت اس بچی کے لئے اور اس کی پرورش کرنے والے شخص کے لئے تمام زندگی ختم نہ ہو۔ اس کے علاوہ ایک کاغذ پر بچی کا سارا شجرہ نسب لکھ کر بھی اس نے صندوق میں رکھ دیا تھا۔ یہ صندوق بادشاہ آدم جام نے اپنے محل کے ایک ایسے خفیہ تہ خانے میں رکھا ہوا تھا، جہاں اس کے علاوہ کسی کو دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ وہاں پہنچ کر بادشاہ نے بچی کو کندھے سے اتارا۔ اور بہت دیر تک اس کی طرف دیکھتا رہا۔

ننھی سی معصوم بچی، کسی قدر حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ شاید وہ نگاہوں کی زبان سے اسے کہہ رہی تھی کہ "پیارے بابا، آپ مجھے کہاں لے جارہے ہیں، آپ کی نگاہوں میں میرے لئے اجنبیت اور نفرت کیوں ہے؟ کیا میں آپ کی بیٹی، آپ کا خون نہیں ہوں۔"

آدم جام ان نگاہوں کی تاب نہ لاسکتا تھا۔ اس کے دل کا اضطراب اس وقت عروج پر تھا۔ شفقت پدری بار بار اس کے ہاتھ روک رہی تھی، خون کی کشش اس کے دل میں کچوکے لگارہی تھی۔ مگر دنیاوی جاہ و حشم کی تمنا، ذاتی عزت اور نیک نامی کی ہوس، اس وقت انسانی رشتوں پر اور پدرانہ جذبے پر غالب آچکی تھی۔ مستقبل کے اندیشوں نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی۔ مگر آج بھنبھور کا "نیک دل، عادل و منصف فرمانروا" اس وقت دنیا کا سب سے سنگدل شخص بن چکا تھا۔

لرزتے ہاتھوں سے اس نے بچی کو صندوق کے اندر بنے ہوئے مخملی گدے پر لٹایا، دھڑکتے دل کے ساتھ ڈھکنا بند کیا اور اس صندوق کو کندھے پر اٹھا کر وہ تہ خانے سے باہر آگیا۔ آدم جام یہ کٹھن کام اپنے کسی ملازم کے سپرد بھی کرسکتا تھا، سینکڑوں دست بستہ خادم ہر وقت اس کے حضور مودب کھڑے رہتے تھے۔ مگر وہ اس کام میں کسی کی مدد لینے پر بھی تیار نہ تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس گھناؤنے کام کا کسی کو علم ہو۔ اور یوں اس کی نیک نامی پر حرف آئے۔ یہ اسی نیک نامی کی ہوس تو تھی، جس نے ایک باپ کو اس کام پر مجبور کردیا تھا کہ وہ خود اپنی ہی اولاد کو اپنے ہی خون کو اپنے ہاتھوں سے دریا برد کردے، ایسی ان دیکھی انجان بستیوں کے سفر پر روانہ کردے، جہاں سے کبھی اس کی خبر تک نہ مل سکے۔

یہ راز داری کا ہی تقاضہ تھا کہ اس نے محل کے صدر دروازے سے نکلنے کے بجائے تہ خانے کے اندر اس راستے کا انتخاب کیا تھا، جو زیر زمین، چند فرلانگ کا فاصلہ طے کرکے دریا کے قریب نکلتا تھا۔ اس راستے کا علم بادشاہ کے علاوہ صرف چند خاص لوگوں کو ہی تھا۔

بادشاہ آدم جام جب دریا کے قریب پہنچا

تو ایک بار اس نے بغور چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ مگر دور دور تک کسی ذی روح کا پتہ نہ تھا اور دریا کے کنارے سائیں سائیں کرتی ہوا کے علاوہ کوئی آواز تک نہ تھی چاروں طرف گہرے سناٹے کا راج تھا اور ایک تاریک ویران رات کائنات کی ہر شے پر حاوی تھی۔

ایک مقام پر بادشاہ پہنچ کر رک گیا اور بہتے ہوئے پرشور دریا کو دیکھنے لگا۔ اس لمحے آدم جام کے دل کی عجیب حالت تھی۔ اس کے بدن پر لرزہ طاری تھا، محبت اور ہوس کی کشمکش اس کے پورے وجود میں تلاطم برپا کئے دے رہی تھی۔ مگر جلد ہی اس نے خود پر قابو پالیا اور لرزتے ہاتھوں سے صندوق کو دریا کے سپرد کردیا۔ بادشاہ چند لمحوں تک وہیں ٹھہر کر صندوق کی طرف دیکھتا رہا جو دریا کی لہروں پر ڈولتا ہوا نگاہوں سے اوجھل ہوتا جارہا تھا، پھر وہ مڑا اور بوجھل قدموں سے چلتا ہوا واپس محل کی طرف روانہ ہوگیا۔

اس لمحے فضا پر ایک گمبھیر خاموشی طاری تھی۔

ایسا لگتا تھا جیسے کائنات کی ہر شے ظلم کی اس انوکھی ادا پر دم بخود ہے۔ بھنبھور کی عظیم سلطنت کی شہزادی بے بسی اور گمنامی کے عالم میں ان جانی منزلوں کی طرف رواں دواں تھی اور اس سلطنت کا "نیک دل" شہنشاہ اپنے ہاتھوں سے اپنے جگر گوشے کو دریا برد کرکے جارہا تھا۔ محض اپنی نیک نامی، اپنی سلطنت کی بقا کی خاطر۔

کم سن معصوم بچی، صندوق کی تاریک فضا میں لیٹی انگوٹھا چوس رہی تھی اور دریا کی لہریں اسے جھولا جھلاتے ہوئے خوابوں کی نگری میں ان دیکھی بستیوں میں لئے جارہی تھیں۔ وہ باہر کے ہر واقعہ سے، اردگرد کی ہر شے سے بے خبر، محفوظ و مامون اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھی۔ اسے دریا میں بسنے والی ان خونخوار بلاؤں کی بھی خبر نہ تھی جو صندوق کے اردگرد منڈلا رہی تھیں۔ خوف ناک خونخوار مچھلیاں اور بھیانک مگرمچھ دریا میں اچانک آنے والی اس عجیب و غریب شے پر اپنے جبڑے آزما رہے تھے مگر قدرت کا ہاتھ اس بچی کی قسمت تحریر کرچکا تھا۔ وہ سب آفات، سب درندے اس کا بال بھی بیکا نہ کرسکے اور وہ نومولود، معصوم بچی، اپنے نرم و گداز بستر پر دراز دریا کی لہروں پر سفر کرتی ہوئی کافی دور نکل گئی۔

☆ ☆ ☆

بھنبھور کے عظیم شہر کے مضافات میں دھوبیوں کی ایک چھوٹی سی بستی تھی، جہاں اتا نامی ایک غریب دھوبی اپنی بیوی کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ دونوں ہی بے اولاد تھے مگر اپنی قسمت پر شاکر اور مطمئن تھے۔ اتا دھوبی بہت محنتی اور اپنے کام میں ماہر تھا۔ اس لئے شہر کے اکثر امراء اور کبھی کبھار شاہی خاندان کے لوگ بھی اپنے کپڑے دھلنے کے لئے اس کے پاس بھیجتے تھے۔ وہ اپنے قول کا پکا تھا اور کبھی کسی کو شکایت کا موقع نہ دیتا تھا۔ مگر اس کے باوجود بہت غربت میں دن کاٹ رہا تھا۔

شاید محنت کرنے والوں اور دیانت داروں کا یہ مقدر ہوتا ہے کہ وہ کبھی خوشحال اور آسودہ نہیں ہوتے۔ ثروت اور امارت تو صرف ان کے نصیب میں ہوتی ہے، جو خود کبھی ہاتھ پاؤں نہیں ہلاتے مگر عیاری اور ظلم سے دوسروں کا حق غصب کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔

اتا دھوبی کا یہ معمول تھا کہ دن بھر جو بھی کپڑے دھلنے کے لئے اس کے پاس آتے وہ انہیں گٹھری میں باندھ کر رات کے آخری پہر اپنے بیل پر لاد کر دریا کے کنارے لے جاتا۔ پھر گھاٹ پر تختہ رکھ کر ان کو دھونے میں مصروف ہوجاتا اور دن چڑھے واپس گھر آتا۔

وہ بھی ایک ایسی ہی رات تھی۔ سحر سے اتا اپنی نیند سے جاگا اور اپنے کام میں مشغول ہوگیا۔ صحن میں پڑے ہوئے کپڑوں کا گٹھر بنایا اور بیل پر رکھ کر گھاٹ کی طرف چل دیا۔

ابھی صبح ہونے میں دیر تھی۔ ساری کائنات محو خواب تھی شہر کی گلیاں اور بازار سوئے ہوئے تھے۔ آسمان پر تاروں کا باغ کھلا ہوا تھا۔ دور کہیں حدی خواں اونٹوں کی قطار لئے جارہے تھے۔ ان کے گلوں میں پڑی ہوئی گھنٹیوں کی ٹن ٹن رات کے سناٹے کو چیر رہی تھی کہیں کہیں مرغوں کی اذانیں سنائی دے رہی تھیں، اور دور باغوں میں پرندوں نے چہچہانا شروع کردیا تھا۔

اتا دھوبی نے گھاٹ پر پہنچ کر کپڑوں کی گٹھری بیل کی کمر سے اتاری اور دریا کے کنارے تختہ رکھ کر کپڑے دھونے میں محو ہوگیا۔ اس کی "چھپا۔ چھپ" کی آوازیں رات کی خاموشی میں دور تک سنائی دے رہی تھیں۔ کپڑے دھوتے دھوتے اچانک اتا کی نظر دریا کی طرف گئی تو اسے دور ایک چمکتی ہوئی چیز دکھائی دی، جو لحظہ بہ لحظہ اس کے قریب تر آرہی تھی۔ اتا اپنے کپڑے چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا اور غور سے اس چمکتی ہوئی چیز کو دیکھنے لگا۔ جب وہ چیز نزدیک آئی تو اتا نے دیکھا کہ وہ ایک خوب صورت صندوق ہے جو لہروں میں ڈولتا ہوا بہا جا رہا تھا۔ اتا کی نگاہوں میں چمک سی پیدا ہوئی ایسے خوبصورت صندوق تو صرف زر و جواہر رکھنے کے لئے بنائے جاتے ہیں، شاید اس میں بھی کوئی خزانہ پوشیدہ ہو۔ اتا نے لپک کر صندوق کو اٹھایا اور تیزی سے باہر نکل آیا۔ اس نے دھلے ان دھلے کپڑوں کی گٹھری باندھ کر دوبارہ بیل کی کمر پر رکھی اور تیزی سے واپس بستی کی طرف چل دیا۔ تمام راستے وہ یہی سوچتا رہا کہ شاید قدرت کو اس کی دیانت داری اور محنت پر رحم آگیا ہے اور اس نے اپنی عطائے غیبی سے یہ خزانہ انعام کے طور پر اس کے لئے بھیجا ہے۔

اتا دھوبی گھر پہنچا تو اس کی بیوی ابھی تک سو رہی تھی، اتا نے جھنجھوڑ کر اسے جگایا تو وہ چونک کر اٹھ بیٹھی اور حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ پھر اس کی نظر آسمان کی طرف گئی جہاں ابھی تک تارے چمک رہے تھے۔ اس نے آنکھیں ملتے ہوئے خاوند سے پوچھا "آج وہ اس قدر جلدی گھاٹ سے کیسے واپس آگیا؟" اتا نے کانپتی ہوئی آواز میں اسے تمام ماجرا سنایا اور پھر صندوق لا کر اس کے سامنے رکھ دیا۔

دھوبن نے حیرت اور بے چینی سے صندوق کی طرف دیکھا جو ابھی تک مقفل تھا۔ اتا فوراً صندوق کا قفل کھولنے کی کوشش میں مصروف ہوگیا۔

کچھ دیر کی جدوجہد کے بعد بالآخر صندوق کا قفل ٹوٹ گیا، اتا نے لرزتے ہاتھوں سے صندوق کا ڈھکن اٹھایا اور پھر اچانک حیرت سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں، سامنے ایک نہایت حسین، نوزائیدہ بچی منہ میں انگوٹھا لئے معصومیت سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے دائیں بائیں بے شمار ہیرے جواہرات اور قیمتی مرصع زیورات چمک رہے تھے، اتا کبھی ان جواہرات کی طرف دیکھتا اور کبھی اس معصوم بچی کی طرف۔

اتا کی بیوی جو بے اولاد تھی، اس نے ایک بار بھی ان جواہرات کی طرف نہیں دیکھا۔ وہ تو یک ٹک اس معصوم، حسین بچی، کو دیکھے جا رہی تھی، جو ان کی حیرت سے بے خبر اپنے ننھے سے بستر پر لیٹی ہوئی تھی، ممتا کی ایک لہر اس کے دل کی گہرائیوں سے اٹھی اور پورے وجود پر چھا گئی، اس نے لپک کر بچی کو اٹھایا اور سینے سے لگا لیا۔ بچی بھی اس کی چھاتی سے یوں چمٹ گئی جیسے وہی اس کی ماں ہو۔

"خدا کو ہماری مفلسی پر نہیں ہمارے بے اولاد ہونے پر ترس آیا ہے، اس نے ہمارے لئے یہ بچی بھیجی ہے یہ میری بچی ہے۔" دھوبن نے اس معصوم بچی کی پیشانی کو چومتے ہوئے کہا۔

"مگر اس صندوق میں بے اندازہ دولت بھی پڑی ہوئی ہے۔" اتا دھوبی نے دھیرے سے کہا اور کسی سوچ میں گم ہوگیا پھر اچانک اسے کچھ خیال آیا اور وہ اپنی بیوی کا بازو ہلاتے ہوئے بولا۔

"ہو نہ ہو بچی کسی بہت اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی ہے مگر کسی وجہ سے اس کے ماں باپ اس کی پرورش کرنے سے معذور ہیں، یہ دولت انہوں نے صندوق میں اسی مقصد سے رکھی ہوگی کہ جو بھی اس بچی کو پائے وہ اس دولت سے اس کی پرورش کر سکے۔ اللہ نے یہ ذمہ داری ہمیں دی ہے، تو ہم اسے اپنی اولاد کی طرح پالیں گے اور اس دولت کی حفاظت بھی امانت سمجھ کر کریں گے۔ یہ اس بچی کی دولت ہے یہ اسی کا مقدر ہے۔" یہ کہتے ہوئے اتا نے صندوق کا ڈھکن بند کر دیا اور دھیمی آواز میں بولا۔

"اس صندوق کا کسی سے ذکر نہ کرنا، نیک بخت اور نہ کسی کو یہ بتانا کہ یہ بچی ہمیں دریا سے ملی ہے

ہمیں سب کو یہی بتانا ہوگا کہ یہ ہماری بچی ہے یہ اب اسی غریب کے گھر میں پروان چڑھے گی۔‘‘ یہ کہہ کر اتا نے صندوق اٹھایا اور گھر کے اندر ایک محفوظ جگہ چھپا دیا۔

اتا دھوبی نے اس بچی کا نام سسی رکھا اور اس دن سے وہ بچی اس کے گھر میں پرورش پانے لگی، اتا دھوبی اور اس کی بیوی بچی سے اتنی محبت کرتے تھے، کہ اگر وہ ان کی سگی اولاد بھی ہوتی، تو اس سے بڑھ کر پیاری نہ ہوتی۔

جوں جوں دن گزرتے گئے، سسی بھی بڑی ہوتی گئی، جس روز سے بچی ان کے گھر میں آئی اس وقت سے اتا کے حالات بھی بہتر ہوگئے تھے، اتا سمجھ گیا کہ یہ سب کچھ قدرت اس بچی کے نصیب سے دے رہی ہے، دونوں پوری تن دہی سے اس بچی کی پرورش کرنے لگے، دھوبن تو ہر وقت اس بچی کو سینے سے لگائے رکھتی تھی اور اس کی صورت دیکھ کر جیتی تھی۔

دن گزرتے گئے اور بچی رفتہ رفتہ بڑی ہوتی گئی، وقت کے ساتھ ساتھ بچی کا حسن بھی نکھرتا جا رہا تھا۔ جب وہ تین سال کی ہوگئی تو اس نے پاؤں پاؤں چلنا بھی شروع کردیا اور توتلی زبان میں باتیں بھی کرنے لگی اتا اور اس کی بیوی پہروں اس کی معصوم باتیں سنتے رہتے اور خوش ہوتے رہتے۔ پانچویں برس میں سسی پوری طرح ہوش سنبھال چکی تھی۔ اور گھر کے چھوٹے موٹے کاموں میں ماں کا ہاتھ بٹانے لگی تھی۔

مگر اتا دھوبی جانتا تھا کہ سسی کسی دھوبی کی بیٹی نہیں ہے۔ وہ کسی اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی ہے اور اس کی پرورش بھی اسی انداز سے ہونی چاہئے لہٰذا اس نے بچی کو مسجد کے مدرسے میں داخل کرایا اور سسی نے سلسلہ تعلیم کا آغاز کردیا۔

قدرت نے سسی کو نہایت زرخیز ذہن بخشا تھا۔ سات سال کی عمر میں وہ نہ صرف روانی سے پڑھ سکتی تھی بلکہ لکھنا بھی سیکھ چکی تھی۔ ایک روز اتا دھوبی نے سسی کو بتایا کہ وہ ان کی سگی اولاد نہیں ہے بلکہ انہیں ایک روز دریا میں بہتے ہوئے ایک صندوق میں ملی تھی۔

سسی اپنے باپ کی بات سن کر حیرت زدہ رہ گئی اور بے یقینی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ تب اتا گھر کے اندر سے وہ صندوق اٹھا لایا جو ابھی تک اسی طرح محفوظ تھا، سسی دیر تک اس صندوق کی طرف دیکھتی رہی، پھر آہستگی سے اس نے صندوق کا ڈھکنا اٹھایا اور اندر رکھے ہوئے زر و جواہر کو دیکھ کر اسے اپنے باپ کی بات کا یقین آگیا۔ اتا نے اسے بتایا کہ یہ سب کچھ اس کی امانت ہے۔

مگر سسی کے دل میں دولت اور زر و جواہر کی کوئی طمع نہیں تھی۔ وہ تو یہ جاننا چاہتی تھی کہ وہ اصل میں کون ہے اور کس کی اولاد ہے تب اچانک اس کی نظر صندوق کے ایک خانے میں رکھے ہوئے ایک کاغذ پر پڑی اور اس نے فوراً وہ کاغذ نکال لیا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے وہ کاغذ کھولا اور پڑھنے لگی، جوں جوں وہ کاغذ پڑھتی جاتی تھی اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہوتا جا رہا تھا کاغذ پر اس کا شجرۂ نسب لکھا ہوا تھا۔

’’میں بھنبھور کے بادشاہ آدم جام کی بیٹی ہوں۔‘‘ سسی نے حیرت سے سوچا۔ ’’آدم جام جو اپنی نیک نفسی اور رحم و عدل کے لئے بہت مشہور ہے، وہ شہنشاہ اتنا سنگدل بھی ہوسکتا ہے کہ اپنی سگی اولاد کو یوں جیتی جاگتی موت کے سپرد کردے۔

سسی بہت دیر تک انہی سوچوں میں گم رہی پہلے تو اس کے جی میں آئی کہ وہ ابھی بادشاہ کے دربار میں جائے اور اس سے پوچھے کہ آخر اس نے اپنی حقیقی اولاد کے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا۔ مگر پھر فوراً ہی اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ایسا نہیں کرے گی۔

’’کیونکہ آخر جس باپ نے جنم لیتے ہی اسے خود سے جدا کردیا وہ بھلا اب کیوں اسے اپنی بیٹی بنانا پسند کرے گا شاید قدرت نے اس کے نصیب میں یہی لکھا ہے کہ وہ بادشاہ وقت کی بیٹی ہونے کے باوجود ایک غریب گمنام دھوبی کے گھر میں پرورش پائے۔‘‘ یہ سوچ کر اس نے اتا کی طرف دیکھا جو منتظر نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"میں یہیں رہوں گی بابا تمہارے پاس، میں تمہاری بیٹی ہوں۔" سسی نے دل گیر آواز میں کہا تو باپ نے آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگالیا اور آنکھوں میں امنڈتے ہوئے آنسوؤں کو پینے کی کوشش کی۔

☆ ☆ ☆

ساعتیں دنوں میں ڈھلیں اور دن مہینے بن گئے۔ وقت پر لگا کر اڑتا رہا اور سسی نے عہد شباب میں قدم رکھا وہ ابھی بارہ تیرہ برس کی تھی جب جوانی کا حسن اس کے دلفریب چہرے سے اور اس کے نازک بدن سے جھلکنے لگا تھا۔ دھوبیوں کی بستی میں دور دور تک اتا کی بیٹی کے لازوال حسن کی باتیں ہونے لگیں اور دھوبیوں کی عورتیں بڑی حیرت سے اس سراپا خوبصورتی، اس بے پناہ حسن کو دیکھتیں اور آپس میں چہ مگوئیاں کرنے لگتیں۔

دھیرے دھیرے سسی کے حسن کے چرچے دھوبیوں کی بستی سے نکل کر پورے شہر بھنبھور میں پہنچ گئے، اس وقت تک سسی چودہ برس کی ہو چکی تھی، اور اب اس کا نوخیز حسن شباب کی تصویر کامل بن چکا تھا، دور دور تک یہ بات مشہور ہو چکی تھی، کہ دھوبیوں کی بستی میں ایک غریب دھوبی کے ہاں سسی نام کی ایک حور جمال دوشیزہ رہتی ہے، جس کا حسن بے مثال اور شباب حد کمال ہے، مگر اس کے ساتھ یہ بات سب جانتے تھے کہ وہ حسین دوشیزہ پاک زبان ہونے کے علاوہ بے حد پاک خیال بھی ہے، جو بھی دیکھتا وہ یہی کہتا کہ یہ کسی غریب دھوبی کی بیٹی نہیں ہو سکتی، یہ تو کسی ملک کی شہزادی لگتی ہے۔

لمبی سیاہ زلفوں میں گھرا ہوا، اس کا سرخ و سپید چہرہ تاریکیوں میں بھی لو دیتا تھا۔ اس کی بڑی بڑی دل نشین آنکھیں جادو کر دینے والی تھیں، ذرا سی اٹھی ہوئی ستواں ناک کے نیچے دو یاقوتی ہونٹ تھے، جن پر ہر وقت ایک دلفریب مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی، اس کے بھرے بھرے گداز رخساروں کی رنگت نوشگفتہ گلاب کی سی تھی اور ان پر ایک چھوٹا سا تل دیکھنے والوں کے دل میں کھب کر رہ جاتا تھا، اس کے گداز بدن میں نوآمیز شاخوں کی سی لچک تھی، اور بوسیدہ، غریبانہ اوڑھنی میں بھی اس کا شباب پر غرور تمکنت اور ایک دل آویز طمطنے کے ساتھ دیکھنے والوں کو اپنی جانب کھینچتا تھا مگر اس کی آنکھوں میں اور اس کے انداز و اطوار میں ایک ایسا شاہانہ وقار تھا کہ دیکھنے والے مرعوب ہو کر رہ جاتے تھے اور کبھی حد سے بڑھنے کی جرأت بھی نہ کر سکتے تھے۔

سسی کا معمول تھا کہ دن ڈھلے تک وہ گھر کے کام کاج میں مصروف رہتی، پھر پاس پڑوس کی لڑکیوں اور ہم جولیوں کے ہمراہ لڑکپن کے کھیل کود اور باتوں میں لگی رہتی۔ کبھی کبھار وہ اپنی سکھیوں کے ہمراہ باغ میں نکل جاتی اور سب کم سن لڑکیاں وہاں چہل قدمی اور کھیلوں میں مگن رہتیں، اور راہ چلتے لوگ انہیں دیکھ کر رک جاتے اور سسی کے چہرے کو دیکھ کر جیسے ان کے پاؤں زمین میں گڑ جاتے اور وہ ارد گرد کی ہر شے سے بے خبر اسے دیکھتے رہتے۔

مگر سسی اپنی ہم جولیوں کے ہمراہ مگن رہتی اور کبھی تجاہلانہ نگاہ اٹھا کر بھی ان کی طرف نہ دیکھتی، سسی کے شب و روز انہی مشاغل میں گزر رہے تھے۔ مگر نجانے کیوں اس کے دل میں عجیب سی بے کلی رہتی تھی۔ ایک انتظار سا انتظار؟ مگر کس کا؟ اس سوال کا کوئی جواب سسی کے پاس نہ تھا۔

پھر ایک رات جب سسی اپنے گھر میں بے خبر سو رہی تھی اور خوابوں کی رنگین دنیا میں کھوئی ہوئی تھی، تو اچانک اسے ایسا لگا جیسے وہ کسی ویران جگہ پر تنہا کھڑی ہوئی ہو۔ دور دور تک کسی ذی روح کا نشان تک نہ تھا پھر اچانک مغرب کی سمت ایک غبار سا نظر آیا اور سسی کو یوں لگا جیسے مغرب میں حد نظر تک پھیلے ہوئے تھل کے ٹیلوں کی اوٹ میں کوئی اس کی جانب چلا آ رہا ہے، سسی کے دل میں ایک عجیب سی کسک ابھری اور وہ منتظر نگاہوں سے اس جانب دیکھنے لگی، جہاں ایک شتر سوار تیزی سے ٹیلے عبور کرتا ہوا اس کی جانب بڑھا چلا آ رہا تھا۔

چند لمحوں کے بعد وہ سوار اس کے سامنے پہنچ چکا تھا۔ سسی کے قریب پہنچ کر وہ دراز قامت نوجوان اونٹ سے اترا اور اس کے مقابل آ کھڑا ہوا، سسی نے

اس کی طرف دیکھا تو دیکھتی رہ گئی نجانے کیوں اسے یوں لگا، جیسے یہ چہرہ اس کے لئے اجنبی نہیں ہے۔ اسے تو وہ صدیوں سے جانتی ہے گرد میں اٹے ہونے کے باوجود اس نوجوان کے چہرے سے ایسی وجاہت، ایسا وقار جھلک رہا تھا کہ بے اختیار سسی اس کے قریب چلی گئی، اور پھر نامعلوم کسی جذبے کے تحت وہ اس سروقامت کھبرو جوان کے قدموں میں جھک گئی اور دھیمی آواز میں پوچھنے لگی کہ وہ کون ہے کہاں سے آیا ہے؟"

سسی کا سوال سن کر اس خوبرو نوجوان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھری اور آہستگی سے بولا۔ "میں پنوں ہوں۔ پنوں خان، میری ذات، ہوت بلوچ ہے، اور شہر کیچ سے صرف تم سے ملنے کے لئے آیا ہوں۔"

"شہر کیچ۔" سسی سحر زدگی کی حالت میں بولی ۔"یہ کہاں ہے یہاں سے کتنی دور ہے۔"

"شہر کیچ، مکران میں ہے۔" پنوں نے اسی لہجے میں کہا اور پھر سسی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

"یہ شہر یہاں سے اتنی دور ہے کہ تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتیں، تھل کے عظیم صحرا کے اس پار، یہاں سے اتنی دور ہے، اتنی دور ہے کہ کسی سواری کے بغیر وہاں جانا قطعی ناممکن ہے حتیٰ کہ کبھی کبھار تو شتر سوار بھی اتنا سفر نہیں کر سکتے، نجانے کتنے قافلے وہاں کا سفر کرتے کرتے ریت کے ٹیلوں میں دب کر ختم ہو گئے، اور اب صحرا کی ریت پر ان کی ہڈیاں بھی باقی نہیں رہیں۔ تھل کی ریتلی زمین، جہاں دن کو آگ برستی ہے، ہاں یہ سفر وہی کر سکتے ہیں جن کے دل میں منزل پر پہنچنے کی لگن ہو۔ اس لئے کہ میرے دل میں تم سے ملنے کی لگن تھی۔"

سسی عالم حیرت میں خاموش کھڑی اس نوجوان کی باتیں سن رہی تھی، جو اجنبی ہوتے ہوئے بھی اس کے لئے اجنبی نہ تھا، وہ یک ٹک اس حسین چہرے کو تکے جا رہی تھی، سحر زدہ وہم بخود، اس کے جی میں آیا کہ وہ بڑھ کر اس کے کشادہ سینے سے لگ جائے، اس کے مضبوط بازوؤں کے حصار میں قید ہو جائے۔ مگر اسی لمحے اچانک سب کچھ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ سارا نظارہ یک لخت بکھر گیا اور اس کی آنکھ کھل گئی۔

چند لمحوں تک تو سسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کہاں ہے۔ پھر رفتہ رفتہ جب اس کے اوسان بحال ہوئے اور اس نے دیکھا کہ وہ اپنے بستر پر دراز ہے، تو اچانک ایک مایوسی، ایک درد آلود جذبہ محرومی اس کے دل میں ابھرا اور وہ چونک کر بستر سے اتر آئی۔

"میرا پنوں، میرا پنوں خان۔" سسی دیوانوں کی طرح کمرے کے در و دیوار ٹٹول رہی تھی۔ "پنوں، مجھے چھوڑ کر کہاں چلے گئے۔ اپنی سسی کو بھی اپنے ساتھ لے جاؤ۔ میرے پنوں...... میرے شہزادے۔"

مگر وہاں کون تھا جو اس کی پکار سنتا۔ رات کے پچھلے پہر کا سناٹا ہر طرف چھایا ہوا تھا، سسی تھک ہار کے خاموش ہو گئی اور اس عجیب و غریب خواب کے بارے میں سوچنے لگی۔ اس گمنام کی صورت اس کے دل و ذہن میں بس گئی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ اڑ کر اس دیس میں پہنچ جائے جہاں اس کا پنوں، اس کے خوابوں کا شہزادہ رہتا تھا۔

رات ڈھل گئی۔ اگلے دن کا سورج طلوع ہو گیا، مگر سسی اپنی جگہ بیٹھی اپنے خوابوں کے متعلق سوچتی رہی اپنے پنوں کو یاد کرتی رہی۔ اسے کھانے پینے کا ہوش تھا نہ اپنے آپ کی کوئی خبر۔ ماں نے آخر پوچھا کہ کیا بات ہے، وہ یوں اداس کیوں بیٹھی ہے، مگر سسی جواب میں خاموشی سے اس کی صورت تکتی رہ گئی، وہ آخر اسے کیا بتاتی کہ دور دیس کا کوئی شہزادہ اس کا سکھ چین لوٹ کر لے گیا ہے؟ وہ کیوں اداس ہے؟

دن چڑھے سسی کی سکھیاں، ہم جولیاں آئیں تو وہ بھی اس کی حالت دیکھ کر حیران رہ گئیں، سسی نے منہ ہاتھ دھویا نہ کچھ کھایا۔ سکھیوں نے جب سسی سے اس حیرت کدائی کی وجہ پوچھی تو وہ ضبط نہ کر سکی اور انہیں تفصیل سے اپنا خواب سنانے لگی، اپنے اس دیوتا کے بارے میں بتانے لگی جو تھل کے صحراؤں کے اس پار سے آیا تھا۔ سسی نے خلاؤں میں دیکھتے ہوئے بتایا کہ اب

تو اسے تب ہی تسکین آ سکتا ہے، جب وہ اپنے اس سپنوں کے راجا کو حقیقی دنیا میں دیکھے گی۔ اب اس کی زندگی کا واحد مقصد یہی ہے کہ وہ اپنے پنوں کو حاصل کرے، چاہے اس کے لئے اسے تپتے صحراؤں میں، پاپیادہ سفر کیوں نہ کرنا پڑے۔ چاہے اس کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ یہ جان تو اب اسی کی امانت ہے۔

سسی کی باتیں سن کر اس کی سہیلیوں کو حیرت بھی ہوئی اور ہنسی بھی آئی، وہ اسے سمجھانے لگیں کہ خوابوں میں دیکھی ہوئی صورتوں کو یوں دل سے نہیں لگاتے۔ خواب تو محض وہم و تخیل کی پیداوار ہوتے ہیں۔

مگر سسی ان کی بات ماننے کو تیار نہ تھی۔ اس نے اپنی سکھیوں کو سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ محض خواب نہیں تھا۔ یہ غیب کا اشارہ تھا، اس کا پنوں واقعی ایک حقیقی وجود ہے، محض وہم و گمان نہیں ہے اور تم دیکھنا ایک نہ ایک دن وہ مجھے ضرور ملے گا۔ اور میں ہر صورت اس کا انتظار کروں گی۔

سسی کی سہیلیوں نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر پنوں کا عشق اس کی شدید آرزو سسی کے رونگیں رونگیں میں رچ گئی تھیں۔ وہ اپنی سدھ بدھ بھول چکی تھی، اسے کھانے پینے کا ہوش رہا تھا نہ اپنے لباس کا دھیان تھا، وہ تو بس دن رات بیٹھی، جاگتی آنکھوں خواب دیکھتی رہتی تھی، یا پچھم کی جانب منہ کیے اداس، منتظر بیٹھی رہتی اسے یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن پچھم کی ان صحراؤں میں سے اس کا شتر سوار، اس کا پنوں، ضرور آئے گا۔

مگر سسی کی اس دیوانگی، اس اداسی کے باوجود اس کا حسن تھا کہ دن بدن نکھرتا ہی جا رہا تھا۔ شاید یہ عشق کے جذبے کا سحر تھا جو جمال بے مثال بن کر اس کے رخ روشن پر، اس کے حسین سراپے پر جھلکتا تھا، بال کھلے، دیوانوں کی طرح خلاؤں میں تکتی ہوئی سسی کو دیکھ کر لوگوں کے دل دھڑکنا بھول جاتے اور جو بھی اسے دیکھتا اپنانے کی آرزو کرنے لگتا تھا۔ ہر نوجوان کی یہ دلی تمنا تھی کہ یہ حسین دوشیزہ کسی طور اسے مل جائے ہر گھر کی یہ آرزو تھی کہ یہ ماہ کامل اسی کے گھر میں اجالا کرے۔

مگر سسی ان سب کی خواہشوں سے بے خبر اپنی ہی دنیا میں مگن تھی۔ اور ہر آنے جانے والے کی صورت میں اپنے محبوب کی صورت تلاش کرتی، کبھی وہ بستی سے باہر دریا کے کنارے پہنچ جاتی اور دریا کے اس پار صحراؤں میں نگاہ جما کر پہروں منتظر کھڑی رہتی کہ شاید ابھی اس کا پردیسی اس کا پنوں خان آ جائے۔

☆...☆...☆

ادھر سسی کے ماں باپ اس کی حالت پر سخت پریشان تھے، ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر ان کی لاڈلی بیٹی کو کیا غم کھائے جا رہا ہے، پھر کسی نہ کسی طرح سے سسی کی ماں کو یہ بھنک لگ گئی، کہ سسی نے خواب میں کسی نوجوان کو دیکھا ہے اور اب اس کے عشق میں دیوانی ہو گئی ہے، پھر اکثر رات گئے نیند میں ماں نے سسی کو پنوں پنوں پکارتے سنا تو اسے یقین ہو گیا، کہ سسی کو کسی سے عشق ہو گیا ہے، اس نے اپنے خاوند اتا دھوبی سے مشورہ کیا اور دونوں نے یہ طے کیا کہ اب جلد از جلد سسی کی شادی کر دی جائے، ورنہ اس ان دیکھے بلوچ شہزادے کا عشق اس کی جان لے لے گا۔

اتا کی برادری کے کئی لوگ کئی بار دبے لفظوں میں اتا سے یہ درخواست کر چکے تھے کہ وہ اپنی بیٹی کا رشتہ انہیں دے دے، مگر اتا نے انہیں کسی نہ کسی طرح ٹال دیا تھا، پھر آخر ایک روز برادری کے بڑے بزرگ سب مل کر اتا کے گھر پر آئے اور اسے سمجھانے لگے کہ جوان بیٹی کو زیادہ عرصے گھر میں بٹھائے رکھنا ٹھیک نہیں ہے، بہتر یہی ہو گا کہ وہ برادری کے کسی نوجوان کو پسند کر کے بیٹی کا رشتہ طے کر دے، اتا بھی اپنی بیٹی کے بارے میں پریشان تھا، اس نے دھوبیوں سے کہا کہ وہ اپنی بیوی اور بیٹی سے مشورہ کر کے انہیں مطلع کر دے گا۔ برادری کے لوگ وہیں بیٹھے رہے اور اتا اپنے گھر کے اندر چلا گیا۔

اندر جا کر اس نے سسی کو بلایا پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بتایا کہ برادری کے لوگ اس کے رشتے کے لئے آئے ہیں، پھر اسے سمجھانے لگا کہ اب وہ جوان ہو چکی ہے، جلد یا بدیر اسے شادی تو کرنا ہی ہو گی

پھر کیوں نہ برادری کے کسی شخص سے ہی اس کا بیاہ کر دیا جائے، اس لئے کہ اپنے پھر اپنے ہوتے ہیں، اگر کبھی کوئی اونچ نیچ ہوگی تو ان کی گرفت کی جاسکے گی۔

سسی باپ کی بات سن کر پہلے تو خاموش رہی پھر رونے لگی اور بولی۔

"بابا! تم بھی مجھے ستانے پر تلے ہوئے ہو، تم شادی کی بات کرتے ہو، تمہیں کیا خبر کہ میں کس عذاب میں گرفتار ہو چکی ہوں۔"

اتا اپنی بیٹی کی بات نہ سمجھ سکا، مگر اس کی بیوی اس کا مطلب جانتی تھی، اس نے آگے بڑھ کر پیار سے اپنی بیٹی کو گلے لگایا اور سمجھانے لگی۔

"بیٹیاں تو ماں باپ کے گھر پرائی امانت ہوتی ہیں، آخر ایک نہ ایک دن انہیں اپنے گھر جانا ہی ہوتا ہے، اب وقت آ گیا ہے کہ وہ بھی اپنے گھر کی روانگی کی تیاری کرلے۔"

سسی نے آنسو بھری نگاہیں اٹھا کر ماں کی طرف دیکھا اور غم زدہ آواز میں بولی۔ "ماں تمہیں کیا پتہ ہے کہ میری جوانی...... کو تو عشق کا داغ جیسے کوئی دھوبی نہیں دھو سکتا، میں اپنی زندگی اپنے پنوں کے نام کر چکی ہوں، اور اس شہزادے کے علاوہ کسی دوسرے کا تصور بھی گناہ سمجھتی ہوں۔"

سسی کی ماں کو یہ توقع نہ تھی کہ سسی یوں کھل کر اپنے عشق کی بات اس سے کرے گی، مگر اسے شاید خبر نہ تھی کہ عشق تو انسان کو بہت جرأت مند بہت بے باک بنا دیتا ہے، اسے کوئی جواب نہ سوجھا تو قدرے ناراضگی سے بولی۔ "سسی تو بہت خود سر ہوگئی ہے، جب سے تو نے وہ احمقانہ خواب دیکھا ہے اپنے آپے میں نہیں رہی۔ تجھے ماں باپ کی عزت کا بھی کوئی خیال نہیں ہے، اب برادری کے لوگ باہر منتظر بیٹھے ہیں۔ انہیں ہم کیا جواب دیں۔"

سسی نے ماں کی بات سنی اور نہایت تیزی سے باہر نکلی اور دروازے میں جا کر کھڑی ہوئی، برادری کے لوگ اسے دیکھ کر قدرے حیران ہوئے، سسی نے ایک نظر ان لوگوں پر ڈالی پھر جیسے چیختے ہوئے بولی۔

"سنو برادری کے لوگو! میں تمہیں یہ کہنے آئی ہوں کہ تم اسی وقت یہاں سے چلے جاؤ، تم میرے رشتے کے لئے آئے ہو تو سنو، کہ میرا رشتہ طے ہو چکا ہے، میں پنوں خان کی مانگ ہوں، اور وہی میرا شوہر ہے اور اپنے پنوں کے لئے میں جان دینے کو بھی تیار ہوں، بے خبر لوگو، تمہیں کیا پتا کہ میرا پنوں سے رشتہ تو آسمانوں پر ہی طے ہو چکا تھا۔ میں اپنے پنوں کی خاطر پیدا ہوئی ہوں اور اسی کے لئے دریا میں بہتی ہوئی یہاں آئی تھی، اب وہی مجھے یہاں سے لے کر جائے گا، تم دیکھو گے کہ ایک روز وہ مجھے ضرور لینے آئے گا۔"

دھوبی حیرت اور بے بسی سے سسی کی یہ بے باکانہ گفتگو سن رہے تھے، مگر کسی میں ہمت نہ تھی کہ جواب میں کچھ کہہ سکے۔ ایک ایک کر کے وہ سب وہاں سے اٹھے اور خاموشی سے اپنے گھروں کو چل دیئے۔ بظاہر وہ خاموش اور پرسکون تھے، مگر ان کے دل اس ذلت پر کھول رہے تھے، اس بالشت بھر کی چھوکری نے جس طرح ان کے مصنوعی رعب داب اور جھوٹے وقار کو تحت حقارت سے ٹھکرا دیا تھا، اس پر بری طرح پیچ و تاب کھا رہے تھے، مگر ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔ کہ وہ اپنی اس بے عزتی کا بدلہ کس طرح لیں۔

عشق کرنے والوں کو تو سماج کے ٹھیکیدار ہمیشہ ہی سے ناکام بنانے پر تلے رہتے ہیں، اور پھر یہ کہ ایک کم سن لڑکی برسر عام اپنے عشق کا اظہار کرے۔ یہ تو بالکل ہی ان کے لئے ناقابل برداشت تھا۔

برادری کے لوگ اب دن رات اسی فکر میں غلطاں تھے کہ کسی طرح سسی اور اس کے والدین کو سبق دیا جائے، آخر انہوں نے ایک ایسی ترکیب سوچی جس کے بارے میں انہیں یقین تھا کہ اگر سسی ان کے گھروں کی رونق نہیں بن سکتی تو کم از کم اپنے خیالی عاشق کو بھی نہیں حاصل کر پائے گی۔

برادری کے کچھ معتبر اور معزز افراد ایک دن شہنشاہ بھنبھور آدم جام کے دربار میں پہنچے اور تعظیم بجالانے کے

بعد سسی کے حسن کی تعریف کرنے لگے دور میانی عمر کا ایک دھوبی نہایت اثر انگیز انداز میں بتانے لگا۔

"جہاں پناہ ہماری برادری کے ایک فرد اتا دھوبی کے گھر میں ایک بیٹی سسی نام کی ہے، جو اس قدر حسین اور نازک اندام ہے کہ کسی انسان نے اتنا کامل حسن آج تک نہ کبھی دیکھا اور نہ کبھی سنا ہوگا۔ تعریف اور ہونی چاہئے دل کھول کر صاف ستھری۔" کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہی شخص نہایت خوشامدانہ لہجے میں بولا۔ "ہم چاہتے تو کسی بیٹے یا بھتیجے کے لئے اس لڑکی کا رشتہ حاصل کر سکتے تھے، لیکن سرکار یہ اس نایاب حسن کی توہین ہوتی جہاں پناہ وہ دوشیزہ تو صرف شاہی محل کے شایان شان ہی ہو سکتی ہے، اگرچہ وہ ایک دھوبی کے گھر میں پیدا ہوئی ہے، مگر اس کا حسن تمام روئے زمین کی شہزادیوں کو بھی شرماتا ہے، ہم پوری برادری کی طرف سے جہاں پناہ کی خدمت میں یہ درخواست لے کر آئے ہیں کہ آپ اس نایاب حسن پارے کو اپنے حرم کی زینت بنا لیں۔ یہ ہماری برادری کی طرف سے اپنے محبوب شہنشاہ کی خدمت میں حقیر سا تحفہ ہے۔"

غرض یہ کہ ان لوگوں نے بادشاہ آدم جام کی آتش شوق کو اس قدر بھڑکایا کہ وہ اس مکروہ اقدام پر آمادہ ہو گیا، مگر اس ارادے کے باوجود اس نے یہ مناسب نہیں سمجھا کہ وہ زبردستی اس دھوبی کی بیٹی کو اٹھوا کر اپنے حرم میں لے آئے، حالانکہ وہ چاہتا تو ایسا کر سکتا تھا، لیکن طبعاً وہ ایک نرم دل شخص تھا، اور اس کے علاوہ اسے اپنی نیک نامی کا بھی خیال تھا، اس نے شاہی کاتب کو بلوایا اور یہ خط لکھوایا۔

"محترم اتا دھوبی کے نام۔"

میں شہنشاہ آدم جام، بھنبھور کا والی ہونے کے باوجود ایک سوالی بن کر آپ سے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے آپ کی صاحبزادی کی صورت اور سیرت کی تعریف سنی ہے، میں بصد ادب آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ اپنی صاحبزادی سسی کا عقد مجھ سے کردیں، اور شاہی خاندان کے متعلقین میں شامل ہو جائیں، اس درخواست کی قبولیت کی صورت میں آپ کو منہ مانگا انعام واکرام بھی دیا جائے گا۔ امید ہے آپ میری التجا کو قبولیت بخشیں گے۔

شاہی قاصد جب یہ خط لے کر اتا دھوبی کے پاس گیا تو وہ اسے دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا، خط پر شاہی مہر دیکھ کر اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ بادشاہ آدم جام کی غریب پروری اور رحم دلی کے بارے میں اس نے بہت کچھ سن رکھا تھا، اسے یقین تھا کہ بادشاہ نے اس کی دیانت داری اور مہارت پر خوش ہو کر کوئی انعام واکرام دیا ہوگا، فوراً خط لے کر اتا دھوبی اپنی بیٹی کے پاس آیا اور مسرت آمیز لہجے میں بولا۔ "دیکھو بیٹی سسی ہمارے محبوب بادشاہ نے اپنے ادنیٰ نوکروں کو یاد فرمایا ہے، ذرا سناؤ اس نوازش نامے میں کیا لکھا ہے۔"

سسی نے فوراً خط اپنے باپ کے ہاتھ سے لیا اور نہایت بے تابانہ انداز میں پڑھنے لگی۔ مگر جوں جوں وہ خط پڑھتی گئی اس کے چہرے کی حالت غیر ہوتی گئی، آخر خط غصے میں اس نے زمین پر پھینک دیا اور سر تھام کر بیٹھ گئی، اتا اپنی بیٹی کی یہ کیفیت دیکھ کر پریشان ہو گیا اور فکر مند لہجے میں بولا۔

"کیا ہوا بیٹی، بادشاہ نے خط میں کیا لکھا ہے؟"

سسی نے غم ناک نگاہیں اٹھا کر باپ کی طرف دیکھا اور قہر آلود آواز میں بولی۔ "کیا پوچھتے ہیں بابا، آپ کی برادری کے لوگوں نے بادشاہ کو نجانے کیا الٹی سیدھی پٹی پڑھا دی ہے، اس نے آپ سے میرا رشتہ مانگا ہے، اسے شاید علم نہیں کہ وہ کتنا بڑا گناہ کر رہا ہے اگر ایسا ہو گیا تو یہ دھرتی لرز اٹھے گی، آسمان پھٹ پڑے گا۔" یہ کہہ کر سسی رونے لگی۔ اتا نے پیار سے اپنی بیٹی کے سر پر ہاتھ پھیرا اور ڈرتے ڈرتے بولا۔

"مگر بیٹی اس میں گناہ کی کون سی بات ہے، یہ تو خوشی کی بات ہے کہ بادشاہ تمہیں اپنی ملکہ بنانا چاہتا ہے، ہماری بیٹی ہے ہی اتنی خوبصورت، پاک صورت اور نیک سیرت کہ اسے تو محلوں میں راج کرنا چاہئے۔"

"تمہیں کچھ بھی خبر نہیں ہے بابا!" قہر میں

تمہیں بتاتی ہوں۔" سسی نے اپنے باپ کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ اور پھر اٹھ کر اس کمرے میں چلی گئی جہاں اس نے وہ منقش صندوق رکھا ہوا تھا، وہی صندوق جس میں وہ چودہ برس پہلے دریا میں بہائی گئی تھی، صندوق کھول کر سسی نے اپنا شجرہ نسب نکالا اور اپنے باپ کو دکھاتے ہوئے بولی۔

"بابا یہ ہے میرا شجرہ نسب جو مجھے صندوق میں بند کرکے دریا میں بہاتے وقت میرے باپ آدم جام شہنشاہ بھنبھور نے اسی صندوق میں رکھ دیا تھا۔" سسی ایک لمحے کو رکی، پھر چیختے ہوئے بولی۔ "میں آدم جام کی بیٹی ہوں بابا، اسی بادشاہ آدم جام کی بیٹی جو..... آپ سے میرا رشتہ مانگ رہا ہے۔"

اتا دھوبی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ "تم ---- آدم جام کی بیٹی؟" اس نے اٹکتی ہوئی آواز میں کہا.....

"تم ---- مگر تم نے پہلے کیوں نہ بتایا بیٹی، میں خود تمہیں اس کے دربار میں لے جاتا۔"

"سب بیکار تھا، جس باپ نے پیدا ہوتے ہی مجھے اپنے محل سے نکال دیا، وہ بعد میں مجھے بھلا کیوں کر محل میں داخل ہونے دیتا۔" سسی نے تاسف سے کہا۔

"میں تو بابا، اسی روز اس بات سے آگاہ ہوگئی تھی، جب چار سال پہلے تم نے مجھے یہ صندوق دکھایا تھا، پہلے پہل میرے دل میں بھی یہ خیال آیا تھا کہ میں اپنے باپ کے دربار میں جاؤں اور اس سے پوچھوں کہ اس نے میرے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا؟ مگر پھر میں نے یہ ارادہ ترک کردیا۔ اس لئے کہ جو شخص اتنا بے رحم ہوسکتا ہے کہ اپنی نومولود بچی کو دریا کی ظالم لہروں کے سپرد کردے، اس پر بھلا اب سسی دکھیاری کی فریاد کا کیا اثر ہوگا بس بابا، میں نے اسی روز یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ میں تقدیر پر شاکر رہوں گی اور اسی کٹیا میں زندگی بسر کروں گی۔"

اتا دھوبی نے آگے بڑھ کر سسی کو سینے سے لگایا اور بولا۔ "مجھے تم پر فخر ہے بیٹی لیکن اب تمہارا کیا ارادہ ہے، ہم بادشاہ کو کیا جواب دیں گے۔"

"تم فکر نہ کرو بابا۔ میں خود اسے خط لکھوں گی اور بتاؤں گی کہ آتش ہوس میں کھو کر وہ کیسا پاپ کرنے والا ہے اس "نیک نام" کو ایسا آئینہ دکھاؤں گی، جس میں اسے اپنا گھناؤنا۔ سیاہ چہرہ دکھائی دے گا۔"

اتا دھوبی خاموشی سے باہر چلا گیا، سسی نے اسی وقت قلم اٹھایا اور اپنے باپ کے نام خط لکھنے بیٹھ گئی، خط لکھتے وقت باپ کا لکھا ہوا شجرہ نسب اس کے سامنے تھا اور آنسوؤں کی دھند اس کی آنکھوں پر چھائی ہوئی تھی خط کا متن یوں تھا۔

"بحضور شہنشاہ بھنبھور عالی مرتبت آدم جام از سسی بنت اتا دھوبی۔

میں سسی بنت اتا دھوبی آپ سے مخاطب ہوں یعنی رعایا کی ادنیٰ فرد اپنے شہنشاہ سے کچھ عرض کرنے کی جسارت کررہی ہوں، آپ نے میرے رشتے کے لئے، میرے والد کو جو مکتوب بھیجا ہے، وہ میری نظر سے بھی گزرا ہے، اور میں یہ بھی خوب جانتی ہوں کہ آپ کے اس نوازش نامے کے پیچھے کن لوگوں کی کوششیں کار فرما ہیں۔ میری برادری کے وہ لوگ جنہوں نے پہلے میرے باپ سے میرا رشتہ مانگا تھا اور میں نے صاف انکار کردیا تھا۔ وہ لوگ یہاں سے ناکام ہوکر اور مجھ سے انتقام لینے کی غرض سے آپ کے پاس گئے اور میرا تذکرہ اس انداز میں کیا کہ آپ بھی بہکاوے میں آگئے، اور بلا سوچے مجھے میرے رشتے کا پیغام بھیج دیا بگرائے والی! بھنبھور، میں نے جس طرح برادری کے لوگوں کو انکار کیا تھا، اسی طرح بصد ادب واحترام آپ سے بھی انکار کرتی ہوں۔

شہنشاہ ذی وقار کے لئے یہ بات یقیناً بہت غیر متوقع اور گستاخی کے مترادف ہوگی، مگر میرے اس انکار کی کچھ وجوہات ہیں، پہلی وجہ تو وہی ہے جو میں نے اپنی برادری والوں کو بھی بتادی تھی اور اب انتہائی ادب سے آپ پر بھی واضح کررہی ہوں کہ میں کسی اور کی امانت ہوں، اور اپنی زندگی اس کے لئے وقف کرچکی ہوں، اس کے علاوہ دوسری وجہ جو زیادہ اہم بھی ہے، یہ ہے کہ یہ رشتہ شرعی اور دنیاوی اعتبار سے کسی طرح بھی

ممکن نہیں ہے۔ آپ شاید میری اس بات پر حیران ہو رہے ہوں، مگر حقیقت یہ ہے کہ میرا اور آپ کا پہلے سے ایک رشتہ قائم ہے۔

میں نے خط کے آغاز میں خود کو اتا دھوبی کی بیٹی لکھا ہے، اس لئے کہ جس باپ نے مجھے آج سے چودہ برس پہلے پیدا ہوتے ہی صندوق میں بند کر کے دریا میں بہا دیا تھا، میں خود کو اس سے کس طرح منسوب کر سکتی ہوں۔ ہو سکتا ہے میرے اس جملے سے آپ کے ذہن میں ماضی کے کچھ بند دریچے کھل گئے ہوں، لیکن اگر ایسا نہیں ہوا تو میں ثبوت کے طور پر وہ شجرہ نسب اس خط کے ہمراہ بھیج رہی ہوں جو میرے باپ نے مجھے دریا میں بہاتے وقت میرے ساتھ رکھ دیا تھا، ذرا غور سے اس تحریر کو دیکھئے کیا یہ آپ کی تحریر نہیں ہے؟ اس شجرے پر ثبت کی ہوئی مہر کو پہچانیئے کیا یہ آپ کی مہر نہیں ہے۔؟

لیکن اے شہنشاہ عالی مقام! آپ شرم سار نہ ہوں مجھے آپ سے کچھ گلہ نہیں ہے، اس لئے کہ آپ نے یہ سب کچھ غفلت اور بے خبری میں کیا ہے، مگر اتنی التجا ضرور کروں گی، کہ میری ماں کو میرا اسلام کہیے گا اور انہیں بتایئے گا کہ ان کی بدنصیب بیٹی مرنے سے بچ گئی تھی، وہ ابھی زندہ ہے اور نصیبوں میں لکھے ہوئے دکھ بھگتنے کی منتظر ہے، آپ سے صرف یہ التجا کروں گی کہ اب آپ ہوس کار مصاحبوں کی جلوت کی بجائے خلوت اختیار کریں اور خود کو خدا کی عبادت میں مصروف کریں شاید اسی طرح خدا آپ کے جور و ستم کو معاف کر دے۔

فقط بدنصیب سسی۔"

یہ خط جب بادشاہ آدم جام کو ملا تو اس نے بے تابی سے خط کھولا اور پڑھنے لگا، مگر جوں جوں وہ خط پڑھتا جاتا تھا، اس کی حالت غیر ہوتی جارہی تھی۔ اس کے چہرے پر پشیمانی اور احساس گناہ کے سائے لرز رہے تھے، آخر اس نے خط پڑھ کر ہاتھ سے اپنا سر پیٹنے لگا کتنے بڑے اور کس قدر گھناؤنے جرم کا وہ ارتکاب کرنے والا تھا۔ ایک باپ اپنی حقیقی بیٹی کا رشتہ مانگ رہا تھا، اگر ایسا ہو جاتا تو خدا کا قہر اس پر نازل ہو جاتا، زمین شق ہو جاتی اور آسمان ٹوٹ کر اس دھرتی پر آ گرتا۔ آدم جام کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے، اور وہ گڑگڑا کر خدا سے اس گناہ کی معافی مانگ رہا تھا، جو انجانے میں اس سے سرزد ہونے والا تھا۔

رفتہ رفتہ جب احساس پشیمانی کا بوجھ کم ہوا تو اس کی شفقت پدری جوش میں آ گئی، اسے شدت سے اپنی وہ ننھی منی بیٹی یاد آنے لگی جسے چودہ برس پہلے اس نے دریا برد کر دیا تھا۔ وہ تو اسے مردہ تصور کر کے فراموش کر بیٹھا تھا، مگر شاید ایسا کرتے ہوئے یہ حقیقت اس کے ذہن سے محو ہو گئی تھی، کہ ایک اور برتر ہستی بھی ہے، جو سب سے عظیم ہے اور ہر شے پر قدرت کاملہ رکھتی ہے، اسے یہ احساس نہیں رہا تھا کہ جسے تقدیر زندہ رکھنا چاہتی ہے، اسے بھلا تدبیر کیا گزند پہنچا سکتی ہے۔

بادشاہ آدم جام کے دل کی بے کلی جب بہت بڑھی تو وہ دربار سے اٹھا اور اپنے خلوت کدہ میں جا کر خدا کے حضور سجدہ ریز ہو گیا، بہت دیر تک وہ اپنے پروردگار کے سامنے گڑگڑاتا رہا، اور اپنے گناہوں کی معافی مانگتا رہا۔ بالآخر اس کے دل کو قدرے سکون سا ہوا تو وہ اپنے خلوت کدہ سے نکلا اور سسی کو بلوانے کے لئے خدام کا ایک دستہ اتا دھوبی کے گھر بھیجا۔

شاہی محل کے خدام جب سسی کے پاس پہنچے اور اسے آدم جام کا حکم سنایا تو وہ سب سے پہلے اتا دھوبی اور اس کی بیوی کے پاس اجازت لینے گئی، ان کی اجازت اور ان کی ان گنت دعاؤں سے وہ شاہی دربار کی طرف روانہ ہوئی، آدم جام نہایت بے چینی سے اپنی بیٹی کی آمد کا منتظر تھا، سسی جب خدام کی ہمراہی میں دربار میں داخل ہوئی، تو بادشاہ تخت سے اتر آیا اور آگے بڑھ کر اپنی برسوں سے بچھڑی ہوئی لخت جگر کو سینے سے لگا لیا۔ سسی کا دل بھی جذبات کی شدت سے بھر آیا، وہ بہت دیر تک باپ کے سینے سے لگی آنسو بہاتی رہی۔ آدم جام کی آنکھیں بھی اشکبار تھیں۔

سارے وزراء اور درباری محو حیرت تھے کہ غریبانہ لباس میں ملبوس یہ نوخیز دوشیزہ کون ہے، جس کی پذیرائی

کے لئے بادشاہ اپنے تخت سے اتر آیا اور اسے یوں بے تابانہ اپنے سینے سے لگالیا، مگر بادشاہ نے ان کی یہ حیرت جلد ہی دور کردی، اس نے سسی کو تخت شاہی پر اپنے پاس بیٹھایا اور پھر بھرے دربار میں اعلان کیا کہ یہ اس کی حقیقی بیٹی سسی ہے جو برسوں پہلے اس سے بچھڑ گئی تھی۔

اس کے بعد بادشاہ نے دربار برخاست کیا اور سسی کو لے کر شاہی محل میں چلا گیا۔ سسی اپنی ماں سے ملی اور تادیر دونوں ایک دوسرے کے گلے سے لگی آنسو بہاتی رہیں، بادشاہ نے سسی سے کہا کہ وہ اب شاہی محل میں ہی رہے گی، مگر سسی اس پر تیار نہ تھی، وہ اپنے منہ بولے والدین کو چھوڑنا نہیں چاہتی تھی، جنہوں نے چودہ برس تک اسے حقیقی اولاد کی طرح پالا تھا۔ اس کی رگوں میں اعلیٰ خاندان کا خون رواں تھا۔ وہ کم ظرف نہیں تھی احسان فراموش نہیں تھی۔

یہ سن کر بادشاہ کے ذہن میں ایک ترکیب آئی، اس نے سسی سے کہا کہ اگر وہ شاہی محل میں قیام پر آمادہ نہیں ہے اور اپنے منہ بولے ماں باپ سے دور نہیں رہنا چاہتی، تو اس کی موزوں ترین صورت یہ ہے کہ وہ لاکھی باغ میں سکونت اختیار کرے، اس طرح وہ دھوبیوں کی بستی کے قریب بھی رہ سکے گی، کیونکہ یہ باغ دھوبیوں کی بستی کے قریب دریا کے کنارے پر واقع ہے، اس کے علاوہ یہ جگہ ایک بادشاہ زادی کی رہائش کے شایان شان بھی ہے۔

سسی نے جب اپنے باپ سے اس جگہ کی تفصیلات دریافت کیں تو بادشاہ نے بتایا کہ یہ وسیع و عریض اور انتہائی سرسبز و شاداب باغ اصل میں بادشاہ آدم جام کا ذاتی باغ ہے۔ وہ جب بھی شکار کے لئے جاتا ہے یا دریا کی سیر کو نکلتا ہے، تو اسی باغ میں قیام کرتا ہے، اس باغ کے وسط میں ایک انتہائی عالی شان محل بھی بنا ہوا ہے مگر یہ محل اسی وقت آباد ہوتا ہے، جب بادشاہ اپنے خدام کے ہمراہ وہاں قیام کرتا ہے ورنہ زیادہ تر یہ محل اور باغ ویران ہی رہتا ہے۔

لاکھی باغ کی ملکیت سسی کے سپرد کرنے کے بعد بادشاہ آدم جام نے شاہی اعلان کے مطابق سسی کو دریا کے آس پاس کے علاقوں کا منتظم بھی مقرر کردیا، سلطنت بھنبھور میں داخل ہونے کا واحد راستہ دریا پر بنا ہوا ایک پل تھا، جس پر سے گزر کر سب قافلے شہر میں داخل ہوتے تھے، اس پل کے ساتھ ہی ایک شاہی چوکی تھی جہاں باہر سے آنے والے ہر قافلے کو محصول ادا کرنا پڑتا تھا۔ یہ پل لاکھی باغ کے قریب ہی واقع تھا۔ بادشاہ نے یہ پل اور چوکی بھی سسی کی تحویل میں دے دی، تاکہ محصول کی آمدنی سے سسی اپنے لئے زندگی کی تمام آسائشیں بہم پہنچا سکے۔

سسی نے اپنے باپ کی یہ پیش کش قبول کرلی اور اگلے ہی روز لاکھی باغ میں سکونت کا آغاز کردیا، اسی روز سسی اس چوکی پر گئی جس کا انتظام و انصرام اب بادشاہ کے حکم کے مطابق سسی کے سپرد کردیا گیا تھا، اس چوکی کے تمام ملازموں کو علم ہوچکا تھا کہ اب ان کی منتظم اعلیٰ سسی ہوگی جو کہ بادشاہ وقت کی اکلوتی بیٹی ہے، وہ سسی کی آمد پر مودب و چوکس ہوگئے، سسی نے اس چوکی اور اس کے تمام امور کا اچھی طرح سے جائزہ لیا، اس چوکی کے باہر ایک بلند و بالا آہنی ترازو نصب تھی، جس پر باہر سے آنے والے قافلے اپنا مال و اسباب وزن کراتے تھے اور وزن کے حساب سے محصول ادا کرتے تھے۔

سسی خود بھی ایک تعلیم یافتہ لڑکی تھی۔ اس نے چوکی کے اہل کاروں کو حکم دیا تھا کہ آئندہ سے جو بھی قافلے والے سلطنت بھنبھور میں داخل ہوں، ان قافلے والوں کے نام، قومیت اور ان کے وطن کا مکمل اندراج کیا جائے اس کے علاوہ قافلے میں جتنے افراد اور جتنی سواریاں ہوں ان سب کی تفصیلات بھی ضابطہ تحریر میں لائی جائیں۔ پھر ان کے پاس جتنا مال و اسباب ہو اس کا وزن کیا جائے اور الگ کتابچے میں درج کیا جائے اور ہر نئے قافلے کی یہ تمام تفصیلات ایک پرچے پر لکھ کر فوراً میرے سامنے پیش کی جائیں۔

دریا کے گھاٹ پر جتنے شاہی پہرے دار تھے انہیں سسی نے اپنے روبرو طلب کیا اور پھر ان کے سامنے

انتہائی پر اثر انداز میں اس نے ان سپاہیوں کو ہدایات دیتے ہوئے کہا کہ آئندہ سے دریا کے کناروں پر پہرا انتہائی سخت ہونا چاہئے۔ اور اس بات کا خیال رکھا جائے کہ کوئی قافلہ بغیر محصول دیئے شہر میں داخل نہ ہونے پائے، سسی نے آدھے پہریداروں کو رات کے وقت فرائض انجام دینے پر مامور کردیا، اس نے پہریداروں کو تلقین کرتے ہوئے کہا کہ وہ دن رات ایک ایک لمحے کے لئے بھی اپنے فرائض سے غافل نہ ہوں۔ مگر جو قافلہ یا مسافر شہر میں داخل ہو، اس سے کسی قسم کی سختی یا درشتی نہ برتی جائے بلکہ انتہائی خوش اخلاقی سے پیش آیا جائے، اس کے ساتھ ہی انہیں چاہئے کہ قافلے والوں کے قیمتی مال واسباب کو دیکھ کر کوئی شخص لالچ میں نہ آئے۔ اگر قافلہ میں عورتیں شامل ہوں تو ان کے حسن وجمال کو بری نظر سے دیکھنے کی کوشش نہ کرے اگر کوئی پیر فقیر یا عالم شہر میں آئے تو ان کے ساتھ نہایت احترام کے ساتھ پیش آیا جائے اور ان سے کسی قسم کا کوئی محصول نہ لیا جائے۔ اسی طرح عمر رسیدہ مرد وعورت یا معصوم بچوں پر کوئی محصول عائد نہ کیا جائے۔

اپنے ماتحت اہل کاروں اور ملازموں کو یہ چند نصائح کرنے کے بعد سسی نے ان سے کہا کہ آدم جام نے اس کے شانوں پر جو یہ اہم ذمہ داری ڈالی ہے، وہ اس میں پوری طرح سرخرو ہونا چاہتی ہے، ایک مرتبہ پہلے وہ شہزادی سے دھوبن بنی تھی اور اب یہ ہرگز برداشت نہیں کرے گی کہ اسے مزید کسی ناکامی یا کسی بدنامی کا سامنا کرنا پڑے۔

چوکی کے اہلکاروں اور پہریداروں نے سسی کو یقین دلایا کہ، اس کی ہر ہدایت پر پورا عمل کیا جائے گا اور ہر کام اس کی خواہش کے مطابق سرانجام پائے گا۔ سسی کے ان اقدامات کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ شاید کبھی کیچ مکران کا کوئی قافلہ بھنبھور میں داخل ہو اور اس کے ذریعے سسی کو اپنے پردیسی شہزادے اپنے پنوں کا کوئی نشان کوئی خبر مل سکے۔

سسی کا قیام اب لاکھی باغ میں بنے ہوئے عالی شان محل میں تھا جہاں وہ تنہا رہتی تھی۔ مگر یہ باغ اور یہ محل دھوبیوں کی بستی سے زیادہ دور نہ تھا، اس لئے سسی اکثر وبیشتر اس بستی میں چلی جاتی تھی جہاں اس نے اپنی زندگی کے چودہ برس عسرت اور تنگ دستی میں گزارے تھے۔

اتا دھوبی اور اس کی بیوی خوش تھے کہ سسی کو اپنے اصلی ماں باپ مل گئے اور اس کی غربت اور پریشانی کے دن تمام ہوئے ان کے لئے یہی فخر تھا کہ بادشاہ وقت کی بیٹی کی پرورش ان کی بوسیدہ کٹیا میں ہوئی ہے اور بھنبھور کی شہزادی کا ان سے بھی کوئی رشتہ ہے، کبھی کبھار سسی کی منہ بولی ماں یعنی اتا دھوبی کی بیوی بھی اس کے محل میں آجاتی تھی۔

سسی کے بچپن اور عہد نوخیزی کی جو سہیلیاں تھیں وہ بھی اس سے زیادہ دور نہ تھیں، کبھی سسی ان سے ملنے چلی جاتی اور کبھی وہ سب سکھیاں ہم جولیاں مل کر سسی سے ہنستی کھیلتی اور باغ کی سیر بھی کرتیں لیکن اس کا دل اندر سے اداس اور بے کل ہی رہتا تھا۔

اسے رہ رہ کر اس خواب کا خیال آتا تھا جو اس نے کچھ برس پہلے دیکھا تھا، اس کے خوابوں کے شہزادے پنوں کا تصور ایک لمحے کے لئے بھی اس کے دل سے محو نہیں ہوتا تھا۔ وہ نہایت بے چینی سے اس دن اس لمحے کی منتظر تھی جب وہ اپنے گمنام شہزادے پنوں کو دیکھے گی، وہ اپنی سہیلیوں کے ہمراہ باغ کی سیر کو نکلتی تو بظاہر بے فکر اور مسرور نظر آتی تھی مگر یہ تو اس کا دل ہی جانتا تھا کہ وہ کس قدر اداس ہے باغ کی سیر کے دوران وہ کسی شاخ گل پر کسی پھڑ پھڑاتے ہوئے پرندے کو دیکھ لیتی تو اس کا دل اپنے پنوں کو یاد کرنے لگتا، کسی بھنورے کو گل سے محو آغوش دیکھتی تو اپنی منتظر، بے چین تنہائیوں کا خیال آجاتا۔ اسے ہر پھول میں ہر غنچے میں اپنے سپنوں کے راجا کی ہی شبیہ نظر آتی تھی۔ اسے موسم بہار بھی اپنے پنوں کے بغیر خزاں جیسا لگتا تھا اور یہ دنیا جہان کی نعمتیں یہ سربلندی وسرفرازی بھی اسے اس محبوب کے بغیر ادھوری لگتی تھی وہ دن کے اجالوں میں بھی اس کو یاد کرتی تھی اور رات کے بے خواب لمحوں میں بھی اس کی راہ تکتی رہتی تھی۔

سسی کے دل میں ایک ہی خیال سمایا ہوا تھا کہ اس کا پنوں مل جائے تو اس کے سارے دکھ ساری پریشانیاں ساری اداسیاں اور بے چینیاں ختم ہو جائیں گی۔ مگر اسے شاید یہ احساس نہیں تھا کہ عشق صرف وصل یار ہی کا نام نہیں ہے بلکہ اس میں ہجر و فراق کی کٹھن اور دشوار گزار گھڑیوں سے بھی گزرنا پڑتا ہے، عشق کی یہ منزلیں اتنی صبر آزما اور جان لیوا ہوتی ہیں کہ وہ عشق کے بیشتر کم حوصلہ مسافر منزل تک پہنچنے سے پہلے ہمت ہار دیتے ہیں، مگر سسی ان لوگوں میں سے تو نہ تھی، وہ تو اسی روز سے منزل تک پہنچنے کا تہیہ کر چکی تھی، جب پہلی بار وہ ماہ رو وہ گمنام جو اس سے خواب میں گو گفتگو ہوا تھا، اب تو وہ اپنا تن، من دھن اسی محبوب شہزادے کے نام کر چکی تھی، اور وہ عشق کی ہر منزل طے کرنے کا اور ہر مرحلے سے گزرنے کا عہد کر چکی تھی۔ اسے اس راہ کی صعوبتوں کا کوئی خوف تھا نہ زمانے کی نکتہ چینیوں کی کوئی پرواہ تھی وہ تو اس راہ میں اپنی جان تک نذر کرنے کا مصمم ارادہ کر چکی تھی۔

ایک روز سسی کی منہ بولی ماں اس سے ملنے کے لئے آئی تو اس نے دیکھا کہ سسی لاکھی باغ کے ایک گوشے میں تنہا اداس بیٹھی ہے اور اس کی نظریں دریا کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ وہ سسی کی حالت دیکھ کر بہت غم زدہ ہوئی، اس نے سسی کو مخاطب کیا اور اسے سمجھاتے ہوئے بولی کہ ”اے میری پیاری بچی، تو نے اپنی یہ کیا حالت بنا رکھی ہے، تمہیں اپنے آپ کا کوئی ہوش ہے نہ اپنے لباس کی کوئی خبر ہے، بادشاہ زادی ہو کر تو کیسے معمولی لباس میں بیٹھی ہے تمہارے بال الجھے ہوئے ہیں اور صورت اداس ہے آخر تو نے اپنا خیال رکھنا اپنے آپ کو سنوارنا کیوں ترک کر دیا ہے، نہ تمہارے بدن پر اچھا لباس ہے، نہ تمہارے بالوں میں کنگھی ہے تمہاری آنکھوں میں سرمہ ہے نہ تمہارے لباس میں خوشبو آخر تو کس کا سوگ منا رہی ہے جو یوں اپنے آپ سے بیگانہ ہو کر یہاں تنہا اور خاموش بیٹھی ہے، تمہاری وہ لڑکپن کی شوخیاں، وہ بچپن کی اٹکھیلیاں کہاں گئیں تمہارا وہ بننا سنورنا وہ چہکنا مسکرانا کیا ہوا ابھی تو تمہاری زندگی کی ابتدا ہے آخر کب تک یوں اپنے آپ سے بیگانہ اور اداس رہو گی۔“

سسی نے شکوہ کناں نگاہوں سے اپنی ماں کی طرف دیکھا اور بولی۔

”اماں تو تو سب کچھ جانتی ہے پھر بھی مجھ سے پوچھتی ہے کیا تجھے یہ علم نہیں کہ میری اس اداسی، اس بے کلی کا سبب کیا ہے، کیا تجھے علم نہیں ہے، کہ میں یہاں تنہا بیٹھی کس کی راہ تک رہی ہوں، ایک ہی تو میرے خوابوں کا شہزادہ، میرا محبوب ہے، جس کے لئے میں اپنا آپ بھلا بیٹھی ہوں، وہ محبوب، وہ مکران کا شہزادہ۔ ”پنوں“ مجھ سے دور ہے، تو پھر میں خود کو سنواروں کس کے لئے سجاؤں، کس کے لئے، کس کی خاطر سنگھار کروں، کس کے لئے خود کو مشکبار کروں، تم دیکھنا، جب وہ آئے گا تو میں خود کو کیسا سجاتی ہوں، کیسا سنوارتی ہوں، پھر میں سولہ سنگھار کروں گی۔ اپنے سراپے کو عطر بار بھی کروں گی۔

ماں میرا پنوں آجائے تو پھر دیکھنا میری ساری شوخیاں ساری اٹکھیلیاں لوٹ آئیں گی، میں مسکراؤں گی اور گنگناؤں گی آخر کیوں نہ گاؤں گی اس کے آنے پر تو دیکھنا، ساری کائنات نغمہ زن ہو جائے گی ذرے ذرے سے گیت پھوٹیں گی۔“ چپے چپے پر بہار آ جائے گی۔“

☆......☆......☆

ایک روز صبح کے وقت سسی کی سہیلیاں اس سے ملنے لاکھی باغ میں آگئیں، سسی ان کی آمد پر خوش ہوگئی، اور حسب معمول باغ کی سیر کا ارادہ کیا، وہ سہیلیاں جب بھی آتی تھیں، سسی ان کے ہمراہ اس وسیع و عریض باغ کی سیر لڑکپن کی شوخی اٹکھیلیوں اور خوش گفتاریوں میں پہروں مصروف رہتی تھیں، مگر اس روز سکھیوں نے سسی سے کہا کہ باغ کی سیر تو ہم کرتی رہتی ہیں۔ آج کیوں نہ اس وسیع و عریض محل کی سیر کی جائے جس میں سسی کا قیام تھا۔

حقیقت یہ تھی کہ یہ محل اتنا بڑا اور شاندار تھا کہ ابھی تک سسی نے بھی محل کا ہر گوشہ نہیں دیکھا تھا۔ اس نے

محل کا صرف ایک حصہ اپنی رہائش کے لئے منتخب اور آراستہ کیا تھا اور محل کے باقی حصوں اور برآمدوں اور غلام گردشوں میں کبھی جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اصل حقیقت یہ تھی کہ سسی فطری طور پر سادگی پسند اور پر قناعت فطرت کی مالک تھی، اسے معلوم تھا کہ وہ تنہا ہے اور یہ شاہی محل اس کی ضروریات سے کہیں زیادہ وسیع اور فراخ ہے، اس لئے اس نے محل کے دوسرے حصوں اور خلوت کدوں کو کھلوانے اور استعمال کرنے کی کبھی ضرورت محسوس نہیں کی تھی، وہ تو اس بات پر اپنے پروردگار کی شکر گزار تھی، کہ بالآخر اس کی آزمائشوں کا دور ختم ہوا، اور اس کے معبود نے اسے غریبی اور گمنامی سے نکال کر ثروت اور سربلندی عطا کی، اگر سسی کی جگہ کوئی اور کم ظرف ہوتا تو شاید اس یک لخت سرفرازی اور بلند مرتبے پر اپنے آپے میں نہ رہتا، اور چھلک کر عقل و توازن کی حدود سے تجاوز کر جاتا، مگر وہ تو نسلاً نجیب الطرفین تھی۔ اس لئے اس میں جاہ و حشم کی کوئی ہوس نہ تھی، وہ اسی مرتبے پر قانع اور شکر گزار تھی لیکن آج اس کی سہیلی نے از حد اصرار کیا تو سسی کے دل میں بھی خیال پیدا ہوا کہ کیوں نہ وہ اس محل کے ان گوشوں کو بھی ایک نظر دیکھ لے جو شاید کئی برسوں سے ویران اور بے استعمال پڑے تھے۔

بادشاہ آدم جام اس باغ اور اس محل کو اپنی سیر کے علاوہ شاہی مہمان خانے کے طور پر بھی استعمال کرتا تھا، اور بیرونی سلطنتوں سے آنے والے معزز مہمان، سفیر اور ممتاز تاجر بھی اس محل میں بادشاہ کے مہمان کی حیثیت سے قیام کرتے تھے، لیکن ایک طویل عرصے سے کوئی مہمان اس محل میں قیام پذیر نہ ہوا تھا، اور سسی کی ملکیت میں آنے کے بعد تو اب اس محل کی وہ حیثیت بھی ختم ہو چکی تھی اب وہ بھنبھور کی شہزادی کی ذاتی رہائش گاہ تھا۔

سسی اپنی ہم جولیوں کے ہمراہ محل کے ایک ایک حصے ایک ایک کمرے اور ہر ایک خلوت کدے کی سیر کرتی ہوئی آگے بڑھتی رہی، محل کے آخری حصے میں ایک طویل و عریض کمرہ ایسا بھی تھا جو مقفل تھا، سسی کے پاس محل کے ہر دروازے کی چابی موجود تھی اس نے اس کمرے کو کھولا اور سہیلیوں کے ہمراہ اس میں داخل ہو گئی۔ اس کمرے میں بے شمار تحائف کے علاوہ کچھ صندوق بھی رکھے تھے، سسی کی نظر ان صندوقوں پر پڑی تو اسے بے اختیار وہ حقیقی صندوق یاد آ گیا، جس میں بند کر کے آدم جام نے اسے چودہ برس قبل دریا کے بے کراں دریا کی نذر کر دیا تھا، سسی کے دل میں تجسس پیدا ہوا کہ دیکھوں تو سہی ان صندوقوں میں کیا چیز بند ہے؟ اس نے آگے بڑھ کر ایک صندوق اٹھایا تو اس میں بہت سی تصویریں تھیں۔ زرق برق لباسوں میں ملک ملک کے لوگوں کی یہ تصویریں نجانے کن مصوروں نے بنائی تھیں۔

سسی ایک ایک تصویر کو دیکھتی جاتی اور ایک طرف رکھتی جاتی ان میں سے کئی تصویریں دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ یہ کئی ملکوں کے بادشاہوں یا راجاؤں یا شہزادوں کی تصویریں ہیں، سسی کے دل میں ایک عجیب سا خیال آرزو بن کر مچلنے لگا کہ کاش ان میں سے اس کے خوابوں کے راجا پنوں کی بھی تصویر ہو، مگر اس نے ایک ایک کر کے تمام تصویریں دیکھ لیں اس کے باوجود اس کے پنوں کی تصویر نظر نہ آئی۔

اصل بات یہ تھی کہ سسی نے کچھ عرصہ قبل پنوں کے بارے میں جو خواب دیکھا تھا اس کے بعد آج تک اسے اپنے محبوب کی صورت کبھی نظر نہ آ سکی تھی، حقیقت کی دنیا میں ملاقات تو دور کی بات ہے وہ اسے دوبارہ کبھی خواب میں بھی نہ دیکھ پائی تھی، یہ تو صرف اس کا اپنا تصور تھا ، جو اس محبوب صورت کو نت نئے انداز میں تر اشتا رہتا تھا، اور وہ اس کے تصور میں ہی مگن رہتی تھی۔ سسی نے مایوس ہو کر تمام تصویریں دوبارہ صندوق میں رکھ دیں اور صندوق کو بند کر دیا، اسی لمحے اس کی ایک سہیلی نے دوسرے صندوق کی طرف اشارہ کیا جو اس کے قریب ہی پڑا تھا اور بولی، "اسے بھی کھول کر دیکھو اس میں کیا ہے؟"

سسی فوراً آگے بڑھی اور دوسرے صندوق کا ڈھکنا اٹھایا پھر جونہی اس کی نظر صندوق کے اندر رکھی ہوئی تصویر پر پڑی وہ چونک کر رہ گئی ملے یوں لگا جیسے اس کا دل

اس کے سینے کی دیوار توڑ کر باہر آ جائے گا، اس کے رگ و پے میں مسرت آمیز حیرانی کی لہریں اٹھ رہی تھیں، اور وہ محویت کے عالم میں اس تصویر کو دیکھ رہی تھی جو سب سے اوپر رکھی تھی یہ اس کے محبوب، اس کے شہزادے، اس کے گلفام اس کے سپنوں کے راجہ "پنوں خان" کی تصویر تھی وہی چہرہ، وہی حسین آنکھیں، وہی دلکش سراپا جو اس نے خواب میں دیکھا تھا، سسی نجانے کب تک محویت اور بے خودی کے عالم میں اس تصویر کی طرف دیکھتی رہی، پھر یکبارگی وہ اس محویت سے چونکی اور اپنی سہیلیوں کی طرف مڑتی ہوئی خوشی سے معمور آواز میں بولی۔

"دیکھو میری ہم جولیو، میں نہ کہتی تھی کہ میرا خواب جھوٹا نہیں ہے، میرے سپنوں کا راجہ، میرا پنوں خان واقعی ایک حقیقی وجود ہے، محض میرا تصور نہیں ہے، دیکھو سکھیو، اپنی آنکھوں سے دیکھو یہی میرا پنوں خان ہے، تم میرا مذاق اڑایا کرتی تھیں اور کہتی تھیں کہ "خوابوں میں دیکھی ہوئی صورتوں کا کوئی حقیقی وجود نہیں ہوتا۔" تم اسے میرا وہم کہا کرتی تھیں، آگے آؤ اور غور سے اس تصویر کو دیکھو یہی میرا محبوب ہے یہ میرا وہم نہیں ہے میرا خواب نہیں ہے، میرا تصور نہیں ہے، آؤ اور بغور اس صورت کو دیکھو اور مجھے بتاؤ کہ اگر میرا خواب سچا نہیں تھا تو پھر یہ تصویر کہاں سے آ گئی۔؟"

سسی کی سہیلیوں نے بھی آگے بڑھ کر اس تصویر کو دیکھا اور حیران و ششدر رہ گئیں، یہ صورت، یہ چہرہ اس قدر حسین ایسا وجیہ اور سحر انگیز تھا کہ وہ محو ہو کر رہ گئیں وہ حیرت اور بے یقینی سے سسی کی طرف دیکھنے لگیں، سسی جس کے چہرے پر مسرت کی صبح طلوع ہو رہی تھی جس کی آنکھوں میں مستقبل کے خواب دمک رہے تھے وہ اپنی سہیلیوں کو فخریہ نگاہوں سے دیکھتی ہوئی بولی۔

"اب تو تمہیں یقین آ گیا ناں کہ میرا خواب جھوٹا نہیں تھا، تم دیکھنا جس طرح قدرت نے مجھے آج یوں اس کی تصویر دکھا دی ہے کبھی نہ کبھی حقیقت کی دنیا میں بھی مجھے اس سے ضرور ملا دے گا، میرا پروردگار اب مجھ پر مہربان ہو چکا ہے، جس طرح اس نے مجھے دھوبن سے پھر شہزادی بنا دیا، جس طرح اس نے میری بے بسی اور میری عسرت کو آسودگی اور سربلندی اور تونگری میں بدل دیا ہے، جس طرح اس نے مجھے آج میرے محبوب شہزادے کی تصویر دکھا دی۔ اسی طرح ایک نہ ایک دن وہ مجھے اس سے حقیقت کی دنیا میں بھی ضرور ملائے گا۔"

سسی بار بار اس تصویر کو تکتی تھی اور ہر بار اس کے ذہن میں خواب کا وہ نقشہ گھوم جاتا تھا۔ جب صحراؤں کے اس پار سے آنے والا ایک شہسوار اچانک اس کے روبرو آ گیا تھا اور وہ اس کا ماہ تاباں، بہار قامت رشک گل چہرہ دیکھ کر اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھی تھی۔ یہ وہی چہرہ تھا وہی آنکھیں تھیں وہی سراپا تھا، وہ صحراؤں کا شہزادہ جس سے بڑھ کر وجیہ کوئی نہ تھا وہ مکران کا بلوچ زادہ جس سے بڑھ کر جوان رعنا کوئی نہ تھا۔

سسی کبھی پلٹ کر اپنی سہیلیوں سے مخاطب ہوتی تھی کہ سکھیوں مجھے مبارک باد دو، آج میں نے اپنے شہسوار، اپنے ماہ کنعان کا دیدار کر لیا اور کبھی تصویر سے ہم کلام ہو جاتی اور دلگیر لہجے میں کہتی۔

"اے میرے بادشاہ، کبھی اس بے آسرا کی طرف بھی نگاہ کرم کر دو۔ اے دور دیس بسنے والے، کبھی مجھ اسیر کی بھی خبر لو، جو تمہاری ایک چشم التفات سے اسیر ہو گئے اور تمہاری زلفوں کی زنجیر میں بندھ گئی ہے، یہ کیسا ستم ہے کہ تم میرے دل میں رہتے ہوئے بھی میری نگاہوں سے اتنی دور بسیرا کئے ہوئے ہو، کبھی اس غریب کے گھر میں قدم رکھو یا پھر مجھے اپنا ٹھکانہ بتاؤ تاکہ میں خود تمہارے پاس چلی آؤں۔ اے میرے خوابوں کے شہزادے بھلا تمہیں کیا خبر نہیں کہ میرا روآں روآں میرا انگ انگ تمہاری الفت سے سرشار ہے میرے ہر سانس میں اور میرے لہو کی ہر بوند میں تمہارا عشق رچا ہوا ہے، کیا تمہیں کبھی احساس نہیں ہوا کیا تمہارے دل میں کبھی اس سچے جذبے کی کسک نہیں ابھری کہ کوئی دیوانی راستے میں نگاہیں بچھائے برسہا برس سے تمہارے آنے کی منتظر ہے۔"

سسی کی سہیلیاں بھی اس تصویر کی طرف دیکھتی

تھیں اور کبھی تاسف سے سسی کی طرف دیکھتی تھیں، جو دنیا و مافیہا سے بے خبر اس بے جان تصویر سے محو گفتگو تھی۔ ساکت نقوش کے اس مجموعے سے ہم کلام تھی، آخر ایک سہیلی نے آگے بڑھ کر سسی کو مخاطب کیا اور سمجھانے لگی کہ کیوں دیوانوں کی طرح اس بے جان صورت سے باتیں کئے جاتی ہو، خبر نہیں کس کی یہ تصویر ہے، تم تو اپنے عشق میں اتنی پاگل ہو چکی ہو کہ تمہیں ہر صورت میں اپنے محبوب کی صورت نظر آتی ہے، معلوم نہیں ان صندوقوں میں کن کن بادشاہوں اور کون کون سے دیس کے شہزادوں کی تصویریں ہیں یہاں تمہارا پنوخان کہاں سے آگیا۔

سسی نے تڑپ کر اپنی سہیلی کی طرف دیکھا اور جذبات سے لبریز آواز میں بولی۔ ''اے بے خبر ہم جولیو، کیا میں نے تمہیں بتایا نہیں تھا کہ میرا پنوں خان بھی تو شہزادہ ہے کیچ مکران کا شہزادہ مگر اس وقت بھی تم نے میرا وہم کہا تھا، آج قدرت نے سب وہم دور کرنے ہی کے لئے مجھے اور تمہیں یہ تصویر دکھا دی ہے، تو تم پھر بھی ابھی شکوک و شبہات میں گرفتار ہو۔'' یہ کہہ کر سسی نے آسمان کی طرف دیکھا اور غم ناک لہجے میں بولی۔

''اے میرے پروردگار، مجھے بتا کہ ابھی انتظار اور جدائی کے کتنے برس، کتنی صدیاں مجھے اور گزارنا ہوں گی اے میرے رب، تو تو برسوں کے بچھڑے یوسف کو اپنے باپ سے اور بھائیوں سے ملوا سکتا ہے، تو تو یونس کو مچھلی کے پیٹ سے زندہ نکال سکتا ہے، تو موسیٰ اور اس کی قوم کے لئے دریا خشک کرسکتا ہے تو محمدؐ کے ایک اشارے پر چاند کو دولخت کرسکتا ہے پھر اے معبود حقیقی تیرے لئے اس میں کیا مشکل ہے کہ تو اس بدنصیب سسی کو اس کا محبوب دلا دے۔ اے میرے پروردگار میں تو عذاب جھیلتے جھیلتے تھک گئی ہوں، بے دم ہو چکی ہوں، اب تو میری تاریک دنیا میں بھی اجالا کردے میری غموں سے بھرپور اس اندھیری رات کی صبح کردے۔ میرے دل کے خزاں رسیدہ چمن میں بہار کی رنگینیاں بکھیر دے مجھ بے بصر کو بینائی دے، مجھ نا سمجھ کو دانائی دے۔''

سسی کی سکھیاں دم بخود اس کی حالت کو دیکھ رہی تھیں۔ پھر اچانک ایک سہیلی نے سسی کو سمجھاتے ہوئے کہا کہ ''ایک ان دیکھی صورت کے عشق میں کیوں اپنا آپ گنوانی ہو، کیا تمہیں نہیں معلوم کہ عشق کرنے والوں کا انجام کیا ہوتا ہے، کیا تمہیں خبر نہیں کہ لیلیٰ کے عشق میں قیس دیوانہ ہو گیا تھا، اور صحراؤں کی بے رحم وسعتوں میں ہلاک ہو گیا تھا۔ کیا فرہاد کا انجام تمہیں نہیں معلوم جو شیریں کے عشق میں خود اپنے ہاتھوں موت کی نیند سو گیا تھا، ہم سب تمہارے بھلے کے لئے کہتی ہیں، کہ اب بھی اس دیوانگی سے باز آجاؤ اور اپنی جان کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔

سسی نے دکھ بھری نگاہوں سے اپنی ہم جولیوں کو دیکھا اور کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔ ''اے میری سہیلیو! تم یہ باتیں اس لئے کر رہی ہو کہ تمہیں کبھی عشق کی لذت سے آشنائی نہیں ہوئی ہے، تمہیں کیا خبر کہ یہ جذبہ جب انسان کے دل میں بسیرا کرتا ہے تو اس کے لئے دنیا کے سارے دکھ بے وقعت ہو جاتے ہیں، عشق کرنے والوں کے لئے نہ تو اپنی جھوٹی عزت کی کوئی اہمیت رہتی ہے نہ انہیں اپنی زندگی کی کوئی پروا ہوتی ہے، تم مجھے دنیا کی مشکلات سے خوف زدہ کر رہی ہو۔ مگر میں تو اپنے محبوب کی خاطر اپنی جان تک دینے کا عزم کر چکی ہوں تم مجھے عقل اور مصلحت کی راہ دکھا رہی ہو، مگر عشق کرنے والے تو دل سے سوچتے ہیں اور عشق کرنے والی آنکھ سے دیکھتے ہیں، راہ یار کی صعوبتیں ہمیں راحتیں دکھائی دیتی ہیں، اور رسوائی کے پتھر ہمیں پھول بن کر لگتے ہیں۔''

سسی کی سہیلیاں خاموش ہو گئیں۔ انہیں احساس ہو چکا تھا کہ سسی اس راہ میں اتنا آگے نکل چکی ہے، کہ اسے ہوش کی دنیا میں واپس لانا اب ممکن نہیں رہا۔ وہ کچھ دیر تو سسی کو پنوں کی تصویر سینے سے لگائے اور آنکھیں بند کئے خود کلامی کے عالم میں دیکھتی رہیں، پھر چپ چاپ واپس اپنے گھروں کو روانہ ہو گئیں۔

(جاری ہے)

زرد گلاب

ساحل دعا بخاری۔ بصیر پور

بریسلیٹ کا نوجوان کے جسم سے ٹچ ہونا تھا کہ اچانک نوجوان کے جسم میں آگ بھڑک اٹھی اور دیکھتے ہی دیکھتے آگ نے پورے جسم کا احاطہ کرلیا، نوجوان کی چیخوں نے فضا کو دہلا کر رکھ دیا، اور پھر وہ چشم زدن میں غائب ہوگیا

لفظ لفظ سطر سطر حیرت سے دوچار کرتی اور دل و دماغ کو خوف کے شکنجے میں جکڑتی دل فگار کہانی

یخ بستہ ہوائیں فضاؤں میں چکراتی پھر رہی تھیں۔ سہ پہر دھیرے دھیرے ڈھلنے کو تھی۔ سڑک پر ایک گاڑی کے بریک چرچرائے، پھر گاڑی کے دروازے کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ ”گھر تو خاصا اچھا اور بڑا ہے۔“ میرین نے اندر داخل ہوتے ہی گھر کا ناقدانہ جائزہ لیا۔

پراپرٹی ڈیلر جیک کی باچھیں کھل گئیں۔ ”یس میم! گھر کافی کشادہ صاف ستھرا اور بہت اچھی حالت میں ہے، اتنی کم قیمت میں آپ کو اتنا اچھا گھر کہیں نہیں ملے گا۔“

ایک چھوٹی سی پگڈنڈی نما سڑک گیٹ سے سیدھی رہائشی عمارت کی طرف جارہی تھی، وہ پختہ اینٹوں سے بنی تھی اور گرد و غبار سے اٹی تھی، اس کے اطراف مختلف پھولوں کے پودوں کے گملے رکھے تھے۔ پودے مرجھا

چکے تھے۔ بائیں جانب بے ترتیب چند درخت تھے اور دائیں جانب پھولوں کی کیاریاں...... وہ تمام تر پھول زرد گلاب تھے۔ باقی تمام تر پودے خشک ہوکر مرجھا چکے تھے، حتیٰ کہ گھاس بھی خشک تھی، لیکن گلاب کے تمام پودے نہ صرف شاداب تھے بلکہ ان پر فریش فریش زرد گلاب کھلکھلا رہے تھے۔

وہ متعجب سی اس طرف چل دی۔ ڈیوڈ بھی چونکا۔ وہ بھی گلابوں کی جانب بڑھ گیا۔ جیک بھی ان کے پیچھے تھا۔ "یہ باقی پھول اور پودے خشک ہیں تو یہ کیسے ......؟" میرین کے انداز میں حیرت نمایاں تھی۔

"وہ میم ...... پتہ نہیں......" جیک نے متذبذب ہوکر شانے اچکائے۔

"اچھا! یہ بتاؤ کہ اس گھر کی قیمت اتنی کم کیوں ہے؟ جبکہ لوکیشن بھی اچھی ہے، اور گھر کی حالت بھی اتنی بری نہیں؟" ڈیوڈ کا انداز پرسوچ تھا۔

"وہ سر! . لوگ کہتے ہیں کہ یہاں کوئی سایہ ہے۔" وہ قدرے ہچکچا کر بولا۔

"واٹ...... فنٹاسٹک!" ڈیوڈ کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ میرین کی نظریں مسلسل زرد گلابوں پر جمی ہوئی تھیں۔

☆ ☆ ☆

صبح دبے پاؤں گھر میں اتر آئی تھی، مگر گھر کے مکین بے خبر سوئے پڑے تھے۔ سورج کی کرنوں نے کھڑکی پر دستک دینا شروع کردی تو میرین نے کسمسا کر آنکھیں کھول دیں، ڈیوڈ ابھی بھی سویا پڑا تھا۔ میرین نے اس کا بازو خود سے ہٹا کر ہاتھوں سے بالوں کو سنوارا اور اٹھ کر کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئی، اس نے کھڑکی کے پٹ وا کیے تو دھوپ میں ملبوس ہوا کا جھونکا اسے چھوتا ہوا گزر گیا۔ اس نے پلٹ کر سوئے ہوئے ڈیوڈ کو دیکھا۔

ان کی شادی ایک سال قبل ہوئی تھی۔ میرین کا باپ جیرالڈ قصبے کا میئر تھا۔ اس کی ماں کینسر کا شکار ہوکر مرگئی تھی۔ ڈیوڈ کا باپ کیمرون، جیرالڈ کا کلاس فیلو رہ چکا تھا۔ وہ ایک دن ڈیوڈ کے ہمراہ کسی کام سے جیرالڈ کے قصبے میں گیا تو جیرالڈ نے اسے ڈنر پر روک لیا۔ وہیں ڈیوڈ کی میرین سے ملاقات ہوئی، اور وہ ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے۔ پھر ان کی شادی ہوگئی۔

ڈیوڈ چونکہ اٹلانٹا سٹی میں جاب کرتا تھا تو وہ میرین کو بھی وہیں لے گیا۔ اسے کمپنی کی طرف سے چھوٹا سا گھر ملا ہوا تھا۔ اب دونوں نے اپنی سیونگ سے یہ خوب صورت سا گھر لیا تھا۔

میرین نے ڈیوڈ کو جگانا چاہا۔ "اوں......" کرکے وہ کروٹ بدل کر پھر سو گیا۔

"ڈیوڈ! اٹھو نا!"

ڈیوڈ نے مندی مندی آنکھوں سے اسے دیکھا پھر ہاتھ اس کی جانب بڑھا دیا۔ میرین نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھانا چاہا، اسی پل ایک جھٹکے سے ڈیوڈ نے اسے خود پر گرالیا۔ اس کے چہرے پر وہ مہر محبت ثبت کررہا تھا۔ جب کھڑکی پر ہلکا سا کھٹکا ہوا، اس نے چونک کر دیکھا۔ وہاں کسی سائے کی ایک جھلک سی دکھائی دی۔ اس نے پلکیں جھپکیں تو وہاں کچھ نہ تھا۔ کھڑکی کے کرٹن سمٹے ہوئے تھے اور پٹ کھلے تھے۔ دائیں طرف والے پٹ پر کچھ لکھا تھا۔ شاید...... یا اسے ہی ایسا لگا۔ وہ میرین کو خود پر سے ہٹاتا ہوا اٹھا۔

"کیا ہوا؟" اسے کھڑکی کی طرف جاتا دیکھ کر وہ چونک اٹھی۔ اتنی دیر میں ڈیوڈ نے کھڑکی کے شیشے کا پٹ بند کیا۔

بلیک گلاس پہ سفید مارکر سے لکھی عبارت واضح تھی۔ "یکم جون 2012ء۔ انجلینا ہاؤس کی پہلی صبح مبارک ہو۔"

میرین سن ہوکر رہ گئی۔ "بھئی! یہ کس نے ہمیں وش کیا ہے، نئے گھر میں؟"

وہ متحیر تھی۔

"رات کو جب تم سو رہی تھی تب میں نے لکھا تھا۔" وہ ہنسا۔

"واٹ؟"

"یس مائی ڈیئر! میں نے سوچا تم ڈر جاؤ گی پر تم کچھ زیادہ ہی ڈر گئیں؟"

"یو چیٹر۔" وہ اس کے کندھے پہ کے برسانے لگی۔ "آج کی بیڈٹی یہ ہے؟" وہ اسے گھورتی ہوئی کچن میں چلی گئی۔ ڈیوڈ کی پرسوچ نظریں کھڑکی پر جمی تھیں۔ میرین کو تو اس نے جھوٹ بول کر مطمئن کر دیا تھا مگر خود الجھا ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆

بھائیں بھائیں کرتے ویران گھر میں شور شرابے کا سیلاب امڈ آیا تھا۔ انہوں نے اپنے گھر لینے کی خوشی میں پارٹی رکھی تھی۔ جام کھنک رہے تھے۔ لان کی صفائی کر کے سارا انتظام وہیں کیا گیا تھا۔ رہائشی عمارت اور دیواروں کے علاوہ درختوں اور پودوں پر بھی آرائشی بلب جگمگا رہے تھے۔ ان دونوں کا حلقہ احباب کافی وسیع تھا میرین فرداً فرداً سب سے ملتی پھر رہی تھی۔ "میری! یہ......" جولیا اپنے سامنے ٹیبل پر رکھے گلاس کو دیکھ کر ہکلائی۔ "کیا ہوا؟" جولیا نے ٹشو پیپر میں اپنے چہرے پر پھوٹتا پسینہ صاف کرتے ہوئے گلاس کی سمت اشارہ کیا۔

میرین نے گلاس کو دیکھا اور سناٹے میں رہ گئی۔ تیس کانچ کے گلاس میں سنہری محلول کے بیچ بہت ہی ننھا سا ایک انسانی ہاتھ تیرتا پھر رہا تھا۔ ہاتھ کسی نومولود بچے کا تھا۔ پتلی چھوٹی انگلیاں اور نرم و ملائم سفید جلد ہاتھ کے گرد ننھے ننھے بلبلے سے بن رہے تھے۔ جیسے برف کو وائن میں ڈال دو تو بنتے ہیں اور ہاتھ کا سائز لمحہ بہ لمحہ بتدریج کم ہوتا جا رہا تھا۔ وہ برف کی مانند سنہری مشروب میں تحلیل ہوتا جا رہا تھا۔ میری پر طاری سکتہ جولیا کی خوف گزیدہ چیخ سے ریزہ ریزہ ہو گیا۔

"کیا ہوا؟" لمحوں میں لوگ وہاں جمع ہو گئے۔ مگر ان کے آنے تک وہ ہاتھ مکمل طور پر تحلیل ہو چکا تھا۔

"اس میں کسی بچے کا ہاتھ تھا۔" اس بات کا ردعمل بے ساختہ تھا۔ کسی نے اسے وہم گردانا اور کسی نے سمجھا کہ وہ مذاق کر رہی ہیں۔ زیادہ تر لوگ سمجھ رہے تھے کہ انہوں نے زیادہ ہی پی لی ہے۔ تنگ آ کر وہ چپ ہو رہیں۔ مگر حقیقت۔ یعنی وہ ننھا سا انسانی ہاتھ اس کے اعصاب پر سوار ہو کر مسلسل ذہن پر کوڑے برسا رہا تھا۔ وہ کھوئی کھوئی سی رہیں......

☆......☆......☆

سورج دھیرے دھیرے پاتال کی گاڑھی دلدل میں دھنستا چلا جا رہا تھا۔ ہوا سرمستی کے عالم میں اپنا آنچل لہراتی پھر رہی تھی۔ ڈیوڈ کمپنی کے کام سے شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔ میرین پارک میں چہل قدمی کر کے واپس آ رہی تھی۔ اس کے ذہن میں مسز شیرف کی باتوں کی بازگشت پھیلی تھی۔ "میری مانو تو یہ گھر چھوڑ دو۔ تم سے پہلے یہ گھر مسٹر برکلے کے پاس تھا۔ اور ان کے دونوں بچے دس سالہ پیٹر اور بارہ سالہ ماریہ کو اکثر وہاں روحیں دکھائی دیتی تھیں۔ وہ ایک دن ذہنی توازن کھو بیٹھیں اور اب وہ مینٹل ہاسپٹل میں ہیں۔"

سنسنی آمیز خوف کی ایک سرد لہر بار بار اس کی ریڑھ کی ہڈی میں رینگ جاتی تھی۔ وہ گھر میں داخل ہوئی تو خاموشی نے اس کا استقبال کیا۔ سناٹا ہر طرف چکراتا پھر رہا تھا اندر کی سمت جاتے ہوئے اس کی نگاہ زرد گلابوں کی سمت اٹھی اور وہیں جم کر رہ گئی۔ خوف نے اپنے بدہیئت استخوانی ہاتھ میں اس کا دل بھینچ کر مسل مسل ڈالا۔

وہاں، زرد گلابوں کے پاس ایک سنہری دراز بالوں والی لڑکی کھڑی تھی۔ اس نے زرد گلابوں کے رنگ جیسا امبریلا فراک پہن رکھا تھا جو اس کے گھٹنوں کو چھو رہا تھا۔ اس کی میرین کی سمت پشت تھی۔ فراک کی آستینیں نہیں تھیں اور سنہری دراز بال پشت پر بکھرے ہوئے لہرا رہے تھے۔ لڑکی پھول توڑ رہی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ کچھ گنگنا بھی رہی تھی۔

میرین کے قدم اس کی سمت اٹھے۔ لڑکی ایک دم پلٹی۔ میرین نے ترشی ہوئی گرین گراس سے لے کر اسے سر تک بغور دیکھا۔ اس کے ننگے سفید پتلے پتلے پاؤں گہری سبز گھاس پر ہیرے کی مانند دمک رہے تھے۔ اس کا زرد شفون کا فراک گھٹنوں سے نیچے تک تھا۔ اس کی پتلی کمر اور فلر فراک کی فٹنگ میں نمایاں تھا۔ کندھوں پہ فراک کی ڈوری لپٹی تھی اور سفید بدن کندن کی مانند

دمک رہا تھا۔ اس نے ہاتھوں میں زرد کھلے گلاب اور ادھ کھلے گلاب شاخوں سمیت تھام رکھے تھے۔ اس کے گلابی ہونٹوں پر مسکان بکھری تھی۔ نیلی جھیل سی آنکھوں میں ایک بے نام مگر بے حد عجیب سا تاثر تھا۔ میرین کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ کسی کوڑیالے سانپ کی طرح بل کھا کر رینگ گئی۔

"کون ہو تم؟" میرین کے لبوں میں سوال سرسرایا۔ لڑکی اسی...... لمحے کے ہزارویں حصے میں غائب ہوگئی۔ تو وہ سناٹے میں کھڑی رہ گئی۔

دوسری بار میرین نے اسے کچن میں چائے بناتے دیکھا تھا۔ میرین ناشتہ بنانے کچن میں گئی تو وہ لڑکی وہاں پہلے سے موجود تھی۔ اس نے وہی زرد فراک پہن رکھا تھا اور بالوں میں ایک کھلا ہوا زرد گلاب تھا۔ میرین ٹھٹک کر وہیں دروازے میں رک گئی۔ لڑکی نے اس کی آمد کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ وہ مگن سے انداز میں چائے بناتی رہی۔ چائے کا برتن ایک طرف رکھ کر اس نے توس سینکے اور انڈے بوائل کئے۔ انڈہ فرائی کرنے کے لئے جب اس نے پین میں ڈالا تو گرم گرم کوکنگ آئل اچھل کر اس کے ہاتھ پر جا پڑا۔ میرین کو حیرت ہوئی، جب وہ لاپروائی سے کھڑی رہی۔ یہی نہیں، جب انڈہ فرائی ہوگیا تو اس نے فرائنگ پین میں ہاتھ ڈال کر آرام سے نکال کر پلیٹ میں رکھ دیا اور پھر میرین کی طرف پلٹی۔ "آج کافی عرصے بعد کچھ بنایا ہے۔ کھا کر بتانا ضرور کہ کیسا بنا ہے؟" اتنا کہتے ہی وہ غائب ہوگئی۔ میرین بدستور ساکت تھی۔

☆......☆......☆

پھر اس لڑکی کو دیکھنا گویا اس کا معمول بن گیا۔ کچن میں، بیڈ روم میں، ٹیرس پہ اور خصوصاً پھولوں کے پاس... وہ اسے روزانہ دکھائی دینے لگی۔ پہلے پہل تو اسے شدید خوف آن گھیرتا، مگر پھر آہستہ آہستہ وہ عادی ہونے لگی۔ ڈیوڈ سے اس لڑکی کا ذکر بھی عام سے انداز میں کرنے لگی۔ "آئم ویری لکی! کہ مجھے اتنی بہادر بیوی ملی ہے۔" وہ اسے ستائشی انداز میں دیکھتا اور وہ ہنس دیتی۔

وقت اپنے مخصوص انداز میں پھڑ پھڑاتا گزرتا رہا۔ اور وقت کا کام تو بس اڑتے چلے جانا ہی ہے۔ کون اس کے ہمراہ بھاگ رہا ہے اور کون گر گیا ہے، کون زیرِ زمین چلا گیا ہے اور کون اس کی دھول میں گم ہوا ہے، وقت کو اس سے کوئی غرض نہیں، بلا کا سفاک ہے یہ...... اور بلا کا خود غرض بھی

☆......☆......☆

23 دسمبر کی وہ صبح کہر میں لپٹی نمودار ہوئی تھی۔ ہر منظر پہ کہر کا پہرہ تھا۔ اس دن نجانے کیوں میرین کو گھر کی ہر شے سے ویرانی ٹپکتی محسوس ہو رہی تھی۔ ایک عجیب خالی پن سا پورے گھر میں چکراتا پھرتا تھا۔ اس نے معمول کے کام بھی بے دلی سے سرانجام دیئے تھے۔ ڈیوڈ چونکہ قدرے مختلف خیالات کا شخص تھا۔ لہٰذا اس نے میرین کو اس کی بہترین جاب چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ سو اب وہ گھر پر ہی ہوتی تھی۔ یا پھر کہیں گھومنے پھرنے نکل جاتی۔ ڈیوڈ آفس سے جلدی واپس آیا تو وہ خوش ہوگئی۔ "مجھے کمپنی کے کام سے دو دن کے لئے لندن جانا ہے۔ ایک گھنٹے بعد کی فلائٹ ہے۔ پیکنگ کر دو۔"

"کیا؟ ڈیوڈ! مت جاؤ نا!" وہ ایک دم اداس ہوگئی۔ "کیوں یار! میرے بغیر دو دن بھی نہیں رہ سکتیں؟" وہ شوخی سے بولتا اس کے چہرے پر جھکا۔

"مجھے...... مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے؟" وہ اس کے کشادہ سینے میں سر دے گئی۔ "کیوں؟" ڈیوڈ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا۔

"پپ...... پتہ نہیں۔ مجھے لگ رہا ہے جیسے...... جیسے کچھ ہونے والا ہے۔" اس کی آواز میں خوف کی لرزش تھی۔

"اوہ ڈارلنگ! کچھ نہیں ہوتا۔ بی ایزی......" وہ اس کا گال تھپتھپاتے ہوئے پلٹ گیا۔ "اگر اکیلے میں گھبراہٹ محسوس کرو تو کسی فرینڈ کے گھر چلی جانا، یا کسی کو بلا لینا۔" اس کے چہرے پر محبتوں کی بارش کر کے وہ چلا گیا۔

وہ ٹائم پاس کرنے پارک میں چلی گئی۔ مسز کیون کے کیوٹ سے بچے جولی کے ساتھ کھیلتے اسے وقت گزرنے کا احساس تک نہ ہوا۔ جانے کب کہر پہ بادل

غالب آئے تھے۔ وہ تو بادلوں کی گڑگڑاہٹ پہ چونکی تھی۔ مسز کیون بھی جولی کو لے کر چلی گئیں۔ وہ بھی ان کے ساتھ ہی نکلی تھی۔ "میری! آج ہمارے گھر آجاؤ۔" چونکہ وہ باتوں باتوں میں انہیں ڈیوڈ کی عدم موجودگی کی بابت بتا چکی تھی۔ سو انہوں نے اپنے گھر کی جانب مڑتے ہوئے اسے دعوت دے ڈالی۔ مگر کیون البرٹ کی ہوسناک نگاہوں کو یاد کرتے ہی اسے جھرجھری آگئی۔

"نہیں، میں گھر جاؤں گی۔" وہ ویران سڑک پہ اکیلی چلنے لگی۔ چونکہ ان کا گھر دیگر گھروں سے قدرے ہٹ کے بنا تھا، اس لئے وہ اکیلی رہ گئی تھی۔ شام بادلوں میں منہ چھپا گئی تھی اور بارش تیزی زمین پہ بکھرے سکوت پہ برستی اسے کسمسانے پر مجبور کررہی تھی۔ گھر کا گیٹ کھولنے تک وہ بارش میں بری طرح شرابور ہوچکی تھی۔ سرد بارش کے ساتھ ساتھ پھرتی اپنی نوکیلی چونچوں سے اسے ٹونگ رہی تھی۔ اس نے گیٹ اندر سے اچھی طرح بند کیا اور پھر سرخ اینٹوں کی پھولوں میں گھری روش پر تیزی سے چلتی اندر داخل ہوگئی۔ ہوا سرسراتی پھرتی تھی اور بارش میں گھل کر جھومتی پھرتی تھی۔ دیوانہ وار جھومتی پھرتی تھی۔ لائٹ غائب تھی۔ شاید بارش کی وجہ سے کوئی مسئلہ ہوگیا تھا۔ اس نے جنریٹر آن کرکے گیلے کپڑے چینج کئے۔ اور جب وہ کچن میں کافی بنانے کی غرض سے گئی تو سردی سے اس کے دانت بج رہے تھے۔ سرد نوکیلی ہوائیں رگوں سے ہوتی ہوئی ہڈیوں کو کاٹتی چلی جاتی تھیں۔ کچن میں آکر ٹھنڈک کا احساس قدرے زائل ہوا تھا۔ وہ کافی کا تھرماس لے کر بیڈروم میں پہنچی تو ہوائیں مزید پھر چکی تھیں۔ کھڑکیوں کے پٹ اور دروازے بری طرح کرا رہے تھے۔ ہوائیں عالم وحشت میں بے قراری سے ان سے سر ٹکرا رہی تھیں۔

اسی پل اسے احساس ہوا شدت سے کہ کھڑکی کے پاس کوئی ہے، وہ دھڑکتے دل کے ساتھ بغور اسی جانب دیکھتی رہی، کھڑکی کے سفید باریک لہراتے پردوں کے بیچ واقعی کوئی تھا۔ باہر آسمان پر بجلی کا کوڑا لہرایا تو میرین کو پتہ چلا کہ وہ کوئی مرد تھا۔ اس کے سر پہ سینگوں سے بنا بڑا ہیٹ تھا۔ اور وہ بلیک تھری پیس میں ملبوس تھا۔

اگلے ہی لمحے وہ عین میرین کے سامنے موجود تھا۔

کھڑکی بند تھی۔ دروازہ بند تھا۔ پھر وہ اندر کیسے آیا؟

مارے خوف کے وہ اپنی جگہ منجمد ہوکر رہ گئی۔ اسے اپنے جسم کا تمام خون خشک ہوتا محسوس ہوا۔ ٹیبل لیمپ کی زرد مائل دودھیا روشنی میں وہ اس کے سامنے تھا۔ اس کی بھوری آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ ایک پراسراری چمک۔۔۔ اور گلابی پتلے ہونٹوں پہ استہزائیہ مسکان کھیل رہی تھی۔

دھیرے دھیرے اس نے اپنا دایاں ہاتھ میرین کی گردن کی سمت بڑھایا۔ اس کی پتلی انگلیوں کے ناخن نہایت لمبے اور مڑے ہوئے تھے۔ میرین الٹے قدموں پیچھے ہٹنے لگی۔ وہ مسلسل آگے بڑھ رہا تھا۔ یہاں تک کہ الٹے قدموں چلتے چلتے وہ دیوار سے جا لگی۔ وہ اس کے گرد دونوں ہاتھ دیوار سے جما کر کھڑا فرار کی تمام تر راہیں مسدود کرگیا تھا۔ وہ ہراساں ہی اسے اپنے چہرے پہ جھکا دیکھ رہی تھی۔ خوف سے اس کی رنگت برف جیسی ہوگئی تھی۔ وہ دھیرے دھیرے اس کی گردن کی جانب ہونٹ لے جانے لگا۔ میرین نے بے دم سا ہوکر سر دیوار سے ٹکا کر آنکھیں بند کرلیں۔ میرین کو اپنی گردن پہ گرم سانسوں کا لمس محسوس ہوا۔ اسے لگا، اس کی گردن جھلس جائے گی، یکایک اس کے لبوں سے سسکاری نکلی۔ اسے گردن پہ چبھن سی محسوس ہوئی تھی۔ سوئی کی سی چبھن...... جیسے کانٹا چبھتا ہے۔ اس نے بند آنکھوں کو مزید بھینچ لیا۔ اسے گردن پہ گرم ہونٹوں کے لمس کے ساتھ ساتھ کچھ عجیب سا احساس بھی ہورہا تھا۔ مگر وہ احساس کیا تھا؟ وہ سمجھنے سے یکسر قاصر تھی۔

باہر آندھی نے شور مچا رکھا تھا۔ سفید ریشمی پردے بری طرح لہرا رہے تھے۔ کھڑکی نجانے کیسے کھل گئی تھی۔ ہوا کی "شائیں شائیں" پہرہ کرنے پہ، سانسیں چھین لینے پہ تلی تھی۔

"جارج! آج میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں

کی۔" ایک چنگاری ابھری۔

میرین نے آنکھیں کھولیں تو وہ لڑکی، وہی زرد گلابوں والی لڑکی بیڈ کی پائنتی کھڑی تھی۔ وہ اپنے مخصوص زرد لباس میں تھی۔ اس کا وہی لمبا فراک، جو ٹخنوں سے کچھ نیچے تک گرتا تھا۔ اس کے لمبے سنہری بال کھلے تھے اور دائیں کان کے پاس تین زرد گلاب سجے تھے۔

جارج دھیمے قدموں سے چلتا اس کے مقابل جا کھڑا ہوا۔ "کیوں؟ آج تمہیں کیا تکلیف لاحق ہوگئی؟" جارج غرایا۔

"اس لئے کہ میرین مجھ سے مانوس ہوگئی ہے۔"

"اوہ! تو تم اب بھی "مانوس" لوگوں کو "مایوس" نہیں کرتیں؟" جارج کے معنی خیز لہجے میں طنز کی آمیزش تھی۔ لڑکی کے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا۔ اور جب وہ بولی تو لہجہ کھویا کھویا سا تھا۔ "ہاں......"

جارج سر جھٹک کے میرین کی جانب بڑھا مگر وہ راستے میں حائل ہوگئی۔ "میرے راستے سے ہٹ جاؤ انجلی!"

"راستے سے تو تم نے مجھے ہٹا دیا تھا۔" اس کا لہجہ عجیب تھا۔ جارج نے اس پر حملہ کرنا چاہا، انجلی نے دایاں ہاتھ اس کی جانب بڑھایا۔ "جونہی اس کی کلائی جارج سے مس ہوئی، جارج کے چہرے پر شدید ترین کرب ابھر آیا۔ اس کی آنکھیں لہو رنگ ہوگئیں، اور وہ ایک دم غائب ہوگیا۔

میرین نے ایک روشنی سی انجلی کی کلائی سے نکل کر جارج کے جسم میں داخل ہوتے دیکھی تھی۔ انجلی میرین کی جانب بڑھی۔ اس نے اسے بیڈ پر بیٹھایا اور پانی لاکر دیا۔ اس سے پانی کا گلاس تھامتے وقت میرین نے اس کے دائیں ہاتھ میں لٹکتے بریسلیٹ کو دیکھا۔ "وائٹ گولڈ کا وہ بریسلیٹ جس میں ننھے ننھے ہیروں سے "اللہ" لکھا تھا۔

☆......☆......☆

انجلینا کے باپ کا تعلق بنیادی طور پر ہندوستان سے تھا۔ وہ اس کی ماں کیتھرین کو انجلی کے پیدا ہونے

اف یہ بیویاں

میں دیکھ رہا ہوں، ندیم تم آج کل گھر سے بہت زیادہ باہر رہنے لگے ہوں، آخر کیا وجہ ہے؟ کچھ نہیں یار، گھر میں چار بیویاں ہیں، انہوں نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ بس اس لئے زیادہ باہر رہتا ہوں۔

اکبر حیرت سے بولا۔ "ہیں تم نے چار شادیاں کی ہیں؟"

نہیں یار! یہ دوسروں کی بیویاں ہیں۔ ایک میرے باپ کی، دوسری بھائی کی، تیسری دادا کی، اور چھوٹی میری اپنی۔

(بلقیس خان۔ پشاور)

کے کچھ ہی عرصہ بعد چھوڑ گیا تھا۔ تاہم جب وہ دس برس کی تھی کہ وہ لوٹ آیا۔ اس نے انجلی کو ایک گھر لے کر دیا۔ اور وہ گھر یہی انجلینا ہاؤس تھا۔ کیتھرین چونکہ بیشتر وقت اپنے بوائے فرینڈز کے ساتھ گزارتی تھی۔ اور ان کی علیحدگی کی وجہ بھی یہی تھی کہ آرتھر کو یہ سب پسند نہیں تھا۔ بہر طور، انجلی کی ذمہ داری آرتھر نے میڈ آرتی کے سپرد کی۔ جسے وہ اپنے ہمراہ ہندوستان سے لایا تھا۔ کیتھرائن انجلی کو آرتھر کے حوالے کرکے نجانے کہاں چلی گئی۔ وہ ویسے بھی انجلی کو اپنی آزادی کی راہ میں رکاوٹ سمجھتی تھی۔ آرتی اس کا بہت خیال رکھتی تھی۔ جب وہ پندرہ برس کی ہوئی تو آرتی چلی گئی۔ اس دوران آرتھر اس سے ملتا رہتا تھا۔ آرتی کے جانے کے بعد وہ اکیلی رہ گئی۔ پھر ایک رات اس کی ملاقات ساحل پر جارج سے ہوئی۔ شوخ و شنگ سے جارج سے اس کی جلد ہی دوستی ہوگئی۔

☆......☆......☆

"یہ تم نے اتنے سارے زرد گلاب کیوں لگا رکھے ہیں؟" جارج لان میں انجلی کا ہاتھ تھامے ٹہل رہا تھا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں وسکی کا گلاس تھا جس سے وہ گاہے بگاہے سپ لیتا جا رہا تھا۔ اس کے قدم زرد گلابوں کے پاس سست پڑ گئے۔ عجیب لائٹس کی طاقتور

روشنی سارے میں پھیلی تھی۔ ''اس لئے کہ مجھے زرد گلابوں سے عشق ہے۔'' انجلی نے ایک ادھ کھلا گلاب توڑ لیا۔ ''یہ دیکھو کتنا خوب صورت لگ رہا ہے نا!'' اس نے پھول اسے تھمایا۔

''ہم م م......'' جارج نے محض ہنکارا بھرنے پر اکتفا کیا۔ اس کی پرسوچ نظریں زرد پھولوں پہ جمی تھیں اور آنکھوں میں ایک پراسراری چمک در آئی تھی۔

ان کی شادی کو دوسرا ہفتہ تھا۔ جب ایک رات انجلی نے ایک برا خواب دیکھا۔ اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے دیکھا کہ جارج کمرے میں نہیں ہے۔ وہ چپل گھسیٹتی واش روم کی سمت گئی۔ وہ وہاں بھی نہیں تھا۔ اس نے کھڑکی کا پردہ سمیٹا۔ چاندنی کرنیں ایک دم پانی کی منہ زور لہروں کی مانند اندر آ ئی تھیں۔ چاندنی کی فسوں خیز روشنی ہر چیز پہ بکھری تھی۔ سرہانے کھڑے درخت اور پودے چاندنی میں نہا رہے تھے۔ اس نے زرد گلابوں کی کیاریوں کو دیکھا اور وہ ٹھٹکی...... وہ بری طرح ٹھٹکی تھی۔

اس نے زرد گلابوں کی کیاریاں نیم دائرے میں قدرے بیضوی بنوائی ہوئی تھیں۔ ان گلابوں کے بیچ اس نے ٹیبل اور کرسیاں سیٹ کر رکھی تھیں۔ شام کی چائے وہ وہیں پیتی تھی۔ یعنی گلابوں کے درمیان

اور اس وقت اس جگہ جہاں ٹیبل ہوتی تھی، وہاں دیئے جل رہے تھے۔ دیئے نیم دائرے میں گلابوں کی طرز پہ ہی روشن تھے اور ان کے عین درمیان کوئی موجود تھا۔ اس نے آلتی پالتی مار رکھی تھی اور اس کے سامنے ایک بڑا سا دیا روشن تھا۔ وہ گاہے بگاہے کوئی چیز دائیں ہاتھ سے سامنے دیئے میں ڈالتا تھا۔ اور آگ مزید بھڑک اٹھتی تھی۔ ماحول پہ عجیب بھری خاموشی چھائی تھی۔

اپنا مخصوص سیٹ پہنے وہ بلاشبہ جارج تھا۔ وہ دھک دھک کرتے دل کے ساتھ سیڑھیاں اترتی وہاں پہنچی۔ جب وہ گلابوں کے پاس پہنچی تو جارج نے اسے گھور کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے ایک روشنی سی نکلی جو سیدھی اس کی آنکھوں میں حل ہونے لگی۔

جس سے میرین کا سر بے حد بوجھل ہو گیا۔ گویا کسی نے سر میں پارہ بھر دیا تھا۔ وہ سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر لہرا کر زمین پر گرتی چلی گئی۔

☆......☆......☆

اگلے روز اس نے جارج سے اس بارے میں بات کی تو وہ بے ساختہ قہقہہ مار کر ہنس دیا۔ ''تم کسی سائیکالوجسٹ کے پاس جاؤ انجلی! میں بھلا وہاں کیا کروں گا، وہ بھی دیئے جلا کر...... اور یہ تمہیں نیند میں چلنے کی عادت کب سے ہے؟''

اب اس نے لاکھ جتلایا کہ اسے نیند میں چلنے کی عادت قطعاً نہیں ہے مگر...... وہ جارج ہی کیا جو یقین کرتا۔

اس سے اگلے ہفتے کی بات ہے۔ وہ ویک اینڈ تھا۔ انہوں نے پروگرام بنایا کہ ویک اینڈ باہر گزارا جائے۔ جارج اس دن بہت خوش تھا۔ ''چلو جلدی سے تیار ہو جاؤ۔'' آسمان پہ بادلوں کا بسیرا تھا۔ انجلی نے وارڈ روب کھولی اور کچھ دیر سارے ڈریسز کا جائزہ لیتی رہی۔ اس نے زرد گلابوں کے رنگ کا امبریلا فراک منتخب کیا، وہ فراک کی ڈوری کندھے پہ درست کر رہی تھی، جب جارج اندر آیا۔ اس کے ریشمی سنہری بال شانوں پہ جھول رہے تھے، وہ کچھ دیر کو مبہوت سا ہو کر اسے دیکھنے لگا۔ پھر مسکرا کر اسے اپنے پسندیدہ پرفیوم میں نہلا گیا۔ بھیگی پھوار اسے خوشبوؤں میں شرابور کر گئی۔

''اب چلو بھی۔'' اسے ڈریسنگ ٹیبل سے ہینڈ بیگ اٹھاتے دیکھ کر وہ جھلایا۔ انجلی نے بریسلیٹ پہنا اور چل دی۔

وائٹ گولڈ کا یہ بریسلیٹ جس پہ ننھے ننھے ہیروں سے ''اللہ'' لکھا تھا، اسے اس کے مسلم دوست جبران نے دیا تھا۔

''ایک چیز کی کمی ہے۔'' جارج اس کی کمر میں ہاتھ ڈالے جا رہا تھا کہ پھولوں کو دیکھ کر رک گیا۔

''کیا؟''

''بالوں میں پھول لگاؤ۔ میں اپنا والٹ اندر

بھول آیا ہوں۔" وہ اندر گیا تو انجلی پھولوں کی جانب بڑھ گئی۔ آسمان سے اکا دکا بوندیں گرنے لگی تھیں۔ وہ پھولوں کی باڑھ کے اندر گئی تو اسے ایک دھچکا سا محسوس ہوا۔ دل جیسے نیچے ہی نیچے گرتا چلا گیا۔ اس نے چند ساعت کو رک کر خود پہ قابو پایا اور پھولوں کی جانب متوجہ ہوگئی۔ بارش کی بوندیں پھولوں پہ شبنم کی صورت جمی تھیں اور شوخ ہوائیں سرسراتی پھرتی تھیں۔ زرد گلابوں کی منہ بند کلیاں، ادھ کھلی کلیاں اور کھلے پھول اسے سحر زدہ سے کر گئے تھے۔ وہ کچھ دیر کو مبہوت سی دیکھتی رہ گئی۔ پھر اس نے تین کھلے پھول توڑے، مگر پھر انہیں چھوڑ کر تین ادھ کھلی کلیاں منتخب کیں۔ اس نے نم پھولوں کو آنکھیں بند کر کے ناک کے قریب لے جا کر سونگھا اور ان کی خوشبو کو سانسوں کے ذریعے اپنے اندر اتارا۔ پھر پھولوں کو اپنے دائیں کان کے پاس بالوں میں اڑس لیا۔ اس نے واپسی کے لئے قدم بڑھائے مگر وہ پھولوں کی باڑھ سے نکل نہ پائی۔ اس نے اپنے خیال پہ چلتے ہوئے باہر جانا چاہا۔ مگر...... خوف کی شدید ترین لہر نے ایک دم اس پر حملہ کیا اور دھڑکنوں کو تہہ و بالا کر گئی۔ وہ وہاں سے نکل نہ پا رہی تھی۔ اس نے چلانا چاہا، مگر خوف کی زیادتی سے اس کی زبان گنگ ہوگئی تھی۔

تبھی اس نے جارج کو آتے دیکھا۔

"جارج......!" اس نے چلا کر اسے بتانا چاہا، مگر حلق سے آواز نہ نکلی۔ اس کی قوت گویائی سلب ہو کر رہ گئی تھی۔ جارج مستحکم قدموں سے چلتا زرد گلابوں کی باڑھ کے پار آن رکا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ انجلی دیوانہ وار اس کی سمت لپکی مگر باہر نہ نکل پائی۔ "تم قید ہو چکی ہو انجلینا!" وہ مسکرایا۔

"میں نے پورے تیس دن محنت کی ہے، آخری کام بس تمہیں پھولوں کے اندر بھیجنا تھا۔ اور وہ بھی مکمل ہوگیا۔ اب تم یہاں سے باہر نہیں جاسکتیں۔ نہ ہی بول سکتی ہو۔" وہ سفاکیت سے مسکرایا۔

بادل ایک دم گرجا۔ اسے لگا کہ لاکھوں ٹن پانی یکلخت اس پر آن گرا ہے۔ جارج نے ہاتھ بڑھا کر زمین اس کے قدموں تلے سے ایک جھٹکے سے کھینچی تھی۔

"تم نے ایک بار کہا تھا نا! کہ تمہیں زرد گلابوں سے عشق ہے اور تم چاہتی ہو کہ تمہاری قبر یہیں بنے۔ سو ایسا ہی ہوا ہے۔" وہ قہقہہ لگا کر ہنسا۔ "تم اپنی تمام دولت میرے نام کر چکی ہو۔ اس کے لئے تھینکس...... تم ان پھولوں میں، اپنے فیورٹ زرد گلابوں میں ہمیشہ کے لئے قید ہو چکی ہو۔ نہ تم کسی کو پکار کر اپنی مدد کا کہہ سکتی ہو۔ کیونکہ اندر داخل ہوتے ہی تمہاری آواز چھن گئی تھی۔ جس کے لئے مجھے افسوس ہے۔ اب تم دو دن بعد "آنجہانی" ہو جاؤ گی اور میں...... میں کیتھی سے شادی کرلوں گا۔"

وہ چیخنا چاہتی تھی۔ اس سے اپنا قصور پوچھنا چاہتی تھی، مگر آواز حلق میں ہی گھٹ گئی تھی۔ حلق سے نیچے ہمیشہ کے لئے دفن ہوگئی تھی۔

☆......☆......☆

اور ٹھیک ویسا ہی ہوا جیسا جارج نے چاہا تھا۔ انجلی وہیں دو دن میں سسک سسک کر مر گئی۔ وہ مر گئی تو جارج نے اسے وہیں دفن کر دیا۔ لیکن جارج ایک بات بھول گیا تھا۔ وہ بھول گیا تھا کہ ہم اپنی مرضی سے کھیلتے ہیں۔ لیکن پھر ایک موڑ ایسا بھی آتا ہے کہ کھیل ہمارے بس میں نہیں رہتا۔ اس سے آگے تقدیر کی حد شروع ہو جاتی ہے۔ پھر ہار جیت کا فیصلہ وہی کرتی ہے۔ یعنی تقدیر...... جو قدرت کے تابع ہے اور قدرت اپنی مخلوق پر بے حد مہربان ہے۔ بے حد منصف ہے۔

جس دن جارج نے کیتھی سے شادی کی، اس دن چرچ سے واپسی پر ان کا ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ جارج کی روح اپنی نا آسودہ خواہشات کی بنا پر بھٹکنے لگی۔ وہ انجلینا ہاؤس میں آنے والی ہر لڑکی کو اپنا شکار بنالیتا تھا۔ انجلی کی روح محض پھولوں میں مقید تھی۔ مگر ایک دن ایک شخص باڑھ کے اندر چلا گیا لہٰذا وہ بھی آزاد ہوگئی اور اس نے جارج کو ظلم سے باز رکھنا چاہا لیکن ناکام رہی۔ اب جب میرین اسے اچھی لگنے لگی تھی کہ وہ دوسرے لوگوں کی طرح اسے برا نہیں سمجھتی تھی تو وہ

جارج سے بھڑ گئی تھی۔

"تب وہ چلا گیا ہے؟" میرین کی آواز میں لرزش تھی۔ بارش اب ایک ردھم سے برس رہی تھی۔ ہوا کے طیش میں خاطر خواہ کمی آئی تھی۔ ہوا اب دیوانہ وار چکرانے کے بجائے ہولے ہولے سرسرا رہی تھی۔

"میں کہیں نہیں گیا میری ڈیئر!" وہ یکا یک نمودار ہوا۔ خوف سے میرین کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ دھڑکنیں ساکت ہو گئیں اور سانسیں گویا تھم گئیں۔ اس سے قبل کہ وہ میرین پہ جھپٹتا۔

اچانک انجلی برق رفتاری سے حرکت میں آئی۔

مگر جارج غافل نہ تھا۔ اس نے کچھ اسی طور گھورا کہ وہ پتھر میں ڈھل گئی۔ اب وہ اپنی جگہ سے حرکت کرنے سے قاصر تھی۔ "جارج! چھوڑ دو اسے۔" اسے میرین کی جانب بڑھتا دیکھ کر وہ چلائی۔ میرین کی آنکھوں میں اندھیرے گھنے لگے۔ اسے لگا کہ اس کی آنکھوں میں چھایا اندھیرا اسے نگلنے والا ہے۔ اسے بس اتنا احساس ہوا کہ جارج اس پر جھپٹا ہے۔ اسے اپنی گردن پہ چبھن کا احساس ہوا پھر...... اس کا ذہن تاریکیوں کے سمندر میں کہیں گہرائی میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆......☆......☆

"میری! آنکھیں کھولو۔" ڈیوڈ اس پر جھکا بے قراری سے اسے پکار رہا تھا۔ اس نے کسمسا کر آنکھیں کھول دیں۔ "وہ...... وہ جارج......" لفظ اس کے لبوں پہ لڑکھڑائے۔

"وہ اپنے انجام کو پہنچ گیا۔" انجلی کی بات پہ اس نے چونک کر دیکھا۔ جب وہ میرین پہ حاوی ہو رہا تھا تو اسی وقت ڈیوڈ اندر آیا تھا۔ اس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا اور بازو میں فریکچر ہوا تھا۔ وہ سارا دن دواؤں کے زیر اثر سویا رہا تھا اور ہاسپٹل سے سیدھا گھر آیا تھا۔ اس نے میری پر جھکے شخص کو دیکھا تو تشویش زدہ ہو گیا۔

"ڈیوڈ! یہ میرے ہاتھ سے بریسلیٹ اتار کر اس سے مس کرو۔" انجلی نے اسے متوجہ کیا۔ ڈیوڈ نے میکا نکی انداز میں اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ اس نے جونہی بریسلیٹ جارج پر پھینکا تو جارج کو آگ نے پکڑ لیا۔ وہ تڑپ کر اٹھا اور بری طرح چلانے لگا۔ اس کی کرب گزیدہ چیخوں نے فضا کو ہلا دیا تھا۔ وہ آگ کے لباس میں ملبوس غائب ہو گیا تھا۔

"وہ بچ گیا تو؟" میرین نے تھوک نگلا۔

"وہ نہیں بچا۔" انجلی نے اسے تسلی دی اور اس نے پرسکون ہو کر آنکھیں موند لیں...... ڈیوڈ اس کے بال سہلانے لگا۔ انجلی کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

☆......☆......☆

میرین نے جھک کر زرد گلاب انجلی کی قبر پر رکھے اور پھر پودوں کی تراش خراش کرنے لگی۔ اس نے فالتو پتیاں اور تنکے وغیرہ سمیٹ کر ڈسٹ بن میں ڈالے اور زرد گلابوں کی ادھ کھلی کلیاں شاخوں سمیت توڑنے لگی۔ اسی پل ڈیوڈ نے آ کر اسے بانہوں کے حصار میں لے لیا۔ "تم بہت بدل گئی ہو میری!

"کیا مطلب؟" اس نے ابرو اچکائے۔

"یار! تم مجھ سے زیادہ اپنے ان زرد گلابوں کو وقت دیتی ہو۔ میں کسی روز انہیں کٹوا دوں گا۔" اس نے اپنی گرفت سخت کرتے ہوئے دھمکایا۔

"کیا! خبردار! جو ایسا سوچا بھی تو۔

"کیوں؟" ڈیوڈ کا لہجہ تیکھا تھا۔

"مجھے زرد گلابوں سے عشق ہے۔" وہ ہاتھوں میں موجود ادھ کھلی کلیوں پر نگاہ جمائے ہوئے تھی۔

"مگر تمہیں تو ریڈ روز پسند۔ "

"اب نہیں پسند۔ یہ تو، جو دلکشی زرد گلاب میں ہے وہ اور کسی میں نہیں۔" وہ اس کی بات کاٹ کر بول اٹھی۔

ڈیوڈ نے اس کے ہاتھ سے تین ادھ کھلی کلیاں لے کر اس کے بالوں میں سجا دیں۔ میرین اس کے سینے سے لگ گئی۔ فضا خوشبوؤں سے بوجھل تھی۔ زرد گلاب فراخ دلی سے خوشبوئیں لٹا رہے تھے۔

امر شکتی

صبا محمد اسلم۔ گوجرانوالہ

اچانک کمرے میں اندھیرا چھاگیا، بجلی چمکی، پھر چمکی اور سامنے کھڑی حسینہ کا چہرہ خوفناک ہوگیا، آنکھوں کی جگہ لگا کہ دو انگارے رکھے ہوں اور جھری زدہ چہرے پر کرختگی نظر آنے لگی، اس کی خرخراتی آواز سنائی دی

فطرت سے متصادم سوچ رکھنے والے نہ گھر کے ہوتے ہیں اور نہ ہی گھاٹ کے

دیپ نگر کے تھانے کے سامنے سڑک پر ایک ٹرک کے انجن کی آواز سنائی دی، اور پھر ٹرک رک گیا، ٹرک سے ایک میلا کچیلا شخص جو کہ ٹرک کا ڈرائیور تھا، وہ نیچے اترا اور تھانے میں آ گیا۔ پھر ایک بھاری مردانہ آواز سنائی۔

"میں صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"اندر چلے جاؤ۔" باہر بیٹھے ہوئے سپاہی نے کہا۔ دروازہ کھلا، اور وہ ڈرائیور اندر داخل ہوا اور سلام کر کے انسپکٹر کمل کمار سے بولا۔ "انسپکٹر صاحب! خونی موڑ پر ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے ایک کار نیچے کھڈ میں پڑی ہے۔"

یہ بات سن کر انسپکٹر کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "ہو بھگوان۔"

"ٹھیک ہے ہم ابھی جا کر دیکھتے ہیں۔" انسپکٹر بولا۔

"لوگ تو اسے اب چڑیل موڑ کہنے لگے ہیں۔" ڈرائیور بولا۔

"لگتا ہے سچ مچ وہاں کوئی چڑیل رہنے لگی ہے، مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔" انسپکٹر نے جواب دیا۔

"اچھا صاحب جی ہم چلتے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے سلام کیا اور باہر نکل گیا۔

ڈرائیور کے باہر جانے کے بعد سب انسپکٹر رانا بولا۔

"کل ہی کیا یہ سچ ہے کہ اب وہ خونی موڑ بن گیا ہے؟"

رانا کی بات سن کر کھل اٹھتے ہوئے بولا۔ "میرے ساتھ آؤ راستے میں تمہیں سب کچھ سمجھا دوں گا۔"

انسپکٹر رانا فوراً اٹھ کھڑا ہوا، باہر آ کر اس نے دو سپاہیوں کو ساتھ لیا اور وہ جیپ میں بیٹھ کر چل دیئے۔

جیپ کو انسپکٹر شیام خود ڈرائیو کر رہا تھا، آبادی سے نکل کر رانا بولا۔ "آپ مجھے کچھ بتا رہے تھے۔"

انسپکٹر شیام نے پل پر نظر جمائے جواب دیا۔

"گیارہواں ایکسیڈنٹ"

"گیارہواں ایکسیڈنٹ میں سمجھا نہیں۔" رانا نے حیرت سے کہا۔

"انسپکٹر شیام نے جواب دیا۔ "یہ موڑ اس علاقے کا سب سے زیادہ خطرناک موڑ ہے۔ سڑک نے اس جگہ سانپ کی طرح دو ایسے موڑ لئے ہیں کہ ذرا سی غلطی سے گاڑی کھنڈ میں گر سکتی ہے، اس لئے اس کو خونی موڑ کہتے ہیں۔"

"تو کیا ان موڑوں پر خطرے کی وارننگ بورڈ نہیں لگے ہیں؟" رانا نے سوال کیا۔

"آدھ میل پہلے سے وارننگ کے بورڈ شروع ہو جاتے ہیں، شروع میں خیال کیا جاتا تھا کہ یہ ایکسیڈنٹ ڈرائیور کی لاپرواہی سے ہوتے ہیں۔ لیکن اتفاق سے چوتھے حادثے میں ڈرائیور مرنے سے پہلے اپنا بیان دینے کے قابل تھا، اس کے بیان سے پہلی بار شک ہوا کہ حادثوں کی وجہ کچھ اور ہے۔"

"وہ کیا وجہ تھی؟" رانا نے پھر سوال کیا۔

یہ سن کر انسپکٹر شیام نے کہا۔ "اس لاش کو دیکھو اس کے گلے میں وہ سوراخ دانتوں کے ہیں اور چہرے پر ناخنوں کے خراش کے نشان بھی ہیں۔"

جب رانا نے لاش کو دیکھا تو فوراً افسردہ ہو گیا۔ کیوں کہ مرنے والا اس کا دوست تھا۔

"چوتھے کار ایکسیڈنٹ میں مرنے سے پہلے ڈرائیور نے بیان دیا" میں رات بارہ بجے کے بعد کار میں آ رہا تھا۔ مجھے کچھ ضروری کام کی وجہ سے دیر ہو گئی تھی۔

جب میں خونی موڑ کراس کرنے ہی والا تھا کہ ایک خوب صورت لڑکی سامنے نظر آئی، اس نے کار روکنے کے لئے ہاتھ ہلایا تو میں نے اس کے قریب جا کر کار روکی اور میں اس کے سراپے کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس کا سراپا اتنا حسین تھا کہ جس کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے کار کا شیشہ نیچے کیا تو دیکھا کہ اس کے سر پر چوٹ لگی تھی، جس میں سے خون بہہ رہا تھا۔

انتہائی سریلی اور شیریں آواز میں بولی۔ "میری کار کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ پلیز! آپ مجھے لفٹ دے دیں، میں بہت جلدی میں ہوں۔"

تو میں نے بنا سوچے سمجھے اسے برابر والی سیٹ پر بیٹھنے کی دعوت دے دی۔ جب وہ بیٹھ گئی تو میں نے کار کو آگے بڑھایا۔ میرے ذہن میں اس خوب صورت لڑکی کے بارے میں جانے کیسے کیسے خیال ابھر رہے تھے۔ میں اسی سوچ میں مگن کار کو ہائی اسپیڈ پر چلائے جا رہا تھا۔

اچانک میری نظر اس لڑکی کے پیروں پر پڑی تو میرے پاؤں بے اختیار کار کی بریک پر جم گئے اور پھر ایک جھٹکے سے کار رکی تو لڑکی چونکی، پھر اچانک اس لڑکی کی شکل تبدیل ہونے لگی، اس کے سامنے کے دانت اور پھر پورا چہرا بدل گیا، اب وہ ایک چڑیل کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ میں نے کار سے نکل کر بھاگنے کی کوشش کرنے لگا، لیکن اس نے مجھے سنبھلنے کا موقع نہ دیا اور اپنے خوفناک دانت میری گردن میں گاڑ کر میرا خون پینے لگی۔" اس کے بعد اسے کچھ ہوش نہ رہا اور اس نے دم توڑ دیا۔"

"تمہیں یہ جان کر حیرت ہوگی انسپکٹر رانا کہ اس شخص کا بیان بھی پہلے مرنے والے کے الفاظ سے لفظ بہ لفظ ملتا تھا۔"

پھر رانا حیرت سے بولا۔ "آپ کا مطلب ہے کہ اس کو بھی خونی موڑ کے پاس اس طرح کی لڑکی ملی تھی۔"

"ہاں۔" انسپکٹر شیام نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"اس لڑکی نے بھی یہی کہا تھا کہ اس کی کار کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔"

پھر رانا گہرا سانس لے کر بولا۔ ''کیا اس نے بھی کار میں بیٹھنے کے بعد اپنے ہاتھ ڈرائیور کو دکھائے تھے اور اس کے ہاتھوں کے ناخن بھی اسی طرح اس کی گردن کی جانب اٹھے تھے؟''

''ہاں۔'' انسپکٹر شیام نے گمبھیر آواز میں کہا۔

''اس کے بعد سے یہ بات یقین کرلی گئی کہ اس موڑ پر کوئی چڑیل رہتی ہے، مثلاً پہلی بات تو یہ ہے کہ حادثے میں مرنے پر ویسے ہی نشان ملتے ہیں جیسے کسی نے ناخن سے چہرہ نوچا ہو۔ دوسری بات یہ ہے کہ حادثہ ہمیشہ پونم کی رات کو ہی ہوتا ہے۔ تیسری بات یہ کہ حادثہ ہمیشہ خونی موڑ پر ہی پیش آتا ہے۔ چوتھی بات یہ کہ یہ حادثات ہمیشہ اسی کار میں پیش آتے ہیں۔ جس میں صرف ایک ڈرائیور ہوتا ہے۔ کوئی دوسرا مسافر نہیں ہوتا، ان دونوں مرنے والوں کا ایک جیسا بیان دینا، بتاؤ ان باتوں سے کیا نتیجہ نکال سکتے ہو۔''

''ویسے تو یہ سب باتیں اتفاق بھی ہوسکتی ہیں؟'' رانا نے جواب دیا تو انسپکٹر شیام نے کہا۔ ''تم کو یہ ماننا پڑے گا کہ آتمائیں اس دنیا میں آکر ہم انسانوں کے معاملات میں مداخلت کرتی ہیں۔''

''بہرحال میں آج رات وہاں جاؤں گا، آپ بھی مجھے اجازت دیجئے، ہوسکتا ہے کہ آپ کا یہ منہ بولا بیٹا کچھ کر دکھائے۔'' رانا نے کہا۔ تو انسپکٹر شیام نے گہری سانس لے کر کہا۔

''آل رائٹ! اگر تم بضد ہو تو مجبوری ہے۔ لیکن پہلے وعدہ کرو کہ تم میری بات ضرور مانو گے۔'' انسپکٹر شیام نے کہا۔

''آج دوپہر کو تم میرے ساتھ چلنا۔''

''مگر کہاں؟'' رانا بولا۔

''تم نے شانتی پور گاؤں کے شاہ جی کا نام تو سنا ہوگا۔ کہتے ہیں کہ وہ مسلمان ہیں اور ان کو ہندو مسلمان سب قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ان کے پاس روحانی طاقت ہے۔ تم دوپہر کو چل کر ان کو اپنی بات بتانا شاید وہ کچھ مشورہ دیں۔''

جب وہ دونوں دوپہر میں شاہ صاحب کے پاس پہنچے تو شاہ صاحب درخت کے سائے تلے بیٹھے وظائف میں مصروف تھے، دونوں نے سلام کیا تو شاہ صاحب نے سلام کا جواب دے کر کہا۔ ''پولیس والوں کو ہم سے کیا کام آن پڑا۔''

انسپکٹر نے اپنا تعارف کروایا پھر شاہ صاحب نے اپنی نظریں رانا کے چہرے پر جمادیں، کچھ دیر اس کو دیکھتے رہے، پھر بولے۔ ''برخوردار انسان چاہے جتنی ترقی کرلے مگر قدرت کے راز نہیں پاسکتا۔ تمہارے ہاتھ میں جو انگوٹھی ہے ذرا اتار کر مجھے دو۔''

رانا نے انگوٹھی اتار کر شاہ صاحب کی طرف بڑھادی۔

شاہ صاحب نے انگوٹھی اپنی مٹھی میں لے کر کچھ پڑھنے لگے۔ کچھ دیر بعد انگوٹھی رانا کو واپس کردی اور کہا۔ ''اس کو اپنے دائیں ہاتھ میں پہن لو اور یہ یاد رکھنا کہ خدا کے حکم کو دنیا کی کوئی طاقت نہیں ٹال سکتی۔ بس اب تم لوگ جاسکتے ہو۔''

شام سات بجے رانا نے اپنے گھر پر آرام سے کھانا کھایا اور رات آٹھ بجے تھانے میں پہنچا، حاضری لگائی اور جیپ لے کر چل دیا۔ آج دوپہر سے بادل چھائے ہوئے تھے۔ اس کی گاڑی تھانے سے باہر نکلی ہی تھی کہ بوندا باندی شروع ہوگئی۔ ریوالور اس کی پیٹی میں تھا، احتیاط کے لئے ایک خنجر بھی اس نے اپنی پنڈلی پر باندھ رکھا تھا، ایک طاقتور ٹارچ بھی اس کے پاس موجود تھا۔ وہ بہت مطمئن تھا، اپنی جیپ خونی موڑ کی طرف اسپیڈ سے دوڑائے لئے جارہا تھا۔ سردیوں کے دن تھے۔ خونی موڑ تک چالیس منٹ کا سفر تھا، ابھی وہ چند میل ہی گیا ہوگا کہ بارش تیز ہوگئی مگر وہ اپنی دھن کا پکا تھا۔ آگے بڑھتا رہا اسے حیرت یہ تھی کہ ''کیا اس تیز بارش میں بھی وہ چڑیل کسی کا انتظار کررہی ہوگی؟''

سڑک بالکل سنسان تھی، آخر کار وہ خونی موڑ کے پاس پہنچ ہی گیا، آدھ میل دور سے ہی دل تنگ ہونا شروع ہوگئے تھے، رانا کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اب اس کے امتحان کا وقت قریب آ گیا تھا اس وقت اس کے ذہن میں ایک ہی سوال تھا کہ ''وہ بدروح یا چڑیل مجھے مل گئی تو مجھے کیا کرنا ہوگا؟ کیا میں اس پر گولی چلاؤں گا؟ لیکن نہیں!

فوراً مجھے اس پر گولی نہیں چلانی چاہئے، پہلے دیکھنا چاہئے کہ وہ کیا کہتی ہے کیا کرتی ہے؟"

اچانک اس کی جیپ کو ایک جھٹکا سا لگا اور جیپ رکتے رکتے بچی۔ اس کا دھیان اس چڑیل کے بارے میں سوچنے لگا تھا کہ سڑک کے بیچوں بیچ ایک انسانی سایہ نظر آیا جو دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے ہوئے تھا۔ رانا نے گاڑی کی رفتار کم کردی وہ سایہ ہاتھ ہلا کر اس کو رکنے کا اشارہ کررہا تھا۔

خونی موڑ وہاں سے مشکل سے سوگز کے فاصلے پر ہوگا۔ بارش اسی طرح موسلا دھار برس رہی تھی۔ ایک بار اس کے جی میں آیا کہ وہ جیپ کو اس کے اوپر سے گزار دے۔ لیکن اس وجود کے قریب پہنچا تو اس کا پاؤں خود بخود بریک کو دباتا چلا گیا۔ اور جیپ عین اس وجود کے پاس جاکر رکی تو اس نے کار کی تیز روشنی میں دیکھا کہ وہ ایک لڑکی تھی اس کے سر کے بال کاندھوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے کپڑے بارش کی وجہ سے جسم سے چپک گئے تھے، وہ بہت خوب صورت تھی۔

رانا شاید زندگی میں پہلی بار اتنی خوب صورت لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ اور اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اس نے آہستہ سے ایک ہاتھ سے ریوالور نکال کر اپنی گود میں رکھ لیا۔ جیپ رکتے ہی وہ لڑکی کھڑکی میں آگئی اور بولی۔

"معاف کیجئے گا بارش بہت تیز ہے، اور میری گاڑی خراب ہوگئی ہے کیا آپ میری مدد کرسکتے ہیں؟"

پہلے اس نے سوچا منع کردے، اتنے میں لڑکی دوبارہ بولی۔ "اپنی گاڑی میں پیچھے چھوڑ آئی ہوں، میں نے سوچا تھا پیدل ہی چلی جاؤں گی مگر بارش تیز ہونے سے مجبور ہوں۔"

رانا شوچ میں پڑ گیا تھا کہ کیا جواب دوں۔

لڑکی نے اس کو خاموش دیکھ کر کہا۔ "پلیز! میری مدد کیجئے مجھ سے ڈریئے نہیں میں کوئی چڑیل نہیں ہوں۔"

رانا نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "اگر آپ چڑیل بھی ہیں تو بھی میں آپ سے خوفزدہ نہیں۔"

"تو کیا آپ میری مدد کرنے کو تیار ہیں؟" لڑکی بولی۔

"جی! آپ بیٹھ سکتی ہیں۔"

شکریہ کہہ کر لڑکی نے فرنٹ سیٹ پر بیٹھنا چاہا لیکن پھر رک کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی اور بولی۔ "میں آگے اس لئے نہیں بیٹھی کہ میرے کپڑے گیلے ہیں۔" رانا نے شکریہ کہا اور جیپ آگے بڑھادی۔ اور پھر پوچھا "آپ نے کہاں جانا ہے؟"

"آگے ایک گاؤں ہے۔" لڑکی بولی۔ "اس گاؤں سے کوئی آدھا میل پہلے ہی ایک راستہ بائیں طرف کو مڑ جاتا ہے، آپ کو اس راستے پر مڑنا ہوگا۔ میں آپ کو راستہ بتاتی رہوں گی۔ تھوڑے ہی فاصلے پر ہماری حویلی ہے۔"

رانا سوچنے لگا۔ "اگر یہ وہی چڑیل ہے جو گیارہ انسانوں کی جان لے چکی ہے۔ یہ تو بڑی اور مہذب لگتی ہے۔" اس نے سوال کیا۔ "آپ کو معلوم ہے یہ کون سی جگہ ہے؟"

"جی ہاں اس کو خونی موڑ کہتے ہیں۔" لڑکی نے جواب دیا۔ پھر اس نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "ارے کہیں آپ مجھے وہ چڑیل تو نہیں سمجھ رہے جو اب تک یہاں اسی کھڈ میں گیارہ آدمیوں کو گرا چکی ہے۔"

عقب نما شیشے میں دونوں کی نظریں ملیں تو رانا نے کہا۔ "اگر ایسی بات ہے تو پہلے بتا دیجئے کہ خونی موڑ پر کس طرح مجھے اپنی گاڑی کھڈ میں گرانی ہوگی؟"

رانا اگرچہ لڑکی سے بے فکری سے باتیں کررہا تھا، لیکن اس کے اندر ایک عجیب سی ہلچل مچی ہوئی تھی، اس کا دل ریل کے انجن کی طرح دھک دھک دھڑک رہا تھا۔ لڑکی نے عقب نما شیشے میں اس کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ اتنے ہینڈسم ہیں۔ اگر میں چڑیل بھی ہوتی تو بھی آپ کو کھڈ میں نہ گراتی۔" یہ کہہ کر لڑکی نے پھر ایک قہقہہ لگایا اور خونی موڑ آگیا۔ لڑکی نے کہا۔ "سنبھال کر رفتار کم کردیجئے۔"

رانا کی گرفت اسٹیرنگ پر سخت ہوگئی۔ موڑ آیا اور نکل گیا۔ موڑ گزرنے کے بعد اسے حیرت ہوئی کہ اس نے موڑ کیسے کراس کرلیا تھا۔ موڑ گزرنے کے بعد اس نے لڑکی سے کہا۔ "کیا آپ مجھے اپنے ہاتھ دکھا سکتی ہیں۔"

”میرے ہاتھوں کے ناخن بڑے ہیں؟“ لڑکی نے شرارتی لہجے میں کہا اور اپنے ہاتھ رانا کے سامنے کر دیئے۔ اس کے ہاتھ بالکل انسانوں کی طرح تھے۔

لڑکی کے ہاتھ دیکھ کر رانا سوچنے لگا۔ ”یہ تو چڑیل نہیں ہے۔ یہ تو سچ مچ کی لڑکی ہے۔“ یہ جان کر اس کے دل کو کچھ سکون ملا۔ جسم کے اندر کا تناؤ بھی ختم ہو گیا۔ لیکن اس کے ساتھ مایوسی بھی ہوئی۔ وہ جو توقع لے کر آیا تھا وہ پوری ہوتے ہوتے رہ گئی۔

موڑ سے گزرنے کے بعد اس نے لڑکی سے پوچھا۔

”کیا آپ اس چڑیل کو جانتی ہیں؟“

”کون نہیں جانتا؟“ لڑکی نے جواب دیا۔

رانا بولا۔ ”آپ اس علاقے میں رہتی ہیں تو اکثر رات کو آپ بھی وہاں آتی جاتی ہوں گی۔ کیا آپ نے اس کو کبھی دیکھا ہے؟“

لڑکی نے پھر قہقہہ لگایا۔ اور کہا۔ ”اگر میں کہوں کہ میں ہی وہ چڑیل ہوں تو؟“

”میں یقین نہیں کروں گا۔“ رانا نے پہلی دفعہ مسکرا کر کہا۔ ”اگر آپ چڑیل ہوتیں تو پروگرام کے مطابق میری جیپ کو خونی موڑ پر کھڈ میں گرا دیتیں، اور نہ آپ مجھ سے بالکل فری ہوتیں۔ خیر آپ راستہ بتایئے۔“ اور اس کے بتانے پر وہ گاڑی وہاں موڑتا جہاں لڑکی کہتی۔ جب راستہ بالکل ختم ہوا تو سامنے ایک عالیشان حویلی تھی۔ جو روشنی میں نہائی ہی ایسے لگا جیسے رات کو دن ہو۔

وہ دونوں گاڑی میں حویلی کے بالکل سامنے پہنچ گئے، لڑکی دروازہ کھول کر باہر نکلی اور کچھ دیر بعد رانا بھی گاڑی سے باہر نکلا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ لڑکی وہاں سے غائب تھی۔

وہ کچھ سوچ کر حویلی کی جانب بڑھا۔ جب حویلی میں پہنچا تو اسے ایسا لگا جیسے کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہے تو اس نے اپنا ریوالور ہولسٹر سے نکال کر ہاتھ میں لے لیا، پھر ایک دم پیچھے مڑ کر دیکھا تو لائٹ چلی گئی۔ اس نے بغیر سوچے سمجھے فائر کیا تو یک دم لائٹ آ گئی۔ اب وہ ایک ہال میں کھڑا تھا، پھر وہ مختلف کمروں کو دیکھتا ہوا آگے بڑھنے لگا کہ اچانک آخری کمرے میں اس نے اندر جھانک کر دیکھا، اس کا اندازہ درست نکلا وہ کمرہ خواب گاہ معلوم ہوتا تھا، ایک طرف بہت خوب صورت مسہری بچھی ہوئی تھی۔ ایک طرف سنگار میز اور وہی لڑکی سنگار میز کے سامنے کھڑی اپنے بالوں میں کنگھا کر رہی تھی۔ اس کے بال اتنے لمبے اور گھنے تھے کہ اس کے گھٹنوں کو چھو رہے تھے۔ لڑکی کو پہچاننے میں رانا کو ذرا بھی دشواری نہ ہوئی، لڑکی اپنا لباس بدل چکی تھی۔ اس کے بدن پر کسی ریشمی کپڑے کا لمبا سا گون تھا جو اس کے پیروں تک کو چھپائے ہوئے تھا۔

رانا نے کہا۔ ”آپ اچانک گاڑی سے کہاں غائب ہو گئی تھیں۔“

”نہیں تو میں آپ کے سامنے گاڑی سے اتر کر آئی تھی، مگر اس وقت شاید آپ کی توجہ کہیں اور تھی۔ بھیگے کپڑوں میں مجھے سردی لگ رہی تھی تو میں نے سوچا، آپ خود ہی اندر آ جائیں گے۔“

ابھی تک رانا اس کا آدھا چہرہ ہی دیکھ پایا تھا۔ اس بار لڑکی اس کی طرف گھومی تو کھلے بالوں نے اس کا آدھا چہرہ چھپایا تھا۔ وہ مسہری کی جانب اشارہ کر کے بولی۔ ”تشریف رکھئے باہر تیز بارش اور طوفان ہے، آج رات آپ میرے مہمان ہیں۔“

رانا مسہری کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ”کیا آپ اس مکان میں اکیلی رہتی ہیں؟“

”اس وقت تو اکیلی ہوں۔“ لڑکی نے جواب دیا۔

”میں سمجھا نہیں۔ کیا آپ یہاں اکیلی رہتی ہیں؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”سب کچھ کیا پہلی ملاقات میں ہی جان لینا چاہیں گے۔“ لڑکی نے اپنے لمبے بالوں کو کنگھی کے ذریعے اپنے آدھے چہرے پر پھیلاتے ہوئے کہا۔

”رانا بولا۔ ”ابھی تک آپ نے یہ نہیں بتایا کہ آپ کون ہیں اور یہ مکان کس کا ہے یہاں کون رہتا ہے؟“

وہ لڑکی اس کی جانب بڑھتی ہوئی بولی۔ ”صبر کیجئے، آپ کو سب کچھ معلوم ہو جائے گا آپ تشریف تو رکھئے۔“

رانا کے ہاتھ میں ابھی تک پستول تھا۔ وہ مسہری کے

کنارے پر بیٹھ گیا۔

لڑکی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے قریب آئی اور اس نے اپنا ایک ہاتھ آگے بڑھا کر کہا۔ "لایئے اپنا ایک ہاتھ میرے ہاتھ میں دیجئے، آپ کو پتہ چل جائے گا کہ میں کون ہوں۔" لڑکی کا رویہ رانا کو بڑا عجیب لگ رہا تھا۔ پھر بھی لاشعوری طور پر اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ لڑکی کا ہاتھ اس کے ہاتھ سے ایک انچ کے فاصلے پر ہوگا کہ لڑکی نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور خوفزدہ لہجے میں بولی۔ "نہیں، نہیں! میں تمہیں نہیں چھو سکوں گی۔"

"کیا ہوا؟" رانا نے حیرت سے کہا۔ "تم نے ہی تو مجھے ہاتھ آگے بڑھانے کو کہا تھا۔"

لڑکی دو قدم پیچھے ہٹ کر کھڑی ہوگئی اور بولی۔ "ایک بات تو بتایئے، میں آپ کو کیسی لگ رہی ہوں؟"

"تم بہت خوب صورت لگ رہی ہو۔" رانا نے اس کے جسم پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

"کیا واقعی؟" لڑکی نے کہا۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ تم بے حد خوب صورت ہو۔" رانا بولا۔

تو لڑکی بولی۔ "کیا میں اتنی خوب صورت ہوں کہ تمہارے دل میں مجھے حاصل کرنے کی تمنا ہے۔"

"ہاں۔" رانا نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ "تم اتنی خوب صورت ہو کہ ہر مرد کے دل میں تمہیں حاصل کرنے کی تمنا پیدا ہو سکتی ہے۔" رانا کی نظر اچانک لڑکی کی کمر اور اس کے دل والی جگہ پر آ کر رک گئی۔ اس کا دل اجازت نہ دیتا تھا کہ وہ نظر اٹھا کر دنیا کا کوئی اور نظارہ دیکھے۔

اچانک لڑکی کی آواز نے رانا کو نظر اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ لڑکی نے کہا۔ "رانا ایک بات کہوں۔"

"ہاں ہاں کہو۔" رانا نے حیرت اور اپنے حواس کو کنٹرول کرتے ہوئے کہا۔ حیرت اس بات کی کہ رانا نے ابھی تک لڑکی کو اپنا نام نہیں بتایا تھا لیکن پھر لڑکی کو اس کے نام کا کیسے پتا چلا؟ اس نے تھوڑا خوف میں مبتلا ہوتے ہوئے کہا۔ "تم کو میرے نام کا کیسے پتا چلا۔"

لڑکی نے اس کے سینے کے دائیں طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، جہاں پر ایک بیج لگا ہوا تھا، جس پر واضح طور پر لکھا تھا۔ "انسپکٹر رانا۔" رانا نے یہ دیکھ کر شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔ "تم کوئی بات کہہ رہی تھی۔"

"تو ہاں میں کہہ رہی تھی کہ جب تم نے مجھے لفٹ دی تھی تب سے میں تمہاری ہر ایک ادا پر مرتی آرہی ہوں۔ اب مجھ سے اور برداشت نہیں ہوتا۔ رانا میں تم کو دل و جان سے پیار کرنے لگی ہوں۔"

رانا تو پہلے ہی سے پاگل ہوئے جا رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "میں نے بھی پہلی نظر میں تمہیں پسند کر لیا تھا۔ لیکن ڈر رہا تھا کہ کہیں تم برا نہ مان جاؤ۔"

آگ دونوں طرف بہت ہی تیز ہوتی ہوئی دونوں کو جلائے جا رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ ان دونوں میں سے کوئی جل جاتا۔"

جب رانا نے اسے چھوا تو لڑکی جیسے کانپنے لگی، اور اس کی آدھی شکل سے بال بھی ہٹ گئے اور اچانک اس نے رانا کو دھکا دیا تو رانا اس وقت اپنے حواس میں آ گیا۔ اور اس نے بے اختیار لڑکی کو جب دیکھا تو اس کا جسم خوف سے کانپ گیا اور پسینے میں شرابور ہو گیا۔ جب اس نے دیکھا کہ ابھی کچھ دیر پہلے یہاں جو ایک بہت ہی خوب صورت پرشباب لڑکی کھڑی تھی اب وہ ایک بھیانک چڑیل کی صورت میں اس کے سامنے کھڑی تھی۔ جس کا آدھا چہرہ بالوں میں چھپا ہوا تھا۔ اب وہ حصہ جھریوں کے جال سے بھرا ہوا تھا۔ آدھے ہونٹ کٹے ہوئے اور بھیانک۔

اس کا آدھا چہرہ بالکل تروتازہ وشاداب تھا۔ لڑکی نے اپنے دونوں ہاتھ سامنے پھیلا کر کہا۔ "ہاں میں وہی لڑکی ہوں جس کی تلاش میں تم یہاں آئے تھے، مجھے بھی تمہاری تلاش تھی۔ تم مجھے نئی زندگی دے سکتے ہو۔ مجھے تمہارے خون کی ضرورت ہے، صرف تھوڑا سا خون، اور پھر میں مکمل ہو جاؤں گی بالکل مکمل۔"

یہ الفاظ ختم ہوتے ہی رانا کو ایک ایسا منظر نظر آیا کہ خوف سے اس کے بدن میں دوڑتا خون جم گیا۔ اچانک لڑکی کے پھیلے ہوئے ہاتھوں کے ناخن بڑھنا شروع ہو گئے۔ جو کہ اب تیزی سے اس کی طرف بڑھ رہے تھے

رانا کو فوراً انسپکٹر شیام کی بات یاد آ گئی۔ اس نے کہا تھا۔ "مرنے والے کی گردن پر دو سوراخ تھے ...." پھر اس کے دماغ نے کہا۔ "بھاگ یہاں سے ورنہ تیری موت لازمی ہے۔" لیکن اس کے پاؤں نے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ خواہش اور کوشش کے باوجود وہ اپنے پاؤں نہ ہلا سکا۔ لڑکی کے ہاتھ اس کی طرف آہستہ آہستہ بڑھتے رہے، فاصلہ کم ہوتا رہا۔ دھیرے دھیرے موت اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اور وہ بے بسی سے یک ٹک بھیانک چڑیل کو دیکھ رہا تھا۔

اچانک ایک معجزہ ہو گیا۔ رانا کی گردن سے لڑکی کے ہاتھ مشکل سے چند انچ کے فاصلے پر رک گئے لڑکی کے منہ سے کربناک چیخ نکلی، ساتھ ہی اس کے ہاتھ کے ناخن ایک دم سمٹ کر غائب ہو گئے اور اس کے خالی ہاتھ فضا میں پھیلے رہ گئے۔ ساتھ ہی اس نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

"کیا ہے، ایسا تمہارے پاس، تم میں ایسی کون سی طاقت ہے جو میرے ہاتھ کو تمہارے پاس نہیں آنے دیتی۔"

رانا کو بھی اس کے ساتھ ہی جیسے اچانک ہوش آ گیا تھا۔ اس کے جسم میں زندگی واپس آ گئی تھی۔ اس نے کہا۔ "تم تو سچ مچ چڑیل ہو۔ میں تو سمجھا بھوت پریت صرف انسانی واہمہ ہوتا ہے۔ لیکن آج مجھے پتا چلا کہ تم واہمہ نہیں بلکہ سچ مچ بھوتنی یا چڑیل ہو۔"

"نہیں۔" لڑکی بولی۔ "میں چڑیا یا بھوتنی نہیں، میں تمہاری طرح ہوں۔ میرا جسم ہے تم مجھے چھو کر دیکھ سکتے ہو، فرق صرف اتنا ہے کہ میں تمہاری طرح انسان نہیں ہوں۔"

"پھر کس طرح کی ہو؟" ارجن نے سوال کیا۔

"ایک شرط ہے۔"

"کیا شرط ہے؟" رانا بولا۔

"مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے، آج کی رات میرے لئے بہت اہم ہے۔ تمہیں میری مدد کرنی ہوگی۔ وعدہ کرو کہ تم میری مدد کرو گے۔ جو میں کہوں گی وہ کرو گے، میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گی۔"

"اور اگر میں وعدہ نہ کروں تو۔" رانا نے بے فکری کے لہجے میں کہا۔

"جو کچھ میں جانتی ہوں کہ تمہیں چھو نہیں سکتی، میں تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ لیکن اگر تم وعدہ نہیں کرو گے تو میں تمہیں اپنے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گی۔ اور یہاں جو کچھ تم نے دیکھا ہے اگر تم واپس جا کر کسی کو بتاؤ گے تو کوئی تمہاری بات پر یقین نہیں کرے گا، کیونکہ اس وقت جو کچھ تم دیکھ رہے ہو وہ سب میری شکتی کا کرشمہ ہے، ورنہ اصل کچھ اور ہے۔"

"اصل کیا ہے؟" رانا نے سوال کیا۔

"اصل دیکھنا چاہتے ہو؟" یہ کہہ کر لڑکی جو کہ بھیانک روپ میں اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ فضا میں لہرایا تو اچانک باہر بڑے زور سے بجلی کڑکی، اندر ایک دم اندھیرا چھا گیا۔ روشنی نہ رہی۔ اسی وقت بجلی دوبارہ زور سے چمکی، اس کے ایک لمحہ کی چمک میں رانا نے جو کچھ دیکھا اسے دیکھ کر ایک بار پھر اس کے جسم میں دہشت کی لہریں دوڑ گئیں، چند سیکنڈ پہلے تو وہ مکان قالین، فانوس، تصویروں اور فرنیچر سے بھرا ہوا تھا۔ آن کی آن میں خالی رہ گیا تھا۔ بلکہ کمرے کی دیواروں کا پلستر ادھڑا پڑا تھا۔ چھتوں میں جالے پھیلے ہوئے تھے فرش پر اینٹیں اور پتھر بکھرے پڑے تھے، کھڑکیاں اور دروازے ٹوٹے ہوئے تھے۔ بالکل ایسا لگتا تھا جیسے ہزاروں سال سے یہ مکان خالی پڑا تھا، پھر بجلی چمکی پھر چمکی۔ اور پھر کچھ دیر بعد لڑکی کی آواز کسی طرف سے دوبارہ ابھری۔ "دیکھ لیا تم نے اب میں پھر تمہارے سامنے آتی ہوں۔" اور پھر ایک دم روشنی ہو گئی، اس روشنی کے ساتھ محل پھر اسی طرح سجا ہوا نظر آنے لگا۔ اسی طرح لڑکی اس کے سامنے کھڑی تھی۔

"یہ وہی لڑکی ہے جو اب تک گیارہ انسانوں کا خون پی چکی ہے۔ اور اگر آج اس کو ختم نہ کیا گیا تو اور نہ جانے کتنے بے گناہ انسانوں کی جان لے گی۔ اس کو ختم کرنا ہی ہوگا۔ ہر قیمت پر چاہے مجھے اپنی جان کی بازی لگانی پڑے۔" اب وہ سمجھ چکا تھا کہ وہ اس وقت تک زندہ کیوں ہے؟ اصولاً اس کو خونی موڑ پر گر کر مر جانا چاہیے تھا۔

وہ صرف اس انگوٹھی کی وجہ سے زندہ ہے جس پر شاہ صاحب نے قرآنی آیات پڑھ کر دم کیا تھا۔ اور کہا تھا کہ "خدا کے حکم کو دنیا کی کوئی طاقت نہیں ٹال سکتی۔" اس وقت اس کو زندہ رکھنے والی یہی انگوٹھی تھی۔

اچانک لڑکی کی آواز نے اس کے خیالات کا سلسلہ توڑ دیا وہ پوچھ رہی تھی۔ "کیا تم میری مدد کر سکتے ہو؟"

"کس قسم کی مدد۔" رانا نے کہا۔

"بتاؤں گی پہلے وعدہ کرو۔"

"میں تمہیں گولی مار کر ختم کر سکتا ہوں۔" رانا نے کہا۔

"تم کوشش کر سکتے ہو مجھے کوئی نہیں مار سکتا، یقین نہ آئے تو گولی چلا کر دیکھ لو۔"

رانا نے اس کے سینے کا نشانہ لے کر گولی چلا دی، گولی اس کے سینے سے پار ہو کر گزر گئی۔ لڑکی نے مسکرا کر کہا۔

"دیکھ لیا تم نے۔" پھر وہ بولی۔

"اگر تم میری مدد کرو تو میں اس کے بدلے میں تمہیں وہ چیز دوں گی جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔"

"کیا چیز؟" رانا نے پوچھا۔ "امر شکتی۔" "جس کے استعمال سے مرنے کے بعد تم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے امر ہو جاؤ گے۔ میں بھی امر بن سکتی ہوں۔"

اس چڑیل کو ختم کرنے کی ایک تجویز اس کے ذہن میں آنے لگی۔ اس لئے اس نے جواب دیا۔ "آل رائٹ۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہاری مدد ضرور کروں گا۔ اب تم مجھے پہلے تفصیل سے بتاؤ کہ کون ہو یا کیا ہو؟ اور تم مجھ سے کس طرح کی مدد چاہتی ہو؟" لڑکی نے اطمینان سے گہرا سانس لیا اور بولی۔ "اب تم وعدہ نہیں توڑ سکتے۔"

"نہیں میں اپنا وعدہ نہیں توڑ سکتا۔" رانا بولا۔

"تو سنو! یہ مکان جس میں تم ٹھہرے ہو وہ سو سال پہلے کا ہے۔ میرا نام راج کماری چندر وتی تھا، میں راجہ بھون راج کی بیٹی تھی، اتنی خوب صورت تھی کہ دور پاس کے علاقوں میں میری خوبصورتی کے چرچے تھے، بڑے بڑے راج کمار مجھ سے شادی کرنے کے خواہش مند تھے، مگر میرے ذہن میں ہمیشہ ایک بات رہتی تھی کہ یہ خوبصورتی فانی ہے چند سال بعد یہ حسن ڈھل جائے گا۔ میرے چہرے پر جھریاں پڑ جائیں گی۔ سیاہ بال سفید ہو جائیں گے۔ آنکھوں کی چمک ماند پڑ جائے گی۔ اس دن سے میں ڈرتی تھی، میری خواہش تھی کہ کسی طرح میری خوب صورتی امر ہو جائے، اور میں سدا اسی طرح جوان رہوں۔

چنانچہ میں نے اعلان کرا دیا کہ میں اس سے شادی کروں گی جو مجھے امر بنا دے گا، لیکن کوئی بھی مجھے امر نہ بنا سکا۔

اور میری عمر بڑھتی چلی گئی، میں نے اس آس میں اپنی جوانی ختم کر دی، میرا جسم سکڑنے لگا، چہرے پر جھریاں پڑنے لگیں، میری حالت ابتر ہو گئی۔

ایک روز ایک بہت بوڑھی عورت میرے پاس آئی اس کا چہرہ مجھ سے بھی خوفناک تھا، اس نے اپنی عمر پانچ سو سال بتائی، وہ خونی موڑ کے پیچھے اس کھنڈر میں رہتی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ "وہ مجھے ہمیشہ جوان اور زندہ رہنے کا راز بتا سکتی ہے اور وہ خود بھی امر بننا چاہتی ہے۔" اس نے بتایا کہ "تین سو سال پہلے ایک شخص نے اسے بتایا" "اگر پونم کی رات کو میں کسی نوجوان مرد کا خون پیوں اور اسی طرح ہر مہینے خون پیتی رہوں، کم از کم بارہ مردوں کا خون پی لوں تو میں امر بن سکتی ہوں، لیکن شرط یہ ہے کہ مرد نوجوان ہو اور پونم کی رات کو ہی اس کا خون پیا جائے۔"

اس بڑھیا نے مزید بتایا کہ "میں دس جوانوں کو اپنے خوب صورت جسم کی لالچ دے کر خونی موڑ پر گرا دیا اور خون پی لیا۔ گیارہواں مرد چالاک تھا اور پہنچا ہوا تھا، اسے میں غار میں لے گئی تو اس نے میرے سر پر پتھر مار کر مجھے بے ہوش کر دیا۔ اس رات میں خون نہ پی سکی۔ اس کے بعد اس شخص نے مجھے وہیں قید کر دیا۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ جن دس جوانوں کا خون میں نے پیا تھا ان ہی میں سے ایک اس کا بھائی تھا، وہ اپنے بھائی کا بدلہ لینے کے لئے ہی آیا تھا۔ وہ پہلے سے تیاریاں کر کے آیا تھا۔ اس نے لوہے کا بہت بڑا پنجرہ بنوایا تھا۔ جس میں مجھے قید رکھ سکے۔ اس رات مجھے بے ہوش کر کے اس نے

مجھے اس پنجرے میں قید کردیا، اور پنجرے کو غار میں چھپا کر چلا گیا۔ مجھے ان جوانوں کا خون پیتے ہوئے ایک منتر بھی پڑھنا ہوتا تھا۔ دس جوانوں کا خون پینے سے میں امر تو نہ ہوسکی لیکن میری عمر بڑھ گئی، جس شخص نے مجھے یہ منتر بتایا تھا اس نے کہا تھا کہ کسی جوان کا خون پینے کے بعد پورا سال گزر جائے تو پچھلی ساری محنت ختم ہوجائے گی۔ اور امر بننے کے لئے پھر نئے سرے سے کوشش کرنی ہوگی۔ صرف دو جوانوں کے خون کی کمی رہ گئی تھی کہ وہ شخص مجھے لوہے کے پنجرے میں قید کرکے چلا گیا۔

ان دس جوانوں کا خون پی کر مجھ میں اتنی شکتی آگئی تھی کہ میں بغیر کچھ کھائے پئے تین سو سال اس پنجرے میں رہی۔ لیکن وقت کا اثر نہیں روک سکتی تھی۔ تین سو سال بعد پنجرہ زنگ آلود ہوکر گل گیا۔ اس کی دو سلاخیں ٹوٹ گئیں۔ تب میں اس قید سے آزاد ہوں۔ اب مجھ میں اتنی قوت اور خوب صورتی نہیں رہی کہ میں نوجوان مردوں کو پھانستی اور ان کا خون پی سکتی، میری موت اب زیادہ دور نہیں اس لئے مرنے سے پہلے میں تمہیں وہ منتر بتاتی جاؤں اس سے تم امر شکتی حاصل کرکے امر بن سکوگی۔"

اس بڑھیا نے مجھے وہ منتر بتایا۔ اور کچھ دن بعد وہ مرگئی۔ میں نے امر بننے کے لئے کوشش شروع کردی۔ لیکن میرے ساتھ بھی وہی ہوا جو اس بڑھیا کے ساتھ ہوا تھا۔ دو سو سال پہلے میں آٹھ جوان مردوں کا خون پی چکی تھی۔ بدقسمتی سے ان میں ایک نوجوان بہت بڑے رئیس کا بیٹا تھا۔ وہ مجھے مار نہیں سکتا تھا۔ مگر اس نے مجھے ایسی شراب پلائی کہ مجھے سو سال بعد ہوش آیا۔ چنانچہ میں اب جاگی ہوں اور اس سال میں پھر سے گیارہ انسانوں کا گیارہ پونم کی راتوں میں خون پی چکی ہوں، آج پونم کی رات ہے، امر بننے کے لئے مجھے تمہارا خون پینے کی ضرورت نہیں صرف دو چلو خون بھی مل جائے تو میرا باقی چہرہ بھی جوان ہوجائے گا۔ اور پھر میں امر ہوجاؤں گی، امر ہونے کے بعد ہم دونوں ایک ساتھ رہ سکتے ہیں۔ تم دو چلو خون دینے سے مر نہیں جاؤ گے۔"

رانا یہ کہانی سن کر حیران رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس کہانی پر یقین کرے یا نہ کرے۔ لیکن اب تک وہ جو کچھ دیکھ چکا تھا اسے جھٹلا نہیں سکتا تھا۔ اس نے جواب دیا۔ "اچھا میں چاقو سے اپنی ایک رگ کاٹ کر تمہیں خون دیتا ہوں۔"

"نہیں اس طرح نہیں۔" لڑکی نے کہا۔ "خون مجھے خود نکالنا ہوگا، اور ساتھ ہی منتر بھی پڑھنا ہوگا۔ تم مجھے اپنے پاس آنے دو، اپنے آپ کو چھونے دو، بس ذرا سی دیر کی بات ہے اس کے بعد ہم دونوں امر ہوجائیں گے۔"

"اچھا۔" رانا بولا۔ "تم میرے پاس آجاؤ اور میرا خون لے لو۔"

"نہیں میں تین بار کوشش کرچکی ہوں تمہارے اندر ایسی کوئی قوت ہے یا کوئی ایسی چیز تمہارے جسم پر ہے جو مجھے تمہارے جسم کے پاس نہیں آنے دیتی۔"

رانا نے مسکرا کر ہاتھ آگے بڑھا کر کہا۔ "یہ انگوٹھی ہے جو تمہیں مجھے چھونے سے روکتی ہے۔"

"تو اس کو اتار دو۔ یہ انگوٹھی اتار کر تمہیں میرے ساتھ خونی موڑ پر چلنا ہوگا۔"

رانا کے ذہن میں اس چڑیل کو ختم کرنے کے لئے ایک ترکیب آئی۔ اس نے لڑکی سے کہا۔ "میں نے تم سے وعدہ کیا ہے، تو اس کو ضرور پورا کروں گا۔ میں تمہارے ساتھ خونی موڑ پر چلنے کے لئے تیار ہوں۔ انگوٹھی میں اتار دوں گا، لیکن ایسا کرنے سے پہلے میں کچھ سوچنا چاہتا ہوں، لہٰذا میں اپنی گاڑی میں واپس جاتا ہوں، دس منٹ میں سوچتا ہوں، اس کے بعد تم آجانا، میں تمہاری ہر بات مان لوں گا۔"

"وعدہ" لڑکی نے کہا۔

"ہاں پکا وعدہ۔"

"تم جاؤ! میں دس منٹ بعد آجاؤں گی۔"

رانا باہر آگیا۔ باہر ابھی تک بارش ہورہی تھی۔ گاڑی میں بیٹھ کر اس نے ٹارچ نکالی اور روشنی کرکے جیب سے اپنی ڈائری نکالی اور قلم نکال کر لکھنے لگا۔ جو کچھ واقعات اس کے ساتھ گزرے تھے وہ تفصیل کے ساتھ لکھنے کے بعد آخر میں اس نے لکھا۔

"انسپکٹر شیام صاحب! اگر آپ کو میری لاش خونی موڑ کے اسی کھڈ میں ملے تو سمجھ لیجئے گا کہ آج کے بعد یہ چڑیل کسی انسان کو ختم نہیں کرسکے گی۔ میں مرنے سے پہلے اس کا ایسا بندوبست کروں گا کہ میرے ساتھ یہ بھی ختم ہوجائے گی، میں جانتا ہوں اس نے مجھے جو کہانی سنائی ہے، وہ آدھی سچ اور آدھی جھوٹ ہے، میرا خیال ہے یہ وہی جادوگرنی ہے، جو تین سو سال سے اس غار میں قید رہ چکی ہے۔ بس اب دس منٹ پورے ہورہے ہیں، میں ڈائری بند کرتا ہوں، صبح کو یا تو میں خود آکر آپ کو بقیہ سارے واقعات سناؤں گا، ورنہ یہ ڈائری آپ کو سب کچھ بتادے گی۔ لڑکی باہر آرہی ہے، مجھے یقین ہے اگر مجھے اپنی زندگی کی قربانی دینی پڑی تو میں اپنے ساتھ ہی اس چڑیل کو ہمیشہ کے لئے ختم کردوں گا۔ اب وہ باہر آگئی ہے۔" رانا نے ڈائری بند کرکے جیب میں رکھ لی۔

رانا نے دیکھا اب وہ دوبارہ ایک حسین دوشیزہ لگ رہی تھی۔ رانا نے کہا۔ "تمہارا چہرہ تو اب ٹھیک ہوگیا ہے۔"

"یہ عارضی ہے۔" لڑکی نے جواب دیا۔ "انگوٹھی سے تھوڑی دیر کے لئے میں اپنے چہرے کو خوب صورت بناسکتی ہوں، لیکن پھر وہ اپنی اصلی حالت میں واپس آجاتا ہے۔ تمہارا چلو بھر خون ملنے پر یہ ہمیشہ کے لئے جوان بن سکتا ہے۔"

رانا نے اپنی برابر والی سیٹ کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ "یہاں آجاؤ۔"

"میں تمہارے پاس نہیں بیٹھ سکتی۔ پہلے تم اپنی انگلی سے انگوٹھی اتاردو۔"

رانا نے انگوٹھی اتار کر سامنے ڈیش بورڈ پر رکھ دی۔ اور کہا۔ "لو اب تو آجاؤ۔"

"ہاں اب میں آجاؤں گی، یہ کہہ کر لڑکی اس کی برابر والی سیٹ پر بیٹھ گئی اور رانا نے جیپ اسٹارٹ کرکے دوبارہ خونی موڑ کی طرف دوڑادی۔

رانا کو یقین تھا کہ لڑکی اس پر فوراً حملہ نہیں کرے گی۔ انگوٹھی ڈیش بورڈ پر اس لئے رکھی تھی کہ وہ اس کے ناخن بڑھتے ہوئے دیکھے گا تو فوراً انگوٹھی اٹھالے گا۔

راستہ بھر دونوں خاموش رہے، آخر خونی موڑ آگیا۔ رانا کا دل دھک دھک کرنے لگا، موڑ کے قریب پہنچ کر اس نے اسٹیئرنگ ایک ہاتھ سے سنبھالا اور دوسرا ہاتھ ڈیش بورڈ پر انگوٹھی کے پاس رکھ لیا۔ "بس اب وقت آگیا ہے۔" لڑکی نے خوشی سے بھرپور لہجے میں کہا۔ رانا نے ترچھی نظروں سے لڑکی کی طرف دیکھا۔ لڑکی دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے ہوئے رانا کی طرف کھا جانے والے انداز میں دیکھ رہی تھی۔ اس کے ناخن بڑھنے شروع ہوگئے تھے۔ ناخن آہستہ آہستہ بڑھ کر اس کی گردن کی طرف آرہے تھے۔

جیپ خونی موڑ پر پہنچی پھر جیسے ہی لڑکی کے بڑھے ہوئے ناخن اس کے بدن کو چھونے ہی والے تھے کہ رانا نے اچانک اسٹیئرنگ چھوڑ کر دو حرکتیں کیں۔ ایک ہاتھ سے اس نے انگوٹھی کو مٹھی میں پکڑلیا۔ اور دوسرا ہاتھ پھرتی سے لڑکی کی کمر میں ڈال دیا۔

اچانک لڑکی کے حلق سے دلخراش، کربناک، دردناک چیخ نکلی۔

اس کے ساتھ ہی جیپ خونی موڑ کے جنگلے سے ٹکرا کر اچھلی اور فضا میں قلابازیاں کھاتی ہوئی کھڈ میں جاگری۔ بجلی بڑے زور سے کڑکی اس کے بعد سناٹا چھا گیا۔

صبح ہوتے ہی انسپکٹر رانا کی تلاش میں انسپکٹر شیام نکل پڑا تھا۔ آخر اسے رانا کی جیپ کھڈ میں مل گئی۔ رانا مرچکا تھا، مگر اس کی گردن پر کسی طرح کا نشان نہیں تھا، البتہ اس کی برابر والی سیٹ پر راکھ کا ذرا سا ڈھیر پڑا ہوا تھا۔ انگوٹھی اب اس کی مٹھی میں تھی۔

اچانک انسپکٹر شیام کی نظر رانا کی جیب پر پڑی، اس میں رانا کے ہاتھ سے لکھی ہوئی ڈائری تھی، انسپکٹر شیام نے ڈائری نکال کر پڑھی تو اسے بھی خوف کا ایک جھٹکا لگا۔

اس کے بعد واقعی اس بارہویں موت کے بعد خونی موڑ پر پھر کوئی حادثہ پیش نہیں آیا۔ رانا نے واقعی اپنی عقلمندی سے اس چڑیل کا خاتمہ کردیا تھا۔

آتش انتقام

ساجدہ راجہ۔ ہنڈواں سرگودھا

"صاحب وہ آپ کے ..." ابھی اتنی ہی بات وہ نوجوان بول پایا تھا کہ نہ جانے کہاں سے ایک گولی سنسناتی ہوئی آئی اور اس کی پیشانی میں سوراخ کرگئی، اور اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی

نفسانی خواہشات کا پروردہ شخص جب اس کی خواہش کی تکمیل نہ ہوئی تو وہ اپنا ہوش و حواس کھو بیٹھا

گل اور لالہ کی موت کی خبر مجھ پر بجلی بن کر گری، میں ساکت رہ گیا، وہ دونوں میرے چھوٹے بہن بھائی تھے اور مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ پیارے تھے۔ لالہ پانچویں کا طالب علم تھا اور گل۔

ہمارے خاندان میں لڑکیوں کو پڑھانے کا کوئی تصور نہیں تھا چونکہ ہمارا خاندان ایک قبائلی خاندان تھا، اس لئے وہ عورت کو چار دیواری میں قید رکھنے کے عادی تھے۔ لڑکیوں کو پڑھانے کی بات کرنا بھی گویا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ ایسے میں گل کیسے اسکول جاسکتی تھی، میرا دل تو بہت کرتا تھا کہ میں اپنی بہن کو پڑھاؤں، اس کی عمر آٹھ سال تھی اور اسے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ میں اکثر دیکھتا تھا کہ وہ لالہ کی کتابیں چھپ کر کھولتی اور صفحات کو دیکھنے میں محو ہو جاتی تھی۔ اور میں کڑھ کے رہ جاتا تھا۔

نام تو میرا اسکندر ہے لیکن صرف نام کا... میں اگر اتنا ہی طاقت ور ہوتا تو اپنی بہن کے حق میں ضرور آواز اٹھاتا، خود تو میں سیکنڈ ایئر میں تھا اور شہر کے ہوسٹل میں رہا کرتا تھا اور کبھی کبھار ہی گاؤں آیا کرتا تھا، یہاں کا مخصوص قبائلی ماحول، بے جا پابندیاں، سخت رواج، مجھے بالکل پسند نہیں تھے اس لئے میں زیادہ سے زیادہ اس سے دور رہنے کی کوشش کرتا تھا۔

میرا چچا پورے علاقے کا سردار تھا، اس کی سخت گیری بہت مشہور تھی، میرے والدین کا تو عرصہ ہوا انتقال ہوگیا تھا، اس کے بعد میں اپنے چچا کی سرپرستی میں آگیا، روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں تھی بلکہ اپنے چچا سے کچھ زیادہ ہی ہماری جائیداد تھی جو ابو کے انتقال کے بعد ہم بھائیوں کے حصے میں آگئی۔ فصلوں اور باغات کی ساری آمدنی ہمارے اکاؤنٹ میں شہر کے بینک میں جمع ہوتی، جتنی رقم کی ضرورت ہوتی میں نکلواتا، اس لئے خرچے کے لئے کبھی چچا کی طرف دیکھنے کی ضرورت پیش نہ آئی، گاؤں میں ہی پرائمری اسکول موجود تھا، جس میں لڑکے پڑھتے تھے، لڑکیوں کی تعلیم کا تو سرے سوال ہی نہیں تھا، اس لئے اسکول کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

گل رخ کے لئے میں نے ڈرتے ڈرتے چچا سے ذکر کیا تو وہ پھٹ پڑے اور ایسی ایسی باتیں سنائیں جن میں دھمکیاں نمایاں تھیں، کہ میں نے دوبارہ گل رخ کی پڑھائی کا بھول کر بھی نام نہ لیا حالانکہ چچا کی اپنی لاڈلی بیٹی بلقیس بھی شہر میں تعلیم حاصل کررہی تھی، وہ میٹرک کی اسٹوڈنٹ تھی اور چچا کے سارے اصول بیٹی کی محبت کے آگے دم توڑ گئے تھے، دوسرا انہیں اپنی شہری تو عمر بیوی سے انتہا درجے کی محبت تھی اور اس کی وہ کوئی بات ٹال نہیں سکتے تھے، اس لئے خاصی تگ و دو کے بعد اور قبیلے والوں کی شدید مخالفت کے باوجود چچا نے بلقیس کو اسکول میں داخل کروادیا تھا۔

چونکہ بلقیس کا رویہ میرے سمیت میرے بہن بھائیوں سے بہت اچھا تھا اس لئے مجھے کبھی اس سے اس بات پر جلنسی محسوس نہیں ہوئی کہ وہ پڑھ رہی ہے اور گل رخ پابندیوں کی زد میں.....!

میرا ارادہ تھا کہ پانچویں کے بعد لالہ کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا، نام تو اس کا عمار خان تھا، بچپن سے ہی سب اسے لالہ کہتے تھے، لیکن اسے ساتھ لے جانے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ اس سے پہلے ہی ان دونوں کو قتل کردیا گیا ۔ کیوں.....؟ اس کیوں کا جواب تو میرے پاس نہیں تھا اور مجھے گاؤں جاکر سب کچھ معلوم ہوسکتا تھا۔ انہیں کس نے اور کیوں قتل کروایا.....؟"

اس بات کی بے چینی مجھے کھائے جارہی تھی اس لئے میں فوراً ہی گاؤں کے لئے روانہ ہوگیا۔ میرے اندر انتقام کی اتنی شدت کی آگ جل رہی تھی کہ میرے لئے سانس لینا بھی دشوار ہورہا تھا۔ رونا مردوں کا شیوہ نہیں، میں جانتا تھا لیکن خود کو روکنا میرے اختیار میں نہیں تھا ابھی تک مجھے خود بھی سمجھ نہیں آرہی تھی کہ یہ کیا ہوگیا، میں جو خود کو ابھی تک چھوٹا سمجھ رہا تھا بہن بھائی کی موت پر جیسے بڑ بڑا کر بڑا ہوگیا، خود کو ایک بچے کی نگاہ سے دیکھنے کے بجائے ایک بھرپور جوان کی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

گاؤں میں میرے والد کی کسی سے دشمنی نہیں تھی، تو ہماری بھی نہیں تھی بلکہ گاؤں والے تو ہم کو بہت پیار دیتے تھے، میں جب بھی ہوسٹل سے گاؤں آتا تو گاؤں کے لوگ بہت خوش ہوکر محبت سے ملتے تھے، دوسرے گاؤں والوں کی ہمت بھی نہیں تھی کہ وہ حاکم خان کے بھتیجوں کو کچھ کہہ سکیں۔ چچا کی تو بہت سی دشمنیاں تھیں لیکن ان کے دشمنوں کی بھی اتنی ہمت نہیں تھی کہ یوں سرعام ان کے کسی بھی رشتہ دار کو کچھ کہتے۔ سوچ سوچ کے میرا دماغ پھٹنے والا ہوگیا تھا، ڈرائیور بار بار بیک مرر سے مجھے تکتا اور مجھے روتے اور غصے سے بل کھاتا دیکھ کر ہونٹ بھینچ لیتا، مجھے کسی پل چین نہیں آرہا تھا جی چاہ رہا تھا کہ اڑ کر گاؤں پہنچ جاؤں۔

خدا خدا کر کے راستہ کٹا اور میں بھاگ کر گاڑی سے باہر نکلا۔ لوگوں کا جم غفیر جمع تھا اور مجھے ہر آنکھ نم دکھائی دے رہی تھی، مجھے دیوانوں کی طرح بھاگتے آتے دیکھ کر لوگ ہمدردی اور ترس سے میری طرف دیکھنے لگے

لیکن مجھے اس وقت کسی چیز کا ہوش نہیں تھا، میں دیوانوں کی طرح بھاگتا ہوا ان دونوں کی چارپائیوں کی طرف گیا جہاں وہ ہمیشہ کی نیند سو رہے تھے، ان کے چہرے سے پھوٹتی معصومیت دل کو تڑپا رہی تھی۔ بھلا اتنے سے معصوم بچوں نے کسی کا کیا بگاڑا تھا۔ میں سوچ تو سکتا تھا لیکن میری زبان تالو سے چپک چکی تھی اور سارے راستے بہنے والے آنسو بالکل رک چکے تھے ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ میں ان معصوموں کی لاشوں سے لپٹ لپٹ کر دھاڑیں مار کر روتا لیکن میں تو ساکت ہو چکا تھا میرے آنسو خشک ہو چکے تھے، دونوں کے سر میں گولی لگی اور وہ دوسری سانس لئے بغیر اس دنیا سے چلے گئے۔

چچا غم سے نڈھال میرے پاس آئے اور مجھے گلے سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر روئے لیکن میں خاموش کھڑا رہا۔ سناٹا جیسے دور دور تک پھیل چکا تھا۔ چچا کا...... دادی کا...... بلقیس کا رونا بھی مجھے نہ رلا سکا، میں خود بھی حیران تھا کہ اچانک مجھے کیا ہوا ہے۔ بس اتنا جانتا تھا کہ مجھے اپنے بہن بھائی کے قاتلوں کو کیفر کردار تک پہنچانا ہے۔ ایسے قاتل جنہیں میں ابھی تک جانتا ہی نہیں تھا لیکن مجھے ان کے بارے میں جاننا تھا اور انہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کے قتل کرنا تھا۔

میں بزدل نہیں تھا اور نہ ہی بزدلوں کی طرح رو کر بیٹھ جانا چاہتا تھا۔

جنازے کے بعد میں نے سب سے پوچھ گچھ شروع کردی، کسی کے شاید وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ میں اتنی جلدی تفتیش کروں گا، ان کا خیال تھا کہ یہ میرے بس کا کام نہیں اور یہ کہ میرے چچا خود ہی قاتلوں تک پہنچ جائیں گے۔

لیکن بہن بھائی تو میرے مرے تھے سو تکلیف تو مجھے ہی زیادہ تھی اور بدلہ بھی مجھے خود ہی لینا تھا، بے شک چچا بھی کوشش کرتے لیکن جب تک میں اپنے ہاتھوں سے قاتلوں کو موت کے منہ میں نہ دھکیل لیتا، مجھے کسی صورت چین نصیب نہیں ہوسکتا تھا۔

لوگوں سے پوچھ گچھ کے دوران مجھے پتہ چلا کہ لالہ صبح حسب معمول اسکول جا رہا تھا، اس کے ساتھ گل رخ بھی تھی کہ کھیتوں میں چھپے ہوئے نامعلوم افراد نے فائرنگ کردی جس کے نتیجے میں وہ دونوں موقع پر ہی ہلاک ہوگئے، گل رخ لالہ کے ساتھ کیوں جا رہی تھی......؟ یہی سوال جب میں نے چچا سے کیا تو ان کا جواب تھا۔

"بچہ...... ہم نے تو لالہ کو بہت روکا کہ وہ گل کو پڑھانے کا خیال چھوڑ دے، لیکن وہ اپنی ضد پر قائم تھا۔ کہنے لگا۔ "کچھ دن میں گل کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا، پھر ہم بھائی سکندر کے پاس شہر چلے جائیں گے، ادھر ہم دونوں مل کر پڑھیں گے۔"

آج اسے گل کو لے جاتے دوسرا دن تھا کہ نہ جانے کن کم بختوں نے ان معصوموں کو مار ڈالا۔ منع بھی کیا لالے کو، لیکن وہ نہ مانا اپنے ساتھ ساتھ اس معصوم کو بھی لے ڈوبا، میں نے یہ بھی کہا کہ قبیلے والے تمہیں بغاوت کی سزا دیں گے لیکن وہ اپنی ضد پر اڑ گیا، بالکل اپنے باپ شاہ عالم پر گیا تھا، شاہ عالم کسی بات کا ارادہ کرلیتا تو پھر وہ پتھر پہ لکیر ہوتا تھا۔ اب کیا ملا اسے......؟" چچا گلوگیر لہجے میں بولے تو میرے اندر انتقام کی آگ مزید بھڑک اٹھی۔

"کیوں......! چچا جان، پڑھنا اتنا بڑا جرم تو نہیں ہے کہ اس کی اتنی بڑی سزا دی گئی۔ پھر آپ کی بیٹی بھی تو خاندان کی روایت کے برخلاف پڑھ رہی ہے، وہ کیوں کسی نامعلوم افراد کی گولی کا نشانہ نہیں بنی......؟ اسے کیوں بغاوت کی سزا نہیں دی گئی......؟ اس لئے کہ وہ آپ کی یعنی سردار حاکم خان کی بیٹی ہے ؟ نہیں چچا جان میں اپنے معصوم بہن بھائیوں کی المناک موت کا انتقام ضرور لوں گا، چاہے وہ جو کوئی بھی ہو، قبیلے کا کوئی فرد حتیٰ کہ اگر مجھے اپنے کسی قریبی عزیز پر شک ہوا تو ابھی موت کے گھاٹ اتارنے میں ذرا بھی دیر نہیں کروں گا...... یہاں تک کہ وہ آپ سمیت جو بھی ہو۔"

پھر میں نے دیکھا کہ میری اس بات پر چچا کے چہرے پر اچانک ایک سایہ سا لہرایا لیکن پھر وہ نارمل لہجے

میں بولے۔ ”حوصلہ رکھو میرے بیٹے، خدا کو یہی منظور تھا، میں خود اپنے بچوں کے قاتل کو تلاش کروں گا، اور انہیں سب گاؤں والوں کے سامنے عبرتناک سزا دوں گا۔“ چچا نے مجھے دلاسہ دینے والے انداز میں کہا لیکن میں جانتا تھا کہ یہ محض طفل تسلی کے علاوہ کچھ نہیں بہر حال میں جو ٹھان چکا تھا اس سے پیچھے ہٹنا اب ناممکن تھا۔ میں چپ چاپ وہاں سے ہٹ گیا۔

نہ جانے کتنے دن گزر گئے، لیکن میں ہنوز اندھیرے میں تھا، کوئی بھی مجھے کچھ بتانے کو تیار نہیں تھا، اگر انہیں کچھ پتہ بھی تھا تو نہ جانے کس خوف سے وہ مجھے کچھ بھی بتا نہیں رہے تھے۔ میرا طیش بڑھتا جا رہا تھا، میرا کھانا پینا برائے نام رہ گیا تھا، ہمہ وقت میری آنکھوں سے وحشت جھلکنے لگی تھی۔ میری آنکھوں کی سرخی سب کو بتانے کو کافی تھی کہ میری راتیں کس طرح کٹتی ہیں، گھر میں، میں ایک پل بھی نکتا نہیں تھا، جس کی وجہ سے چچا جان بہت پریشان رہنے لگے تھے، نہ جانے انہیں کون سی فکر کھائے جا رہی تھی کہ وہ مجھے دوبارہ ہوسٹل بھجوانا چاہ رہے تھے تاکہ میرا دھیان کچھ بٹے، میرے دماغ میں ہر وقت ہر پل ایک ہی آواز گونجی تھی۔ ”بس انتقام اور صرف انتقام......!!“

اس دن میں ایک جگہ اداس اور چپ چاپ بیٹھا ہوا تھا کہ ڈرائیور جس کا نام سربلند تھا میرے پاس آیا، اضطراب اس کے چہرے سے جھلک رہا تھا۔ میں نے حیرانی سے اسے دیکھا ؟

”وہ......صاحب میں آپ سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔“ وہ بے چینی سے انگلیاں مروڑ رہا تھا اور کن انکھیوں سے آس پاس بھی دیکھ رہا تھا۔ ”بیٹھو سربلند... کہو کیا بات ہے......؟ تم بہت پریشان لگ رہے ہو؟“ میں نے گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیا......وہ سر جھکا کر میرے پاس بیٹھ گیا۔ ”اب بولو کیا بات ہے؟“ میں نے اسے مسلسل چپ دیکھ کر پوچھا۔

”صاحب جی! میں آپ کو کل بی بی اور لالہ صاحب کے قتل بلکہ قاتلوں کے بارے میں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔“

اور اچانک مجھے کرنٹ سا لگا اور میں اچھل پڑا۔

”کک کون ہیں وہ؟ جلدی بتاؤ سربلند۔“ میری آواز جوش جذبات سے کچھ بلند ہوگئی۔

”خدا کے لئے صاحب......آہستہ بولیں۔ کسی نے سن لیا تو غضب ہو جائے گا۔“ وہ بے تابی سے بولا۔

”ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے تم مجھے بتاؤ۔“

”وہ صاحب آپ کسی کو مت بتانا ورنہ وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ میں نے خود ان کی باتیں سنی تھیں اور میں آپ کو مطلع بھی کرنا چاہتا تھا لیکن اسی رات یہ بات نہیں بتائی جا سکتی تھی، میرے پاس آپ سے رابطے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا اور پھر صبح وہ سانحہ ہو گیا اور مجھے آپ کو لانے کے لئے بھیج دیا گیا۔ میں کب سے آپ کو بتانے کا سوچ رہا تھا لیکن موقع نہیں ملا دوسرا مجھے اپنی جان اور اپنے خاندان کا بھی خطرہ تھا۔“

”ان باتوں کو چھوڑو سربلند! مجھے قاتلوں کا نام بتاؤ۔“ میں اس کی لمبی داستان سے اکتا کر بولا۔

”صاحب وہ آپ کے......“ ابھی اتنی ہی بات وہ بول پایا تھا کہ نہ جانے کہاں سے ایک گولی سنسناتی ہوئی آئی اور اس کی پیشانی میں سوراخ کر گئی۔ اس کی چیخ بھی نہ نکل سکی۔

میں حواس باختہ ہو گیا۔ آس پاس نظر دوڑائی کوئی بھی نظر نہ آیا، جلدی سے سربلند کا سر اپنی گود میں رکھ لیا، وہ آخری سانس لے رہا تھا۔ ”سربلند خدا کے لئے مجھے بتاؤ......قاتلوں کے نام، مجھے بتاؤ......“ میں دیوانوں کی طرح چیخ رہا تھا لیکن اس کے منہ سے محض خرخراتی ہوئی آواز ہی نکل سکی اور اس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔

میں صدمے سے چور ہو گیا۔ کامیابی کے قریب پہنچ کر ناکام رہ جانا بہت اذیت ناک ہوتا ہے۔ ”مجھ سے بھی یہ اذیت برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ کاش! مجھے ان بے رحم قاتلوں کا پتہ چل جاتا......“ یا میرے خدا! میرے حال پر رحم فرما، مجھے میرے مقصد میں کامیابی عطا فرما۔“ میں نے کہا۔

میں تھکے قدموں سے گھر آ گیا۔ سربلند کو دفن کر دیا

گیا لیکن مجھے کہیں بھی جائے پناہ نہیں مل رہی تھی۔ دادی میری حالت دیکھ کر کڑھتی رہتی تھیں، مجھے کہے بکا ہے دلاسے بھی دیتیں، مجھے اپنے انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کا کہتیں لیکن میں اب بے اختیار ہوچکا تھا کچھ بھی تو میرے بس میں نہیں تھا، جب تک میں انہیں قتل نہ کرلیتا میرے سینے میں بھڑکتی ہوئی آگ ٹھنڈی ہونے والی نہیں تھی، دادی بھی اپنے خاندان کی ان روایات سے بے بس تھیں، کچھ نہیں کرسکتی تھیں، چچا کی عادات اور ان کے ظلم سے وہ بھی خوش نہیں تھیں لیکن وہ خاموش تھیں کیونکہ وہ کچھ نہیں کرسکتی تھیں سوائے دل میں کڑھنے کے۔

"سکندر پتر۔ تو اں شہر کیوں نہیں چلا جاتا۔ یہاں تیرا چچا موجود ہے۔ وہ ضرور قاتلوں کو ڈھونڈ لے گا۔ تو اپنا وقت ضائع نہ کر اور پڑھنے پر توجہ دے۔ آخر کب تک یہاں کی خاک چھانتا رہے گا۔" دادی نے ایک دن مجھے مخاطب کیا جبکہ میں تھکا ہارا ادھر ادھر سے لوٹا تھا۔

"کیا آپ کو یقین ہے کہ چچا قاتلوں کو ڈھونڈ رہے ہیں؟" اگر وہ ڈھونڈ رہے ہوتے تو کیا ابھی تک قاتل مل نہ جاتے۔ آپ جانتی ہیں نا کہ بغاوت کرنے والوں کی سزا کیا ہوتی ہے اور میرے بہن بھائی بھی تو باغی تھے ناں...؟" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا تو دادی خاموش ہوگئیں۔

"دادی جان...... میں اس وقت تک ہرگز واپس نہیں جاؤں گا جب تک میرے معصوم بہن بھائیوں کے قاتل نہیں مل جاتے۔ میں ایسے کیسے پڑھ سکوں گا، کیسے سکون سے رہ سکوں گا......؟" میں نے بے بس لہجے میں دادی سے کہا تو وہ ٹھنڈی آہ بھر کر خاموش ہوگئیں اور اسی رات ایک ایسا ہولناک انکشاف مجھ پر ہوا کہ میں اندر تک لرز گیا۔

"کیا کیسے ہوسکتا ہے......؟ کہیں یہ میرا وہم تو نہیں۔
لیکن وہم اتنا زوردار تو نہیں ہوتا۔
کیا کوئی اتنا ظالم بھی ہوسکتا ہے؟ لیکن میرے جھٹلانے سے کیا ہوسکتا ہے۔ حقیقت بدل تو نہیں جائے گی۔

جب چچا ہی اپنے بھتیجوں کا قاتل ہو تو پھر کون کیا کرسکتا ہے۔ میرے باپ نما چچا نے اپنی فرسودہ روایات کی وجہ سے میرے معصوم بہن بھائیوں کو قتل کروایا۔ ان کا قصور صرف یہی تھا کہ وہ تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ان فرسودہ روایات کو بدلنا چاہتے تھے اور چچا کی بیٹی خود بھی تو پڑھ رہی تھی پھر یہ روایات اس کی راہ کیوں نہ روک سکے۔ اس کو اس بغاوت کی سزا کیوں نہ دی گئی......؟ اس لئے کہ وہ ان کی بیٹی ہے لیکن یہ بھی تو انہی کا خون تھے؟"

کمرے میں میرا دل گھبرانے لگا تو میں یونہی چہل قدمی کے لئے پچھلے لان میں آگیا اور وہیں پر یہ ہولناک انکشاف مجھ پر ہوا۔ چچا اپنے ایک خاص ملازم پر برہم ہورہے تھے کہ وہ مجھ پر نظر کیوں نہیں رکھ رہے اور یہ کہ ملازموں کو اتنی جرات ہوگئی کہ وہ اپنے مالک کی باتیں آگے بتائیں، انہی باتوں کے دوران انہوں نے میرے معصوم بہن بھائیوں کے قتل کا انکشاف کردیا اور میں تو وہیں سن ہوکر رہ گیا...... مجھے کچھ سمجھ نہ آئی کہ میں کیا کروں......؟ چچا کب گئے، مجھے کچھ خبر نہ ہوئی۔ میں اس وقت چونکا جب بلقیس نے میرے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھا۔

"سکندر کب تک اپنی جان ہلکان کرتے رہو گے؟" خدا کے لئے نارمل زندگی کی طرف آجاؤ۔ تم نہیں جانتے کہ تمہیں اس حالت میں دیکھ کر مجھے کتنی تکلیف ہوتی ہے۔" میں نے اداس بھری نگاہ اس پر ڈالی اور کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اس سے میری یہ بے اعتنائی برداشت نہ ہوئی اور وہ میرے پیچھے پیچھے آنے لگی۔

جب سے یہ قتل والا سانحہ ہوا تھا، میں نے بلقیس سمیت سب سے بات چیت ختم کردی تھی، اب بھی میں نے اس کی کسی بھی بات کا جواب دینے سے گریز کیا۔

"سکندر تم کیوں مجھ سے بات نہیں کرتے؟ اس میں میرا کیا قصور ہے؟"

وہ رو دینے والے لہجے میں بولی۔ میں پھر بھی کچھ نہ بولا، نہ جانے کیوں اسے دیکھ کر مجھے غصہ آرہا تھا جسے میں چھپانے کی کوشش میں ناکام ہورہا تھا۔ ناگواری کے

تاثرات میرے چہرے پر مترشح تھے جو نہ جانے کیوں اس سے برداشت نہیں ہو رہے تھے۔ میری مسلسل خاموشی اور لاتعلقی نے اسے وہم میں ڈال دیا، بہت زیادہ رنجیدہ ہو کر وہ رو پڑی۔

اسے روتے دیکھ کر بھی مجھے اس پر رحم نہیں آیا بلکہ اس وقت میرے سامنے میرے معصوم بہن بھائیوں کے چہرے تھے اور قاتل کی شکل میں بلقیس کا باپ۔ اور قاتل کی بیٹی پر ترس کھانا میں کسی صورت گوارہ نہیں کر سکتا تھا۔

جب وہ کسی صورت خاموش نہ ہوئی تو میں نے اسے بازو سے پکڑ کر ایک جھٹکے سے کھڑا کیا اور قہر آلود لہجے میں بولا۔ "بس کرو اس ناٹک کو...... مجھے اس طرح کے فریب بالکل اچھے نہیں لگتے، آخر تم رو کر ثابت کیا کرنا چاہتی ہو...... نکلو میرے کمرے سے......" میں نے غصے میں اسے باہر کی طرف دھکیلا تو وہ مزید بلک پڑی۔

"سکندر...... تم میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہے ہو؟ میں نے کیا کیا ہے؟ خدا کے لئے مجھے میرا قصور تو بتاؤ۔"

"تمہارا قصور!! بتاؤں...؟" میں نے نفرت بھری نگاہ سے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا تو وہ سراسیمہ نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ "تمہارا قصور یہ ہے کہ تم نے اس خاندان کی روایت کے برخلاف پڑھا بلکہ پڑھ رہی ہو اور میرے معصوم بہن بھائی اس کوشش کی پاداش میں دنیا بدر کر دیئے گئے اور تمہیں کسی نے کچھ نہ کہا...... ایک منٹ......"

اسے کچھ کہنے کی کوشش میں ہاتھ اٹھا کر بولنے سے روکتے ہوئے کہا۔ "لیکن میرے رویے کی وجہ کچھ اور ہے اور امید ہے اس وجہ کو جاننے کے بعد تم میرے ساتھ اپنا کوئی تعلق جتانے کی کوشش نہیں کرو گی۔ بلکہ شرم سے منہ ضرور چھپاؤ گی۔ تم جانتی ہو تم کس کی بیٹی ہو......؟"

میرے اس سوال پر وہ ہکا بکا ہو کر میری آنکھوں کو بغور دیکھنے لگی۔ اس وقت میری آنکھیں قہر آلود ہو رہی تھیں۔

"میں بتاتا ہوں کہ تم کس کی بیٹی ہو...... تم ایک ایسے سردار کی بیٹی ہو جو اپنے اور اپنی اولاد کے علاوہ سب کو انسان نہیں سمجھتا...... جو دنیا میں خدائی کا دعویٰ کر بیٹھا ہے۔ وہ فرعون سے بھی بدتر ہے۔ چلو فرعون تو خدا کو نہیں مانتا تھا لیکن تمہارا باپ!! خدا کو ماننے کا دعویٰ کرنے کے باوجود غریبوں کا خدا بن بیٹھا ہے، جس کے ظلم کو روکنے اور اس کے خلاف آواز اٹھانے والا کوئی نہیں۔

لیکن میں۔" میں نے شدت جذبات سے بوجھل آواز میں کہا۔ "میں اسے عبرتناک انجام تک پہنچا کر دم لوں گا، میں قتل کر دوں گا تمہارے باپ کو...... اسے کبھی چین کی سانس نہیں لینے دوں گا...... کیونکہ......؟ کیونکہ وہ قاتل ہے میرے معصوم لالہ اور میری گڑیا گل کا...... سنا تم نے بلقیس! حاکم خان تمہارے باپ نے فرسودہ روایات کی وجہ سے اپنے سگے خون کو مار ڈالا...... ان کا قاتل کوئی اور نہیں صرف تمہارا باپ ہے۔" غم و غصے سے میری آواز پھٹ چکی تھی اور بلقیس آنکھیں پھاڑے صدمے سے چور میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اسے یقین کرنے میں تامل ہوا ہوگا۔ لیکن وہ میری بات کو جھٹلا بھی نہیں سکتی تھی کیونکہ میں نے اس سے کبھی جھوٹ نہیں بولا تھا۔

"یہ...... یہ تم کیا کہہ رہے ہو سکندر؟...... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ بابا جان ایسا کیسے کر سکتے ہیں وہ تو ان سے بہت پیار کرتے تھے۔" وہ بے یقین تھی......!!

"جو حقیقت تھی وہ میں نے تمہیں بتا دی۔ مجھے اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ تم یقین کرو یا نہ کرو...... اب نکلو یہاں سے۔" یہ کہہ کر میں نے اسے دروازے سے باہر دھکیلا اور جھٹ دروازہ بند کر دیا۔

☆...☆...☆

لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ میری ساری باتیں سنی جا چکی ہیں۔ اسی رات مجھے بے ہوش کر کے تہہ خانے میں بند کر دیا گیا...... جس کا راستہ حاکم خان اور اس کے خاص ملازموں کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ مجھے دن رات کا کچھ پتہ نہیں تھا، بس کھانا آنے کی وجہ سے میں اندازہ لگا پاتا کہ اب صبح ہے یا رات...

دوسری رات حاکم خان بڑے کروفر کے ساتھ تہہ خانے میں آیا، رعونت اور تکبر اس کے چہرے سے

چھلک رہا تھا۔

"لڑکے! تجھے تمام باتوں کا پتہ چل گیا جو برا ہوا لیکن مجھے ہر غلط کو ٹھیک کرنا آتا ہے اس سے پہلے کہ تو مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش کرے، میں اس سے پہلے ہی تجھ جیسے سنپولئے کا سر کچل دوں گا تاکہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری، تعلیم تو ایک بہانہ تھا، میں تو تم تینوں کو ختم کرنا چاہتا تھا تاکہ تمہاری ڈھیروں جائیداد میرے حصے میں آسکے، وہ دونوں تو مارے گئے اور تیرا کانٹا بھی آج کل میں نکل جائے گا، توں ویسے بھی اب میرے لئے خطرناک ہو چکا ہے اور تجھے مارنے کے علاوہ میرے پاس کوئی چارہ نہیں...... ہاں ایک بات......

تیرا باپ میرا سگا بھائی نہیں تھا، تیرے دادا نے مجھے پالا ضرور تھا لیکن میں اس کی سگی اولاد نہیں، اب تجھے مارتے ہوئے مجھے ذرا بھی دکھ نہیں ہوگا کیونکہ میرا تم لوگوں سے کوئی خون کا رشتہ نہیں، کل مجھے شہر جانا ہے، پرسوں تجھے اس دنیا سے روانہ کردیا جائے گا......!" یہ کہہ کر وہ بڑے کروفر سے چلا گیا اور میں نے ضبط کی شدت میں تھوک دیا کیونکہ اب میں اسے اس قابل بھی نہیں سمجھتا تھا کہ اسے مخاطب بھی کروں۔

چلو اک حقیقت تو واضح ہوگئی کہ وہ ہمارا سگا چچا نہیں ورنہ مرتے وقت تک دل میں سگے رشتوں کے خلاف اک خلش سی رہتی، مجھے موت کا خوف نہیں تھا لیکن دکھ اس بات کا تھا کہ میں اپنا بدلہ نہیں لے پاؤں گا اور یہ ظالم یونہی دندناتا پھرے گا!

خیر میں نے اپنا معاملہ خدا پر چھوڑ دیا۔

میں نے آنکھیں موند لیں اور آنے والے وقت کے بارے میں سوچنے لگا، مجھے صرف دادی کی فکر تھی کہ وہ حقیقت سے بے خبر حاکم خان پر بھروسہ کئے بیٹھی تھیں اور حاکم خان سے کچھ بعید نہیں تھا کہ انہیں بھی راستے سے ہٹوا دیتا۔

یہ تیسری رات کا ذکر ہے، جب کسی کے جھنجھوڑنے سے میری آنکھ کھل گئی اور میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ بلقیس تھی حواس باختہ سی...... ڈری ڈری، میں نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

"سکندر...... خدا کے لئے فوراً اٹھو اور میرے ساتھ ابھی چلو ورنہ کوئی آجائے گا...... میں نے دادی کو سب باتیں بتادی ہیں، وہ بھی بہت غصے میں ہیں، پھر میں نے ملازموں کی باتیں سن لیں وہ صبح تمہیں ہر حال میں قتل کردیں گے۔ بابا جان کچھ ہی دیر میں گاؤں پہنچنے والے ہیں، پھر تمہارا نکلنا ناممکن ہو جائے گا۔ میں تمہیں مرتا نہیں دیکھ سکتی، اس لئے میں بھی تمہارے ساتھ جارہی ہوں، کیونکہ میں بھی اس جہنم کدے میں نہیں رہنا چاہتی.. سکندر تمہیں کسی صورت بھی بابا معاف نہیں کریں گے۔ اٹھو پلیز!"

"نہیں میں کہیں نہیں جاؤں گا کیا پتہ تم بھی اپنے باپ سے ملی ہوئی ہو اور مجھے قتل کروانے کا یہ نیا طریقہ ہو...؟" میں نے بے یقینی کی نظر سے اس کی طرف دیکھا تو احساس بے بسی سے اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔

"تم مجھے ایسا کیوں سمجھتے ہو سکندر...... میں حاکم خان کی بیٹی ضرور ہوں لیکن ان کے کسی بھی ظلم کو اچھا نہیں سمجھتی...... پلیز! مجھ پر اعتماد کرو۔"

"لیکن تم مجھے کیوں بچانا چاہتی ہو......؟"

"کیونکہ میں تم سے محبت کرتی ہوں...... تمہارے ساتھ ظلم ہوتا ہوا، اب نہیں دیکھ سکتی، تم بے شک مجھ سے نفرت کرو لیکن میں نے تمہیں چاہا ہے، بہتر سوچا ہے لیکن خدا جانے کیوں میرے جذبوں کی سچائی تم تک نہیں پہنچ پاتی... اب جلدی اٹھو! ورنہ بہت دیر ہو جائے گی۔" یہ کہہ کر اس نے بازو سے پکڑ کر مجھے اٹھایا، تو میں بھی حیران سا اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

"محبت......؟" ہاں محبت تو مجھے بھی بلقیس سے تھی، تبھی تو میرے غصے کی زد میں بھی وہی آئی اور میں نے اپنے جذبوں کو ہوا نہیں لگنے دی تھی لیکن اس نازک وقت میں بلقیس نے اظہار کرکے مجھے عجیب سے احساس سے دوچار کردیا تھا۔ اس کی محبت ایکدم میرے اندر عود کر آئی تھی اور میں اپنی کیفیت پر حیران تھا۔

وہ مجھے لے کر باہر نکل آئی۔ چوکیداری پر مامور آدمی سویا ہوا تھا، اس کے بقول نشے والی چائے پی کر بے ہوش تھا، ہم آسانی سے مرکزی گیٹ سے باہر نکل آئے۔ مجھے دادی جان کی فکر تھی کہ میں ان سے مل بھی نہیں سکا تھا۔ بلقیس نے تسلی دی تھی کہ دادی سب جانتی ہیں اور انہیں میری سلامتی عزیز ہے۔ باہر آ کر میں رک گیا، اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"تم واپس چلی جاؤ، پر بلقیس، تمہارا میرے ساتھ جانا بہت بڑے نقصان کا سبب بنے گا۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہیں کسی قسم کا نقصان پہنچے۔" وہ بے یقینی سے میری طرف دیکھ رہی تھی، بعد میں دکھ کی لہر اس کے چہرے پر چھا گئی۔

"سکندر خدا کے لئے مجھے چھوڑ کے مت جاؤ، میں تمہارے بنا نہیں رہ پاؤں گی، پلیز! مجھے ساتھ لے چلو۔" اس نے میرے ساتھ چلنے کی ضد کرتے ہوئے کہا۔

"خدا کے لئے بلقیس مان جاؤ...... میں تمہیں کسی صورت بھی نہیں لے جا سکتا، میں مزید کسی اور پریشانی کا متحمل نہیں ہو سکتا، مجھے خود اپنی منزل کا پتہ نہیں، پھر میں تمہیں کہاں لے جاؤں گا۔"

"اتنے میں کسی گاڑی کی آواز آئی اور دور سے چمکتی ہیڈ لائٹس دیکھ کر بلقیس خوف زدہ ہو گئی۔" بابا جان آ گئے سکندر...... خدا کے لئے بھاگ جاؤ۔ جلدی کرو۔" اس نے مجھے ایک طرف دھکیلا تو میں نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ خدا جانے میرے ذہن میں کیا آئی کہ میں نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے کر اس کے ماتھے کا بوسہ لیا، الوداعی بوسہ...... وہ ساکت رہ گئی، میں اک گہری مسرت بھری نظر اس پر ڈالتا ہوا ایک جانب بھاگ کھڑا ہوا۔ نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اب شاید میں بلقیس سے کبھی نہ مل پاؤں گا......

گاڑی حویلی کے قریب آ چکی تھی، میں درختوں کے جھنڈ میں کھڑا دیکھ رہا تھا۔ بلقیس بھی حویلی کے اندر جا چکی تھی۔ مجھے اسی کی طرف سے پریشانی تھی کہ نہ جانے اس کے ساتھ کیا سلوک ہو، چچا کو وہ بہت پیاری تھی لیکن مجھے فرار کرانے کی سزا تو اسے لازمی ملتی، اور میرے فرار ہونے کی ساری حقیقت چند لمحوں میں کھل جاتی۔

میں ادھر کھڑے ہو کے وقت ضائع نہیں کر سکتا تھا۔ میں یوں بے بسی کی موت نہیں مرنا چاہتا تھا۔ اپنے بے گناہ بہن بھائی کی موت کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔

میں درختوں کے جھنڈ میں آگے بھاگتا چلا جا رہا تھا، کچھ دور ہی پہاڑوں کا سلسلہ شروع ہونے والا تھا جس کے بعد ایک گاؤں تھا جس میں زیادہ تر ہندو آباد تھے اسے کراس کرنے کے بعد بڑی سڑک پر مجھے کسی سے بھی لفٹ مل سکتی تھی اور میں با آسانی شہر پہنچ سکتا تھا۔

شہر میں میرا دوست اکبر جو کہ مجھے بہت عزیز تھا وہ بھی مجھے بہت چاہتا تھا، میرے بینک کا چیک بک اور میرا پاسپورٹ وغیرہ اس کے پاس ہی رہتے تھے، یہ تمام اہم چیزیں میں ہوسٹل میں نہیں رکھتا تھا، میرے اکاؤنٹ میں بہت بڑی رقم موجود تھی۔

میں درختوں کے جھنڈ میں بھاگتا جا رہا تھا، میرے کان ہر لحہ پیچھے آنے والی متوقع آہٹوں پر لگے ہوئے تھے لیکن ابھی تک ایسی کوئی آہٹ مجھے سنائی نہیں دی تھی۔ درختوں کے درمیان بھاگتے بھاگتے اچانک میرے قدم ٹھٹک کے رک گئے۔ درخت کے اوپر سے کوئی نرم سی چیز میرے کندھے پر آ کے گری، میں نے دہشت زدہ ہو کر اپنے ہاتھ سے اسے نیچے پھینکا اور یہ جان کر میری سانس رک سی گئی کہ وہ نرم سی چیز کچھ اور نہیں ایک خطرناک سانپ تھا، جس کی پھنکار اب میرے کانوں میں واضح آ رہی تھی، وہ مجھ سے کچھ دور ہی گرا تھا اور اب اس کی غصے سے بھری پھنکار میرے رونگٹے کھڑے کر رہی تھی اور اگر میں ایک لحہ بھی ادھر ٹھہرتا تو وہ مجھے ڈسنے میں دیر نہ کرتا، میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، سرپٹ دوڑ پڑا، میں درختوں کے جھنڈ سے جلد از جلد نکلنا چاہتا تھا، مجھے خطرہ تھا کہ پھر کوئی سانپ مجھے بے خبری میں ڈس نہ لے۔

اللہ اللہ کر کے درختوں کے جھنڈ ختم ہوئے اور میں نے کھلے میدان میں آ کے سکون کی سانس لی۔ لیکن

کہاں۔ ابھی مجھے وہاں رکے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ دور سے مجھے ہلکا سا شور سنائی دیا جو بتدریج نزدیک آتا جارہا تھا۔ میرا دل زور سے دھڑکا..... یہ یقیناً چچا کے لوگ ہوں گے جو مجھے تلاش کرتے آرہے ہوں گے۔ میرا وہاں کھڑا رہنا خطرے سے خالی نہیں تھا، میں قریبی پہاڑیوں کی طرف دوڑا تاکہ انہیں پار کرکے قریبی بستی میں پہنچ جاؤں۔ ہوسکتا تھا وہاں مجھے کوئی جائے پناہ مل جاتی یا پھر شہر جانے والی سڑک پر مجھے لفٹ مل جاتی تو میرا کام مزید آسان ہوجاتا، میں دوڑتا رہا، دوڑتا رہا، بڑی جدوجہد سے میں نے پہاڑی سلسلہ عبور کیا۔ لوگوں کا شور مجھے اب سنائی نہیں دے رہا تھا۔ میں تیزی سے چلتا ہوا ہندوؤں کی بستی میں داخل ہوگیا۔

ساری بستی خواب خرگوش کے مزے لے رہی تھی۔ ایسے میں مجھے بڑی سڑک پر جانے کا خیال آیا کہ اگر مجھے لفٹ مل گئی تو پھر چچا کے گرگے میرا کچھ نہیں بگاڑ پاتے۔ یہ سوچ مجھے بڑی تیزی سے سڑک کی طرف لے جارہی تھی، مگر کئی گھنٹے انتظار کے باوجود بھی کسی گاڑی کے آثار نظر نہ آئے تو میں بددل سا دوبارہ بستی کی طرف آگیا۔ سڑک پر مجھے یہ بھی خوف تھا کہ کوئی مجھے دیکھ نہ لے بستی میں رات کسی طرح گزارنی ہی تھی، دھڑکتے دل کے ساتھ میں نے ایک گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ تھوڑی دیر بعد کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی اور پھر دروازہ کھل گیا۔ ”کون ہے رے..... اس سمے کا کام پڑ گیا؟“ وہ آدمی سر سے پیر تک مجھے گھورتے ہوئے بولا۔

”جناب میں مسافر ہوں، راستہ بھٹک گیا ہوں، مہربانی کرکے کیا آپ مجھے رات یہاں گزارنے کی اجازت دیں گے۔“ میں نے شائستہ لب و لہجے میں اس سے اپنا مدعا بیان کیا، اگر سچ بتادیتا تو ہوسکتا ہے وہ مجھے گھر میں گھسنے بھی نہ دیتا، تھوڑی دیر تک وہ گہری نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا، نظروں ہی نظروں میں جیسے میرے سچ جھوٹ کو ناپ رہا ہو، پھر اس نے مزید کوئی سوال نہیں کیا اور مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔

اس کے گھر میں مجھے کوئی اور نظر نہ آیا، اس نے ایک چارپائی کی طرف اشارہ کیا اور مجھے وہاں سونے کو کہا، میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور چارپائی پر لیٹ گیا، وہ بھی مجھ سے کچھ فاصلے پر رکھی اپنی چارپائی پر دراز ہوگیا۔ میرے ذہن میں جھکڑ چل رہے تھے، ان گنت سوالات اور سوچیں مجھے الجھائے دے رہی تھیں، لیکن کب تک.....؟ آخرکار نیند نے مجھے جکڑ لیا اور میں ہر قسم کے تفکر سے آزاد ہوگیا۔

صبح دم میری آنکھ کھل گئی، میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ رات کے سارے واقعات میرے ذہن میں تازہ ہوگئے، میں جلدی سے چارپائی سے اترا تاکہ جلد از جلد یہاں سے روانہ ہوسکوں، لیکن اتنے میں وہ آدمی اندر سے نکلا، اس کے ہاتھ میں ناشتے کے برتن تھے جو اس نے لاکر میرے سامنے رکھ دیئے۔ میں نے تشکر بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور منہ ہاتھ دھونے کے بعد ناشتہ شروع کردیا۔ اس کے بعد اس آدمی کا شکریہ ادا کرنے کے بعد وہاں سے نکل پڑا۔ ساری بستی پر ابھی تک خاموشی سی چھائی ہوئی تھی، لوگ ابھی تک بیدار نہیں ہوئے تھے، میں تیزی سے چلتا ہوا بڑی سڑک کی طرف آگیا۔

سڑک سنسان تھی، کسی گاڑی کے کوئی آثار نہیں تھے، میں مضطرب سا آس پاس دیکھ رہا تھا، مجھے ہر پل یہی خطرہ تھا کہ کہیں میرے چچا کے بھیجے ہوئے غنڈے مجھے ادھر آنہ لیں میں ایک ایسی جگہ چھپ کر بیٹھ گیا، جہاں سے میں دور سے آتی ہوئی گاڑی کو دیکھ سکتا تھا اور بروقت لفٹ بھی لے سکتا تھا، اس کے ساتھ ہی میں اپنے رشتوں پر نظر رکھنے کے علاوہ ان سے پوشیدہ بھی رہ سکتا تھا۔ بہت سا وقت بیت گیا، یہاں تک کہ دن ڈھلنے لگا میری پریشانی حد سے سوا ہوگئی، یہ کیسے ممکن تھا کہ سارا دن ایک گاڑی بھی نہ گزرتی۔ ”شاید خدا بھی مجھے یہاں سے نکالنا نہیں چاہتا.....؟“ میں نے دل میں سوچا اور آہستہ آہستہ پھیلتے اندھیرے کو بھی دیکھا اور پھر ان جھاڑیوں میں سے نکل آیا۔ رات کے اندھیرے میں زہریلے کیڑے مکوڑوں کی وجہ سے وہ جھاڑیاں خطرناک بھی

ہو سکتی تھیں۔

میرا رخ پھر اسی گاؤں کی طرف تھا، ابھی میں گاؤں میں داخل بھی نہیں ہونے پایا تھا کہ مجھے کچھ عجیب سا احساس ہوا، میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو میری آنکھیں خوف سے پھیل گئیں، وہ پانچ چھ لوگ تھے جو نہ جانے کب دبے قدم میرے قریب پہنچنے والے تھے، مجھے کچھ سمجھ نہیں آئی کہ میں اس وقت کیا کروں؟

بہرحال اتنی آسانی سے تو میں بھی ان کے ہاتھ لگنا نہیں چاہتا تھا، اس لئے میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، وہاں سے دوڑ لگا دی، مجھے دوڑتے دیکھ کر وہ لوگ بھی شور مچاتے ہوئے میرے پیچھے بھاگنے لگے، ان کے ہاتھ میں اسلحہ بھی تھا لیکن وہ انہوں نے مجھ پر چلانے کی کوشش نہیں کی یقیناً انہیں حکم نہیں ہوگا کہ وہ مجھ پر گولی چلائیں۔

میں بھاگ کر گاؤں میں داخل ہوگیا، گلی میں بھاگتے مجھے کافی دیر ہوگئی، میری رفتار کافی تیز تھی، اس لئے میں ان لوگوں سے کافی آگے نکل آیا، پھر ایک جگہ مجھے لگا جیسے میں ان کے ہتھے چڑھ جاؤں گا، تو میں نے ایک غیر آباد مکان کے ٹوٹے ہوئے دروازے کے پیچھے پناہ لے لی۔ وہاں میرے دیکھے جانے کے بہت امکان تھے لیکن جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے کے مصداق وہ اس جگہ سے آگے بھاگتے ہوئے گزر گئے، میں نے اللہ کا شکر ادا کیا اور جلدی سے وہاں سے نکل کر ان کے مخالف سمت میں دوڑ لگا دی۔ اندھیرا بدستور قائم تھا۔ لیکن چاند کی چاندنی نے اس کی شدت کو کم کر دیا تھا اس لئے بھاگنے میں کوئی دشواری نہیں ہو رہی تھی۔ بلکہ تھکن کا احساس بڑھتا جا رہا تھا، مجھ میں مزید بھاگنے کی ہمت نہیں تھی، اس لئے میں آر پار کا سوچ کر بے دھڑک ایک گھر میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا۔ صحن میں کوئی بھی نظر نہیں آ رہا تھا، ہاں سیڑھیاں چھت پر جاتی نظر آ رہی تھیں، میں جلدی سے ان سیڑھیوں پر چڑھ گیا، اور چھت پر پہنچ کر آس پاس نگاہ دوڑائی اور تو کوئی جگہ نہیں تھی، ہاں سیمنٹ سے بنی ہوئی پانی کی ٹنکی تھی۔

میں جلدی سے اس کی طرف بڑھا اور یہ دیکھ کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی کہ وہ خشک تھی اور بڑی بھی کہ میں آسانی سے اس میں چھپ سکتا تھا میں ہر حال میں چھپنا چاہتا تھا اگر اس میں پانی بھی ہوتا تب بھی میں اس میں ضرور چھپتا۔ ویسے بھی سردیوں کا موسم نہیں تھا کہ میں پانی میں جاتے ہوئے ڈرتا، ٹنکی پر موجود ڈھکن بھی سیمنٹ سے بنا ہوا تھا جو اٹھایا اور رکھا جا سکتا تھا۔

میں جلدی سے ٹنکی میں داخل ہوگیا اور آنے والی آہٹوں پر کان لگا دیئے، تھوڑی دیر تو خاموشی رہی، پھر بھاگتے قدموں اور کسی کے تیز تیز بولنے کی آواز آنے لگی، میرا دل سہم گیا، میں مزید سکڑ کر بیٹھ گیا، تھوڑی دیر آوازیں آتی رہیں، پھر خاموشی چھا گئی، جب بہت دیر بعد بھی کوئی آواز نہ آئی تو میں آرام سے پھیل کر بیٹھ گیا اور نہ جانے کب نیند کی وادی میں اتر گیا ؟؟

☆ ☆ ☆

صبح ہی صبح میں جاگ گیا لیکن ابھی ٹنکی سے باہر نکلنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ ایک بچی نے اوپر سے ٹنکی میں جھانکا، اس کی آنکھوں میں شرارت صاف نظر آ رہی تھی۔

''انکل اب باہر آ جائیں ناشتہ تیار ہے اور یقیناً آپ کو بھوک بھی لگی ہوگی؟'' اس پیاری سی بچی کی آواز میرے کانوں میں پڑی تو میں جلدی سے ٹنکی میں سے باہر نکل آیا۔ میں حیران تھا کہ وہ مجھے یوں اپنے گھر میں چھپا دیکھ کر حیران ہونے اور ڈرنے کے بجائے حیران کر رہی تھی، میں بولنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اس نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور چھت سے نیچے اترنے کا کہا تو میں خاموشی سے نیچے اتر آیا۔

گھر میں سوائے اس بچی اور اس کی ماں کے کوئی بھی موجود نہیں تھا، اس کی ماں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر نمستے کہا اور رسوئی میں چلنے کا کہا، میں نے منہ ہاتھ دھویا اور رسوئی کی طرف بڑھ گیا، چٹائی پر سادہ سا ناشتہ موجود تھا لیکن مجھے وہ بھی غنیمت محسوس ہو رہا تھا، میں نے خوب ڈٹ کر ناشتہ کیا اور ان کا شکریہ ادا کیا۔

میرے اندر بہت سے سوالات تھے، جن کے

جواب انہی سے مل سکتے تھے۔ اس عورت جس کا نام لکشمی اور بچی کا نام پوجا تھا، انہیں بھی میرے اندر اٹھتے سوالات کا پتہ تھا اس لئے جب میں نے ناشتہ ختم کرلیا تو لکشمی بولی۔ ”جب رات کو آپ ہمارے گھر میں اچانک داخل ہوئے تو ہم نے آپ کو اسی وقت دیکھ لیا تھا پہلے تو ہم ڈر گئیں لیکن جب آپ سیدھا اوپر چلے گئے تو ہمیں لگا جیسے آپ کسی بڑی مصیبت میں ہیں اور پناہ چاہتے ہیں۔ اس لئے ہم نے آپ کو کچھ نہیں کہا، ہمیں یہ بھی ڈر تھا کہ اگر رات کو کوئی آجاتا تو آپ کو ہمارے گھر میں دیکھ کر پتہ نہیں کیا کیا باتیں بناتا۔ اب آپ اگر مناسب سمجھیں تو اپنے بارے میں بتادیں۔“ اور میں نے بھی انہیں سب کچھ شروع سے لے کر اب تک جو بھی حالات پیش آئے تھے انہیں بتادیے۔ وہ میری باتیں سن کر دکھی ہوگئیں پھر کوئی خیال آنے پر جلدی سے بولی۔ ”بھیا آپ کا یہاں زیادہ دیر رکنا خطرناک ہوسکتا ہے، وہ لوگ کسی بھی وقت آپ کو ڈھونڈتے ہوئے یہاں آسکتے ہیں، اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ وہ لوگ اب بھی گاؤں میں ہی موجود ہوں گے، کیونکہ انہوں نے آپ کو اسی گاؤں میں داخل ہوتے دیکھا ہے، وہ ہر حال میں آپ کو ڈھونڈیں گے اور ایک ایک گھر کی تلاشی لیں گے......“

وہ بالکل ٹھیک کہہ رہی تھی، میں بہت پریشان ہوگیا تو اس نے مجھے دلاسہ دیا اور کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولی...... ”ایک منصوبہ ہے میرے ذہن میں...... اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو......“ پھر اس نے سارا منصوبہ مجھے سمجھایا اور مجھے اس کا پلان بہت اچھا اور جامع لگا کیونکہ اس کے علاوہ میرے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔

مجھے ایک ہندو سادھو کا روپ دھارنا تھا اور اس علاقے سے نکلنے کی کوشش کرنا تھی، ورنہ مجھے کسی حال میں بھی گاؤں سے نکلنے نہ دیا جاتا۔ میں نے فوراً ہامی بھرلی، لکشمی مجھے کمرے میں لے گئی اور مطلوبہ چیزیں میرے حوالے کرنے کے بعد کمرے سے نکل گئی، میں نے سادھو کا لباس پہنا اور اسے آواز دی، وہ اندر آگئی اس نے مزید تیاری میں میری مدد کی اور جب میں نے خود کو آئینے میں دیکھا تو حیران رہ گیا، میں خود کو بھی نہ پہچان پایا۔ میں نے لکشمی کا شکریہ ادا کیا اور باہر جانے کے لئے قدم بڑھادیے۔

میرا ارادہ تھا کہ اگر مجھے گاڑی وغیرہ نہ ملی تب بھی میں پیدل چلوں گا اور کسی نہ کسی طرح شہر پہنچنے کی کوشش کروں گا، ابھی میں گلی میں کچھ آگے ہی گیا تھا کہ بہت سے آدمی گاؤں میں داخل ہوئے انہیں دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ وہ سب میری تلاش میں آئے تھے، کچھ لوگ میری طرف بھی آئے، میرا دل زور سے دھڑکا لیکن میں ”رام رام“ بولتا چلتا رہا۔ میرے قریب پہنچ کر انہوں نے سر سے پاؤں تک مجھے گھورا۔ اور اچھی طرح ٹٹولنے کے بعد انہوں نے مجھ سے میرے ہی بارے میں پوچھا، تو میں نے ان سوال کو لاتعلق ظاہر کیا اور رام نام جپتا آگے بڑھنے لگا۔ وہ غصے کے مارے ایک طرف بڑھ گئے۔

جب وہ نظروں سے اوجھل ہوگئے تو میرے قدموں کی رفتار میں تیزی آگئی، اور میں جلدی سے گاؤں سے باہر نکل آیا۔

سڑک پر پہنچ کر خوش قسمتی سے مجھے ایک ٹرک مل گیا، جس نے مجھے شہر تک لفٹ دے دی۔ شہر پہنچ کر میں نے سب سے پہلے اپنا حلیہ درست کیا اور ہوسٹل پہنچ گیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ لوگ مجھے تلاش کرتے ہوئے ہوسٹل کا ہی رخ کریں گے اس لئے میں نے وہاں سے ضروری کاغذات اور چیزیں لیں اور دوست کے پاس چلا گیا۔ دوست نے میری بہت مدد کی، کچھ دن میں روپوش رہا، اس کے بعد میں اگلے منصوبے پر عمل پیرا ہوگیا۔ یعنی میں اپنے وطن سے بہت دور چلا گیا۔

☆......☆......☆

میں آج پورے پانچ سال بعد اپنی سرزمین پر قدم رکھ رہا تھا، میں خوش بھی تھا اور دکھی بھی...... انتقام کی آگ میرے اندر اول روز ہی کی طرح بھڑک رہی تھی۔ اپنے معصوم و بے قصور بہن بھائی کے چہرے مجھے اک پل بھی چین نہ لینے دیتے تھے۔ میں فوری طور پر گاؤں کی طرف روانہ ہوا، میرے پاس اپنی حفاظت کا مکمل سامان

تھا۔ دوسرا یہ کہ مجھے اب ظالم چچا سے کسی بھی قسم کا خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ آج سے پانچ سال پہلے اس طرح گاؤں چھوڑنے پر مجھے شرمندگی محسوس ہوئی، لیکن اس وقت وہ سب ضروری تھا۔

میری گاڑی گاؤں کی حدود میں داخل ہو چکی تھی، جانے پہچانے منظر میری آنکھوں کو بار بار دھندلا رہے تھے۔ گاؤں میں گو کہ میں نے کم وقت گزارا تھا لیکن جتنا بھی گزارا تھا مجھے آبدیدہ کرنے کو کافی تھا۔ میں نے گاڑی حویلی کے گیٹ کے آگے روک دی۔ حیرت انگیز طور پر مجھے ہر طرف خاموشی اور سکون نظر آیا۔ گیٹ پر کوئی مسلح پہرے دار بھی نظر نہ آیا۔ بلکہ میری گاڑی رکتے ہی چوکیدار نے گیٹ کھول دیا اور پھر مجھے گاڑی میں بیٹھا دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرانی سے پھٹنے کے قریب ہو گئیں۔ پھر اس کی آنکھوں میں مجھے خوشی کی جھلک نظر آئی۔ میں اسے نظر انداز کرتا گاڑی اندر لے آیا، پھر جس نے بھی مجھے دیکھا حیرانی اور خوشی سے معمور ہو گیا۔ گاڑی سے اترا تو سب مجھ سے ملنے کے لئے آگے بڑھے، میں سپاٹ سا انداز لئے اندر بڑھ گیا، نہ جانے کیسے بلقیس کو خبر ہو گئی تو وہ بھاگتی ہوئی آئی اور روتے ہوئے مجھ سے لپٹ گئی۔ رونا تو مجھے بھی آ رہا تھا لیکن میں خاموش کھڑا رہا، بڑی مشکل سے اسے خود سے الگ کیا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔

”بابا جان چلے گئے سکندر...... دادی بھی چلی گئیں...... میں اکیلی نوکروں کے سہارے...... کتنا انتظار کیا تمہارا...... پلٹ کر خبر بھی نہ لی تم نے......“ وہ روتے ہوئے بے ربط سا بول رہی تھی لیکن چچا کے مرنے کی خبر نے مجھے چونکا دیا۔

”کیسے مر گئے......؟“ میں نے بے تابی سے پوچھا۔

وہ روتے ہوئے بولی......”جس رات میں نے تمہیں بھگایا تھا اس رات بابا کو پتہ چل گیا تو انہوں نے مجھے بہت مارا پھر دادی نے مجھے بچایا، انہوں نے تمہیں بہت تلاش کیا لیکن خدا جانے تم کہاں چلے گئے تھے، اور یہ بھی اچھا ہی ہوا ورنہ وہ تمہیں زندہ نہ چھوڑتے، آج سے دو سال پہلے انہیں فالج ہوا اور اسی دوران ان کی وفات ہو گئی۔ دادی تو بہت پہلے اس دنیا کو چھوڑ چکی تھیں۔ میں بہت اکیلی ہو گئی تھی، گاؤں کے لوگ بہت اچھے ہیں۔ سب نے میرا بہت ساتھ دیا لیکن مجھے تمہارا انتظار تھا، کتنی دعائیں مانگیں میں نے تمہارے لوٹنے کی بہت سے ہاتھ بڑھے مجھے تھامنے کو لیکن مجھے صرف تمہارا انتظار تھا۔ مجھے یقین تھا کہ تم لوٹ کر ضرور آؤ گے، میرے لئے نہ سہی اپنے انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لئے آؤ گے، دیکھو میری دعائیں رنگ لائیں “ وہ مسلسل رو رہی تھی۔

اور میں اللہ تعالیٰ کی اس کارگزاری پر حیران تھا جس نے میرے ہاتھ اپنے چچا کے خون سے رنگنے کے بجائے میرا انتقام خود لے لیا، وہ دولت جس کے لئے یہ سب کچھ چچا نے کیا، وہ یہیں رہ گئی۔

قبر میں تو صرف اپنے اعمال ہی جاتے ہیں۔ ہم دنیا میں عیش و عشرت، دولت جائیداد اور نفسانی خواہشات کے پیچھے بھاگتے بھاگتے تھک جاتے ہیں لیکن آخر میں انسان کو پتہ چلتا ہے کہ اس نے جس قدر رنگ، وہ اور خون خرابہ کیا وہ سب تو سراب تھا، اصل منزل تو دو گز زمین ہی ہے اور اصل سفر تو دنیا سے جانے کے بعد شروع ہوتا ہے، زادِ راہ کے طور پر اچھے اعمال جتنے زیادہ ہوں گے یہ لمبا سفر اتنی ہی آسانی سے کٹے گا۔

میں نے اس حقیقت کو بہت جلد پا لیا تھا اور اب میں بلقیس کے سنگ ایک نئی زندگی شروع کروں گا۔ دولت کا لالچ نہ پہلے تھا، نہ اب ہے حالانکہ اب سب کچھ میرے پاس میرے بس میں ہے...... بلکہ گاؤں والوں کے لئے میں وہ سب کچھ کروں گا جو چچا جان کی زندگی میں نہ ہو سکا کیونکہ غریب لوگوں کی دعائیں میرا مقصد اور ان کے چہرے پر بھی مسکراہٹ دیکھنا میرے خواب کی تعبیر ہے۔

سزاوار

شائستہ سحر۔راولپنڈی

کھلے میدان میں اچانک بے شمار خونخوار کتے نمودار ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے نوجوان کو چاروں طرف سے گھیرلیا، نوجوان بے بسی سے چیخنے لگا کہ پھر وہ کتے غراتے ہوئے نوجوان پر جھپٹ کر اس کا تکہ بوٹی کردیا۔

خلق خدا کی باتوں کو جو لوگ جھٹلاتے ہیں، انہی لوگوں کو لے رونگٹے کھڑے کرتی کہانی

''**جیمس** میں سخت پریشان ہوں، وہ منحوس کتا ہر روز میرے دروازے کے سامنے کھڑا ہو کر بھونکنے لگتا ہے، دل تو چاہتا ہے کہ اس کا خون کردوں۔'' چارلس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

''اتنا غصہ اچھا نہیں، اور وہ بھی ایک کتے کی وجہ سے۔'' میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''یار بات اس کے جانور ہونے کی نہیں، تمہیں کیا بتاؤں اس خبیث جانور نے مجھے کس قدر تنگ کرکے رکھ دیا ہے، ہر بار میرے گھر کے اندر گھسنے کی کوشش میں رہتا ہے، میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اس کا اس گھر سے کیا تعلق ہے؟''

میں کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ''کیا یہ مناسب نہیں کہ تم گھر ہی تبدیل کرلو؟'' چارلس نے میرے اس مشورے پر نہایت ناگواری سے مجھے گھورا۔

"تمہارے منہ سے کبھی کوئی اچھی بات نکل ہی نہیں سکتی، ہمیشہ الٹے مشورے دیتے ہو، اب میں ایک حقیر جانور کی وجہ سے اتنا اچھا گھر چھوڑ دوں، تم کچھ کر نہیں سکتے تو بہتر ہے کہ اپنا منہ بند رکھو۔"

میں سمجھ سکتا تھا کہ چارلس اس وقت غصے میں تھا، اس لئے میں نے سر کھجاتے ہوئے خاموشی اختیار کرلی۔

میں یعنی جیمس اور چارلس بہت گہرے دوست تھے کچھ ہی روز پہلے چارلس نے وہ گھر کرائے پر لیا تھا مگر اس کتے نے چارلس کو سخت پریشان کردیا تھا۔

اگلے روز میں چارلس کے ساتھ اس گھر کی مالکن مس ہیلن کے پاس پہنچ گئے، مس ہیلن پچاس سالہ عمر رسیدہ عورت تھی، جو ایک چھوٹے سے فلیٹ میں تنہا زندگی بسر کررہی تھی، جب میں اور چارلس اس کے فلیٹ میں پہنچے تو وہ ہمیں دیکھ کر یوں مسکرائی جیسے اسے پہلے ہی ہماری آمد کی توقع ہو۔

"تو آخر کار آپ بھی اس کتے کی وجہ سے تنگ ہوکر یہاں آہی گئے۔" مس ہیلن ہمیں دیکھتے ہی بولی۔

چارلس قدرے حیرت سے بولا۔ "یعنی آپ سب کچھ پہلے سے جانتی تھیں؟"

مس ہیلن اثبات میں سر ہلا کر بولی۔ "بالکل کیونکہ میں خود بھی اس گھر میں کچھ عرصہ پہلے رہ چکی ہوں اور مجھے بھی یہ مسئلہ درپیش تھا اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میں نے آپ کو یہ بات سمجھانے کی کوشش بھی کی تھی کہ گھر کے پاس اکثر ایک کتا بھونکتا رہتا ہے، کہیں آپ تنگ نہ ہوں، اس کی وجہ سے۔"

"ہاں شاید آپ نے سرسری انداز میں بات کی، تب میں نے دھیان نہیں دیا تھا، اب جاکر مجھے احساس ہورہا ہے کہ وہ کتا انتہائی خبیث جانور ہے، دن رات بھونک بھونک کر میرا دماغ کھا جاتا ہے۔"

چارلس نے بے چارگی کے عالم میں میری طرف دیکھا تو میں بھی گویا ہوا۔ "کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ اس گھر سے اس کتے کا کیا تعلق ہے؟"

مس ہیلن میرے اس سوال پر قدرے مضطرب ہوگئی اور کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ "بڑا عجیب بندہ تھا وہ بھی، آج سے دس سال پہلے شاید اس نے یہ مکان کرائے پر لیا تھا، یہ کتا بھی اس کے ساتھ تھا، آس پڑوس سے سننے میں یہی آیا تھا کہ وہ شخص گھر سے بہت کم باہر نکلتا تھا زیادہ تر گھر میں ہی بند رہتا تھا۔

اچانک وہ شخص لاپتہ ہوگیا یہ کتا اس سے بہت مانوس تھا اس لئے شاید آج بھی یہ اسے ہی اس گھر میں تلاش کرتا پھرتا ہے۔

"اچھا تو یہ وجہ ہے وہ کتا اس گھر کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔" چارلس گہری سوچ میں بولا۔

"جی بالکل ......" مس ہیلن نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

"میرے خیال میں اب ہمیں چلنا چاہئے۔" میں اٹھتے ہوئے بولا جواباً چارلس بھی اٹھ کر کھڑا ہوگیا، مس ہیلن انتہائی پراسرار انداز میں بولی۔

"میرا مشورہ ہے مسٹر چارلس آپ اس کتے کو ہرگز مت چھیڑیں، یہی آپ کے لئے بہتر ہوگا اگر آپ کو زیادہ مسئلہ ہے تو بے شک آپ مکان تبدیل کرسکتے ہیں۔" چارلس بنا کوئی جواب دیئے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

میں اور چارلس وہاں سے واپسی پر بالکل خاموش رہے، میں نہیں جانتا تھا چارلس کے دماغ میں کیا کھچڑی پک رہی تھی، مگر جب میں چارلس کے گھر میں پہنچا تو اس کی آنکھیں کسی خیال کے تحت فوراً چمک اٹھیں، میں حیرانگی سے اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگا، حالانکہ میں سمجھ چکا تھا وہ اس کتے سے جان چھڑانے کا کوئی خطرناک منصوبہ بنا چکا ہوگا۔

اور واقعی ایسا ہی ہوا چارلس نے اپنا منصوبہ بتاتے ہوئے کہا۔ "میں آج ہی اس کتے کا قصہ ختم کردوں گا، پتہ نہیں مجھ بے وقوف کے دماغ میں یہ خیال پہلے کیوں نہیں آیا۔"

"کیا خیال؟" میں نے بظاہر بے زاری سے پوچھا۔

چارلس بڑے مزے سے بتاتے ہوئے بولا۔

"آج رات ہی اس کتے کو ماردوں گا میرے پاس کیڑوں اور چوہوں کو مارنے والا زہر موجود ہے، اور فریج میں گوشت بھی پڑا ہے۔ وہی زہر اس گوشت پر لگا کر باہر گوشت ڈال دوں گا، پھر دیکھنا اس خبیث کتے سے کیسے جان چھوٹ جائے گی۔"

میں ناگواری سے اسے ٹوکتے ہوئے بولا۔ "تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے تمہیں پتہ ہے مس ہیلن نے بھی تمہیں اس کتے کو چھیڑنے سے منع کیا ہے پھر؟"

چارلس تلخی سے بولا۔ "میں کچھ نہیں جانتا، میں آج رات اس کتے کو ختم کرکے رہوں گا۔ میں کافی دیر چارلس سے اس موضوع پر بحث کرتا رہا مگر چارلس پر کچھ اثر نہ ہوا، آخر تنگ آکر میں وہاں سے اٹھ گیا اور اپنے فلیٹ میں آگیا۔

صبح چارلس نے مجھے کال کرکے اپنی طرف بلایا، میں اس کی طرف پہنچا تو چارلس کے گھر کے دروازے کے باہر میں اس بھاری بھرکم سیاہ کتے کی لاش دیکھ کر چونک کررہ گیا۔ اس کے پاس ہی ایک برتن پڑا تھا، جس میں گوشت کے بچے ہوئے چند ٹکڑے موجود تھے، اس کتے کے منہ سے جھاگ بہہ کر اس کے منہ اور زمین پر جم چکی تھی۔ مجھے اندازہ ہوچکا تھا کہ چارلس نے اپنا کام دکھا چکا تھا، چارلس ایک بوری لے کر باہر نکلا۔ "یہ سب کیا ہے چارلس؟" میں نے سوالیہ انداز میں اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"وہی جو تم دیکھ رہے ہو۔" چارلس نے انتہائی لاپرواہی سے کہا۔ اور اس کتے کے مردہ وجود کی طرف بڑھ گیا۔ "تم نے آخرکار اس کتے کو ماردیا مگر تم نے سراسر یہ غلط کیا ہے۔" میں نے افسوس ناک لہجے میں کہا۔

"کیوں غلط ہے؟" چارلس تمسخرانہ نگاہوں سے مجھے گھورتے ہوئے بولا۔

"تم کو اندازہ نہیں ہے، میں ڈر رہا ہوں اس طرح تمہیں نقصان بھی پہنچ سکتا ہے۔" میں نے اپنے دل میں آنے والے اندیشے کو بیان کرتے ہوئے بولا۔

"یہ..... یہ..... مردہ حقیر کتا مجھے نقصان پہنچائے گا۔" چارلس نے اس مردہ کتے کی طرف حیرت سے اشارہ کرتے ہوئے کہا اور انتہائی حقارت سے اس کتے کے مردہ وجود کو ٹھوکر ماری۔

"تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے، اس معصوم جانور کے ساتھ اس قدر برا سلوک کیوں کررہے ہو؟" میں جھنجلاتے ہوئے کہا۔

چارلس لاپرواہی سے اس کتے کے مردہ وجود کو بوری میں دھکیلتے ہوئے بولا۔ "تم تو یوں غصہ کررہے ہو جیسے میں نے تمہارے کسی رشتے دار کو قتل کردیا ہو۔" چارلس نے ہنستے ہوئے میری طرف دیکھا۔

"بکواس بند کرو اب اس کے ساتھ کیا کرنے لگے ہو تم؟" میں نے سنجیدگی سے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"بس تم دیکھتے جاؤ۔" چارلس نے مجھے آنکھ ماری اور اس کتے کی بوری بند لاش کو گھسیٹتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

نجانے اب وہ کیا کرنے والا تھا، میں دل ہی دل میں پیچ وتاب کھاتا ہوا اس کے پیچھے چل دیا۔ چارلس اس بوری کو لے کر ایک بلند چٹان کے آخری کونے پر آن کھڑا ہوا اور اس بوری کو جیسے ہی اس چٹان سے نیچے پھینکنے لگا تو میری برداشت ختم ہوگئی، میں اسے ٹوکتے ہوئے احتجاجاً بولا۔

"یہ تم غلط کررہے ہو، تم پہلے ہی اس معصوم جانور کے ساتھ بہت ظلم کرچکے ہو۔"

میرا یوں ٹوکنا چارلس کو انتہائی ناگوار گزرا اس نے بڑے غصیلے انداز میں اس بوری کو دونوں ہاتھوں سے اٹھایا اور اس چٹان کے نیچے پھینک دیا۔ "اب تم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جہنم میں جاؤ۔" وہ بلند آواز میں ہانکا تو اس کی بازگشت ان بلند ترین چٹانوں میں گونج کررہ گئی تھی۔

میں افسوس ناک نگاہوں سے کبھی اسے دیکھتا رہا تو کبھی اس کتے کے بوری بند وجود کو جو اس بلندترین چٹان کی اتھاہ گہرائیوں میں کھو کر رہ گیا تھا۔ یہ نہ صرف میری بلکہ چارلس کی زندگی کا بھی بدترین دن تھا۔ کیونکہ اس واقعے کے بعد چارلس کی زندگی جہنم بن کررہ گئی تھی۔

ہوا یوں کہ اس کتے کو ماردینے کے بعد چارلس بہت خوش تھا، اسی خوشی میں اس نے مجھے باہر ڈنر کروایا۔ مگر اس ڈنر کے بعد جب ہم دونوں اپنی اپنی رہائش گاہ کی طرف لوٹ گئے تو آدھی رات کو چارلس نے مجھے کال کی، میں نے نیند میں ہی کال اٹینڈ کی۔

"ہیلو جیمس! وہ...... وہ کتا پھر میرے گھر کے باہر بھونک رہا ہے۔" چارلس کی انتہائی گھبرائی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ میں غنودگی میں تھا مگر اس کی بات سن کر فوراً میری نیند اڑ گئی اور میں چونکتے ہوئے بولا۔ "کیا وہ کتا؟ مگر اسے تو تم مارچکے ہو، ضرور یہ کوئی اور کتا ہوگا۔"

چارلس میری بات رد کرتے ہوئے سہمے ہوئے لہجے میں بولا۔ "یہ وہی کتا ہے تم خود آکر دیکھ لو، یا ایسا کرتا ہوں کہ میں تمہاری طرف آجاتا ہوں۔" میں اسے روکتے ہوئے بولا۔

"تم مت آؤ میں ابھی تھوڑی دیر میں تمہارے پاس آتا ہوں۔" میں نے اتنا کہہ کر رابطہ منقطع کردیا اور اپنا حلیہ درست کرکے فوراً بائیک پر اس کی طرف روانہ ہوگیا۔

چارلس کے گھر کے قریب بائیک کھڑی کرکے میں اس کے گھر کے مرکزی دروازے کے سامنے آن کھڑا ہوا، پر وہاں کسی کتے کا نام ونشان نہیں تھا بلکہ ارد گرد تو اس قدر خاموشی تھی کہ مجھے اپنے ہی سانس کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی، میں نے ڈور بیل بجائی تو اگلے ہی لمحے میں دروازہ کھل گیا، چارلس پہلے ہی سے میرے انتظار میں دروازے کے قریب کھڑا تھا، مجھے دیکھتے ہی وہ مجھ سے لپٹ گیا، مجھے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ یہی وہ چارلس ہے جو صبح کے وقت تو ہنٹر بن کر ایک معصوم جانور کو مارچکا تھا اور اب کیسے کسی سہمے ہوئے بچے کی طرح مجھ سے لپٹا تھرتھر کانپ رہا تھا۔ میں اس کی کمر تھپتھپاتے ہوئے اندر لے گیا۔

''باہر تو کوئی کتا موجود نہیں تھا چارلس۔'' میں نے چارلس کی حالت سنبھلتے ہی اس سے پوچھا۔

''وہ تمہیں دیکھ کر غائب ہوگیا تھا۔'' چارلس نے یوں کہا جیسے وہ کوئی بھوت تھا جو مجھے دیکھ کر غائب ہوگیا ہو۔

''یقیناً تمہارا وہم ہے یا وہ کوئی اور کتا ہوگا۔'' میں اپنی بات پر اٹل ہو کر بولا۔

''جیمس میں یقین سے کہہ سکتا ہوں یہ وہی کتا تھا، میں نے خود اسے کھڑکی سے دیکھا ہے، وہ بری طرح سے بیرونی دروازے پر ٹانگیں مار رہا تھا تاکہ اندر آسکے اور میں اس سے اس قدر خوفزدہ ہوگیا کہ تمہارے آنے کی خبر ہو کر بھی اس وقت دروازہ نہیں کھولا جب تک تم نے ڈور بیل نہیں بجائی۔'' چارلس نے یوں بولا جیسے ابھی رو دے گا۔ ''ٹھیک ہے تم خود کو سنبھالو۔'' میں اس کے کندھے کو مضبوطی سے پکڑتے ہوئے بولا۔

''تم آج رات میرے پاس رک جاؤ۔'' چارلس کے اصرار پر میں اس رات اس کے گھر ہی رک گیا۔

مجھے کسی کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی نہیں دی۔ مگر اس رات کے بعد چارلس کی ذہنی حالت بگڑ گئی، وہ کتا تو جیسے کسی خوفناک عفریت کی طرح اس کے ذہن سے چمٹ گیا تھا، اٹھتے بیٹھتے اسے وہی کتا نظر آتا حتیٰ کہ آئینے میں اپنے عکس کی جگہ اسے وہی کتا بھونکتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ چارلس کی ذہنی حالت اس قدر بگڑ چکی تھی کہ میں اسے ماہر نفسیات کو دکھانے پر مجبور ہو چکا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ اس کتے کو اس قدر برے طریقے سے مارنے کی وجہ سے چارلس خود کو لاشعوری طور پر مجرم سمجھ رہا ہے۔ اور یوں اس کتے کا ہر جگہ دکھائی دینا احساس پشیمانی کے باعث ہے۔ عموماً ایسا ہوتا ہے، بہت زیادہ حساس ذہن رکھنے والے لوگوں سے جب کوئی ایسا برا کام سرزد ہو جاتا ہے، جس کی انہیں خود سے توقع نہیں ہوتی تو وہ اسی احساس گناہ کی کیفیت کا شکار ہو جاتے ہیں۔

چارلس کی حالت کسی بھی ماہر نفسیات سے علاج کرانے کے باوجود نہیں سنبھل رہی تھی، میں نے یہی مناسب سمجھا کہ چارلس کو اپنے ساتھ ہی فلیٹ میں رکھ لوں۔

چنانچہ چارلس کا کچھ ضروری سامان اور کپڑے وغیرہ میں نے اپنے فلیٹ میں منتقل کر دیئے اور چارلس کو اپنے فلیٹ میں چھوڑ کر، میں نے ضروری سمجھا کہ اس گھر کی مالکن مس ہیلن کو بھی چارلس کی ذہنی حالت کے متعلق آگاہ کر دوں۔ میں یہی سوچ کر مس ہیلن کے گھر پہنچ گیا۔

مس ہیلن بڑی سی شال لئے صوفے پر براجمان تھی۔ یہی شال اس نے اس وقت بھی اوڑھ رکھی تھی جب میں پہلی بار اس سے ملنے چارلس کے ساتھ آیا تھا، میں نے اسے چارلس کے ساتھ گزرنے والے تمام حالات سے آگاہ کیا۔ وہ کافی دیر تک چپ رہی اور افسوس ناک انداز میں سر جھکائے بیٹھی رہی، پھر اس گہری خاموشی کو توڑتی ہوئی اس کی بوڑھی آواز گونجی۔

''جو کچھ ہوا بہت برا ہوا، میں نے کوشش بھی کی تھی چارلس کو خبردار کرسکوں کہ اس کتے کو چھیڑنے کا مطلب اپنے گلے میں مصیبت ڈالنا ہے۔''

''میں سمجھا نہیں مس ہیلن؟'' میں نے سوالیہ انداز میں اس کو دیکھا۔

''دراصل وہ کتا مافوق الفطرت قسم کی مخلوق تھا اس لئے اسے جب بھی کسی نے نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو وہ خطرناک حالات سے دوچار ہوا، میں خود اس کا نتیجہ بھگت رہی ہوں۔'' مس ہیلن نے دکھ بھرے انداز سے کہا۔

''کیسا نتیجہ مس ہیلن؟'' میں نے پریشانی سے پوچھا۔

مس ہیلن نے اپنی چادر ذرا سی سرکائی اور اپنا بازو میرے سامنے کر دیا، میں یہ دیکھ کر اچھل پڑا کہ ان کی کلائی پر ہاتھ موجود نہیں تھا۔ ''یہ... یہ سب کیا ہے۔ مس ہیلن؟'' میں اپنی کیفیت پر بامشکل قابو پاتے ہوئے بولا۔

مس ہیلن گہرا سانس لیتے ہوئے بولی۔ ”برسوں پہلے میں نے بھی اس کتے سے تنگ آ کر اسے شہر سے بہت دور ایک ویران علاقے میں پھنکوا دیا تھا۔

اسی رات وہ کتا میرے گھر میں دروازہ لاک ہونے کے باوجود نجانے کہاں سے گھس آیا اور مجھ پر حملہ کردیا، میرے اس ہاتھ پر اس نے اس قدر زور سے کاٹا کہ میں تکلیف سے بلبلا اٹھی، خدا جانے وہ کتا کیسی بلا تھی کہ اس کے کاٹنے کی وجہ سے پہلے میرے ہاتھ پر خطرناک زخم بن گیا جو بعد میں اس قدر موذی ہوگیا کہ مجھے اپنا ہاتھ کٹوانا پڑا، اگر میں ایسا نہ کرتی تو اس زخم کا زہر میرے پورے جسم میں پھیل جاتا، اس واقعے کے بعد میں اس قدر خوفزدہ ہوگئی اور وہ گھر ہی چھوڑ کر یہاں شفٹ ہوگئی۔

”یہ تو بہت برا ہوا آپ کے ساتھ۔“ میں دکھی لہجے میں بولا۔

”ہاں بہت برا اور بہت بھیانک۔“ مس ہیلن کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

”اگر وہ کتا واقعی کوئی ماورائی مخلوق ہے تو پھر مجھے کیا کرنا چاہئے؟ چارلس کی حالت بہت خراب ہے۔“ میں اس سے مشورہ مانگتے ہوئے بولا۔

مس ہیلن سوچتے ہوئے بولی۔ ”مناسب تو یہی ہوگا کہ اسے اس قصبے سے دور لے جایا جائے، ہوسکتا ہے اس طرح اس کی حالت سنبھل جائے۔“

مس ہیلن کا مشورہ مجھے نہایت مناسب لگا اور میں ان کا شکریہ ادا کرکے وہاں سے اٹھ گیا۔

اگلے ہی دن میں ضرورت کا کچھ سامان لے کر چارلس کے ساتھ ایک ایسے علاقے میں پہنچ گیا جو ہمارے قصبے سے کافی دور تھا، میں اور چارلس چھٹیوں میں کئی بار اس علاقے میں آچکے تھے، ہماری زندگی کی بہترین یادیں اس علاقے سے وابستہ تھیں، وہاں میں نے اور چارلس نے ایک ہوٹل میں قیام کیا، چارلس کسی بچے کی طرح خیال رکھتا تھا، اس دنیا میں وہ میرا واحد بہترین دوست تھا اور میں پوری نیک نیتی سے اسے چاہتا تھا، چارلس کی حالت بہتر ہوجائے اور واقعی نئی جگہ پر آکر چارلس میں فوری تبدیلی آگئی تھی، اس کتے کا جگہ جگہ دکھائی دینے کا وہم بھی چارلس میں ختم ہونے لگا تھا یعنی وہ سنبھل رہا تھا، اب وہ مجھ سے بات کرتا تو اس کی آنکھوں میں پہلے جیسا خوف قطعاً دکھائی نہیں دیتا تھا البتہ باتوں ہی باتوں میں جب میں اس کتے کا ذکر بھی کر بیٹھتا تو فوراً ہی وہ خوفزدہ ہوجاتا تھا اس لئے میں پوری کوشش کرتا تھا اس کتے کا ذکر نہ ہو۔ مجھے امید تھی چارلس بالکل پہلے جیسا ہوجائے گا۔

اس روز میں معمول کے مطابق صبح صبح بیدار ہوا تو چارلس مجھ سے پہلے ہی جاگا ہوا تھا، وہ بندوق صاف کرنے میں مصروف تھا۔

”کہیں جانے کا پروگرام ہے کیا؟“ میں نے جمائی لیتے ہوئے پوچھا۔

چارلس مسکراتے ہوئے بولا۔ ”پہلے ہم جب بھی یہاں آئے تھے، شکار پر جاتے تھے کیوں نا آج بھی ہم شکار پر چلیں اس علاقے کا جنگل بھی کیا خوب ہے۔“

”کیوں نہیں یہ بندوقیں یہ سامان میں اسی ارادے سے تو لایا تھا یہاں۔“ میں نے جواباً مسکراتے ہوئے اس کی حوصلہ افزائی کی۔

ناشتہ کرنے کے بعد ہم دونوں تیار ہوکر شکار پر نکل گئے۔ جنگل میں شکار کی تلاش میں چارلس مجھ سے دور نکل گیا، میں بھی بندوق لے کر شکار کی تلاش کرنے لگا۔ دفعتاً دو تین فائر کی آواز جنگل میں گونجی اور ساتھ ہی چارلس کی دلخراش چیخ سنائی دی۔ اس نے مجھے چیختے ہوئے پکارا تھا۔

میں فوراً سرپٹ اس آواز کی سمت بھاگا کر جیسے ہی میں اس مقام پر پہنچا جہاں چارلس تھا تو پریشان رہ گیا، چارلس درخت کے قریب سہما ہوا کھڑا تھا اس کی بندوق اس سے چند قدم فاصلے پر زمین پر گری پڑی تھی اور اس کو چاروں طرف سے کئی خونخوار کتوں نے گھیر رکھا تھا، وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ پوری قوت سے چیخا۔ ”جیمس مجھے بچاؤ ان سے۔“

"تم گھبراؤ مت میں ان کو نہیں چھوڑوں گا۔"

اتنا کہہ کر میں نے اپنی بندوق کا رخ ان کتوں کی جانب کیا لیکن اس سے پہلے کہ میں ان کتوں پر فائر کرتا۔ اچانک کسی نے عقب سے مجھ کو دھکا دیا، اس اچانک حملے سے میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ پایا اور منہ کے بل زمین پر آ گرا۔ بندوق میرے ہاتھ سے چھوٹ کر مجھ سے چند قدم دور جا گری۔ وہ جو کوئی بھی تھا پلک جھپکتے ہی میری پشت پر سوار ہو گیا، یہ سب کچھ اس قدر اچانک ہوا تھا کہ میں بالکل بے بس ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ خونخوار کتے میری آنکھوں کے سامنے چارلس پر چڑھ دوڑے، چارلس خود کو بچانے کی کوشش میں زمین پر گر پڑا اور ان میں سے کئی کتے چارلس پر سوار ہو کر اس کے وجود کو نوچ نوچ کر کھانے لگے۔

چارلس کی دلخراش چیخوں سے پورا جنگل جیسے گونج اٹھا تھا۔

میں پوری کوشش کررہا تھا، اس وجود کو اپنی پشت سے اتار پھینکوں مگر وہ جو کوئی بھی تھا انتہائی وزنی اور طاقت ور تھا، اسی کوشش کے دوران جیسے ہی میں نے پشت پر چڑھے اس وجود کو ہاتھ لگایا تو مجھے احساس ہوا وہ کوئی طاقت ور جانور تھا میں چارلس کو بچانے کے لئے ہر ممکن کوشش کررہا تھا مگر میری مزاحمت اس کے سامنے کچھ بھی نہیں تھی۔

چارلس میرے سامنے ان خوفناک کتوں کی خوراک بن رہا تھا اور میں بے بسی سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔

بالآخر چارلس کی چیخیں مدھم پڑنے لگیں اور وہ ناقابل برداشت تکلیف سہنے کے بعد اذیت سے دم توڑ گیا۔

وہ تمام کتے چارلس کے مردہ وجود سے گوشت نوچ نوچ کر کھا رہے تھے، یہ تمام منظر اس قدر بھیانک تھا کہ میرا دماغ چکرانے لگا تھا کچھ ہی دیر بعد چارلس کی جگہ خون آلود ہڈیوں کا ڈھانچہ موجود تھا اس ڈھانچے کو بھی وہ خطرناک کتے چاٹ رہے تھے۔

دفعتاً اس وجود سے مجھے اپنی پشت ہلکی ہوتی ہوئی محسوس ہوئی، اس احساس کے ساتھ ہی میں فوراً رینگتا ہوا اپنی بندوق کی جانب بڑھا اور بندوق ہاتھ میں آتے ہی میں نے اندھا دھند گولیاں ان خونخوار کتوں پر برسائیں مگر بدقسمتی سے ایک بھی گولی ان کتوں کو نقصان نہ پہنچا سکی۔ البتہ گولیوں کی آواز سن کر وہ کتے ادھر ادھر درختوں کے جھنڈ میں گم ضرور ہو گئے تھے۔

میں فوراً اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس ساعت اپنے عقب سے مجھے غراہٹ کی آواز سنائی دی، یقیناً یہ اسی بھاری بھرکم جانور کی آواز تھی جو کچھ دیر پہلے میری پشت پر سوار تھا۔ میں فوراً پلٹا مگر اسے اپنے سامنے زندہ دیکھ کر میں دنگ رہ گیا کیونکہ یہ وہی کتا تھا جسے چارلس نے بے دردی سے مارا تھا۔ وہ کتا بڑی خاموشی سے مجھے گھور رہا تھا۔ مگر اس نے مجھ پر حملہ کرنے کی کوشش ہرگز نہیں کی۔ اگر کوئی اور وقت ہوتا تو میں یقیناً اس کتے کو دیکھ کر خوفزدہ ہو جاتا مگر اس وقت اپنے بہترین دوست کی موت پر میں سراپا احتجاج تھا، دل غم و غصے سے پھٹا جا رہا تھا۔ میں نے اپنی بندوق اس کتے کی طرف سیدھی کرتے ہوئے غصے سے چیختے ہوئے کہا۔ "تم نے مجھ سے میرا عزیز دوست چھین لیا میں ہرگز تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔"

یہ کہہ کر میں نے دیوانہ وار گولیاں اس کتے پر برسائیں مگر وہ گولیاں اس کتے کے وجود سے گزر کر ادھر ادھر بکھر گئیں، مگر اس کتے پر کچھ اثر نہ ہوا۔ پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس کتے کا وجود ہوا میں تحلیل ہوتا گیا، چند لمحوں بعد وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ جہاں وہ کتا موجود تھا۔

چارلس کی اس بھیانک موت نے مجھے حواس باختہ کردیا تھا۔ میں بےدم ہو کر زمین پر بیٹھ گیا اور اس لمحے کو کوسنے لگا جب میں چارلس کو اس جنگل میں لے کر آیا تھا مگر انسان جو برا کام کرتا ہے اس کا خمیازہ بھی وہ ضرور بھگتتا ہے۔ میرے پچھتاوے سے بھلا اب ہو ہی کیا سکتا تھا۔ وہ کتا چارلس سے اپنی موت کا انتقام لے چکا تھا۔

سنہری تابوت

ایم اے راحت

قسط نمبر:23

خراماں خراماں اور سبک رفتاری سے دل و دماغ کو خوف کے شکنجے میں جکڑتی ہوئی صدیوں پر محیط اپنی نوعیت کی اچھوتی انوکھی دلکش دلفریب ایک طویل عرصہ تک دماغ سے محو نہ ہونے والی حقیقت سے قریب تر، سوچ کے افق پر جھلمل کرتی ناقابل فراموش کہانی۔

شاہکار کہانیوں کے متلاشی لوگوں کے لئے اچنبھے میں ڈالتی حیرت انگیز اور تحیر انگیز کہانی

"میں حاروش عبداللہ ہوں۔ پتہ نہیں تاریخ کے کون سے دور میں میرا نام آتا ہے۔ مجھے تاریخ اور سنین سے واقفیت نہیں ہے۔ نہ ہی میں نے سنین میں خود کو تلاش کیا۔ مجھے اس سے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ وہ بھی کسی فرعون ہی کا دور تھا۔ حاروش عبداللہ چرواہے کا بیٹا تھا۔ بہت چھوٹی سی عمر میں اس پر ذمے داریوں کا بوجھ پڑا تھا۔ اس کا باپ سانپ کے کاٹنے سے ہلاک ہوگیا۔ ماں اور تین بھائیوں کی پرورش کا بوجھ بہت چھوٹی عمر میں اسے سنبھالنا پڑا۔ لیکن اس نے بھیڑوں کے ساتھ جنگلوں سے دوستی کرلی۔ درختوں اور پتوں سے اس کی شناسائی ہوگئی۔ ان کے درمیان اس کی دنیا آباد ہوگئی۔ وہ ان میں مگن ہوگیا۔ ہوائیں جہاں جہاں سے گزرتیں وہاں کی کہانیاں سناتیں۔ اسے سارے جہاں کے بارے میں معلوم ہوگیا تھا۔ انہی ہواؤں نے درختوں کے بجتے ہوئے پتوں کی آواز میں اسے سلاکیہ کی داستان سنائی۔ اس کے حسن و جمال کی ایسی تصویر کھینچی کہ وہ اس پر فریفتہ ہوگیا۔ اس کی آنکھیں سلاکیہ کو تلاش کرنے لگیں۔ اس کے دوستوں نے اسے آزردہ پایا تو اسے مشورہ دیا کہ وہ اپنی محبوبہ کا بت تراشے، وہ بت تراشی نہیں جانتا تھا لیکن اس کے دوست بہت کچھ جانتے تھے۔ انہوں نے اسے بت تراشی سکھائی اور اس نے سلاکیہ کو پتھروں سے تخلیق کیا۔ اس تخلیق پر اسے اتنا پیار آیا کہ اس نے ہر پتھر کو سلاکیہ کا روپ دینا شروع کردیا۔ اس نے پھولوں سے رنگ حاصل کیے اور سلاکیہ کے وجود کو رنگین کردیا۔ بت تراشی میں اسے کمال حاصل ہوتا چلا گیا۔ کیونکہ اس میں اس کی لگن اس کا عشق پوشیدہ تھا۔ پتھر اس سے باتیں کرنے لگے، بالکل اسی طرح جیسے درختوں کے پتوں سے اس کی شناسائی تھی اور جیسے زمین پر اگی ہوئی کونپلیں اس سے ہمکلام ہوتی تھیں۔

تب ایک بار فرعون وقت کا ادھر سے گزر ہوا اور اس نے جو پہاڑی چٹانوں کو بولتے دیکھا تو ششدر رہ گیا۔ اسے جستجو ہوئی اور اس نے ان چٹانوں سے ابھرنے والے مجسموں کے خالق کی تلاش کی۔ میرا اس کے سامنے آجانا کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ لیکن اس نے بہتر نہ کیا اس نے مجھ سے سوالات کیے تو میں نے اسے بتایا کہ میری تخلیقات امر ہیں، انہیں زوال نہیں ہے۔ تب اس کے ذہن میں خیال آیا کہ کیوں نا وہ اپنے آپ کو تخلیق کرائے اور میرے فن کو استعمال کرکے خود کو زندہ جاوید کرلے۔

لیکن مجھے اس سے عشق تو نہیں تھا۔ میں نے اس کے بت تراشنے سے انکار کردیا، تو اس نے مجھے قید کردیا۔ مجھے سلاکیہ سے دور کردیا۔ لیکن سلاکیہ تو میرے وجود میں بس گئی تھی، میں نے اپنے قید خانے میں اسے نقش کرلیا۔ دیواریں کھرچ کھرچ کر میں نے وہاں سلاکیہ کو اپنی نگاہوں کے سامنے اتارلیا۔ میرا فن جاوداں ہوتا چلا گیا۔ اور پھر فرعون وقت کو جب میرا خیال آیا تو اس نے مجھے قید خانے میں آکر دیکھا، وہاں بھی اسے سلاکیہ نظر آئی وہ بے چین ہوگیا۔ مجھے موت نہیں دینا چاہتا تھا وہ لیکن اپنے آپ کو مجھ سے تخلیق کرا کے امر کردینا چاہتا تھا۔ میری داستانیں دور دور تک پھیل گئی تھیں۔ اس نے مجھ سے ہر طرح کی سودے بازی کی۔ مجھے رہنے کے لئے محل دیا، عیش وعشرت کی زندگی دی اور یہ چاہا کہ میرے ہاتھوں سے دوبارہ تخلیق ہوجائے۔ تصویر کی شکل کا یہ فن مجھے کیا کیا دے سکتا ہے۔

چنانچہ میں نے ان تمام نقوش کو ترتیب دیا جو مجھے آزادی دے سکتے تھے۔ میں نے دوسری تصویریں بنانا شروع کردیں، بت تراشی کے لئے میرے پاس انتظامات نہیں تھے۔ چنانچہ میں نے رنگ اور برش استعمال کئے جو اس وقت اس شکل میں نہیں تھے۔ لیکن میں جانتا تھا کہ وہ میرے لئے کتنے کارآمد ہوسکتے ہیں اور اس کے بعد جب میں نے اپنے وجود کا ذرہ ذرہ اپنے فن کو بخش دیا۔ تو فن نے مجھے نئی نئی راہیں دکھانا شروع کردیں میری تصویریں، میری تخلیقات مجھے بتانے لگیں کہ مجھے عمر جاوداں کیسے حاصل ہوسکتی ہے۔ میں نے اپنے آپ کو نقش کیا اور اس کے بعد باآسانی فرعون وقت کے چنگل سے نکل آیا۔ اب میرے لئے دنیا کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔

فرعون نے میرے فرار کے بعد اپنی ساری سپاہ کو میری تلاش پر لگا دیا جگہ جگہ سے مجھے گرفتار کیا گیا، سزائیں دی گئیں، لیکن یہ میں نہ تھا میرے بنائے ہوئے نقش تھے اور فرعون وقت میرے اصل کی تلاش نہ کرسکا۔ میرے نقش میری ہی مانند تھے۔ میری جیسی سوچوں کے حامل میرے جیسے عمل میں کامل وہ میری طرح اپنے نقش تراش سکتے تھے، بنا سکتے تھے۔ میں جگہ جگہ موجود تھا۔ اور جب فرعون وقت میرے اصل وجود کو نہ پاسکا تو شدت غم سے دیوانہ ہوگیا۔ اس نے خودکشی کرلی، مگر حاروش عبداللہ اب اپنی ذات میں یکتا ہوگیا تھا۔

فن مصوری میں اگر تاریخ کے اوراق کھنگالو تو حاروش عبداللہ کا نام تمہیں ایک پراسرار مصور کی حیثیت سے نظر آئے گا اور یہ بات میں صرف تمہیں بتا رہا ہوں نشا دانش کہ بالآخر حاروش عبداللہ نے اپنی محبوبہ کی آغوش میں دم توڑ دیا۔

ایک ویران پہاڑی سلسلے میں پتھر سے تراشی ہوئی ایک چٹان جو سلاکیہ کا وجود رکھتی تھی اس کا مرقد بن گئی اور اس کی بنائی ہوئی تصاویر جن کی تعداد ناقابل یقین تھی..... کائنات کے گوشے گوشے میں سرگرداں ہوگئیں۔ وہ تصاویر خود اپنے آپ کو تخلیق کرسکتی تھیں۔ اور ان میں وہی تمام صفات موجود تھیں جو حاروش عبداللہ میں تھیں۔ نہ جانے کتنی تصویریں موجود تھیں اور کس کس طرح ضائع ہوگئیں، میں بھی اس کی بنائی ہوئی تصویر ہوں۔ اگر تم میرے وجود کو حاروش عبداللہ کے طور پر تسلیم کرسکو تو تسلیم کرلو اور اگر نہ مانو تو اس کا بنایا ہوا ایک نقش سمجھ لو۔ رنگ اور برش میرے ہاتھوں میں کائنات کی ہر کہانی تحریر کرتے ہیں۔ مجھ میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو حاروش عبداللہ میں تھیں۔ میں خود اپنی بے شمار تصویریں تراش سکتا ہوں، بنا سکتا ہوں اور میری بنائی ہوئی ہر تصویر میں حاروش عبداللہ کا عکس موجود ہوگا۔ شاید تمہیں اس داستان سے الجھن ہورہی ہو لیکن یہی سچائی ہے۔ تم نے خود بھی دیکھا بے شمار تصویریں موجود ہیں۔ میں اگر سو بار بھی مٹ جاؤں تو حاروش عبداللہ کے وجود میں زندہ رہوں گا اور تصویریں تخلیق کرتا رہوں گا۔ مجھ میں تمام انسانی صفات ہیں، جو حاروش عبداللہ میں تھیں۔ لیکن اگر میں خود ہی اپنی حقیقت کو اپنے آپ پر طاری کروں تو تم نے دیکھ لیا کہ کاغذ کا ایک ٹکڑا ہوں بوسیدہ، قدیم، جو جلی

سی ہوا سے اڑتا ہوا نہ جانے کہاں سے کہاں جا سکتا ہے اور مجھے یقین ہے نشا دانش کہ اب تمہیں شدت سے اس بات کا غم ہوگا کہ تم کسی زندہ وجود کے ساتھ نہیں ہو بلکہ ایک تصویر کے ساتھ جی رہی ہو۔ مجھے اس کے عکس میں جیتا ہے، یہ ایک مصور کا نام ہے جو نہ جانے کتنی صدیاں دیکھے اور فنا نہ ہو۔ فن اسی کو کہتے ہیں ۔ انسان اگر فن کا رہے تو جئے گا صدیوں جئے گا۔"

میں آنکھیں پھاڑے ہوئے اسے گھور رہی تھی۔ جو کچھ وہ کہہ رہا تھا وہ ایک پر اسرار کہانی تھی۔ ناقابل یقین ہوش وخرد سے عاری کر دینے والی، لیکن اس کا ثبوت ابھی چند لمحات قبل جب بلی نے اس پر حملہ کیا تھا اور وہ کاغذ کی طرح پھٹ گیا تھا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔ چہرہ جھکا لیا۔ وہ بھی کچھ نہ بولا، بہت دیر تک سوچتا رہا، پھر مجھے اس کی ہنسی کی آواز سنائی دی اور میں نے گردن اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ آہستہ سے بولا۔

"اور تم نے میرے لئے سوچ کی ایک نئی راہ کھولی ہے نشا دانش، اور یہ مشغلہ تو نہایت ہی دلچسپ ہوگا۔ وہ گویا ایجنی ترا وزی کے لئے اس کی یہ کاوش جان مسلسل بن گئی۔ اب وہ مصیبتوں کا شکار ہو جائے گا نشا دانش، اب وہ در حقیقت مصیبتوں کا شکار ہو جائے گا۔ میں اپنے آپ کو اس دلچسپ مشغلے سے باز نہیں رکھ سکتا۔ میرا دل چاہتا ہے کہ وہ کروں جو میرے ذہن میں آیا ہے۔"

میں نے ایک گہری سانس لے کر اسے دیکھا وہ مسکرا رہا تھا۔ مردانہ حسن وجمال کا مرقع، جسے دیکھ کر زائرہ ایمان کم عمری میں اس پر فریفتہ ہوگئی تھی اور آج تک اس کی یاد میں جی رہی تھی، لیکن یہ ایک زندہ وجود نہیں ہے، ایک تصویر ایک مصور کا شاہکار ایک عشق کی داستان، سلاکیہ کے بارے میں اس نے کہا تھا کہ اس نے سلاکیہ کی کوئی تصویر نہیں بنائی بلکہ اسے دل میں رکھا ہے۔ سچ تو ہے جب ایک مصور نے اپنا وجود ہزاروں تصویروں میں منتقل کر دیا تو اس کی سوچ اس کا عمل وہی ہوتا ہے جو مصور کا تھا۔

حاروش عبداللہ میری سوچوں سے بے نیاز اپنی سوچوں میں گم تھا۔ اس نے کہا۔

"اور اگر تمہاری بھی ایسی ہی تصویریں متحرک ہو جائیں نشا دانش، جس طرح میں حاروش عبداللہ کی شکل میں بھٹک رہا ہوں اور میرا کچھ نہیں بگاڑا جا سکتا تو کیا وہ احمق تمہیں تلاش کر سکے گا۔ کیا تمہارے لئے وہ خطرات باقی رہ جائیں گے جن سے تم دوچار ہو؟"

اس کے الفاظ میرے ذہن تک پہنچے تو ایک بار پھر میں اچھل پڑی، میں نے کپکپاتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"کیا کہہ رہے ہو حاروش عبداللہ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا؟"

"حاروش عبداللہ میٹھی مسکراہٹ کے ساتھ مجھے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

"ہاں میں تمہاری اپنی جیسی لاتعداد تصویریں تراش سکتا ہوں، تمہارا وجود ان تصویروں میں متحرک ہوگا۔ لوگ تمہیں دیکھیں گے اور صرف نشا دانش سمجھیں گے۔ تمہیں نشا دانش ہی کی حیثیت سے ہر جگہ جانا جائے گا۔ لیکن تمہارا اصل کہیں اور ہوگا۔ وہ بھٹکتے رہیں گے اور یقیناً روشناق بھی تمہیں نہ پا سکے گا۔ تم نے دیکھا کہ وہ مجھے ہی نہ پا سکا اور اس نے اپنی کاوشیں مجھ پر ہی مکمل کر دیں۔ بولو نشا دانش کیا تمہیں یہ دلچسپ تجربہ منظور ہے؟"

ہر چند کہ میں حاروش عبداللہ کی کہانی جان کر کچھ عجیب سی کیفیت کی شکار ہوگئی تھی، لیکن وہ جو کچھ کہہ رہا تھا وہ اتنا دلچسپ تھا کہ میں اپنے آپ کو ان الفاظ کے سحر سے آزاد نہ کر سکی۔ میں نے سرسراتی آواز میں کہا۔

"یہ تو ایک انوکھا تجربہ ہوگا، کسی ذی روح کی زندگی میں جیسے میں.....؟"

"ہاں حاروش عبداللہ نے اپنی اصل کو کہیں ایسی جگہ پوشیدہ کر لیا تھا جہاں فرعون وقت اسے پا نہ سکے اور وہ پاگل بادشاہ اسے جگہ جگہ سے گرفتار کر کے موت کی سزائیں دے رہا تھا۔ موت تو حاروش عبداللہ کو ملی، لیکن اس کی چتر یلی محبوبہ کی آغوش میں اس کی پسند کے مطابق اور اس کے باوجود اس کی تصویریں اس کی جگہ پہ کے رہیں۔ نہ جانے کتنی صدیوں سے آج تک۔"

"اس کا مطلب ہے حاروش عبداللہ، اس کے بے شمار تصاویر متحرک ہیں۔ کیا سرزمین مصر کے کسی اور گوشے میں بھی اس کی کوئی تصویر تمہاری طرح زندگی گزار رہی ہوگی؟"

"نہیں اگر ایسا ہوتا تو اس کا تعلق مجھ سے ہی ہوتا۔ ہم سب ایک دوسرے سے واقف ہوتے، میرے علاوہ اب اس کی کوئی اور تصویر کہیں موجود نہیں ہے، کیونکہ بقیہ تصویریں میں نے ہی بنائی ہیں۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ اب اس کی اصل تم ہی ہو۔"

"اصل تو نہیں ہوں تم دیکھ چکی ہو، نشا دانش لیکن اسکی بقیہ تصویریں فنا ہو گئیں، ہاں میں نے ہی چند تصاویر بنائی ہیں اور یہ بھی صرف ایک اتفاق ہے، ورنہ تراوزی کی بلی اگر مجھے ختم کر دیتی تو شاید حاروش عبداللہ کا نام ختم ہو جاتا۔ لیکن ابھی صدیاں درکار ہیں، میں نے البتہ اپنی تصویریں کافی تعداد میں تیار کر لی ہیں اور وہ میرے پاس محفوظ ہیں۔"

"کیا اسی نگار خانے میں؟"

"نہیں احتیاطاً میں نے انہیں کہیں اور محفوظ کیا ہے۔"

"تم نے ابھی کہا تھا کہ تم میری تصویر بنا دو گے۔"

"ہاں تم سے جو لگاوٹ، جو انسیت میرے دل میں بیدار ہو گئی ہے نشا دانش، اس کے تحت میں ایسا کروں گا۔ اگر اناطور بھی کچھ وقت یہاں قیام کرتا اور جنون کا شکار نہ ہوتا تو شاید میں اسے اس طرح نہ مرنے دیتا۔ بہر حال وقت کا عمل سب سے بڑا مقام رکھتا ہے، کون جانے کب میری آخری تصویر بھی ضائع ہو جائے، اس کے بعد حاروش عبداللہ کا نشان کم از کم اس جیتی جاگتی دنیا میں نہ رہے گا وہ فنا ہو کر بھی صدیوں سے اس کائنات کو دیکھ رہا ہے، اس میں بس رہا ہے، آخری تصویر نجانے کب فنا ہو جائے اس کے بارے میں، میں بھی نہیں جانتا۔"

میں گہری گہری سانسیں لے کر گردن جھٹکنے لگی۔ پھر میں نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"تب تو تم نے سچ ہی کہا حاروش عبداللہ نہ تمہارا کوئی مذہب ہے نہ فلسفہ، نہ تمہاری ضرورت، بھلا تم زائرہ ایمان کی محبت کیسے قبول کر سکتے تھے لیکن جو کچھ کھاتے پیتے اور جس طرح تم ایک زندہ انسان کی حیثیت سے بسر کرتے ہو وہ باعث حیرت ہے۔"

"یہ بھی نہ کہو بس یوں سمجھ لو یہ تمہاری پذیرائی تھی اور وہ بھی اناطور کے حوالے سے کہ وہ ایک بلند پایہ انسان تھا۔"

"مگر اس طرح ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے حاروش عبداللہ۔"

"پوچھو۔ جب میں نے تمہیں اپنی داستان حیات بتادی ہے تو بھلا اس کے بعد کوئی اور سوال نہ بتانا کیا معنی رکھتا ہے۔"

"کیا ایک تصویر ہونے کے باوجود تمہارے سینے میں دل ہے، اس دل میں محبت ہے، دوستی کا جذبہ ہے، جیسے اناطور کے بارے میں تم نے اپنے جذبات کا اظہار کیا، اناطور اس وقت تو موجود نہ تھا جب حاروش عبداللہ کی اصل اس دنیا میں تھی۔"

وہ ہنسنے لگا پھر بولا۔

"میں حاروش عبداللہ ہی ہوں۔ اور جب تک میں اس کی تصویر کی شکل میں متحرک ہوں۔ میرے سینے میں انسانی جذبات انسانی عمل پوشیدہ ہے اور جب تک میں جاری رہوں گا، جب تک اس کی آخری تصویر باقی رہے گی، وہی تمام عمل رہے گا جو دنیا میں بسنے والوں کا ہے۔"

"اوہ! کیا یہ سب کچھ قابل یقین ہے؟"

"کائنات میں اتنا کچھ ہے نشا دانش کہ تمہارے دماغ کے بیس ہزار خلیے اسے سمجھنے کے لئے کچھ بھی نہیں ہیں، کائنات کے راز ہائے سربستہ تو اتنی وسعتیں رکھتے ہیں کہ تم ہزار بار بھی مر کر جیو اور تحقیق کا عمل جاری رکھو تو سمندر سے ایک قطرے کے برابر بھی کائنات کے راز ہائے سربستہ حاصل نہ کر پاؤ۔ عقل انسانی ان وسعتوں کا احاطہ بھلا کیسے کر سکتی ہے۔ جنہیں اس کائنات کے خالق نے ترتیب دیا ہے۔ بہت معمولی سی بات ہے، یہ بس عقل جہاں تک ساتھ دے، وہیں تک سفر کیا جا سکتا ہے۔ لیکن وہاں سے اس سفر کا تو احساس ہوگا کہ یہ آغاز

ہے لیکن انجام کے لئے عقل ناکافی ہے چنانچہ جو کچھ سو
پالو جو نہ جانو اس کے لئے خود کو فنا نہ کرو۔ اور اپنی بھی حد
متعین کرلو کہ یہی ضروری ہے۔"

میں خاموش نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی۔ بات
سمجھ میں آ رہی تھی۔ وہ مسکرایا اور اٹھتا ہوا بولا۔

"امید ہے تمہیں خاصا اطمینان حاصل ہو چکا
ہوگا۔ تم اپنے طور پر محفوظ ہو اور یہ جگہ تمہارے لئے
موزوں ترین ہے۔ میرے بارے میں اب سب کچھ
جاننے کے بعد تمہیں مزید جستجو نہ رہی ہوگی۔ ہاں جو کچھ
میں نہیں آیا اس کے لئے میری ہدایت پر غور کرلینا مجھے
اب ان تکلفات سے نجات مل گئی ہے۔ جو تمہارے
ساتھ ناواقفیت کی بنیاد پر برتنے پڑ رہے تھے۔ نہ مجھے
خوراک درکار ہے، نہ کوئی اور حاجت کہ بے جان چیزیں
اس کی ضرورت نہیں رکھتیں۔ سو اب میں اپنا عمل کروں
گا۔ جو تمہارے لئے ہے اور میرے لئے ایک دلچسپ
مشغلہ، سو مجھے اس میں مصروف رہنے دینا، اور میری
ضرورت نہ محسوس کرنا، ہاں اگر تمہاری کوئی طلب ہو تو
بے شک میں اس کی تکمیل کے لئے حاضر ہوں۔ اس
میں تمہیں دقت نہیں ہوگی۔"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر گردن ہلائی اور
اس کے ساتھ ہی اٹھ گئی۔ میرا دماغ اب ہر طرح کے
الجھاوے برداشت کرنے کا عادی ہو گیا تھا۔ لیکن اس
سے جدا ہو کر اپنے کمرے میں اس کے بارے میں
سوچتے ہوئے کم از کم مجھے ایک گونہ گوں سکون ضرور
محسوس ہوا تھا۔ ایک ایسی انوکھی تخلیق میری معاون کار
ہے جو روشاق کا نشانہ نہیں بن پائی۔ اس کا مطلب ہے
کہ روشاق مجھے آسانی سے اب کوئی نقصان نہیں
پہنچا سکے گا اس کا غرور خاک میں مل چکا ہے بس اس سے
زیادہ اور کچھ سوچنا میرے بس میں نہیں تھا۔

پھر وقت گزرنے لگا اگر کسی جاندار شے کی حاجت
محسوس ہوتی تو جوہڑ کے کنارے جا بیٹھتی۔ تین چار دن
اسی طرح گزر گئے تھے نہ وہ اپنے نگار خانے سے برآمد
ہوا تھا نہ میں نے اس کی جستجو کی تھی، ماحول پر خاموشی
مسلط تھی، یہ تنہائیاں شاید ازل ہی سے میرا مقدر تھیں،
اپنے گھر میں بھی سب تھے لیکن میں اپنی ذات میں تنہا
تھی۔ ملازموں کی ہمدردیاں کاروباری طور پر بے شک
حاصل تھیں، لیکن ان جذبوں سے محروم تھی۔ جو محبت
کرنے والوں کے دلوں میں ہوتے ہیں۔ خود بھی ہر
کوشش میں ناکام رہی تھی۔ کوئی سچے جذبوں سے میری
قربت کا روادار نہیں ہوتا تھا۔ اور آج تک یہی کیفیت
تھی۔ بے شک اس دوران چند لوگوں نے میری سرپرستی
کی لیکن اس میں بھی ان کی اپنی غرض پوشیدہ تھی یہاں
تک کہ بات حاروش عبداللہ تک آ پہنچی۔ ہاں یہاں
ایک اعتبار ملا تھا، ایک تحفظ ملا تھا، لیکن تقدیر نے یہاں
بھی چھکا مار دیا تھا یعنی اب بھی جو میرا ہمدرد، میرا غمگسار
تھا وہ کوئی جاندار نہیں تھا۔ اپنے آپ پر خوب ہنسی تھی۔
بعض اوقات۔

پھر ایک دن حاروش عبداللہ ہی نے میری خوابگاہ
کا دروازہ بجایا۔ میں حیرت سے اچھل پڑی تھی، بالکل نیا
انداز تھا یہ، بھلا کون اس ویران مکان میں میرے کمرے
کے دروازے تک آتا۔ دو ہی نام ذہن میں آئے تھے۔
زائرہ ایمان یا پھر شلز انہ ادشیاناس، لیکن دروازہ بجانے
والا حاروش عبداللہ تھا۔ اسے دیکھ کر دل کو ایک عجیب سی
مسرت کا احساس ہوا۔ وہ مسکراتا ہوا بولا۔

"آؤ میں تمہیں تمہاری چند تصویریں دکھاؤں جو
میں نے تیار کی ہیں۔"

میں حیرت زدہ سی اس کے ساتھ باہر نکل آئی۔ وہ
مجھے لئے ہوئے ملحقہ عمارت میں داخل ہو گیا۔ بڑے
بڑے کینوس فریم پر لگے ہوئے تھے اور میں ان میں نظر
آ رہی تھی۔ مکمل ہر طرح سے مکمل جاندار رنگوں کی تخلیق
بس یوں لگتا تھا جیسے ابھی فریم سے اتر کر کمرے میں
چہل قدمی کرنے لگوں گی۔ میں سحر زدہ سی ان تصویروں
کو دیکھتی رہی۔ اور حاروش عبداللہ داد طلب نگاہوں سے
مجھے دیکھتا رہا۔ پھر مسکرا کر بولا۔

"میں نے تمہاری آنکھوں میں پسندیدگی دیکھ لی
ہے۔ یہ تم ہو نشا دانش ان میں تم ہو، انہیں چھوڑ کر

دیکھو..... آگے بڑھو انہیں چھو کر دیکھو۔"

"یہ خراب ہو جائیں گی۔" میری لرزتی آواز ابھری۔

"نہیں ان کے رنگ پکے ہیں۔ اب تو انہیں زندگی کے جانے کتنے رنگ دیکھنے ہوں گے، ان کے رنگ پکے ہیں، انہیں چھو کر دیکھو۔"

میں نے آگے بڑھ کر ایک تصویر کا ہاتھ چھوا اور میرے جسم کو کرنٹ سا لگا، نرم و گداز ہاتھ میرے جیسا اس کے بعد اس میں تحریک ہوئی اور دوسرے لمحے میں نے اسے فریم سے نیچے اترتے دیکھا۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی بلندی سے نیچے کودتا ہے، میرے پیروں کو جھٹکا لگا اور بدن ہل گیا، جیسے میں خود نیچے کودی ہوں۔ میں نے حیران ہو کر حاروش عبداللہ کو دیکھا اور مزید حیران اس وقت ہوگئی جب میری تصویر نے بھی میری مانند گردن موڑی۔ حاروش عبداللہ نے کہا۔

"طلب اور محبت کا عرفان حاصل تھا اسے اور اس کے رنگوں کو زندگی عطا کر دی گئی۔ یہ اس کی جنبش ہے اب تم دوہرا وجود رکھتی ہو۔ تمہارے لمس نے اس تصویر کو متحرک کر دیا ہے۔ باقی تصویروں کو اس وقت تک نہ چھونا جب تک دوبارہ ضرورت نہ محسوس کرو۔"

"اگر میں انہیں ہاتھ نہ لگاؤں تو یہ متحرک نہیں ہو سکتیں؟" میں نے سوال کیا۔

"ہرگز نہیں، تمہارے ذہن کے تاروں سے منسلک ہیں۔ تم کہیں بھی بیٹھ کر انہیں آواز دو گی تو یہ تمہارے پاس پہنچ جائیں گی۔"

"خواہ میں اپنی جگہ سے جنبش بھی نہ کروں۔"

"ان کے وجود میں تمہاری جنبش ہوگی بس یوں سمجھو یہ تمہارا دوسرا حصہ ہوں گی۔"

"تم رنگوں کے جادوگر ہو، حاروش عبداللہ، تم ناقابل یقین ہو۔ تمہیں ایک پُراسرار کہانی تو کہا جا سکتا ہے ایک ایسی کہانی جسے تفریح طبع کے لئے لکھا جائے..... سنا جائے، کوئی اس پر یقین نہ کرے۔"

"نہیں، یہ نظریہ تصور کی نفی ہے، تمہیں بہت کچھ عطا کیا گیا ہے لیکن تم اس دین سے ناواقف ہو، جو ذہن میں آ سکے وہ کہانی نہیں حقیقت ہے، اس کا وجود ہے، کیونکہ اسے تمہارے تصور میں محفوظ کیا گیا ہے۔ خیر یہ طویل بحث ہے اس سے کوئی کام لو۔ اپنے اس دوہرے وجود کو متحرک کرو۔ میں تمہیں اس کا طریقہ بتاتا ہوں....."

حاروش عبداللہ مجھے ناقابل یقین عمل بتاتا رہا اور میں سنتی رہی۔ پھر میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اور یہ اسی طرح ممکن ہے جیسے تم نے کہا؟"

"تجربہ کر کے دیکھ لو، لیکن اس طرح جیسے میں نے کہا۔ جاؤ تم پہلی بار یہ تجربہ کر رہی ہو۔ اس لئے تمہاری پوری توجہ اس تجربہ پر مرکوز ہونی چاہئے۔"

میں اپنے کمرے میں آگئی، میں نے تصویر وہیں چھوڑ دی تھی۔ میں نے اپنے کمرے میں آ کر اسے دیکھا۔ وہ حاروش عبداللہ کے قدم سے قدم ملا کر عمارت سے باہر آ رہی تھی۔ مجھے یہ تجربہ کیسے کرنا چاہئے۔ کیوں نہ میں اس عمارت سے باہر جاؤں۔ یہ شام یہاں سے دور رہ کر گزاروں لیکن کہاں۔ ہوٹل کا وہ کمرہ یقیناً میری تحویل میں ہوگا۔ مگر وہاں تک جانے کا کیا ذریعہ ہوگا۔ باہر نکل کر دیکھا جائے۔ میں نے اپنے آپ کو اس احاطے کا راستہ طے کرتے ہوئے پایا۔ پھر لکڑی کے گیٹ سے باہر نکل آئی۔ سنسان سڑک پر آگے بڑھتی رہی۔ پھر عقب میں روشنی دیکھ کر ٹھٹک گئی، ایک کار آ رہی تھی۔ میں نے رک کر اسے اشارہ کیا۔ کار رک گئی۔ ایک بوڑھا آدمی اسے ڈرائیو کر رہا تھا۔

"کیا آپ مجھے قاہرہ چھوڑ دیں گے؟" میں نے لجاجت سے کہا۔

"آؤ بیٹھو۔" اس نے کہا اور میں اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔ کار اسٹارٹ ہو کر چل پڑی۔ میرا سانس پھول رہا تھا۔ میں نے اس انوکھے تجربے کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ اس طرح تو میں نہ جانے کیا کیا کر سکتی ہوں۔ اس طرح تو مجھے ایک عظیم قوت حاصل ہوگئی ہے۔ اگر ذہن کو یکسو کر کے اسے استعمال کروں تو وہ سب کچھ ہو سکتا ہے جو میرے دل میں آئے۔

روشن قاہرہ میری نگاہوں کے سامنے تھا۔ اپنی

تمام راحتوں کے ساتھ۔ اس سے قبل میرے دل میں خوف جاگزیں تھا۔ میں نے لاکھ خود کو بہادر بنالیا تھا۔ ہر مشکل کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہوگئی تھی۔ لیکن پھر بھی یہ احساس تھا کہ نجانے کیسی کیسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے۔ مگر اب صورتحال بالکل مختلف تھی۔ میرے دل میں کسی کا خوف نہیں تھا۔ مہربان بوڑھے نے نرم لہجے میں کہا۔

''تم جہاں جانا چاہتی ہو مجھے بتادو میں تمہیں وہاں پہنچادوں گا۔''

''آپ کا بہت شکریہ، بس یہیں اتار دیجئے۔''

بوڑھے نے کار روک دی اور میں نیچے اتر آئی، موسم معمول کے مطابق گرم تھا، لیکن دل میں خوشی کا سمندر موجزن تھا تو موسم بھی خوشگوار محسوس ہورہا تھا، میں کچھ دور پیدل چلتی رہی، پھر ایک ٹیکسی روک کر اس میں بیٹھ گئی۔ ڈرائیور کو میں نے اپنے ہوٹل کا پتہ بتادیا تھا۔

ہوٹل کے کاؤنٹر سے میں نے اپنے کمرے کی چابی طلب کی تو کاؤنٹر منیجر نے چونک کر مجھے دیکھا، پھر چابی نکال کر میرے حوالے کردی، پھر خوش اخلاقی سے بولا۔

''آپ کئی دن کے بعد تشریف لائی ہیں میڈم۔''

''ہاں۔ میرے لئے کوئی پیغام؟''

''نہیں بالکل نہیں۔ غالباً آپ سیاح ہیں اور کسی طویل سفر پر نکل گئی تھیں۔''

''ہاں، لیکن میں ابھی یہ کمرہ اپنے پاس ہی رکھنا چاہتی ہوں، تم حساب بنا کر مجھے بھیج سکتے ہو۔'' اس نے نیازمندی سے گردن خم کی اور میں وہاں سے چل پڑی۔

کمرہ بالکل صاف ستھرا تھا۔ سب سے پہلے میں نے اپنے اثاثے تلاش کئے۔ ہوسکتا تھا یہ اب تک کمرے کی صفائی کرنے والے کی میراث بن گئے ہوں۔ لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔ سونے کے نادر سکے اپنی جگہ موجود تھے۔ میں ایک آرام کرسی میں دراز ہوگئی، اب کیا کرنا چاہئے۔ سوچتی رہی۔

سب سے پہلا خیال عسکری کا تھا۔ اب آزادی سے اسے تلاش کرسکتی ہوں، مجھے سب سے پہلے یہی کرنا چاہئے۔ اس کی یاد نے مجھے تڑپادیا، دل پر ایک گھونسہ سا پڑا۔ میں چونک گئی، بدحواس سی ہوگئی، عسکری اتنا اجنبی نہیں تھا میرے لئے، میں بری طرح بے کل ہوگئی، کہاں چلا گیا وہ، اسے کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔ ایک بار پھر جاوید عالی سے ہی رجوع کروں، ممکن ہے کوئی خبر مل سکے۔ جاوید عالی کے فون نمبر یاد تھے۔ ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کئے، دوسری طرف سے فون ریسیو کرنے والے سے جاوید عالی کے بارے میں معلوم کیا اور چند لمحات کے بعد وہ فون پر آ گیا۔

''جاوید عالی بول رہا ہوں۔''

''جاوید صاحب میں نشا دانش ہوں۔'' میں نے مجرمانہ لہجے میں کہا اور دوسری طرف سکوت چھا گیا۔

''ہیلو......'' چند لمحات انتظار کے بعد میں نے پھر کہا۔

''جی فرمایئے؟'' جاوید عالی کا لہجہ طنزیہ تھا۔

''جاوید صاحب میں عسکری کے بارے میں معلوم کرنا چاہتی ہوں۔''

''محترمہ نشا دانش، آپ میری زندگی کی سب سے حیرت ناک خاتون ہیں۔ آپ یقین کیجئے میں آپ کو بالکل نہیں سمجھ پایا۔ نہ جانے آپ کیا کرنا چاہتی ہیں، آپ کو اپنی عزت کا پاس نہیں تو اپنے ملک کی، ہماری عزت کا خیال کریں، آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ ہم آپ کی وجہ سے کتنے بدنام ہورہے ہیں۔''

''مجھے علم ہے جاوید صاحب۔''

''خدارا کچھ تو بتادیجئے، صرف اتنا بتادیجئے کہ آپ کیا چاہتی ہیں، کس کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ ہمیں علم ہوجائے تو ہم آپ کی مدد کریں گے۔ ہم آپ کے ہم وطن ہیں۔ غیر نہیں ہیں۔ آپ کے سلسلے میں حکومت مصر کو جواب دہی نہیں کر پارہے ہیں، ہم کیا کہیں کیا نہ کہیں۔''

''عسکری کے بارے میں کچھ پتا نہیں چلا؟''

''چل گیا ہے، کار کے ایک حادثے میں زخمی ہوکر اسپتال میں داخل ہوئے تھے۔ وہاں سے پولیس کی

تحویل میں پہنچ گئے۔"

"عسکری کو حادثہ پیش آ گیا ہے۔" میرے حلق سے چیخ آواز نکلی۔

"ایک ٹانگ ٹوٹ گئی ہے، داہنا رخسار بری طرح رگڑ کھا گیا ہے اور جبڑے کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔" جاوید عالی نے بتایا۔

"اوہ میرے خدا......" میں سسک پڑی...... پھر بولی۔

"کہاں ہے وہ؟"

"سینٹرل سول اسپتال، روم نمبر گیارہ سو بیس لیکن مس نشا دانش۔" جاوید عالی نے کہا مگر میں نے مزید کچھ سنے بغیر فون بند کردیا۔ میرا دل رو رہا تھا۔ یہ بہت برا ہوگیا، آہ بے چارہ عسکری...... کیا درگت بنی ہے اس کی میری وجہ سے۔ خدا، اسے سلامت رکھے، اسے ہر مشکل سے بچائے۔ میں فوراً اٹھ گئی۔ سنہرے سکے واپس اسی جگہ رکھ دیئے بعد میں دیکھوں گی سب کچھ پہلے اس کے پاس جاؤں۔

ہوٹل سے باہر نکل کر ٹیکسی میں بیٹھی اور ڈرائیور کو سینٹرل سول اسپتال چلنے کے لئے کہا۔ راستے بھر اس کے لئے دعائیں مانگتی رہی تھی، اسپتال پر اتری اور استقبالیہ سے معلومات حاصل کیں۔

"جی ہاں۔ گیارہ سو بیس میں اس نام کا زخمی موجود ہے۔ آیئے میں آپ کو وہاں پہنچادوں۔"

"بہت شکریہ۔" میں نے ریسپشنسٹ کے اس تعاون کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس کے ساتھ قدم اٹھادیئے۔

اس نے لفٹ سے مجھے مطلوبہ منزل پر پہنچادیا اور پھر راہداری سے گزر کر گیارہ سو بیس کے سامنے پہنچ گئی۔ میں نے بے تابی سے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوگئی۔ اندر پانچ افراد کھڑے ہوئے تھے جن میں ایک جاوید عالی تھا۔ دو لیڈی پولیس کارکن اور باقی دو دوسرے مقامی افراد تھے، انہیں نظر انداز کرکے میں نے اسپتال کے بستر کی طرف دیکھا مگر بستر خالی تھا، عقب میں آنے والے ریسپشنسٹ نے دروازہ اندر سے بند کردیا تھا۔

"عسکری...... عسکری کہاں ہے۔" میں نے رندھی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"آپ دونوں ہاتھ بلند کردیں۔" مقامی مردوں میں سے ایک نے غراتے ہوئے لہجے میں کہا۔ اور پستول نکال کر اس کا رخ میری جانب کردیا۔

"کیا مطلب؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"تلاشی لو......" پستول بردار شخص نے لیڈی پولیس کانسٹیبل سے کہا اور وہ میرے پاس آ گئی۔ اس نے میری تلاشی لی اور جو کچھ تھا اس نے تحویل میں لے لیا۔

"عسکری کہاں ہے...... تم لوگ بتاتے کیوں نہیں؟"

"یہ بھی آپ ہی بتائیں گی، میڈم کہ وہ کہاں ہے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا......؟"

"آپ نے اپنے ملک کو، ہمارے سفارت خانے کو بری طرح بدنام کردیا ہے مس نشا دانش، اب ہمیں آپ سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ مسٹر پولیس افسر آپ کی مجرم آپ کی تحویل میں ہے۔ اس کے بعد سفارت خانہ خود کو اس ذمہ داری سے بری الذمہ قرار دیتا ہے۔ براہ کرام آپ انہیں اپنی تحویل میں لینے کے اس اقرار نامے پر دستخط کردیں۔ ہم نے اپنا فرض پورا کردیا ہے۔ اس کے بعد اگر یہ آپ کی تحویل سے نکل جاتی ہے تو ہم ذمہ دار نہیں۔"

جاوید عالی نے ایک قلم اور کاغذ نکال کر دوسرے آدمی کے سامنے کردیا۔

"ہتھکڑی لگادو۔" اس دوسرے شخص نے لیڈی پولیس سے کہا اور انہوں نے میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگادیں۔

"خدا کے لئے مجھے عسکری کے بارے میں بتادو۔" میں نے روتے ہوئے کہا۔

"ہمیں اس بارے میں کچھ نہیں معلوم مس نشا دانش، ہم صرف آپ کو گرفتار کرنا چاہتے تھے۔ میں نے

آپ کے فون سے فائدہ اٹھایا اور جھوٹی اطلاع دے کر اسپتال بلایا ہے۔ میں جانتا تھا کہ اگر آپ خود عسکری کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں تو یہاں ضرور پہنچیں گی۔ جس برق رفتاری سے میں نے دوسرے انتظامات کئے...... میں ہی جانتا ہوں۔" جاوید عالی نے کہا۔

"اوہ تو یہ بات ہے۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

"گویا عسکری کے بارے میں تمہیں بھی نہیں معلوم۔"

"بالکل نہیں۔ پروفیسر انا طور صاحب بھی اپنے ہوٹل سے مسلسل غائب ہیں۔ جانے تم لوگوں نے کیا چکر چلایا ہوا ہے، اس بارے میں کچھ بتاؤ گی۔"

میں حقارت سے ہنس پڑی۔

"کچھ دیر کے بعد وہ لوگ وہاں سے چل پڑے۔ جاوید عالی سفارت خانے کی گاڑی میں بیٹھ کر چلا گیا تھا۔ مجھے دونوں لیڈی کانسٹیبلوں کے ساتھ پولیس کار میں بیٹھا دیا گیا۔ اور کار چل پڑی۔

پولیس ہیڈ کوارٹر کی عمارت میرے لئے اجنبی نہیں تھی۔ لیکن اس بار مجھے جس لاک اپ میں رکھا گیا تھا اسے غالباً زیادہ محفوظ تصور کیا گیا تھا۔ بغیر کسی مزید پوچھ گچھ کے مجھے اس میں بند کر دیا گیا۔ جاوید عالی کی مشکل میں جانتی تھی، یہ بہتر ہوا کہ سفارت خانہ مجھے پولیس کی تحویل میں دے کر بری الذمہ ہو گیا۔ لاک اپ میں میرے سوا کوئی نہیں تھا۔ کافی بہتر جگہ تھی، ہر آسائش موجود تھی۔ میں وقت گزارتی رہی۔ عسکری بے چارہ نہ جانے کہاں گیا۔ یہ پتہ ضرور چل گیا تھا کہ وہ مصری پولیس کے ہاتھ نہیں لگا ہے۔ اب اسے کہاں تلاش کروں۔

رات کے تقریباً دو بجے تھے۔ میں بیڈ پر لیٹی چھت کو گھور رہی تھی کہ لاک اپ کے دروازے پر کچھ چہل پہل سی نظر آئی، پھر جو شخص اندر داخل ہوا وہ شناسا سا تھا۔ وہی پولیس کمشنر تھا۔ جس کے بارے میں مجھے علم تھا کہ وہ عثمان امیری وغیرہ کا آلہ کار ہے۔ میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ گہری نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

"تم آخر کیا ہو۔ مجھے تو تمہارے جسم میں کوئی روح حلول محسوس ہوتی ہے۔" اس نے ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"آپ کا تعلق بے شک پولیس سے ہے اور آپ ایک اعلیٰ پولیس افسر ہیں، لیکن کیا اخلاقیات سے آپ کا کوئی تعلق نہیں ہے؟"

"یقیناً تم کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"اس وقت رات کے دو بجے ہیں، اور دنیا بھر میں قیدیوں کو انسان سمجھا جاتا ہے، اس کے علاوہ میں ایک لڑکی ہوں، میرا تعلق بھی آپ کے ملک سے نہیں ہے۔"

"بات اگر تمہارے ہی فائدے کی ہو تو؟"

"کیا اس کے لئے یہ وقت موزوں تھا؟"

"موزوں ترین۔"

"کیوں......؟"

"تم ایک بار پھر پولیس کی تحویل میں آ گئی ہو اور اب تمہارا جرم شدید تر ہو گیا ہے، تمہارے سفارت خانے نے تم پر سے ہاتھ اٹھا لیا ہے۔ اب تمہارا کوئی پرسان حال نہیں ہے۔"

"ہوں......تو پھر......؟"

"اگر تم سمجھتی ہو کہ تمہیں با آسانی تمہارے وطن پہنچا دیا جائے تو یہ تمہاری خام خیالی ہے۔ تم پر مقدمہ چلے گا۔ یہ معلوم کیا جائے گا کہ آخر تم یہاں کیا کر رہی ہو۔ اس کے بعد تمہیں لازمی قید بھی بھگتنا ہو گی۔ پھر کہیں جا کر تمہیں اپنے وطن جانا نصیب ہو گا۔"

"دوسری صورت میں؟"

"تمہارے لئے آسانیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔"

"کیسے......؟"

"ہم سے تعاون کر کے۔"

"اس تعاون کی نوعیت کیا ہو گی......؟"

"یہاں سے نکل کر معلوم ہو گا۔" اس نے جواب دیا اور میں گہری نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔ پھر میں نے مسکرا کر کہا۔

"مسٹر کمشنر، کیا آپ اب بھی خاتون زینا کے

لئے کام کر رہے ہیں؟"
وہ ڈھٹائی سے مسکرا دیا اور بولا۔
"سو فیصد، اس کی وجہ یہ ہے بی بی کہ خاتون زیونا کے مجھ پر بہت احسانات ہیں، عشان اور فیصل میرے گہرے دوست ہیں۔ اور ان تمام باتوں سے بڑی بات یہ ہے کہ مجھے اس کام کے معاوضے کے طور پر جو کچھ ملے گا وہ ناقابل یقین ہے۔"
"آپ شاندار آدمی ہیں کمشنر، لیکن خاتون زیونا کا جرم ثابت ہو چکا ہے اور سنا ہے کہ انہیں سزا بھی ہو گئی ہے۔ شاید موت کی سزا۔"
"ہاں، یہ سب کچھ درست ہے، لیکن ابھی اس سزا کی تکمیل نہیں ہوئی ہے، وہ زندہ ہیں اور زندہ رہنا چاہتی ہیں۔"
"کیسے؟" میں نے دلچسپی سے پوچھا۔
"تمہارے تعاون سے۔ اس تعاون کے صلے میں تمہیں یقین رہائی حاصل ہو جائے گی، اس کے ساتھ ہی اگر تم نقد معاوضہ بھی چاہو تو وہ بھی تمہیں مل سکتا ہے، تمہیں پورے اعتماد سے تمہاری مطلوبہ جگہ پہنچا دیا جائے گا۔ پہلے بھی تمہیں یہی پیشکش کی گئی تھی۔"
"لیکن وہ اس پیشکش میں مخلص نہیں تھے۔"
"تمہاری خام خیالی ہے اور تم نے جلد بازی کی تھی۔"
"اگر میں تیار ہو جاؤں کمشنر تو مجھے کیا کرنا ہوگا۔"
"میرے ساتھ چلنا ہوگا۔"
"کہاں.....؟"
"یہ ابھی نہیں بتایا جا سکتا۔"
"اس بار آپ مجھے یہاں سے کیسے لے جائیں گے۔" میں نے سوال کیا اور کمشنر ہنسنے لگا۔
"میں دس بار تمہیں دس مختلف طریقوں سے لے جا سکتا ہوں، تم معصوم لڑکی ہو، تم نے اتنا بھی نہیں سوچا کہ پچھلی بار بھی تم نے باقاعدہ مجھے اس جرم میں مع ثبوت کے شریک ثابت کیا تھا۔ لیکن مجھ پر کوئی آنچ نہیں آئی اور میں اپنے عہدے پر موجود ہوں۔ میں پولیس کمشنر ہوں، تمہیں معلومات کے لئے آسانی سے لے جا سکتا ہوں۔ میرے خیال میں بہت سوالات ہو گئے۔ اب فیصلہ کرو۔"
"میں تیار ہوں۔"
"خلوص کے ساتھ یا کوئی نئی چال سوچ لی.....؟"
"اس کا جواب میں نہیں دوں گی۔"
"ٹھیک ہے چلو تیار ہو جاؤ۔"
"کمشنر کو واقعی مجھے اپنی گاڑی میں بٹھا کر باہر لے آنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی تھی۔ وہ سب کے سامنے میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگا کر باہر لایا۔ کچھ دور چل کر گاڑی روکی، پھر ہتھکڑی کھول دی۔ یوں لگتا تھا جیسے اسے مجھ پر اعتبار ہو۔ الغرض یہ ایک دلچسپ مرحلہ تھا۔ وہ عمارت بھی اجنبی تھی۔ جہاں وہ مجھے لے گیا تھا۔ لیکن جو لوگ نظر آئے وہ اجنبی نہیں تھے۔ وہ فیصل اور عشان تھے۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے میرا استقبال کیا۔
"یوں لگتا ہے مس نشا دانش کہ ہمارے ستارے آپ سے ملتے ہیں۔ ہم ایک دوسرے سے دور نہیں رہ پاتے، آیئے خوش آمدید۔" ایک وسیع کمرے میں پہنچ کر فیصل نے کہا۔
"اور خوش قسمتی سے اس وسیع کمرے میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس پر آپ ہماری آواز ریکارڈ کر سکیں، یا اس ملاقات کی ویڈیو کیسٹ وغیرہ بنا سکیں۔ اسے آپ سے ملاقات کرنے کے لئے خصوصی طور پر آراستہ کیا گیا ہے۔ اگر آپ کے اپنے لباس میں کوئی ایسی چیز ہوتی تو اس کمرے میں بھیانک آواز میں سائرن بج رہے ہوتے۔"
"ظاہر ہے آپ ذہین لوگ ہیں۔"
"تشریف رکھئے۔" میرے بیٹھنے کے بعد وہ بولا۔
"ہم دونوں بھائی اعتراف کرتے ہیں کہ آپ نہایت پراسرار خاتون ہیں۔ ہم نے آپ کی سرگرمیوں پر بہت غور کیا لیکن کوئی اندازہ نہیں لگا پائے۔ اس دن بھی آپ نے ساحل نیل پر ہمیں ایسا چکمہ دیا کہ ہم آپ کا سراغ نہ پا سکے۔ مس نشا دانش کیا آپ کسی ملک کی

سیکرٹ ایجنٹ ہیں۔ یہاں کوئی خفیہ مشن سرانجام دے رہی ہیں۔"

"آپ صرف یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں؟"

"نہیں بلکہ اگر ایسی بات ہے تو ہم آپ سے تعاون کرسکتے ہیں، ایسا تعاون کہ آپ تصور بھی نہ کرسکیں۔۔۔"

"یہ بات آپ پولیس کمشنر کے سامنے کہہ رہے ہیں۔"

"پولیس کمشنر ہمارے قابل اعتماد دوست ہیں، خاتون زیونا انہیں اپنا تیسرا بیٹا سمجھتی ہیں۔"

"خیر..... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" میں نے صوفے پر گردن ٹکا کر کہا۔

"آپ آخر کون ہیں؟ مس نشا دانش، آخر آپ کے مسلسل یہاں قیام کی کوئی وجہ تو ضرور ہوگی؟"

"ممکن ہے، لیکن اس بارے میں آپ کو بتانا ضروری نہیں سمجھتی، آپ لوگوں سے میرا کیا واسطہ۔" میں نے کہا۔

"ہم نے کو واسطہ پیدا کرنے کی مسلسل کوشش کی ہے، لیکن آپ نے قبول ہی نہیں کیا، مختصر یہ کہ نشا دانش پہلے ہم آپ کو پیشکش کرتے ہیں کہ نہ صرف قاہرہ میں بلکہ پورے مصر میں آپ جو کچھ بھی کررہی ہیں خواہ اس کی نوعیت قانونی ہو یا غیر قانونی، ہم آپ کا ہر طرح ساتھ دینے کے لئے تیار ہیں۔ اگر آپ دولت کی خواہش مند ہیں تو اس دولت کا تعین اپنے ذہن میں کرلیں، ہم آپ کو منہ مانگی دولت دینے کے لئے تیار ہیں۔"

"اس پیشکش کے بعد؟" میں نے مدھم مسکراہٹ سے پوچھا۔

"آپ سے مدد طلب کریں گے۔"

"کیسی مدد؟"

"آپ کو علم ہے کہ خاتون زیونا مشکل کا شکار ہوگئی ہیں۔ انہیں موت کی سزا سنادی گئی ہے۔ وہ ہماری ماں ہیں آپ ان کی زندگی بچاسکتی ہیں۔"

"وہ کیسے......؟"

"امیر غیری کے قتل اور دوسرے جرائم کا اعتراف کرکے۔" فیصل نے کہا اور میں حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ پھر میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"آپ تینوں ہی شاید پاگل ہوگئے ہیں۔ اول تو خاتون زیونا مشکل ثبوتوں کے ساتھ اعتراف جرم کرکے اس سزا کی مستحق قرار پائی ہیں۔ میرے بے تکے اعتراف جرم سے وہ ثبوت باطل نہیں ہوسکتے۔ دوم اگر ایسا ممکن بھی ہوسکے تو اس کے بعد موت کی یہ سزا مجھے دے دی جائے گی۔ اس وقت آپ کی دی ہوئی دولت یا مراعات میرے کس کام آئیں گی۔"

"یہی تو دلچسپ پہلو ہے۔ حکومت مصر آپ کا بال بھی بیکا نہ کرسکے گی، اگر آپ کو سزائے موت بھی دے دی گئی تو ہم آپ کو اس سے بچالیں گے۔ دوسرا اعتراف جرم کا مسئلہ تو اس کے لئے خود آپ کی شخصیت کو سامنے رکھتے ہوئے پھر سے منصوبہ تیار کرلیا ہے۔ آپ ایک سحر زدہ خاتون ہیں، کچھ پراسرار طاقتوں نے آپ کو آلۂ کار بنایا ہوا ہے۔ وہی آپ سے سب کچھ کرارہی ہیں۔ اور انہوں نے ہی خاتون زیونا کے لئے یہ ماحول پیدا کیا ہے کہ امیر غیری کی موت کا جرم ان پر ثابت ہوجائے۔ اس کے ثبوت کے طور پر غیری کا وہ قید خانہ موجود ہے۔ جس میں اس نے زمانہ قدیم کا ماحول پیدا کیا ہے۔ آپ ایک پراسرار کہانی سنا کر خود کو اس طاقت کے زیر اثر بتائیں گی۔ اس سے آپ کے جرم کی شدت کم ہوجائے گی اور ممکن ہے آپ کو سزائے موت نہ سنائی جائے۔ ہمارے پاس ایسا ایک پلان تیار ہے جس کے بارے میں مکمل تفصیل آپ کو اس وقت بتائی جائے گی جب آپ ہم سے تعاون کے لئے تیار ہوجائیں۔"

"فرض کریں مجھے سزا ہوجائے، خواہ وہ کچھ بھی ہو تو پھر آپ کیا کریں گے؟"

"آپ کو باآسانی آپ کے قید خانے سے نکال لیا جائے گا۔ آپ کہیں جانا چاہیں گی تو آپ کو وہاں پہنچادیا جائے گا۔ بلکہ اسی طرح جیسے آپ اس وقت یہاں

موجود ہیں۔ حالانکہ یہ آسان کام نہیں۔"

"واقعی میں اس کا اعتراف کرتی ہوں۔ مسٹر کمشنر با اختیار انسان ہیں۔ یہ بہت کچھ کر سکتے ہیں، لیکن ایک سوال کا جواب دیجئے، اگر آپ مجھے اسی طرح نکال سکتے ہیں تو خاتون زیونا کو اس طرح سزائے موت سے کیوں نہیں بچاتے؟"

"اس سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔"

"کیوں......؟"

"پھر وہ مصر میں منظر عام پر تو نہیں رہ سکتیں۔ انہیں مفرور مجرم کی حیثیت حاصل ہوگی جبکہ آپ کو مصر میں مستقل قیام سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

"ہوں...... یہ بات سمجھ میں آتی ہے، مگر طریق کار کیا ہوگا؟"

"کچھ نہیں۔ بہت آسان...... مسٹر کمشنر، آپ کو واپس قید خانے میں پہنچا دیں گے۔ آپ کے بیانات ہوں گے اور آپ اعتراف کریں گی۔ ظاہر ہے آپ سے آپ کی روپوشی اور وطن واپس نہ جانے کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ آپ ساری کہانی سناتے ہوئے اسی میں اپنے قاتل ہونے کا اعتراف بھی کریں گی۔" فیصل نے کہا۔

"اوہ۔ واقعی یہ تو بہت آسان ہے۔ گویا کمشنر صاحب دوطرفہ کام کر رہے ہیں۔ یہ مجھے نکال کر یہاں لے آئے اور اب ایک ذمے دار افسر کی طرح مجھے واپس بھی پہنچا دیں گے۔"

"آسانی ہے۔" فیصل ہنس کر بولا۔

میں خاموش ہوگئی۔ کچھ دیر سوچتی رہی، پھر میں نے آہستہ سے کہا۔

"ٹھیک ہے میں تیار ہوں۔"

وہ سب خوشی سے اچھل پڑے۔ اس کے بعد ان کے لئے مجھ سے زیادہ چہیتا اور کون ہو سکتا تھا۔ میں نے ان سے بھی عسکری کے بارے میں کہا کہ وہ میرے ساتھی کو تلاش کریں، کمشنر نے وعدہ کر لیا تھا۔ پھر انہوں نے مجھے وہ بیان رٹایا جو مجھے عدالت میں دینا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس طرح خاتون زیونا کا جرم مشکوک ہو جاتا تھا۔ اور شاید اس بیان کی روشنی میں عدالت کو اپنا فیصلہ بدلنا پڑ جاتا۔ میں نے اس بیان کو اچھی طرح یاد کر کے انہیں مطمئن کر دیا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ اس کے صلے میں انہیں میرے لئے کیا کرنا ہوگا۔ میں نے جواب دیا کہ یہ اسی وقت بتاؤں گی جب وہ میرے بیان کے بعد مجھے بچا لیں گے۔ البتہ عسکری کی تلاش کی ذمہ داری میں نے انہیں سونپ دی تھی......

رات کے آخری پہر صبح ہونے سے کچھ پہلے کمشنر نے مجھے واپس لاک اپ میں پہنچایا، بہت دلچسپ صورتحال تھی۔ فیصل اور عشان اپنی ماں کو بچانا چاہتے تھے۔ حالانکہ تینوں ماں بیٹے مجرم تھے۔ انہوں نے دو معصوم بہن بھائیوں کو قتل کر دیا تھا۔ امیر فیری کچھ بھی تھا۔ اس نے کبھی مجھے میلی نگاہوں سے نہیں دیکھا تھا۔ اس بے چارے کا تو دماغ الٹ دیا گیا تھا۔ مجھے بھلا ان قاتلوں کی مدد کرنی چاہئے۔ بدترین گناہ تھا اور وہ خود کو بہت ذہین سمجھ رہے تھے۔ وہ میرے قتل کا اعتراف کرنے کے بعد مجھے سزا ہو جائے گی اور پھر یہ مجھے دودھ سے مکھی کی طرح نکال پھینکیں گے۔ میری طرف پلٹ کر بھی نہیں دیکھیں گے۔ یہی ان کا منصوبہ ہوگا۔ یقیناً عدالت میں اعتراف کے بعد انہیں کیا غرض ہوگی کہ وہ میرے لئے سرگرداں ہوں۔ دیوانے کہیں کے دوسروں کو بے وقوف سمجھتے ہیں۔

لاک اپ میں تین دن گزارنے پڑے۔ کمشنر کے ہاتھ لمبے تھے، اس نے مجھے ہر سہولت فراہم کر دی تھی۔ چوتھے دن مجھے عدالت میں پیش کر دیا گیا۔ اچھا خاصا جرم تھا میرا، میرا چالان پیش کرنے والے نے عدالت کے سامنے پرزور لہجے میں کہا تھا کہ میں پراسرار سرگرمیوں میں ملوث ہوں، اور غیر قانونی طور پر مصر میں قیام کئے ہوئے ہوں۔ میں نے بار بار مصری حکام کو دھوکہ دیا ہے اور روپوش ہوتی رہی ہوں۔ مجھے ایک خطرناک مجرمہ قرار دے کر مجھے ایک بدترین سزا دی جائے اور سزا کی تکمیل کے بعد مجھے مصر سے نکال دیا

جائے۔

معزز جج نے مجھے صفائی کا موقع دیا۔ اس وقت کمرۂ عدالت میں فیصل، عشان اور خود کمشنر بھی موجود تھے۔ غالباً اخباری رپورٹر بھی موجود تھے، میں نے سب پر نگاہ ڈالی اور کہا۔

”معزز جج صاحب! میں ایک سوال کرنا چاہتی ہوں۔ جن پراسرار سرگرمیوں کو مجھ سے متعلق کہا گیا ہے ان کی تفصیل کسی کو معلوم ہے۔ کیا مصری پولیس اتنی ناکارہ ہے کہ وہ مجھ سے ان کی تفصیل نہیں معلوم کرسکی۔ یا خود ان کا پتہ نہیں لگا سکی۔“

”تم کیا کہنا چاہتی ہو......؟“ جج نے کہا۔

”حقیقت تو یہ ہے کہ مصر میں میرے ساتھ سخت زیادتی کی گئی ہے۔ میں ایک تباہ شدہ جہاز کے مسافر کی حیثیت سے یہاں آئی تھی اور اپنے وطن جانا چاہتی تھی کہ سازشوں کا شکار ہوگئی۔ مجھے میرے ہوٹل سے اغوا کرکے قید کرلیا گیا اور پھر دو افراد کو قتل کرکے ان کے قتل کی ذمہ داری مجھ پر ڈالنے کی کوشش کی گئی، میرے ایک نوجوان ساتھی نے جس کا نام عسکری ہے، زندگی کی بازی لگا کر وہ ثبوت فراہم کیے جن کی بنا پر خاتون زبونا اصل قاتل کی حیثیت سے سامنے آئیں۔ میرے سلسلے میں جو ثبوت پیش کیے گئے تھے ان میں یہ بات بالکل واضح ہوچکی تھی کہ پولیس کمشنر صاحب جو اس وقت بھی کمرۂ عدالت میں موجود ہیں میرے خلاف براہ راست سازش میں شریک تھے۔ خاتون زبونا کا جرم ثابت ہونے کے بعد ان کے لیے سزا تجویز کردی گئی اور مجھے بری کردیا گیا۔

میرے سفارت خانے نے مجھے وطن واپس بھجوانے کا بندوبست کیا لیکن خاتون زبونا کے دونوں صاحبزادگان فیصل اور عشان نے مجھے اور میرے ساتھی کو پھر سے اغوا کرلیا۔ وہ مجھے مجبور کرنے لگے کہ میں اس قتل کی ذمہ داری قبول کرکے خاتون زبونا کی سزا رکوادوں۔ اس کے صلے میں وہ مجھے پولیس کی تحویل سے نکال کر میرے وطن واپس بجھوادیں گے۔ پولیس کمشنر صاحب اس وقت بھی ان کے دست راست تھے۔ میری گمشدگی کا تمام عرصہ ان کی قید میں گزرا ہے۔ پھر جب میں نے ان سے تعاون پر آمادگی کا اظہار کیا تو انہوں نے مجھے ایک منصوبے کے تحت آزاد کیا اور مجھے حکم دیا کہ اپنے سفارت خانے سے رابطہ کروں۔ اپنی موت کے خوف سے ان کے ہاتھوں میں کھیلتے ہوئے میں نے وہی کیا جو انہوں نے کہا۔ اس بار میں اس لئے گرفتار کرائی گئی تھی کہ عدالت میں خاتون زبونا کی بے گناہی اور اپنے اصل قاتل ہونے کا بیان دوں۔ یہ بیان سننے کے لئے اس وقت بھی کمرۂ عدالت میں عشان امیری اور فیصل امیری مع اپنے سرپرست کمشنر صاحب کے ساتھ موجود ہیں۔ ورنہ ان کی یہاں موجودگی کا کوئی اور جواز ان سے پوچھا جائے۔

میں معزز عدالت سے ایک غیرملکی مہمان کی حیثیت سے پوچھتی ہوں کہ کیا قانون مصر بکتا ہے؟ کیا اہرامین کی سرزمین میں کھنچے چلے آنے والوں کو ایسا ہی تحفظ حاصل ہے؟ پولیس کمشنر کے خلاف پہلے ہی اتنے ثبوت موجود تھے لیکن ان پر کوئی آنچ نہیں آئی۔ تین دن قبل وہ مجھے نہایت اطمینان سے پولیس لاک اپ سے نکال کرلے گئے اور وہاں ان دونوں حضرات نے مجھے آخری ہدایات دیں اور دوبارہ لاک اپ میں پہنچا دیا۔

جناب والا! میرا ساتھی عسکری ابھی تک لاپتہ ہے ان لوگوں نے اسے ضمانت کے طور پر رکھا ہوا ہے۔ ہم دونوں بخوشی یہاں سے نکل جانا چاہتے ہیں۔ لیکن ہمیں سازشوں کے جال میں جکڑ لیا گیا ہے۔ میں عدالت عالیہ سے درخواست کرتی ہوں کہ میرے ساتھی کو بازیاب کیا جائے۔ اس کی زندگی کا تحفظ کیا جائے۔“

کمرۂ عدالت میں سنسنی پھیل گئی۔ خود جج ششدر رہ گیا تھا کوئی وکیل تک کچھ نہ بول سکا۔ بات بہت سنگین ہوگئی تھی۔ فیصل اور عشان کے ساتھ ہی خود کمشنر صاحب حواس باختہ ہوگئے تھے۔ بالآخر جج نے چیختے ہوئے لہجے میں کہا۔

”مسٹر عشان امیری اور فیصل امیری کیا آپ ایک

لے میں اپنی یہاں موجودگی کی وجہ بتا سکتے ہیں۔“ دونوں گھبرائے ہوئے تھے۔ ان کے منہ سے ایک لفظ نہیں نکل سکا۔ کچھ دیر کے بعد جج نے کہا۔

”غیر ملکی مہمان خاتون نشا دانش کے بیان کی تصدیق کی جائے۔ محکمہ داخلہ خصوصی طور پر ان کے تحفظ کا بندوبست کرے۔ ایک غیر ملکی شخصیت کے بیان پر اس کی طرف سے رپورٹ لکھی جائے، فیصل امیری اور عشان امیری کو فوری حراست میں لے کر ان سے غیر ملکی شخص عسکری کو بازیاب کیا جائے۔

کمشنر صاحب اپنے فرائض سے سبکدوش ہو کر اپنے اوپر لگائے ہوئے الزام کی تحریری رپورٹ پیش کریں۔ نشا دانش کا خصوصی تحفظ کیا جائے۔ کمشنر صاحب چونکہ اس کیس میں خود فریق ہیں، چنانچہ ان سے یہ اختیار لے لیا جائے کہ وہ تنہائی میں اس لڑکی سے ملاقات کرسکیں۔ محکمہ پولیس عدلیہ کے احکامات کی تعمیل کرے۔“

میرا دل بے اختیار قہقہے لگانے کو چاہ رہا تھا۔ ان سب کو میں نے مرغا بنا دیا تھا۔ بڑے طرم خان بنے پھرتے تھے، دولت کے بل پر۔ مجھے غیری کا قاتل قرار دینا چاہتے تھے۔ مزید کھیل شروع ہوگیا تھا۔ ایک بات بروقت سوجھ گئی تھی، پہلے سے ذہن میں نہیں تھی وہ تھی عسکری کے سلسلے میں۔ وہ دیوانہ اگر مصر میں موجود ہے اور میرے لئے خود کو چھپائے ہوئے ہے تو اس طرح وہ کم از کم قانونی مشکلات سے بچ جائے گا۔ اگر کہیں گرفتار ہوگیا تو روپوشی کا مجرم نہیں قرار پائے گا۔ بس اور کچھ نہیں کرسکتی تھی۔

عدلیہ کا فیصلہ تھا، پولیس کی مجال نہیں تھی کہ اس سے انحراف کرتی۔ مجھے پولیس ہیڈ کوارٹر میں لایا گیا اور ایک بالکل محفوظ کمرے میں رکھا گیا تھا۔ یہ عام لاک اپ نہیں تھا۔ کمرہ بھی وسیع تھا۔ مجھے خدمت کے لئے ایک ملازمہ دی گئی، لیکن میری ضرورت ہی کیا تھی۔ لاک اپ کے بستر پر لیٹ کر میں نے حالات کا تجزیہ کیا۔ واقعی لطف آگیا تھا۔ وہ دونوں گدی بری طرح مار کھا گئے تھے۔ جو خود کو نہ جانے کیا سمجھتے تھے اور کمشنر صاحب پتہ چلنا چاہئے۔ ان کے ساتھ کیا ہوا۔

دوسرے دن میں نے اپنی خادمہ سے اخبار طلب کیا تھا جو کچھ دیر کے بعد مجھے حاصل ہوگیا۔ لاک اپ انچارج جو ایک خاتون انسپکٹر تھی۔ دو بار میرے پاس آکر خیریت پوچھ چکی تھی اور بہت خوش اخلاقی سے پیش آئی تھی۔ اخبار پڑھا تو مزا آگیا۔ صحافی کسی لیپی سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ بشرطیکہ کوئی خاص ہی مشکل نہ پیش آجائے۔ میرا پورا کیس شہ سرخیوں کے ساتھ شائع کیا گیا تھا۔ اخبارات نے حکومت اور خاص طور سے محکمہ پولیس پر لعن طعن کی تھی۔ کمشنر صاحب کے بارے میں سوال کیا گیا تھا کہ وہ حکومت مصر کی پولیس سے تعلق رکھتے ہیں، یا خاتون زیونا کے ذاتی ملازم ہیں۔ حکومت سے سوال کیا گیا تھا کہ جب کمشنر صاحب امیر غیری کے کیس میں باقاعدہ ملوث پائے گئے تو ان کے خلاف کیا کارروائی کی گئی۔ وہ کیوں آزاد پھرتے رہے۔ اس کے علاوہ عسکری کے لئے بھی آواز اٹھائی گئی تھی۔ اور اس کے بارے میں فیصل اور عشان سے معلومات حاصل کر کے اسے بازیاب کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔

یوں لگتا تھا جیسے مقامی اخبارات میری آواز بن گئے ہوں، مجھے یہ تفصیلات پڑھ کر بہت لطف آیا تھا۔ اول تو کیس ہی بدل گیا تھا، حالانکہ پہلے میں یہاں ضرورت سے زیادہ قیام اور پراسرار سرگرمیوں میں ملوث ہونے کی مجرم قرار دی گئی تھی، لیکن اب مجھے مظلوم گردانا جارہا تھا۔ اخبارات نے حکام کو الرٹ کردیا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد آرام کررہی تھی کہ عدلیہ اور انتظامیہ کے چند ارکان نے مجھ سے ملاقات کی، ایک معمر شخص نے جو کسی بڑے عہدے پر فائز تھا محبت بھرے لہجے میں کہا۔

”تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا ہم اس پر سخت شرمندہ ہیں۔ لیکن عزیزہ تمہیں اندازہ ہے کہ کالی بھیڑیں ہر جگہ پائی جاتی ہیں۔ اور ہمیشہ ناکامی کا باعث بنتی ہیں۔ خیر ہمیں تمہارے تفصیلی بیانات درکار ہیں۔“

"میں حاضر ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ اس کمرے میں ٹائپسٹ وغیرہ کو بلوایا گیا اور مجھ سے سوالات کئے جانے لگے۔ وہی سب کچھ بتایا تھا میں نے جو عدالت میں کہہ چکی تھی۔ میرے بیانات پر دستخط لئے گئے۔ اس مسٹر نفس نے کہا۔

"اس جگہ کو پولیس لاک اپ نہ تصور کرنا بلکہ اپنی حفاظت گاہ خیال کرنا۔ ہم تمہیں کچھ ضروری کارروائیوں کی تکمیل کے لئے کچھ دن روکیں گے۔ اس کے بعد تمہیں تمہارے وطن روانہ کردیا جائے گا۔ اب یہ حکومت مصر کی ذمہ داری ہے۔"

"میں اپنے ساتھی کے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گی جناب۔" میں نے کہا اور مسٹر نفس سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر اس نے کسی قدر الجھے ہوئے انداز میں کہا۔

"میرا خیال ہے اس کے لئے ضد نہ کرو، اسے تلاش کرکے واپس وطن پہنچانا بھی حکومت مصر کی ذمے داری ہے اور ہم اس ذمے داری کو یقیناً پورا کریں گے، لیکن اگر اس کی بازیابی میں کچھ وقت لگ جائے تو مشکل پیش آئے گی۔ ہم تمہیں مصر میں ایک معزز مہمان کی حیثیت سے مزید قیام کی اجازت دے سکتے ہیں، لیکن تمہارے تحفظ کے خیال سے یہ قیام بہتر نہیں ہوگا۔ پھر بھی کوشش کی جارہی ہے کہ عشان امیری اور فیصل امیری اس نوجوان کا پتہ بتادیں ابھی تک اس سلسلے میں کارروائی کا آغاز نہیں ہوا ہے لیکن اگر انہوں نے شرافت سے زبان نہ کھولی تو مجبوراً تشدد کا سہارا لینا پڑے گا۔ خیر یہ ہمارا کام ہے ہم جس طرح بھی کریں لیکن اس نوجوان کو تلاش کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی جائے گی۔ ویسے ہم تمہارے لئے ہر بہتری کے خواہاں ہیں۔"

"میں بھی چاہتی ہوں جناب کہ وہ میری روانگی سے پہلے دستیاب ہوجائے۔ آپ میرے بزرگ ہیں لیکن آپ کو حقیقت حال سے آگاہ کرنے کے لئے مجبور ہوں۔ اصل میں وہ میرا منگیتر ہے اور ہماری بہت جلد شادی ہونے والی تھی۔"

مسٹر نفس کے چہرے پر تاسف کے آثار نظر آنے لگے۔ اس نے کہا۔

"میری دعائیں اس کے لئے ہیں، براہ کرم تم ہم سے تعاون کرو جن مشکلات کا تم شکار ہوچکی ہو، ہمیں تو درحقیقت انہی پر دکھ ہے۔"

ان کی کارروائی بہت دیر تک جاری رہی۔ پھر وہ اس کی تکمیل کرکے واپس چلے گئے۔ مجھے ہنسی آرہی تھی لیکن عشان امیری اور فیصل امیری اسی قابل تھے۔ ان تینوں ماں بیٹوں نے مل کر دولت اور جائیداد کے حصول کے لئے امیر غیری اور ان کی بہن کو فنا کردیا تھا۔ انہیں سزا ملنی ہی چاہئے۔ عسکری کے معاملے میں بھی میں نے جو کچھ کیا تھا اس سے بہت مطمئن تھی حالانکہ میرے علاوہ کسی اور کو یہ علم نہیں تھا کہ وہ اپنی مرضی سے روپوش ہوا ہے۔ اور نجانے کہاں کہاں بھٹک رہا ہے۔ اگر وہ پولیس کے ہاتھ لگ گیا تو اسے بھی غیر قانونی قیام کا مجرم قرار دیا جائے گا۔ اس طرح وہ اس الزام سے بچ بھی سکتا ہے۔ لیکن اسے گرفتار ہوکر میرے پاس آنا چاہئے تاکہ میں اسے اپنے بیان کے مطابق بیان دینے پر آمادہ کرلوں۔ ممکن ہے وہ خود بھی اخبارات میں تفصیل پڑھ لے اور اس کے مطابق عمل کرے۔ مگر دیوانہ ہے کوئی الٹی سیدھی حرکت نہ کر بیٹھے۔ ایک موہوم سی امید یہ تھی کہ شاید یہ تفصیلات پڑھ کر وہ خود ہی مجھ سے ملنے چلا آئے۔

شام ہوگئی۔ عسکری تو نہ آیا لیکن جاوید عالی کو سرکاری طور پر میرے پاس آنا پڑا۔ بدقسمتی سے یہ شعبہ انہی کے پاس تھا اور وہ اس کے تحت اپنے فرائض سر انجام دینے پر مجبور تھے، جو شکل بنا کر آئے تھے اسے دیکھ کر مجھے ہنسی آنے لگی لیکن خود کو سنبھالے رکھا۔

"مس نشا دانش۔ اگر تقدیر نے ان واقعات سے چھٹکارا دلادیا تو کم از کم دو ماہ کی چھٹی پر ضرور جاؤں گا ورنہ شاید کسی دماغی اسپتال میں داخل ہونا پڑے۔"

"بہتر فیصلہ ہے۔ مجھے خوشی ہوئی۔"

"آپ میرا مذاق اڑانے میں حق بجانب ہیں۔ میں جانتا ہوں، آپ مجھ سے سخت ناراض ہوں گی۔ مگر

مجھے بتایئے کہ میں کیا کرتا۔ آپ کی گمشدگی میں ہمارا ہاتھ تصور کیا جارہا تھا۔ آپ کو علم نہ ہوگا کہ باقاعدہ سفارت خانے پر شک کیا جارہا تھا۔ یہ سوچا جارہا تھا کہ آپ کسی پوشیدہ سرگرمی میں مصروف ہیں اور سفارت خانہ آپ کی مدد کررہا ہے۔ ہمیں اپنی پوزیشن صاف کرنا ضروری تھا۔"

"ٹھیک ہے جاوید صاحب! مجھے خوشی ہے کہ آپ کی پوزیشن صاف ہوگئی۔" میں نے کہا۔

"ایک بات سچ سچ بتایئے کہ آپ اب بھی وطن واپس جانے کے موڈ میں ہیں یا نہیں۔"

"ظاہر ہے اور کہاں جاؤں گی۔"

"میں نہیں مانتا۔ آپ یقین کریں مجھے اس بات پر شک ہے آپ پہلے بھی واپس جاسکتی تھیں، لیکن آپ نہیں گئیں۔ کیوں، میں نہیں جانتا۔"

"یہ آپ کا خیال ہے۔ بھلا اس کی تائید یا تردید کیسے کرسکتی ہوں؟"

"اور وہ شخص۔ عسکری بھی اپنی مرضی سے کہیں روپوش ہوا ہے، انا طور صاحب کا بھی کہیں پتہ نہیں چل سکا۔ شکر ہے وہ ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔ آہ . آپ نجانے کیا ہیں مس نشا دانش، نہ جانے آپ کیا ہیں۔ خدارا اتنا تو بتا دیجئے مجھے کہ آپ یہاں کیا کررہی ہیں۔ حالانکہ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ آپ نہیں بتائیں گی۔"

اب میرے لئے ہنسی روکنا مشکل ہوگیا۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"جاوید صاحب آپ واقعی کافی پریشان معلوم ہوتے ہیں لیکن میں سمجھی نہیں۔ میں نے عدالت میں جو بیان دیا ہے وہ تمام ثبوتوں کے ساتھ ہے۔ فیصل امیری اور عشان امیری گرفتار ہوگئے ہیں۔ کمشنر صاحب کے خلاف کارروائیاں شروع ہوگئی ہیں۔ حکومت مصر کو مجھ پر کوئی شک نہیں ہے۔ صرف آپ میری جانب سے مشکوک ہیں۔ کیا یہ عجیب بات نہیں ہے۔"

"نہیں ہے مس نشا دانش۔ نہیں ہے۔ ایک ایسا نکتہ ہے جس پر حکومت مصر نے غور نہیں کیا لیکن آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں اس پر اسے غور کروانا چاہتا ہوں۔ بہرحال آپ میری ہم وطن ہیں...... مجھے سب سے زیادہ عزیز ہیں۔"

"نکتہ...... کون سا نکتہ......؟"

"مس نشا دانش آپ نے آزادانہ طور پر ٹیلی فون کرکے مجھ سے عسکری کے بارے میں معلومات حاصل کی تھیں۔ اس وقت آپ عشان امیری کی قید میں نہیں تھیں۔ آپ آزادانہ طور پر عسکری کے سلسلے میں معلومات حاصل کرنے میرے پاس تشریف لائی تھیں۔ اگر آپ ان لوگوں کی قیدی ہوتیں تو یہ کیسے ممکن ہوتا اور اس وقت آپ کی کیفیت ایسی بھی نہیں تھی کہ آپ ان کی قید سے فرار ہوکر آئی ہوں۔"

میں نے آنکھیں پھاڑ کر جاوید عالی کو دیکھا، اور وہ پرجوش انداز میں گردن ہلا کر بولا۔

"براہ کرام! اس بات سے انکار نہ کریں۔ یہ صرف میرا اور آپ کا ذاتی معاملہ ہے۔ بہرحال آپ نے جس طرح پانسہ پلٹ دیا ہے وہ ہمارے لئے بھی بہتر ہے۔ ایک بار پھر یہ ذمے داری ہم پر عائد ہوگئی ہے کہ آپ کی واپسی کی نگرانی کریں۔"

"ضرور کیجئے۔" میں نے کہا اور وہ بے بسی سے میری صورت دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔

"آپ واپس جارہی ہیں نا؟"

"کیوں نہیں۔ بلکہ میری رائے ہے کہ آپ دو ماہ کی چھٹی گزارنے کے لئے میرے ساتھ ہی وطن واپس چلیں۔" وہ پھیکے سے انداز میں ہنس دیا۔ پھر مجھ سے اجازت لے کر چلا گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اس کے اس پوائنٹ میں کافی گہرائی تھی اور اسے میرے بیان کے خلاف عشان وغیرہ کے حق میں استعمال کیا جاسکتا تھا۔ دوسروں نے اس پر توجہ نہیں دی تھی۔

دوسرے دن دوپہر کے بعد مجھے لاک اپ سے نکال کر ایک اور خوشنما عمارت میں منتقل کردیا گیا۔ یہ بھی سرکاری عمارت تھی اور اس پر پولیس کا پہرہ تھا۔ یہاں میرے لئے ہر آسائش مہیا کردی گئی تھی۔ مجھے نہ وہاں

کوئی الجھن تھی نہ یہاں۔ اس دوسری رہائش گاہ میں یہ میری پہلی رات تھی۔ میں تمام معلومات سے فارغ ہوکر یہاں بستر پر آرام کرنے لیٹی تھی کہ اچانک باہر زبردست فائرنگ ہونے لگی۔ میرا دل لرز گیا گھبرا کر بستر سے اتری ہی تھی کہ اچانک دو نقاب پوش دروازے پر لات مار کر اندر گھس آئے۔ ان کے ہاتھوں میں ہلکی اسٹین گنیں تھیں۔ دونوں نے مجھ پر بے دریغ گولیاں برسانا شروع کردیں اور میرے بدن میں لاتعداد سوراخ ہوگئے۔ پھر ان میں سے ایک نے شاید پیٹرول بم پھینکا اور کمرے کے فرنیچر نے آگ پکڑلی۔ پورے کمرے میں شعلے بکھر گئے تھے۔

میرے چاروں طرف شعلے لپک رہے تھے۔ دھوئیں کے غول کے غول ابھر رہے تھے۔ چند لمحے جا رہے تھے کہ میرا بدن بھی آگ پکڑلے۔ میرا دم گھٹ رہا تھا اور دل بند ہوا جا رہا تھا کہ حاروش عبداللہ کی آواز سنائی دی۔

"نشاء دانش کیا ہورہا ہے۔" میں چونک پڑی۔ میں نے وحشت زدہ نگاہوں سے اسے دیکھا، اور خوفزدہ لہجے میں بولی۔

"حاروش عبداللہ!.... آگ.... آگ۔"

"آگ؟ کہاں ہے آگ؟" حاروش عبداللہ نے کہا اور میں نے وحشت ناک آگ کو دیکھا۔ لیکن میں تو حاروش عبداللہ کی رہائش گاہ میں، اپنے کمرے میں تھی۔

"میرے خدا.... وہ سب کیا تھا۔ کوئی خواب مگر وہ خواب.... اوہ کیا وہ خواب تھا۔"

حاروش عبداللہ مجھے دلچسپی سے دیکھتا ہوا آگے بڑھا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"کیا تم نے کوئی خواب دیکھا تھا؟"

"پتہ نہیں۔ مگر خواب ایسے نہیں ہوتے۔"

"مجھے اس خواب کے بارے میں بتاؤ۔" اس نے کہا اور میں سہمی ہوئی آواز میں اپنی آپ بیتی اسے سنانے لگی۔ پوری کہانی سن کر اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"گویا تمہاری ایک تصویر ٹھکانے لگی، چلو کوئی حرج نہیں، یہ دلچسپ تجربہ تمہیں اعتماد بخشے گا۔"

"تصویر، تجربہ؟" میں نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

"تمہارا ذہن اسی خوف میں ڈوبا ہوا ہے، ورنہ تمہیں یاد آجاتا کہ میں نے تمہیں تصویروں کے بارے میں کیا بتایا تھا۔ حاروش عبداللہ کی بنائی ہوئی تصویریں حقیقت کا عکس ہوتی ہیں، تم نے جس پہلی تصویر کو اپنا عکس بخشا وہ تمہارا وجود لے کر باعمل ہوگئی۔ تم تو ابتداء سے یہاں ہو تمہاری تصویر تمہارا تصور لے کر باہر نکل گئی۔ اور جو واقعات پیش آئے، اس کے ساتھ پیش آئے، اس عمارت میں جب تمہارے پاس راہ فرار نہ رہی تو تمہارا اس سے رابطہ ٹوٹ گیا۔ اب تمہیں کچھ یاد آیا؟"

"آہ.... تو صرف میری تصویر تھی، لیکن وہ کیا ہوگئی۔ وہ اب کہاں ہوگی؟"

"جل کر راکھ ہوگئی، کاغذ جل ہی جایا کرتے ہیں۔" حاروش عبداللہ نے لاپروائی سے کہا۔ میں حیرت سے اسے دیکھتی رہی۔ پھر میں نے کہا۔

"اور جو کچھ ہوا حاروش عبداللہ کیا وہ سب کچھ حقیقی تھا....؟"

"سو فیصد۔ وہ تم ہی تھیں نشاء دانش، تم ایک نئی کہانی تخلیق کرآئی ہو۔"

"اس طرح تو میں بہت کچھ کرسکتی ہوں۔ اس طرح تو میرے دشمن میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔"

"تمہیں شاید میرے الفاظ پر یقین نہیں آیا تھا۔ میں نے تمہیں پہلے ہی بتایا تھا کہ تصویروں کے روپ میں تم بہت دلچسپ زندگی گزار سکتی ہو۔"

"آہ.... تجربہ کرنے کے بعد میں بہت مطمئن ہوگئی ہوں، میں بہت خوش ہوں، حاروش عبداللہ، تم نے مجھے بہت اعتماد بخشا ہے۔ اسی طرح میں اپنی تمام خواہشات پوری کرسکتی ہوں۔ مجھے دوسری تصویر درکار ہے حاروش عبداللہ....!"

"وہ موجود ہے۔ تمہیں میرے نگار خانے میں جانا

ہوگا۔" میں نے فوراً آمادگی کا اظہار کردیا۔ آج اس نگار خانے کو میں نے نئی نگاہ سے دیکھا تھا۔ یہ ایک طلسمی مصور کی جادوگری تھی۔ میری دو تصویروں کے علاوہ یہاں ہر طرف حارث عبداللہ کی چند تصویریں تھیں۔ باقی تصویریں جل کر خاک ہوچکی تھیں۔ حارث عبداللہ یہاں آکر اداس ہوگیا تھا۔

"میں نے جلد بازی کی جس کے لئے میں خود کو کبھی معاف نہیں کرسکوں گا۔" اس نے افسردگی سے کہا۔

"ہاں...... واقعی وہ شاہکار تھے۔ جنہیں تم نے خود اپنے ہاتھوں جلادیا۔"

"ان میں سے چند تصویریں مجھے دوبارہ بنانی ہوں گی۔ وہ میرے ماضی کے شناسا تھے۔ میرے ہمدم، میرے دوست جو مجھے بہت کچھ سکھاتے سمجھاتے تھے۔" اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ پھر بولا۔

"اپنی ایک تصویر ہمیشہ متحرک رکھو اور خود کو اس کی آڑ میں پوشیدہ۔ ورنہ نقصان اٹھا سکتی ہو۔ یہ دو تصویریں باقی ہیں۔ لیکن موقع ملنے پر میں اور بھی چند تصویریں تخلیق کروں گا تاکہ کوئی خطرہ باقی نہ رہے۔"

میری خواہش پر دوسری تصویر متحرک ہوگئی اور میں اپنی زندگی کے ناقابل یقین دور سے گزرنے لگی۔ اب میں جانتی تھی کہ مجھے کس طرح کامل ہونا ہے۔ اپنے اس روپ سے میں بہت سے کام لینا چاہتی تھی۔ عسکری کی تلاش کے لئے کئی کارروائیاں کرچکی تھی۔ اس تلاش کو جاری رکھنے کی خواہش مند تھی۔ کم از کم میں نے اس کے لئے بہتر فضا پیدا کردی تھی۔ اب اگر وہ پولیس کے ہاتھ لگ گیا تو اسے کوئی سزا نہیں ہوگی بلکہ پولیس اسے اس کے وطن واپس پہنچادے گی۔ وہ سلامت رہے زندہ رہے، میرے لئے یہی خوشی کی بات ہوگی۔

ایک بار پھر شہر قاہرہ میں داخل ہونے کے لئے مجھے ایک کار والے سے لفٹ لینی پڑی تھی۔ ایک نوجوان شخص تھا جو اس علاقے میں کسی پروجیکٹ پر کام کررہا تھا۔ روزانہ آتا جاتا تھا لیکن بے حد شریف آدمی تھا۔ تھوڑی سی باتیں ضرور کی تھیں اس نے لیکن غیر معیاری نہیں۔ اس کے بعد مجھے مطلوبہ جگہ اتار کر چلا گیا۔ یہاں سے میں نے اپنے ہوٹل کا رخ کیا تھا۔ اور اس وقت خوشی ہوئی تھی کہ ہوٹل چھوڑنے میں جلد بازی نہیں کی تھی۔ کم از کم ایک ٹھکانہ تو تھا جہاں میرے لئے خزانہ موجود ہے۔ جو میری مالی مدد کرسکتا ہے۔

میں نے سب سے پہلا کام یہی کیا کہ خاصی تعداد میں سکے لے کر نکل گئی جہاں انہیں رقم میں تبدیل کرنا تھا۔ وہ جگہ مجھے معلوم تھی۔ سونے کے سوداگر نے جو کچھ دیا اسے خوشی سے قبول کرلیا۔ ایک منصوبہ دماغ میں تھا۔ چنانچہ بہت سے اخبارات خریدے اور ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر ہوٹل واپس آگئی، پہلے بھی اس بارے میں اس سے بات کی تھی اور کاؤنٹر منیجر نے میرے حسابات بنا کر رکھے تھے۔ بعد کے اخراجات اس میں جوڑ دیئے گئے اور میں نے اصل رقم سے کافی زیادہ پیشگی رقم ادا کرکے رسید حاصل کرلی۔ اس طرح میں نے ہوٹل کے اس کمرے کو خاصے دنوں کے لئے اپنے نام مخصوص کرالیا۔

پھر کمرے میں آکر میں نے اخبارات کھولے اور پہلے ان کی خبروں پر نگاہیں دوڑانے لگی۔ ذہن میں بس ایک تصور تھا، ذرا دیکھوں تو سہی، میرا واقعہ کہیں درج ہے یا نہیں...... لیکن اخبارات بے خبر نہیں تھے۔ اور بات بھی خاصے اعلیٰ پیمانے پر اٹھی تھی۔ میرے سفارت خانے نے اس سلسلے میں خاصی تگ و دو کا مظاہرہ کیا تھا۔ یہ بات کھل گئی تھی کہ مجھے زیوبا خاندان نے بری طرح اپنے جال میں جکڑ کر بالآخر ہلاک کردیا تھا۔ ایک غیر ملکی لڑکی کی ہلاکت بہرطور حکومت مصر کے لئے بدنامی کا باعث تھی۔

ایک اخبار میں خاصی جلی سرخی کے ساتھ میرے بارے میں تفصیلات لکھی گئی تھیں کہ کس طرح میں ایک تباہ شدہ جہاز کی مسافر تھی اور ہنگامی حالات کے تحت مصر آگئی تھی، یہاں خاتون زیوبا نے اپنے ایک مذموم مقصد کی تکمیل کے لئے میرا انتخاب کیا اور مجھے اغوا کرنے کے بعد مسلسل مشکلات کا شکار رکھا۔ یہاں تک کہ انہوں

نے اپنے بھتیجے امیر غیری کو قتل کرکے اس کا الزام میرے سر تھوپنا چاہا..... لیکن حقیقت حال سامنے آگئی۔ خاتون زیبونا گرفتار ہوگئیں، انہیں سزائے موت دی گئی، جس کی تعمیل پر اسرار طریقے سے ابھی تک نہیں ہوسکی۔

یہ بات وضاحت کے ساتھ کہی گئی تھی کہ اس قتل میں صرف خاتون زیبونا کا ہاتھ نہیں تھا۔ بلکہ ان کے بیٹے بھی براہ راست ملوث تھے۔ لیکن قانونی ڈھیل نے ان دونوں کو آزادی دے دی اور بعد میں انہوں نے میرے خلاف انتقامی کارروائی کرتے ہوئے بالآخر مجھے ایک عمارت میں جلا کر خاکستر کردیا۔ جاوید عالی نے اپنے افسر اعلیٰ کی وساطت سے میرے بارے میں تفصیلی بیان دیا تھا۔ اس عمارت میں میری جلی ہوئی لاش تو دریافت نہیں ہوسکی تھی، لیکن وہ تمام شواہد مل گئے تھے۔ جن سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ فیصل امیری اور عشان امیری نے اپنی گرفتاری کے بعد اپنے ساتھیوں کے ذریعے مجھ سے انتقام لیا..... اور میں جو اپنے وطن جانے کے لئے تیار بیٹھی ہوئی تھی، موت کا شکار کردی گئی۔

مجھے یہ خبر پڑھ کر ہنسی آرہی تھی، لیکن اس کی خوشی بھی تھی کہ بالآخر عشان اور فیصل بھی کیفر کردار کو پہنچے۔ امیر غیری اور ظہورہ کی ہلاکت کے بعد وہ جائیداد ان کے قبضے میں بھی نہیں آسکی۔ یہ خبر پڑھ کر میں بہت دیر تک اس پر غور کرتی رہی تھی، اصل میں اخبارات میں نے ایک اور مقصد کے تحت خریدے تھے۔ میں نے ان کے پتے دیکھے۔ ٹیلی فون نمبر بھی موجود تھے۔ میں نے بالآخر کاغذ اور قلم حاصل کرکے ایک اشتہار لکھا، جس کا مضمون یوں تھا۔

"میں اس سے مخاطب ہوں، جس نے میرے ساتھ مشکلات کا سفر کیا، میرا تحفظ کیا، مجھ سے محبت کی اور جب ہماری قربتوں کا وقت آیا تو کچھ حادثات نے مجھے اس سے جدا کردیا اور اب وہ مجھ سے ناراض ہوکر روپوش ہے۔ میں اسے مخاطب کرتے ہوئے کہتی ہوں کہ مجھ سے فوراً آکر اس پتے پر ملے، میں اس کی منتظر ہوں، حوالے کے لئے درمیانی کردار مینا کا نام لیا جاسکتا ہے۔ لیکن اب وہ ہمارے درمیان نہیں..... میں اس کا انتظار کررہی ہوں۔ نام اس لئے نہیں لکھوں گی کہ کچھ مشکلات درپیش ہیں۔"

عسکری احمق نہیں تھا۔ بس اشتہار اس کی نظر سے گزر جائے، تو یقینی طور پر وہ ادھر کا رخ کرے گا۔ اس اشتہار کے مضمون کا جائزہ لے کر اور اس سے مطمئن ہونے کے بعد میں نے ٹیلی فون اٹھایا اور اخبار کا نمبر ڈائل کرکے متعلقہ شعبے سے گفتگو کرنے کی خواہش کا اظہار کیا..... متعلقہ شعبے کے انچارج سے میں نے پوچھا کہ اس مضمون کا اشتہار اگر میں اخبار کو دوں تو اس کے لئے مجھے کوئی مشکل تو نہیں پیش آئے گی..... اس نے مجھ سے کہا کہ تلاش گمشدہ کی حیثیت سے یہ اشتہار دیا جاسکتا ہے اور اس پر کوئی قانونی پابندی نہیں عائد ہوتی۔ میں نے اس سے کہا کہ تین دن کے لئے یہ اشتہار بک کرے، میں اشتہار کا مضمون مع رقم بھیج رہی ہوں

اسی طرح کی گفتگو میں نے دوسرے اخبارات کے متعلقہ شعبوں سے بھی کی۔ تین اخباروں میں یہ اشتہار میں نے تین تین دن کے لئے بک کرادیا۔ اور پھر اس سلسلے میں ایک ویٹر کی خدمات حاصل کیں۔ جس نے کہا کہ وہ یہ کام کرکے مجھے رسید لادیتا ہے۔ اس کے لئے وہ دوسرے آدمی کو بھیجے گا کیونکہ وہ خود ڈیوٹی پر ہے۔ میں نے اسے خاصہ انعام دیا تھا، جو اس کے لئے تسلی بخش تھا۔ بس اتنا ہی کام کرنا تھا آج مجھے۔ اس کے بعد انتظار کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ میں مطمئن تھی۔ بات وقت گزرنے ہی کی تھی نا..... سو میں وقت گزار رہی تھی۔

دوسرے دن کے اخبارات میں وہ اشتہار آگیا۔ پھر تیسرے اور چوتھے دن بھی اشتہار چھپا۔ میں منتظر رہی۔ ہر لمحہ میرے کان آہٹوں پر لگے ہوئے تھے۔ لیکن میرے اشتہار کا کوئی جواب نہیں آیا۔ میں مایوسیوں کی حد میں داخل ہوگئی تھی۔ عسکری کا ملنا اب مشکل ہی ہوگیا تھا۔ اس سے زیادہ مزید وضاحت کے ساتھ میں اشتہار نہیں دے سکتی تھی۔ کیونکہ صورتحال میرے لئے

خطرناک ہوجاتی اور ہوسکتا ہے میری یہ آزادی خطرے میں پڑ جاتی۔ لیکن تیسرے دن کسی نے میرے دروازے پر دستک دی اور میں نے اسے اندر آنے کی اجازت دے دی۔

آنے والا ایک دراز قامت خوش پوش اور خوش شکل جوان آدمی تھا، عمر بتیس سے پینتیس کے درمیان ہوگی، کسی قدر جھکتا ہوا اندر آیا، میں اسے دیکھ کر ذرا سنبھل گئی۔ تاہم میں نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھا تو وہ بولا۔

"خاتون انتہائی معذرت خواہ ہوں، اس کمرے کے حوالے سے ایک اشتہار اخبار میں چھپتا رہا ہے۔ اس کے سلسلے میں حاضر ہوا ہوں۔"

"ہاں...... ہاں! آیئے تشریف لایئے۔ آپ اس اشتہار کے بارے میں کیا کہنا چاہتے ہیں؟" میں نے سمجھا کہ وہ عسکری کے بارے میں کچھ جانتا ہے۔

وہ بیٹھ گیا اور پھر آہستہ سے بولا۔

"میں ایک موہوم سی امید پر یہاں آیا تھا۔ لیکن آپ کو دیکھ کر مجھے مایوسی ہوئی۔ آپ وہ نہیں ہیں جس کے تصور میں، میں نے یہاں تک آنے کی جرأت کی، معاف کیجئے گا میرا نام طاہر نظیر ہے۔ نیچ کا رہنے والا ہوں۔ میں ایک بہت اچھی فرم میں ملازمت کرتا ہوں۔ اصل میں میرا واقعہ بھی کچھ اسی قسم کا ہے۔ میری ایک دوست تھی جس کا نام ستارہ تھا۔ کچھ ایسے ہی وقعات میرے اور اس کے درمیان پیش آئے وہ ایک الجھن کا شکار ہوگئی تھی۔ میں نے اس کی مدد کی، ہمارے درمیان محبتوں کے رشتے استوار ہوگئے۔ بس ایک نام کھٹک رہا تھا، مجھے اور وہ نام تھا غنا، میں پھر بھی تصدیق کے لئے چلا آیا۔ آپ کو زحمت دینے کے لئے معافی چاہتا ہوں، بس اجازت دیجئے۔"

"اگر آپ کچھ دیر میرے پاس تشریف رکھیں مسٹر طاہر تو مجھے خوشی ہوگی......"

"میں تو صرف اس لئے اٹھ رہا تھا خاتون کہ کہیں آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں ایسے کسی اشتہار کا سہارا لے کر آپ سے فراڈ کرنا چاہتا ہوں۔"

"نہیں جو اس قسم کے لوگ ہوتے ہیں، وہ نگاہوں سے چھپ نہیں پاتے، آپ کیا پینا پسند کریں گے۔"

"کافی منگوالیجئے بشرطیکہ آپ بھی پسند کریں۔"

میں نے ویٹر کو طلب کرکے کافی اور کچھ لوازمات لانے کے لئے کہا...... وہی تنہائی، وہی بے کلی اور اس میں کسی کی قربت کے تصور نے مجھے اس شخص کو روکنے پر مجبور کردیا تھا۔ کافی کے دوران اس نے مجھے اپنی دوست ستارہ کی کہانی سنائی۔ میں اس کہانی کے تانے بانے کو ٹٹولتی رہی، جھوٹی کہانی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ ویسے بھی وہ ایک سنجیدہ نوجوان تھا جس کے چہرے پر شوخی نہیں تھی۔ میں نے خود بھی اسے اپنے بارے میں ایک جھوٹی کہانی سنائی۔ اب ان جھوٹی کہانیوں کو گھڑنے میں مجھے کوئی دقت نہیں ہوتی تھی، میں اچھی خاصی دنیا دار ہوگئی تھی اور دنیا کو سمجھنے لگی تھی۔ میں نے اپنی کہانی سے اسے مطمئن کردیا۔ اس نے مجھ سے ہمدردی کا اظہار کیا اور کہا۔

"ہوسکتا ہے آپ کا ساتھی باقاعدہ اخبار نہ پڑھتا ہو...... لیکن اگر وہ تعلیم یافتہ ہے تو ان تین دنوں کے اخباروں میں کسی نہ کسی اخبار کا اشتہار اس کی نگاہوں سے گزرے گا آپ کو انتظار کرلینا چاہئے، ویسے میرے لائق اگر کوئی خدمت ہو تو بتایئے مجھے خوشی ہوگی۔"

میں نے اس سے کہا کہ بس وہ مجھ سے ملاقات کرتا رہے۔ عسکری کے سلسلے میں مزید دو تین دن تک انتظار کیا۔ طاہر اس دوران دو بار میرے پاس آیا اور دو تین بار اس نے مجھے ٹیلی فون کیا۔

صاف ستھرے ذہن کا آدمی تھا۔ میرے ذہن پر کسی طور بار نہیں بنا...... بالآخر عسکری کی بازیابی سے مایوس ہوگئی۔ اب اس کے سلسلے میں جدوجہد کرنا بے سود تھا۔ ہوسکتا تھا وہ خاموشی سے مصر سے نکل گیا ہو۔ ویسے بھی بے کار ہی تھا، مل بھی جاتا تو زیادہ سے زیادہ کیا کرسکتی تھی۔ سوائے اس کے کہ اسے وطن واپسی کی تلقین کرتی۔ چنانچہ اب اسے بھول جانے کے سوا چارہ کار

نہیں تھا۔ کئی دن گزر چکے تھے۔

ایک صبح جاگی تو ذہن پر وادی ارمناس کا خیال سوار تھا۔ دل میں یہ آرزو تو تھی کہ دوبارہ وہاں جاؤں۔ پہلی بار تو کچھ عجیب سی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ لیکن اب پورے اعتماد سے اس کا تجربہ کرنا چاہتی تھی۔ اس کے لئے کیا طریقہ کار اختیار کروں۔ ایک بار دل چاہا کہ طاہر کو ساتھ دینے پر آمادہ کروں، لیکن یہ مناسب نہیں تھا۔ اس بے چارے کی زندگی کیوں خطرے میں ڈالوں۔ جو کچھ بھی ہے خود ہی بھگتوں، یہی بہتر ہے پھر ضروری تیاریاں کرکے اس خیال سے جلد ہوٹل سے نکل آئی کہ کہیں طاہر نہ آجائے، سارا پروگرام خراب ہوجائے گا، ایک ٹیکسی ڈرائیور سے بات کی۔

"بادشاہوں کی وادی چلوگے؟"

"بسر و چشم میڈم۔" اس نے ادب سے کہا اور میں ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔ باادب ڈرائیور نے ٹیکسی آگے بڑھادی۔ اپنا ٹریول کٹ میں نے قریب ہی رکھ لیا تھا۔ جس میں ضروریات کا مختصر سامان تھا۔ ڈرائیور نے کہا۔

"اگر آپ واپسی کے لئے مجھے وہاں روکے رکھیں خاتون تو میں کسی اضافی معاوضے کے بغیر آپ کا منتظر رہ سکتا ہوں۔ واپسی میں مجھے صرف وہی عطا کیجئے گا جو میرا بل بنے......"

میں نے فوراً ہی اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ بتدریج اس سے سودے بازی کرنا چاہتی تھی۔ کچھ دیر کے بعد میں نے اس سے کہا۔

"تم اپنی ٹیکسی لے کر قاہرہ سے کتنے فاصلے تک چلے جاتے ہو؟"

"جہاں تک کی سواری مل جائے میڈم، ہمیں تو اپنے کام سے غرض ہے۔ ہاں بس رات تک واپسی ضروری ہوتی ہے۔" ڈرائیور نے جواب دیا۔

"ہوں... کیا تم مجھے وادی رتاب تک لے جاسکتے ہو، جو ماضی میں وادی ارمناس یا ارمناس کہلاتی تھی...؟ ڈرائیور نے حیرانی سے گردن گھما کر مجھے دیکھا پھر بولا۔

"وادی ارمناس کے بارے میں تو میں کچھ نہیں جانتا، لیکن آپ جسے وادی رتاب کہہ رہی ہیں، ہولناک ریگزار ہے، جہاں لوگ جانا پسند نہیں کرتے، کیونکہ ریگزار کے ساتھ ایسی داستانیں وابستہ ہیں، جن میں لوگوں کو نقصان پہنچنے کی کہانیاں سنائی گئی ہیں اور چند ایسے بزرگ بھی ملے ہیں جنہیں وہاں پہنچنے والے نقصانات کا ذاتی تجربہ بھی ہے، مجھے صرف اس بات پر حیرت ہے خاتون کہ آپ وہاں کیوں جانا چاہتی ہیں، وہاں آپ کو ریت کے ٹیلوں کے علاوہ کچھ نہیں ملے گا۔"

"سنا ہے وہاں ریت کے ٹیلوں میں قدیم اہراموں کی چوٹیاں بھی جھانکتی ہیں، کیا ایسا نہیں ہے۔"

"ہوسکتا ہے، کیونکہ صحرائے مصر میں نہ جانے کہاں کہاں قدیم داستانیں بکھری پڑی ہیں، لیکن ان اہراموں کا رخ کرنا بھی خطرناک ہوسکتا ہے۔ تاہم اگر آپ حکم دیں گی تو میں ریگزار رتاب کی سیر کراسکتا ہوں آپ کو...... ویسے اب میں سمجھا کہ آپ سیاح ہیں۔ اصل میں دیکھنے کی تو بہت سی چیزیں یہاں موجود ہیں۔ لیکن اپنے اپنے مزاج اور اپنی پسند کی بات ہے، تو کیا آپ ریگزار رتاب جانا چاہیں گی؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں... تم مجھے سیدھے وہیں لے چلو۔"

"آپ ضرور چلئے وہاں۔ ایک نگاہ جائزہ لے لیجئے۔ واپس لانے کے لئے میں خود موجود رہوں گا، آپ کو خود ہی اندازہ ہوجائے گا کہ آپ غلط جگہ آگئی ہیں۔" اس کے بعد خاموشی طاری ہوگئی۔ ڈرائیور بہت زیادہ باتونی نہیں تھا... لیکن پھر بھی اس نے مجھے ایک سیاح سمجھ کر قاہرہ اور اس کے نواح کے بارے میں بہت سی باتیں بتائیں۔ مجھے اس کا گفتگو کرنا برا نہیں لگ رہا تھا۔ وادی ارمناس میں پیش آنے والے ہولناک واقعات اب بھی میرے ذہن میں تھے۔ وادی کے مناظر میری نگاہوں میں گھوم رہے تھے اور اس کے ساتھ ہی اناطور یاد آرہا تھا۔ اس پر دیوانگی سی سوار ہوگئی تھی۔ ہوسکتا ہے ریت کے کسی ٹیلے کے درمیانی حصے میں مجھے اس کی ہڈیاں بکھری ہوئی نظر آجائیں......

بہت دیر تک میں انہی خیالات میں گم رہی۔
صحرائے مصر کی روایتی گرمی، ہمارے ساتھ سفر کررہی
تھی۔ ماحول بدل رہا تھا۔ نواحی علاقوں میں کبھی کبھی
دریائے نیل کی نمی جذب کئے ہوئے ہوا کے جھونکے
آتے تو یہ محسوس ہوتا کہ درمیانی حصہ ٹھنڈا ہے لیکن بس
یہ جھونکے ہی ہوتے اور آگے یہ ہوائیں پھر گرم ہواؤں
میں تبدیل ہوجاتیں۔

جس وقت ہم وادی ارمناس پہنچے تو سورج اپنی
بلندیاں عبور کرکے واپسی کا سفر طے کررہا تھا۔ صحرائے
اعظم نگاہوں کے سامنے بکھرا ہوا تھا۔ ڈرائیور کا خیال
تھا کہ وہاں کچھ نہ پاکر اور گرمی کی شدت سے پریشان
ہوکر میں اسے فوری واپسی کے لئے کہوں گی۔ اس نے
ایک جگہ ٹیکسی روک دی اور کہنے لگا۔

"آپ دیکھ لیجئے یہاں دور دور تک کسی ذی روح
کا نشان نہیں۔ اس بات سے ہی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ
ریگزار انسانوں کی توجہ کا مرکز نہیں ہے۔ لیکن اس کے
باوجود آپ ضرور اپنی خوشی پوری کیجئے اور یہاں کی
سیر کیجئے۔ میں آپ کا انتظار کروں گا یا پھر حکم ہو تو میں
آپ کے ساتھ چلوں۔"

"نہیں..... اس پیش کش کا شکریہ! یہاں تک تمہارا
بل کتنا بنا۔" میں نے پوچھا اور ڈرائیور نے مجھے رقم بتادی۔
میں نے اس رقم کو دوگنا کرکے اسے دیتے ہوئے کہا۔

"میری طرف سے اجازت ہے کہ اگر راستے میں
تمہیں کوئی سواری مل جائے تو اسے قاہرہ لے جانا،
فاصلے تو دونوں طرف کا کرایہ تمہیں مل چکا ہے۔ اب یہ
اتنی ہی رقم اور رکھو، دو دن کے بعد اگر ممکن ہو تو ایک
گھنٹے میرا انتظار کرلینا نا ہو تو واپس چلے جانا، تمہارا
نقصان نہیں ہوگا۔"

ڈرائیور نے حیرت سے منہ کھول کر پہلے اس رقم
کو دیکھا پھر مجھے اور اس کے بعد اس نے بزرگانہ
انداز میں کہا۔

"عالیہ! میں بے شک ڈرائیور ہوں اور مجھے وہی
کرنا چاہئے جو آپ نے حکم دیا لیکن انسانی رشتے سے
میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں، جو کچھ آپ کررہی ہیں
غیر دانشمندی ہے، آپ دو دن کی بات کرتی ہیں۔ ذرا
اس گرم ریگستان میں آپ دو گھنٹے گزار لیجئے۔ آپ اپنا
فیصلہ بدل دیں گی۔ یہاں چند گھنٹے زندہ رہنا مشکل
ہے۔ آپ دو دن کیسے زندہ رہ سکیں گی۔ میری گزارش
ہے کہ یہ فیصلہ بدل دیں۔"

"تمہاری ہمدردی اور نصیحت کا شکریہ۔ میں
دراصل پاگل ہوں اور ایسے ہی دیوانگی کے فیصلے کرتی
ہوں اور ان پر اٹل ہوتی ہوں۔ ایک بار پھر شکریہ۔ اب
تم جاؤ۔"

میں نے ریگستان کی طرف قدم اٹھادیئے۔ وہ بھی
کچھ ضرورت سے زیادہ ہی جھکی انسان تھا۔ بوکھلائے ہوئے
انداز میں نیچے اترا اور میرے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ وہ
مجھے مسلسل سمجھا رہا تھا۔ لیکن میں آگے بڑھتی جارہی
تھی۔ پھر اسے اپنے بہت دور نکل آنے کا احساس ہوا
اور وہ رک گیا۔

"رک جایئے عالیہ..... میری بات مان لیجئے۔"
اس نے کہا۔

میں مسکراکر اس کی طرف پلٹی اور میں نے آنکھیں
بند کرکے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"تمہارا شکریہ مہربان شخص۔ اب تم جاؤ۔" میں
نے آگے قدم بڑھادیئے۔ وہ چند لمحات کھڑا رہا، پھر ہوا
کے گرم جھکڑوں سے پریشان ہوکر واپس پلٹ پڑا۔ کچھ
دیر کے بعد میں نے ایک بلند ٹیلے پر چڑھ کر دور جاتی
ہوئی ٹیکسی کو دیکھا۔ اور مسکراتی ہوئی نیچے اتر آئی۔

طلسمی ریگستان نگاہوں کی انتہا تک پھیلا ہوا تھا۔
اور ریت چاندی کی طرح چمک رہی تھی۔ میں آگے
بڑھتی رہی۔ ہوا بے شک گرم تھی۔ اور دھوپ جھلسا
دینے والی لیکن میں ہر احساس سے بے نیاز صرف
تجسس میں ڈوبی آگے بڑھ رہی تھی۔ میں پورے
اندازے سے اسی سمت بڑھ رہی تھی لیکن ہواؤں نے
یہاں اپنی مملکت قائم کررکھی تھی۔ وہ ریت کو جو شکل
چاہتی دے دیتی تھیں۔ چنانچہ اب دلکش ڈیزائن اور

عدنان شائی کے پنجروں کا کوئی نشان موجود نہیں تھا۔ نہ ہی مجھے اناطور کا جسم نظر آیا۔

میں نے بہت فاصلہ طے کرلیا تھا۔ سورج اب ڈھل رہا تھا اور دھوپ کی تیزی ختم ہوگئی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ ریت پر شام اترنے لگی۔ فضا کا حبس بھی کم ہوگیا۔ اور ہوائیں ٹھنڈی ہونے لگیں۔ مجھے ذرا بھی تھکن محسوس نہیں ہوئی تھی۔ نہ ہی گرم دن مجھ پر اثر انداز ہوا تھا۔ اب ریت کے ٹیلوں میں کہیں کہیں سیاہ دھبے نظر آنے لگے تھے۔ یہ ریت میں دفن اہرام تھے۔ لیکن ان کی گہرائیوں تک جانے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

بالآخر رات ہوگئی۔ میں نے ایک چوڑے ٹیلے پر اپنا ٹھکانہ بنایا اور ٹریول کٹ اس پر پھینک کر بیٹھ گئی۔ وادی ارمتاس میں پہلی رات...... میں نے دل میں سوچا کہ دیکھوں یہ رات کیسی گزرتی ہے۔ یہ جگہ بہتر تھی۔ دور دور تک کے نظارے ہورہے تھے۔ وہ تمام داستانیں میرے ذہن سے گزرنے لگیں۔ جو میں نے سنی تھیں۔ ہواؤں میں تیزی نہیں تھی اور وہ بھی ریت کو چھوتی گزر رہی تھی۔ ہوا کے جھونکوں سے کہیں کہیں ریت ہولے ہولے متحرک ہوجاتی اور یوں لگتا جیسے کوئی ذی روح رینگ رہا ہو۔

پھر ان داستانوں کی تصدیق ہونے لگی، جونہی چاند نے سر ابھارا ہوائیں تیز ہونے لگیں۔ انہوں نے ایک خاص انداز اختیار کرلیا۔ وہ چاروں طرف ٹیلوں سے ٹکرا کر بھنور کی شکل اختیار کرگئیں۔

یہ بھنور ریت کو بلند کرکے بگولے کی شکل اختیار کرگیا اور اس میں ستارے چمکنے لگے۔ یہ ستارے اصل میں ریت میں شامل ذرات تھے جو چاندنی سے منعکس ہونے لگتے، لیکن امیر غیری نے ان کی جو نقشہ کشی کی تھی۔ ہو بہو نگاہوں کے سامنے تھی۔ بڑا طلسمی ماحول تھا، کئی بگولے میرے سامنے سے گزرے اور میں ان میں کھلنے والے دروازوں کی منتظر رہی لیکن بگولے گزر جاتے تھے۔ ان میں کوئی دروازہ نہ کھلا۔

بہت دیر تک میں ہواؤں کی اٹھکیلیاں دیکھتی رہی۔ منظر واقعی ایسا تھا کہ کچے ذہن کا انسان دماغی توازن کھو بیٹھے۔ بگولوں کی تعداد اب بڑھ گئی تھی۔ لیکن اب وہ گہرائیوں ہی میں تھے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے یہ ٹیلا جس پر میں بیٹھی ہوئی تھی بلند ہوگیا ہو کیونکہ گہرائیاں زیادہ محسوس ہونے لگی تھیں۔ میں دور دور تک نگاہیں دوڑا رہی تھی۔

پھر اچانک میں اچھل پڑی۔ میں نے جو کچھ بھی دیکھا وہ نظری دھوکہ نہیں تھا۔ وہ کوئی انسان ہی تھا۔ جو ریت پر قدم اٹھاتا چلا آرہا تھا۔ چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا اور میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس انسانی وجود کو دیکھ رہی تھی جو اسی سمت آرہا تھا۔ پھر میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ سنہری حسینہ جو روشاق کی نمائندہ تھی۔ روشاق کو میری یہاں آمد کا علم ہوگیا تھا۔

آہ اب وہ کھیل شروع ہوگیا جس کی میں نے توقع کی تھی۔ شلزانہ اوشیانوس کی آمد بے معنی نہیں تھی۔ میں تیار ہوگئی۔ میرا یہاں آنا بے کار نہیں گیا تھا۔ مجھے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ چند لمحات کے بعد وہ ٹیلے پر چڑھ آئی۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ تم بہت دلیر لڑکی ہو۔" اس نے حسین آواز میں کہا۔

"اور تم؟" میں نے سوال کیا۔

"میں بھی نہیں؟"

"اس وقت تمہارے گلے میں روشاق کی آواز نہیں سنائی دی۔"

"ہاں اس وقت میں آزاد ہوں۔"

"جب تم آزاد ہوتی ہو تو کیا ہوتی ہو؟"

"شلزانہ اوشیانوس۔" اس نے ہنس کر کہا اتنی پیاری ہنسی تھی کہ دل میں اتر جائے۔

"تمہاری اپنی بھی تو کوئی کہانی ہوگی؟"

"شاید کبھی تھی اب نہیں ہے۔"

"گویا تمہیں اپنے بارے میں بتانے کی اجازت نہیں ہے۔"

"میں صرف تراوزی کی غلام ہوں اور کچھ نہیں۔ مجھ سے اس کے بارے میں پوچھو میرے بارے میں کچھ پوچھنا بے کار ہے۔"

"خوب۔ چلو ٹھیک ہے، تراوزی اس وقت کہاں ہے؟"

"اپنے دانش کدے میں۔"

"اور اس کا دانش کدہ کہاں ہے؟"

"جس سمت سے میں یہاں آئی ہوں اسی سمت۔"

"کتنی دور ہے؟"

"بہت فاصلہ نہیں۔"

"کیا میں وہاں جا سکتی ہوں؟"

"میں اس کی اجازت سے یہاں آئی ہوں وہ خود تم سے ملنا چاہتا ہے۔"

"اسے میری یہاں آمد کا علم ہے؟"

"وہ وادی ارمتاس کا شہنشاہ ہے اس وادی میں جو کچھ ہوتا ہے اسے پتا ہوتا ہے۔"

"اس کے باوجود وہ ٹیلوں میں ماضی کے دروازے نہیں تلاش کر سکا۔" میں نے طنزیہ کہا۔

"یہ ایک احمقانہ روایت ہے، جس میں کوئی صداقت نہیں، ہوا کے شور سے اڑتی ہوئی ریت بے حقیقت ہوتی ہے اس میں بھلا دروازوں کا کہاں وجود ہے۔"

"اوہ ظاہر ہے تمہیں اس کا صحیح علم ہوگا۔"

"تو پھر چلو تراوزی تم سے ملاقات کا خواہش مند ہے۔" اس نے کہا۔ اور میں تیار ہوگئی۔ سنہری لڑکی واپس چل پڑی۔ دن کی ہولناک گرمی کا اب نام ونشان نہیں تھا۔ ریت کی کہکشاں قدموں تلے بکھری ہوئی تھی۔ میں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔

"کیا روشاق نادیدہ کیفیت میں مجھ سے ملاقات کرے گا؟"

"یہ میں کیسے جان سکتی ہوں۔" اس نے جواب دیا۔ اس کے بعد میں نے اس سے کوئی سوال نہیں کیا۔ ہمیں خاصا طویل سفر کرنا پڑا۔ راستے میں ریت سے ڈھکے ہوئے ٹیلے اہراموں کی چوٹیاں نظر آئیں، مصر کی بہت بڑی تاریخ ریت کے نیچے دفن ہے۔ اگر کبھی کسی صدی نے مصر کے صحراؤں سے یہ ریت صاف کی تو یقیناً اس سے مصر کی ایک اور تاریخ برآمد ہوگی۔

میں سوچوں میں ڈوبی آگے بڑھتی رہی۔ سنہری لڑکی ریت کے ایک ٹیلے کے پاس رک گئی۔ اور میں نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔ یہاں تو کوئی ایسی جگہ نظر نہیں آ رہی تھی جہاں کسی دانش کدے کی موجودگی کا امکان ہو۔ لیکن چند ہی لمحات کے بعد اس ٹیلے کی ریت نیچے کھسکنے لگی۔ جس کے سامنے آ کر وہ کھڑی ہوئی تھی۔ غالباً اندر سے کوئی عمل ہو رہا تھا۔ میں حیرانی سے ٹیلے کی کھسکتی ہوئی ریت کو دیکھتی رہی۔ اس کے نیچے سے پتھر کی ایک سل برآمد ہوئی تھی، سیاہ رنگ کی کائی زدہ سل خود بخود ایک دروازے کی مانند کھل گئی اور شلزانہ اوشیانوس نے مجھے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر اطراف کے ماحول پر نظر ڈالی۔

تاحد نگاہ ایسے بے شمار ٹیلے بکھرے ہوئے تھے اور کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ریت کے ان ٹیلوں میں چھپے ہوئے اہرامین کا دروازہ اس طرح بھی کھل سکتا ہے۔

بہرحال میں اس کے اشارے پر بے دھڑک اندر داخل ہوگئی۔ مدہم مدہم روشنی میں سیڑھیاں نیچے اترتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ پتھریلی ناہموار، ٹوٹی پھوٹی، بوسیدہ سیڑھیاں، گہرائی میں کتنی دور چلی گئی تھیں۔ اس کا اندازہ اس مدہم روشنی میں ہونا ممکن نہیں تھا۔ میں بلا تردد ان سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگی۔ شلزانہ اوشیانوس کے بدن سے پھوٹنے والی مدہم مدہم سنہری روشنی سیڑھیوں کو اجاگر کرتی چلی جا رہی تھی۔ اور وہ مجھ سے آگے آ گئی تاکہ میری رہنمائی کر سکے اور میں اس کے عقب میں سیڑھیاں اترتی رہی۔ شاید یہ پاتال کا سفر تھا۔ یا زمین کے ساتویں طبق تک جاتا تھا۔ سیڑھیاں تھیں کہ شیطان کی آنت کی طرح نیچے اور نیچے چلی جا رہی تھیں۔ میں پوری طرح یہاں کے ماحول کا تجزیہ کر رہی تھی۔ حالانکہ اتنی ہی

دیر میں ہم کافی گہرائیوں میں آ گئے تھے۔ لیکن گھٹن کا ذرہ برابر احساس نہیں تھا بلکہ فضا میں ایک عجیب سا ہلکا پن ایک خوشگوار سی کیفیت کا احساس مسلسل بڑھتا جا رہا تھا۔

میں کچھ سوچے سمجھے بغیر نیچے اترتی رہی اور پھر مجھے سفید دودھیا روشنی نظر آئی، یقیناً یہ ابھی ابھی ہوئی تھی، کیونکہ اوپر سے ہم اس روشنی کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔ غالباً سیڑھیوں کا اختتام ہو گیا تھا۔ مجھے یونہی لگا جیسے میں ہزاروں فٹ کی گہرائی میں زمین کے سینے میں اتر آئی ہوں اور سفید دودھیا روشنی میں، میں نے ایک عجیب و غریب ٹھنڈا اور پرسکون ماحول دیکھا۔ بڑا سا ہال جیسا کمرہ تھا۔ اسے کمرہ ہی کہا جا سکتا تھا کیونکہ اس کی دیواریں باقاعدہ انسانی تراش کا نمونہ تھیں۔ چوڑی چوڑی سلوں سے بنی ہوئی لیکن اہرام نما۔ یعنی اوپر سے بتدریج فاصلے کم ہوتے چلے گئے تھے۔ نیچے بے شمار عجیب و غریب چیزیں موجود تھیں۔ یہ روشنی بالکل قدرتی لگ رہی تھی۔ اور غالباً دیواروں ہی سے پھوٹ رہی تھی۔ یہ اندازہ بالکل نہیں ہو پا رہا تھا کہ روشنی کہاں سے آ رہی ہے۔ چاندنی بھی نہیں معلوم ہوتی تھی۔

بہتر طور پر ایک محقق سائنسدان یا زمانہ قدیم کے کسی سامری کا طلسم کدہ تھا۔ اس کا علم مجھے پہلے ہی تھا۔ ٹھنڈی، پرسکون، فضا میں پہنچ کر میں رک گئی۔ سنہری لڑکی نے مسکرا کر مجھے دیکھا اور کہنے لگی۔

"یہاں میرا کام ختم ہو جاتا ہے۔ اب تم ایمی تراوزی کی مہمان ہو۔"

"ہاں! لیکن میرا میزبان مسلسل میری نگاہوں سے غائب ہے۔" میں نے کہا۔ تب ہی مجھے اس ہال نما غار میں ایک گونج سنائی دی۔

"نہیں بے بی میں تم سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہوں۔" یہ روشاق ہی کی آواز تھی، میں نے اسے پہچان لیا۔ یہاں وہ بہت زیادہ پر اعتماد اور پر وقار نظر آتا تھا۔ میں نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اتنے میزبان ہو، کیا سامنے آ کر مہمان کا استقبال نہیں کر سکتے۔"

"شلزانہ اوشیانوس اب تمہارا یہاں کوئی کام نہیں، تم جاؤ۔" سنہری لڑکی باادب گردن جھکائے واپس مڑی، میں اسے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی، پھر وہ ایک دیوار سے اس طرح گزر گئی، جیسے اس کا جسمانی وجود نہ ہو۔ دیوار اپنی جگہ برابر نظر آ رہی تھی۔ میں سحرزدہ نگاہوں سے چاروں طرف کا جائزہ لے رہی تھی۔

روشاق کی آواز پھر ابھری۔

"اگر تھوڑی دیر آرام کرنا چاہو تو سامنے سامنے نشست ہے، اس پر بیٹھ جاؤ۔ جہاں تک میری میزبانی کا تعلق ہے، تمہیں میں اس کی وضاحت کئے دیتا ہوں۔ بہت عرصہ پہلے ہارون دانش یہاں آیا تھا۔ اس نے یہ دانش کدہ اپنی کاوشوں سے دریافت کیا تھا اور اس کی گہرائیوں میں اتر آیا تھا۔ آج اس کی بیٹی یہاں آئی ہے۔ میں اس کی آمد سے بہت خوش ہوں، یہی تو میں چاہتا تھا۔ یہی تو میرا اور تمہارا تنازع تھا جس کو تم نے میری مرضی سے قبول نہ کیا، لیکن اپنی مرضی سے یہاں آ گئیں۔ ہاں جہاں تک میرے سامنے آ کر استقبال نہ کرنے کا سوال پیدا ہوتا ہے، تو پیاری لڑکی میں اس کے لئے مجبور ہو چکا ہوں۔ میں نے اپنا وجود ماضی کے سفر پر روانہ کر دیا ہے۔ اور وہ طویل مسافتیں طے کرتا ہوا بالآخر مطلوبہ دور میں پہنچ گیا ہے۔ اب میری واپسی ہارون دانش اور تمہارے ساتھ ہوگی۔ تب میرا وجود وہاں میری حیثیت اختیار کر جائے گا۔ میں اپنے جسمانی وجود کی بات کر رہا ہوں۔ یہ سب کچھ ضروری تھا۔ میں نے تو اس پر عمل کر ڈالا ہے اب تمہارا معاملہ ہے۔ خیر یہ گفتگو قبل از وقت ہے۔ میں نے تمہیں صرف یہ بتایا کہ بحالت مجبوری میں تمہارے سامنے آ کر تمہاری میزبانی نہیں کر سکتا۔"

میں خاموش رہی۔ البتہ آگے بڑھ کر میں اس نشست پر بیٹھ گئی تھی۔

(جاری ہے)

لرزہ براندام

ملک نعیم ارشاد- ڈجکوٹ فیصل آباد

کربناک ہولناک وحشت ناک اور درد ناک پرہیبت رات کے اندھیرے میں جنم لینے والی دلوں پر دہشت طاری کرتی دلخراش، جسم کے رونگٹے کھڑے کرتی خونی اور لہولہان کہانی۔

اپنے ہاتھوں اپنی موت کا سامان کر چلے، پڑھ کر دیکھیں ثبوت کہانی میں موجود ہے

ناصر کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو رسیوں سے بندھا ہوا پایا، اس کے ہاتھ پیچھے کی طرف کر کے باندھے گئے تھے، وہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں وہ اس وقت قید تھا، ناصر کے سامنے ایک تپائی پڑی ہوئی تھی، جس پر شیشے کا ایک جگ اور دو گلاس موجود تھے۔ ناصر کو یاد نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس کمرے میں کیسے پہنچا اور کس نے اسے رسیوں سے باندھا تھا۔ اس نے یاد کرنے کی بہت کوشش کی مگر اسے کچھ یاد نہ آیا۔

اچانک ناصر کی ناک سے کسی چیز کے جلنے کی تیز بدبو ٹکرائی اور وہ بدبو دوسرے کمرے سے آ رہی تھی، ناصر نے ہاتھوں کو ہلا کر دیکھا، ادھر اس نے اندازہ لگالیا کہ رسی کافی مضبوطی سے بندھی ہوئی ہے، وہ اپنی آنکھوں کو ادھر ادھر گھمانے لگا مگر اسے آزادی کی کوئی راہ نظر نہ آئی۔

"یہ میں کہاں پھنس گیا؟" وہ بڑبڑایا۔

"بچاؤ.....بچاؤ......" وہ چلایا۔

"بچاؤ بچاؤ" کی آوازیں لگاتار رہا، پھر اسے اندازہ ہوگیا کہ وہ ایسی جگہ بندھا پڑا ہے جہاں سے اس کی آواز کسی تک نہیں پہنچ سکتی۔ دوسرا اندازہ اس نے یہ لگایا کہ دوسرے کمرے کی طرف کافی زوروں کی آگ بھڑک رہی تھی۔

اچانک اس مشکل وقت میں اس کے ذہن نے ایک ترکیب کا سہارا لیا وہ بندھی ہوئی حالت میں جیسے تیسے گھسٹتا ہوا اس تپائی تک پہنچا، قریب پہنچتے پر لات کی زور دار ضرب سے اس نے تپائی کو نیچے گرا دیا، تپائی کے فرش پر گرنے سے جگ اور گلاس ٹکڑوں میں بٹ گئے تو وہ پھر گھسٹتا ہوا شیشے کے ٹکڑوں کے قریب آیا، اس نے اپنا رخ دوسری طرف کیا، اس کے ہاتھ پشت پر بندھے پڑے تھے اس نے بہت مشکل طریقے سے پشت کے بل لیٹ کر شیشے کا ایک بڑا ٹکڑا اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا اور کلائی پر بندھی رسی پر پھیرنے لگا۔ نتیجتاً کافی تگ و دو کے بعد ہاتھوں پر بندھی رسی کو کاٹنے میں کامیاب ہوگیا۔ آگ دروازے کو جلانے کے بعد کمرے میں داخل ہو چکی تھی۔

ناصر حیران و پریشان نگاہوں سے بھڑکتی ہوئی آگ کو دیکھ رہا تھا، باہر نکلنے کا صرف یہی ایک راستہ تھا، جسے آگ نے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ کافی کوشش اور اچھل کود کے باوجود بھی آگ نے ناصر کو جھلسا کر رکھ دیا۔ اس کی چیخیں قرب و جوار کو ہلانے لگیں۔

☆.....☆.....☆

"انسپکٹر صاحب ناصر صاحب کی باڈی کافی حد تک جھلس چکی ہے، ابھی وہ خطرے میں ہیں۔" ڈاکٹر فراز نے انسپکٹر احمد کو بتاتے ہوئے کہا۔

"ہوں....." انسپکٹر احمد نے گہری سانس کھینچی۔
"اس کا مطلب ہے کہ میں ابھی ان کا بیان نہیں لے سکتا۔"
"بیان! انسپکٹر صاحب آپ کیسی باتیں کررہے ہیں، ابھی تو یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ زندہ بھی بچیں گے کہ نہیں اور آپ ہیں کہ بیان کی بات کررہے ہیں۔" ڈاکٹر فراز نے عذر بتاتے ہوئے کہا۔
"ٹھیک ہے ڈاکٹر ویسے کب تک امید ہے کہ وہ ہوش میں آجائیں گے۔" انسپکٹر نے پوچھا۔ "اگر یہ چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر ہوش میں آگئے تو ٹھیک ورنہ..... خطرے کی بات ہے۔" ڈاکٹر فراز نے انسپکٹر کو آگاہ کیا۔
"اور ان کی بیوی؟" انسپکٹر نے پوچھا۔
"وہ تو جل کر کوئلہ بن چکی ہیں۔" ڈاکٹر نے افسوسناک لہجے میں کہا۔ "لیکن انسپکٹر صاحب ایک بات کی مجھے حیرت ہے۔"
"وہ کیا؟" انسپکٹر نے پرتشویش لہجے میں پوچھا۔
"آخر ایسا کیسے ہوا.....؟ ناصر صاحب کا پورا بنگلہ جل گیا، دونوں میاں بیوی اس آگ میں جھلس گئے..... ایسا پتھر دل انسان کون تھا جس نے جیتے جی دونوں میاں بیوی کو آگ کی نذر کردیا۔" ڈاکٹر فراز نے پریشان کن لہجے میں کہا۔
"اس کا میں ضرور پتہ لگا کر رہوں گا اور سفاک مجرم کو ضرور کیفر کردار تک پہنچاؤں گا۔ جس نے یہ کام کیا۔" انسپکٹر نے سخت لہجے میں کہا۔
"اللہ آپ کو کامیاب کرے۔" ڈاکٹر فراز نے صدق دل سے کہا۔
"ڈاکٹر صاحب مجھے مسز ناصر کی پوسٹ مارٹم رپورٹ کب تک ملے گی؟" انسپکٹر نے ایک مرتبہ پھر پوچھا۔
"آج شام تک مل جائے گی۔" ڈاکٹر نے کہا تو انسپکٹر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ اسپتال سے باہر آیا اور اپنی جیپ میں بیٹھ کر جیپ اسٹارٹ کی اور گیئر لگا کر جیپ آگے بڑھادی، جلد ہی وہ ناصر کے کوئلہ بنے بنگلے پر پہنچا، بنگلہ کافی حد تک جل چکا تھا۔ انسپکٹر کو ملنے والے ثبوت کافی حد تک مٹ چکے تھے۔ وہاں موجود کانسٹیبلوں نے بنگلے کے چاروں طرف وارننگ پٹی کھینچ دی تھی۔ پورے بنگلے کے گرد لوگوں کا کافی بڑا ہجوم تھا۔
انسپکٹر وارننگ پٹی کراس کرکے آگے بڑھا تو کانسٹیبل مراد اس کے قریب آیا۔ "کچھ پتہ چلا؟" انسپکٹر نے مراد سے پوچھا۔
"جی سر! فنگر پرنٹس کے حملے کو کافی حد تک فنگر پرنٹس ملے ہیں، اردگرد کے لوگوں سے بھی تھوڑی بہت معلومات ملی ہیں۔" مراد نے بتاتے ہوئے کہا۔
"کیسی معلومات؟" انسپکٹر نے پوچھا۔
"دونوں میاں بیوی ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے، وہ دونوں اس دنیا میں اکیلے تھے، باقی معلومات آپ کو ناصر صاحب کے آفس کا عملہ دے گا۔" مراد نے کہا۔
جلد ہی انسپکٹر کا ناصر کی پرسنل سیکریٹری سے آمنا سامنا ہوگیا۔ "مس زاہدہ آپ ہمیں بتاسکتی ہیں کہ یہ کس کا کام ہوسکتا ہے؟" انسپکٹر نے زاہدہ سے پہلا سوال کیا۔
"نہیں انسپکٹر صاحب! میرا اس معاملے میں کوئی اندازہ نہیں ہے۔" زاہدہ نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔
"ان کا کوئی دشمن؟" انسپکٹر نے دوسرا سوال کیا۔
"انسپکٹر صاحب ان کا کوئی دشمن نہیں تھا وہ انسان کے روپ میں فرشتہ تھے۔" یہ کہتے ہوئے زاہدہ کی آواز بھرا گئی۔
"یہ تو تم غلط کہہ رہی ہو۔" انسپکٹر نے بغور زاہدہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"کیا انسپکٹر صاحب؟" زاہدہ نے حیرانگی سے پوچھا۔
"یہی کہ ناصر صاحب کا کوئی دشمن نہیں ہے، یہ کام کوئی دوست تو کر نہیں سکتا۔" انسپکٹر نے پوائنٹ کی بات کی۔
"ہوسکتا ہے انسپکٹر یہ کسی دوست کا ہی کام ہو۔" اس مرتبہ زاہدہ نے بھی پوائنٹ کی بات کی۔
"یہ کی ناں تم نے پتے کی بات، تو تمہارے خیال میں وہ دوست کون ہوسکتا ہے؟" انسپکٹر نے جاننا چاہا۔
"یہ تو آپ کا کام ہے انسپکٹر صاحب" فی الحال

میں کوئی اندازہ نہیں لگا سکتی۔" زاہدہ نے کہا۔ زاہدہ کافی تیز معلوم ہوتی تھی، تبھی تو وہ انسپکٹر کے سوالوں کا جواب اسی کے انداز میں دے رہی تھی۔

"تم کوئی خاص بات تو ان کے متعلق جانتی ہوگی، کیونکہ تم ان کی پرسنل سیکریٹری رہی ہو؟" انسپکٹر نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"انسپکٹر صاحب میں آپ کو ایک بہت اہم خبر دے سکتی ہوں۔" زاہدہ نے مسکراتے ہوئے کہا تو انسپکٹر کا دل چاہا کہ وہ تھپڑوں سے زاہدہ کا منہ سرخ کردے، وہ کافی دیر سے فضول باتوں سے اسے الجھا رہی تھی لیکن کام کی بات بتا نہیں رہی تھی۔ "کیا اہم خبر ہے بتاؤ؟" انسپکٹر نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔

"ناصر صاحب دو ماہ سے کافی پریشان تھے، وہ اکھڑے اکھڑے رہتے تھے۔ اور میٹنگز بھی کم ہی اٹینڈ کرتے تھے فون پر کسی سے جھگڑتے رہتے تھے، ان کا موڈ آف رہتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی انہیں فون پر دھمکی دے رہا ہو، میں اس دن آفس میں ان کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔" میں نے کہا۔ "سر خیر تو ہے۔"

"پچھلے دو ماہ سے آپ کافی ٹینس لگ رہے ہیں، پہلے تو آپ کا موڈ کافی فریش رہتا تھا لیکن اب آپ؟" میں نے معنی خیز انداز میں بات ادھوری چھوڑ دی۔ میں ان کی طرف غور سے دیکھ رہی تھی۔

"نن..... نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں۔" جواباً ناصر صاحب ہکلائے۔

"گھر میں ماریہ میڈم تو ٹھیک ہیں ناں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں وہ بالکل ٹھیک ہے۔" اس مرتبہ ناصر صاحب مسکرائے۔ اس کے بعد بھی ناصر صاحب پریشان ہی رہتے تھے اور پھر اس حادثے سے کچھ دن پہلے میں ان کے پاس گئی وہ فون پر کسی سے جھگڑ رہے تھے۔ "تم کچھ بھی کرلو میں تمہیں کسی بھی قیمت پر وہ رقم نہیں دوں گا، چاہے تم کچھ بھی کرلو۔" اتنا کہہ کر وہ کچھ دیر کیلئے رکے اور دوسری طرف کی بات سننے لگے اور پھر بپھرے ہوئے لہجے میں بولے۔ "ہاں، ہاں جان سے مار ڈالو تم مجھے، کچھ بھی ہوجائے میں تمہاری بات کسی بھی صورت نہیں مانوں گا۔" انہوں نے غصے سے فون کا ریسیور کریڈل پر پٹخا۔

"سر آپ ٹھیک تو ہیں۔" میں نے پوچھا۔

"تم کس سلسلے میں آئی تھیں؟" انہوں نے میرے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"سر..... سلامت صاحب کے ساتھ آپ کی میٹنگ ہے، وہ بتانے کے لئے آئی تھی۔" میں نے سنبھلتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے میں آتا ہوں تم جاؤ۔ انہوں نے خشک لہجے میں کہا تو میں اثبات میں سر ہلاتی ہوئی آفس سے باہر نکل آئی۔" یہاں تک کہہ کر زاہدہ خاموش ہوگئی۔

زاہدہ سے بڑی اہم خبر ملی تھی۔ "زاہدہ میں نے تم سے سب سے پہلا سوال کیا تھا کہ کیا تم بتا سکتی ہو کہ یہ کس کا کام ہے اور پھر تم سے پوچھا تھا کہ تمہیں کسی پر شک ہے، تم نے دونوں سوالوں کا جواب مثبت نہیں دیا اور اب تم کہہ رہی ہو کہ ناصر صاحب کو فون پر کوئی دھمکیاں دے رہا تھا۔ یہ کیا چکر ہے؟" انسپکٹر نے زاہدہ کی طرف غصے سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"انسپکٹر صاحب آپ نے پہلا سوال کیا تھا کہ یہ کام کس کا ہوسکتا ہے تو میں واقعی یہ نہیں جانتی کہ یہ کام کس کا ہوسکتا ہے دوسرا سوال آپ نے یہ کیا کہ ناصر صاحب کا کوئی دشمن ہے؟ تو ناصر صاحب فون پر بات کررہے تھے مجھے کیا پتہ کہ وہ کون تھا؟ اور میں نے آپ سے یہ بھی کہا کہ ہوسکتا ہے یہ کام کسی دوست کا بھی ہوسکتا ہے یہ میں نہیں جانتی کہ وہ دوست کون ہوسکتا ہے؟ تو انسپکٹر صاحب یہ کام تو آپ کا ہے۔"

زاہدہ کے اس جواب نے انسپکٹر کو مسکرانے پر مجبور کردیا تھا حالاں کہ وہ ایسا وقت نہیں تھا۔ "کوئی مزید اہم بات؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"نہیں انسپکٹر صاحب میں مزید کچھ نہیں جانتی۔" زاہدہ نے نفی میں سر ہلایا۔

"ٹھیک ہے! بہت بہت شکریہ مس زاہدہ اگر مجھے

مزید آپ کی مدد درکار ہوئی تو میں آپ کو زحمت دوں گا۔"
انسپکٹر نے کہا تو زاہدہ نے صرف اس مرتبہ سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا۔

اس کے بعد انسپکٹر نے ناصر کے پڑوسیوں سے گفتگو کی تو ان سے پتہ چلا کہ آگ تقریباً رات بارہ بجے بھڑکی تھی۔ ایک پڑوسی نے فائر بریگیڈ کے عملے کو فون کیا تھا لیکن فائر بریگیڈ کی گاڑیاں پہنچنے سے پہلے ہی آگ نے اپنا کام کرلیا تھا۔

ناصر تو جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے کی مثال کے طور پر بچ گیا تھا لیکن اس کی بیوی ماریہ مرچکی تھی۔ حیرانگی والی بات تھی کہ اتنی جلدی آگ لگی تو کیسے؟

اس کا جواب کانسٹیبل مراد نے دیا۔ "سر پورے بنگلے میں مٹی کا تیل چھڑکا گیا تھا۔"

"اوہ!" حیرت کے باعث انسپکٹر کے منہ سے نکلا۔

"یس سر! اسی لئے تو آگ نے جلد ہی پورے بنگلے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔" مراد نے بتایا تو انسپکٹر نے سمجھ جانے والے انداز میں اثبات میں سر ہلایا۔

انسپکٹر احمد کا پورا دن مصروفیات کی نظر رہا، شام کو وہ تھانے میں آکر بیٹھا تو ماریہ کی دعا کہ خیر پوسٹ مارٹم رپورٹ اس کی منتظر تھی، پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق ماریہ آگ لگنے سے پہلے ہی ختم ہوچکی تھی اور اسے خنجر سے قتل کیا گیا تھا لیکن حیرت والی بات یہ تھی کہ ماریہ چار ماہ سے پریگنینٹ تھی۔ وہ بچہ بھی چاقو کے لگنے سے ہی ختم ہوچکا تھا۔

فنگر پرنٹس کی رپورٹ کے مطابق ناصر کے بنگلے سے ناصر اور ماریہ کے علاوہ کسی تیسرے شخص کی انگلیوں کے نشان بھی ملے تھے۔

انسپکٹر احمد کو اب یہ پتہ چلانا تھا کہ وہ شخص کون ہوسکتا ہے جو بقول زاہدہ کے ناصر کو فون پر دھمکیاں دیتا تھا۔ باقی اس کیس کا سب سے اہم گواہ ناصر تھا جو اسپتال میں پڑا زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہا تھا لیکن انسپکٹر کو اسی بات پر نہیں بیٹھنا تھا کہ ناصر کب ہوش میں آئے اور وہ اس کا بیان لے، لیکن ناصر کے ہوش میں آنے تک انسپکٹر کافی ثبوت اور معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔

اچانک انسپکٹر کے آفس کا دروازہ کھلا اور کانسٹیبل مراد اندر داخل ہوا، اس نے انسپکٹر کو سیلوٹ کیا۔ "ہاں مراد... کیسے آنا ہوا؟" انسپکٹر نے مراد سے پوچھا۔

"سر گلشن کالونی میں ایک شخص کی لاش ملی ہے۔!" مراد نے عجیب خبر سنائی۔

"کب...؟" انسپکٹر نے حیرانگی سے پوچھا۔ "ابھی دس پندرہ منٹ پہلے سر۔" مراد نے بتایا۔

"ہوں..." انسپکٹر نے گہری سانس لی۔ "چلو پھر چلتے ہیں۔"

وہ گلشن کالونی کے اس مکان میں پہنچے، لاش ایک خوب صورت نوجوان کی تھی، جس کے جسم پر کسی زخم کا نشان نہیں تھا اس کے نوکر نے اسے جگانے کی کوشش کی مگر وہ زندگی کی قید سے آزاد ہوچکا تھا، انسپکٹر نے احتیاطاً اس کی تلاشی لی تو ID کارڈ کے حوالے سے اس کا نام سلمان تھا اور وہ 28 سال کا تھا، انسپکٹر نے کانسٹیبلوں کو اشارہ کیا کہ وہ پورے گھر کی تلاشی لیں۔ کانسٹیبل فوراً حرکت میں آگئے تب تک انسپکٹر نے نوکر کا انٹرویو لینا مناسب سمجھا، نوکر اس کے سامنے آکر بیٹھ گیا۔

"ہاں بھئی کیا نام ہے تمہارا؟" انسپکٹر نے پہلا سوال کیا۔

"جی مختار۔" نوکر نے مؤدبانہ لہجے میں اپنا نام بتایا۔

"کتنے سال سے یہاں کام کررہے ہو؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"سات سال ہوگئے جی مجھے سلمان صاحب کے پاس کام کرتے ہوئے۔" مختار نے بتایا۔

"تب تو تم اپنے مالک کے دوستوں کے بارے میں بھی جانتے ہوگے اور دشمنوں کے بارے میں بھی۔" انسپکٹر نے مختار کی طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"انسپکٹر صاحب سلمان صاحب کا کوئی دشمن نہیں تھا، وہ بڑے خوش مزاج اور ہنسی مذاق کرنے والے شخص تھے۔" مختار نے بتایا۔

"دوست؟" انسپکٹر نے مزید پوچھا۔

"جی صاحب! دوست تو ان کے کافی تھے۔" مختار نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ اسی وقت مراد اندر داخل ہوا جس کے ہاتھ میں کالے رنگ کا ایک بڑا سا بیگ تھا۔ "سر یہ بیگ ہمیں سلمان صاحب کے ڈرائنگ روم سے ملا ہے۔" مراد نے وہ بیگ انسپکٹر احمد کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

"کیا ہے اس بیگ میں؟" انسپکٹر نے پوچھا تو مراد نے جواباً بیگ کی زپ کھول دی۔ کمرے میں موجود سب کے دل تیزی سے دھک دھک کرنے لگے کیونکہ بیگ نوٹوں سے بھرا پڑا تھا۔ "یہ کس کے نوٹ ہیں؟" انسپکٹر نے مختار سے پوچھا۔

"صاحب میں نہیں جانتا۔ یہ تو سلمان صاحب ہی جانیں۔" انسپکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے مختار نے ہکلا کر کہا۔

"ڈرائنگ روم میں تمہیں یہ کہاں پڑا ملا۔" اس مرتبہ انسپکٹر نے مراد کی طرف دیکھا۔

"یہ بیگ ڈرائنگ روم میں رکھے صوفوں کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔" مراد نے بتایا۔

"گنو انہیں۔" انسپکٹر نے کہا تو مراد اثبات میں سر ہلاتے ہوئے انہیں گننے لگا۔

"تو تم ان نوٹوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔" انسپکٹر دوبارہ مختار کی طرف متوجہ ہوا۔

"انسپکٹر صاحب میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں میں واقعی ان نوٹوں کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتا۔" مختار ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔

"سر یہ رقم ایک کروڑ روپے کی ہے۔" مراد نے بتایا۔

"اوہ" حیرت کے باعث انسپکٹر کے منہ سے نکلا اور پھر انسپکٹر نے ان نوٹوں میں سے ایک گڈی اٹھائی۔ اس پر نیشنل بینک کی مہر لگی ہوئی تھی۔

"ٹھیک ہے مراد تم لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے لے جاؤ۔" اور مختار تم بتا رہے تھے کہ.... "انسپکٹر نے مراد کو حکم دے کر مختار سے کچھ پوچھنا چاہا کہ بیچ میں ہی موبائل کی رنگ ٹون بج اٹھی۔ موبائل کی اسکرین پر ڈاکٹر فراز کا نمبر تھا۔ "اللہ خیر کرے۔" انسپکٹر نے پریشان کن لہجے میں کہا اور ok کا بٹن پریس کر کے موبائل کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ "السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام" انسپکٹر صاحب جلدی سے اسپتال پہنچ جائیں، مسٹر ناصر ہوش میں آچکے ہیں لیکن ان کے پاس وقت بہت کم ہے جلدی آجائیں۔" ڈاکٹر فراز نے تیز لہجے میں کہا۔

"ok ڈاکٹر صاحب، میں ابھی پہنچتا ہوں۔" اتنا کہہ کر انسپکٹر نے موبائل فون جیب میں ڈالا اور مراد کو حکم دیا۔ اور مختار کو کل تھانے آنے کی تاکید کرنے کے بعد انسپکٹر اسپتال پہنچا۔

"انسپکٹر صاحب افسوس کی بات یہ ہے کہ مسٹر ناصر اپنی یادداشت کھو چکے ہیں انہیں صرف چند باتیں یاد ہیں باقی وہ سب کچھ بھول چکے ہیں۔" ڈاکٹر فراز نے انسپکٹر کو عجیب خبر سنائی۔

"اوہ نو......" پریشانی کے باعث انسپکٹر کے منہ سے نکلا۔ "یہ تو بہت برا ہوا۔"

انسپکٹر کمرے میں داخل ہوا۔ "ناصر صاحب کیسے ہیں آپ......؟" انسپکٹر احمد نے ناصر کے قریب کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ایک مرتے ہوئے انسان سے آپ پوچھ رہے ہیں کہ کیسے ہیں آپ؟"

جواباً ناصر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "سوری ناصر صاحب میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" "آپ پلیز یہ بتایئے کیسے ہوا یہ سب کچھ؟"

"ہم...... میں خود نہیں جانتا انسپکٹر صاحب جب مجھے ہوش آیا تو میں ایک کمرے میں رسیوں سے بندھا پڑا تھا۔ میں نے یاد کرنے کی کافی کوشش کی کہ مجھے یہاں کس نے اور کیوں باندھا لیکن مجھے یاد نہ آیا۔" اس کے بعد ناصر نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کہانی سنانے کے بعد کہا۔ "اور جب مجھے ہوش آیا تو میں نے اپنے آپ کو اسپتال کے اس کمرے میں پایا جو بقول ڈاکٹر صاحب کے میری آخری آرام گاہ ہے۔"

"لیکن ناصر صاحب! آپ کو کچھ تو یاد ہوگا۔"

انسپکٹر نے کریدنے والے لہجے میں کہا لیکن دیر ہوچکی تھی ناصر کی بے جان آنکھیں انسپکٹر احمد کو دیکھ رہی تھیں۔ انسپکٹر کے لئے یہ ایک حیران کن موت تھی جس نے انسپکٹر کو شکست کا احساس دلایا تھا وہ الجھن میں مبتلا ہوگیا تھا۔ اب انسپکٹر کے سارے سوالات کا جواب ناصر تھا۔ مگر افسوس کہ اس کی یادداشت ہی چلی گئی تھی۔

انسپکٹر بوجھل بوجھل قدموں کے ساتھ کمرے سے باہر آیا وہ ڈاکٹر فراز کے کمرے میں آکر بیٹھ گیا تھوڑی دیر بعد مراد بھی آگیا۔

"ہاں تو انسپکٹر صاحب کچھ انفارمیشن ملیں ناصر صاحب سے کہ نہیں۔" ڈاکٹر فراز نے اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"نہیں ڈاکٹر صاحب عجیب اتفاق دیکھیے کہ ایک تو وہ آگ میں جلے دوسرا ان کی یادداشت چلی گئی، تیسرا وہ مرگئے۔" انسپکٹر شکستہ لہجے میں بولا۔

"تو انسپکٹر صاحب آپ کا یہ کیس سلجھتا ہوا نظر آرہا ہے کہ نہیں؟" ڈاکٹر فراز نے پوچھا۔ "فی الحال تو اندھیرا ہی اندھیرا ہے ڈاکٹر صاحب... کوئی ثبوت نہیں مل رہا کہ کس نے ناصر صاحب کے گھر میں آگ لگائی تھی؟ کس نے ان کی وائف کا مرڈر کیا؟ کیس مزید سے مزید الجھتا ہی جارہا ہے۔" انسپکٹر بیزار لہجے میں بولا۔

"نہیں انسپکٹر صاحب خیر یہ بات تو نہیں ہے۔" ڈاکٹر فراز نے کہا۔

"کیا مطلب ڈاکٹر صاحب؟" انسپکٹر نے حیرانگی سے پوچھا۔

"مجرم سے کوئی نہ کوئی غلطی ضرور ہوتی ہے وہ کوئی نہ کوئی ثبوت ضرور چھوڑتا ہے آپ دوبارہ سے چھان بین کریں، چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی سمجھیں انشاء اللہ یہ کیس ضرور Solve ہوگا۔" ڈاکٹر فراز نے کہا۔

"باقی کام تو ڈاکٹر صاحب اب میں صبح ہی کروں گا کیونکہ میں کافی الجھ چکا ہوں اور مجھے نیند کی ضرورت ہے اور ہاں دوسری لاش کی پوسٹ مارٹم رپورٹ کب تک ملے گی؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"انشاء اللہ کل دوپہر تک۔" ڈاکٹر فراز نے کہا تو انسپکٹر اثبات میں سر ہلاتا ہوا کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

☆ ☆ ☆

"جی انسپکٹر صاحب نوٹ تو ہمارے بینک کے ہی ہیں۔" نیشنل بینک کے منیجر نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ انسپکٹر احمد صبح اٹھنے کے بعد مراد کو ہدایات دینے کے بعد بینک چلا آیا تھا اور منیجر کے سامنے یہ بیگ رکھ دیا تھا۔ "تو کیا آپ مجھے بتاسکتے ہیں کہ یہ اماؤنٹ سلمان کے اکاؤنٹ سے نکلی ہے؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"جی نہیں انسپکٹر صاحب! یہ رقم مسٹر ناصر کے اکاؤنٹ سے نکلی ہے!!!" بینک منیجر نے عجیب خبر سنائی۔

"آپ کو پکا یقین ہے؟" انسپکٹر نے تصدیق چاہی۔

"جی ہاں انسپکٹر صاحب...... وہ آدمی میرے لئے انجان تھا جو یہ رقم لینے کے لئے آیا تھا اس لئے میں نے ناصر صاحب سے رابطہ کیا تھا اور انہیں بتایا تھا کہ یہ صاحب آپ کے اکاؤنٹ سے رقم کیش کروانا چاہتے ہیں۔ ناصر صاحب نے مجھ سے کہا کہ چیک کیش کردیں، میں نے ان سے کہا بھی کہ اس طرح تو آپ پر کافی ٹیکس پڑے گا تو انہوں نے کہا کوئی بات نہیں آپ چیک کیش کردیں، اور میں نے یہ چیک کیش کردیا۔ بڑے اچھے انسان تھے ناصر صاحب اللہ ان کو اپنی رحمت میں رکھے۔" منیجر نے آخری بات افسردہ لہجے میں کہی۔

انسپکٹر احمد نے سلمان کی ڈیڈ باڈی کی کھینچی گئی تصویر نکالی اور بینک منیجر کے سامنے رکھ دی۔ "کیا یہی تو وہ آدمی نہیں جس نے یہ اماؤنٹ کیش کرایا تھا۔" انسپکٹر نے پوچھا تو بینک منیجر نے چونکتے ہوئے تصویر اٹھائی اور حیرت سے بولا۔ "بالکل انسپکٹر صاحب سو فیصد یہی آدمی تھا۔ پر یہ تو "

"جی ہاں یہ مرچکا ہے آپ کا بہت بہت شکریہ۔" انسپکٹر نے تصویر پکڑتے ہوئے کہا اور ٹیبل سے بیگ اٹھالیا۔ وہ تھانے پہنچا تو حنا اس کا منتظر تھا۔ انسپکٹر احمد نے اسے اپنے آفس میں بلالیا اور کئی انداز سے کرید کرید کر اس

سے سوال پوچھے۔ اس سے صرف یہی معلوم ہوسکا کہ سلمان کا خاص دوست ناصر ہی تھا۔ کچھ کچھ کہانی واضح ہورہی تھی ناصر کو فون پر دھمکیاں دینے والا شخص سلمان ہی تھا اور ناصر نے ہی سلمان کو ایک کروڑ روپے کی رقم دی تھی لیکن سوال یہ اٹھتا تھا کہ اگر ناصر جانتا تھا کہ سلمان ہی وہ آدمی ہے جو اسے فون پر دھمکیاں دیتا ہے تو پھر اس نے پولیس کو انفارم کیوں نہیں کیا، دوسرا اگر سلمان اپنی مطلوبہ رقم لے چکا تھا تو پھر اس نے ماریہ اور ناصر کے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا؟ تیسرا سوال جو سب سے اہم تھا وہ یہ تھا کہ سلمان کی موت کیسے ہوئی؟ اس سوال کا جواب پوسٹ مارٹم کی رپورٹ دے سکتی تھی جو انسپکٹر کی میز پر پڑی تھی۔

انسپکٹر احمد پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطالعے میں مصروف ہوگیا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق سلمان کی موت زہر کی وجہ سے ہوئی تھی جو پورے جسم میں پھیل گیا تھا۔ فنگر پرنٹس لیبارٹری والوں نے بھی ایک رپورٹ بھیجی تھی فنگر پرنٹس رپورٹ کے مطابق ناصر کے گھر سے جو تیسرے شخص کے نشانات ملے تھے وہ سلمان کے ہی تھے۔

یہ کیس جتنا حل ہورہا تھا اتنا ہی الجھ بھی رہا تھا اب اگر انسپکٹر یہ مان بھی لیتا کہ سلمان ہی وہ شخص تھا جس نے ماریہ کو پہلے خنجر سے قتل کیا اور پھر ناصر کو بے ہوش کرکے اسے باندھنے کے بعد پورے گھر میں آگ لگادی لیکن پھر سلمان کو کس نے زہر دیا، اگر سلمان نے کوئی کارنامہ کیا ہوتا تو وہ رقم لے کر کب کا فرار ہوجاتا، لیکن وہ تو ابھی تھانے میں حاضری دے کر گیا تھا۔ اس کیس نے انسپکٹر کو الجھا دیا تھا یہ کیس بار بار اپنا رخ بدل رہا تھا، اس کیس کی اصل حقیقت سے انسپکٹر کافی دور تھا، انسپکٹر نے آنکھیں بند کیں اور کرسی کی پشت سے اپنا سر لگادیا وہ کچھ سوچ رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور تیزی سے ٹیبل پر پڑے فون کا ریسیور اٹھایا اور نمبر ڈائل کرنے لگا دوسری طرف سے نیشنل بینک کے منیجر نے فون اٹھایا، اپنا تعارف کروانے کے بعد انسپکٹر نے کہا۔ "منیجر صاحب کیا آپ مجھے بتاسکتے ہیں کہ اس پورے ماہ میں ناصر صاحب کے اکاؤنٹ میں کتنی ٹرانزیکشن ہوئی ہیں؟"

"ہولڈ کیجئے......" منیجر نے کہا اور ریسیور ہولڈ پر رکھ دیا۔ "ہیلو سر کیا آپ لائن پر موجود ہیں؟" تھوڑی دیر بعد بینک منیجر نے پوچھا۔ "جی جی بالکل......" انسپکٹر احمد نے اثبات میں سر ہلایا۔ "سر ایک تو پانچ کروڑ کا ڈرافٹ بنا تھا ایک کروڑ کا چیک مرحوم سلمان صاحب نے کیش کروایا تھا اور ایک 20 لاکھ روپے کا چیک بھی کیش ہوا ہے۔" منیجر نے رقوم کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

"چیک کہاں ٹرانسفر ہوا ہے؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"وہ ہماری اکاؤنٹ ہولڈر ہی ہیں۔" بینک منیجر نے بتایا۔

"اکاؤنٹ ہولڈر نیم پلیز؟" انسپکٹر نے بے چین لہجے میں پوچھا۔ انسپکٹر کو یقین تھا کہ بینک منیجر کے اگلے الفاظ دھماکہ خیز ہوں گے اور ہوا بھی کچھ ایسا ہی...... "سر وہ اکاؤنٹ ہولڈر ہیں مس زاہدہ" بینک منیجر نے کہا۔

"کیا؟؟" انسپکٹر نے حیرت سے کہا وہ اس نام کی بالکل بھی توقع نہیں کررہا تھا۔

"جی ہاں زاہدہ ہی ہے" شاید بینک منیجر نے کمپیوٹر سے دوبارہ چیک کیا تھا۔

"Thanks you" منیجر صاحب۔" اتنا کہہ کر انسپکٹر نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ "کیس میں نیا انکشاف ہورہا تھا۔ زاہدہ کچھ زیادہ ہی تیز اور شاطر نکلی تھی ایک مرتبہ انسپکٹر نے اندازوں کی کہانی کو جوڑنا شروع کردی لیکن پھر اس نے سر کو جھٹکا دیا، اس نے سوچا کہ اندازوں کے بجائے اصل کہانی اور اصل مجرم تک پہنچنا چاہیے۔

☆ ☆......☆

دروازہ زاہدہ نے ہی کھولا تھا اپنے سامنے انسپکٹر احمد اور دو کانسٹیبلوں کو دیکھ کر وہ پریشان ہوگئی۔ "کیسی ہو مس زاہدہ؟" انسپکٹر نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

"ٹھ...... ٹھیک ہوں سر۔" وہ ہکلائی ساتھ ہی وہ زبردستی مسکرائی بھی تھی۔

"مس زاہدہ کے گھر کی تلاشی لو" انسپکٹر نے مراد سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا تو مراد نے اثبات میں سر ہلایا

اور دوسرے کانسٹیبل کے ساتھ زاہدہ کے گھر کے اندرونی حصوں کی طرف بڑھ گیا۔

"انس... پکٹر... صاحب... خ... خیریت تو ہے؟" زاہدہ نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

"ابھی پتہ لگ جائے گا خیریت ہے کہ نہیں...... مس زاہدہ۔" انسپکٹر نے غصے سے زاہدہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور زاہدہ نے اپنی نظریں جھکا لیں، تھوڑی دیر بعد مراد کامیاب لوٹا اس کے ہاتھوں میں کالے رنگ کا نوٹوں کا بیگ تھا، جسے دیکھ کر زاہدہ کا رنگ اڑ گیا۔

"مراد ان نوٹوں کے سیریل نمبر چیک کرو۔" انسپکٹر نے مراد سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا تو مراد اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اپنے کام میں لگ گیا، پھر وہ بولا۔ "سر یہ نوٹ سو فیصد نیشنل بینک کے ہی ہیں۔"

"مس زاہدہ... میں آپ کو ہوشیار سمجھتا تھا لیکن آپ ہوشیار ہونے کے ساتھ ساتھ شاطر بھی ہیں۔" انسپکٹر نے بظاہر اقرار کرتے ہوئے کہا۔ "اب شرافت سے یہ بتا دو کہ تم نے ناصر صاحب سے یہ پیسے کیوں لئے؟ کہیں تم دونوں کے بیچ ناجائز تعلقات تو نہیں؟"

"نہیں انسپکٹر صاحب... ناصر صاحب ایسے آدمی نہیں تھے۔" زاہدہ زور سے بولی۔ "یہ پیسے انہوں نے مجھے خود دیئے تھے۔"

"کیوں دیئے تھے؟" انسپکٹر نے سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

"و... وہ دراصل میری ماں بیمار تھی۔" زاہدہ نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

"کہاں ہے تمہاری ماں؟" انسپکٹر نے زاہدہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"وہ... وہ گاؤں میں ہے۔" زاہدہ نے ایک مرتبہ پھر آنکھیں چرائیں۔

"دیکھو مس زاہدہ... اس مرتبہ میں تم سے آخری بار پوچھوں گا اگر تم نے اس مرتبہ کسی بھی قسم کی دروغ گوئی کا مظاہرہ کیا تو میں تم سے بہت برے طریقے سے پیش آؤں گا۔" اس مرتبہ انسپکٹر سخت لہجے میں بولا تو زاہدہ نے انسپکٹر کی طرف دیکھا وہ انسپکٹر احمد کی آنکھوں کا مطلب صاف سمجھ گئی تھی کہ اگر اس نے اس مرتبہ جھوٹ بولا تو واقعی انسپکٹر اس سے سخت رویے سے پیش آئے گا۔

"انسپکٹر صاحب اس حادثے سے کچھ دن پہلے ناصر صاحب نے مجھے اپنے کمرے میں بلوایا۔ "زاہدہ تم بیس لاکھ روپے کمانا چاہتی ہو؟" انہوں نے یکدم مجھ سے عجیب سوال کیا۔

"سر... یہ آپ کیسا سوال کر رہے ہیں۔" میں الجھن آمیز لہجے میں بولی۔

"میں نے جو پوچھا ہے اس کا جواب دو۔" میں نے دیکھا ناصر صاحب سنجیدہ تھے۔ "پیسوں کی بھلا کسے ضرورت نہیں سر۔" میں زبردستی مسکرائی۔

"ہوں... تو اس کا مطلب ہے اگر تمہیں بیس لاکھ روپے دے دیئے جائیں تو تم خوش ہو جاؤ گی" ناصر صاحب نے بغور میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"س... سس... سر......" ٹوٹے پھوٹے الفاظ کے ساتھ میرے منہ سے نکلا۔

"دیکھو زاہدہ جو بات میں تمہیں بتانے جا رہا ہوں اسے غور سے سننا اور کسی سے بھی اس بات کا تذکرہ نہ کرنا۔" اتنا کہہ کر ناصر صاحب کچھ دیر کے لئے رکے اور پھر دوبارہ مجھ سے گویا ہوئے۔ "پچھلے کچھ مہینوں سے مجھے ایک شخص فون پر دھمکیاں دے رہا ہے۔"

"کیسی دھمکیاں سر......؟" میں نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"قتل جیسی سنگین دھمکیاں۔" ناصر صاحب نے بتایا۔

"سر لیکن کیوں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"پیسوں کی خاطر اور کس لئے۔" ناصر نے کہا۔

"تو سر آپ پولیس میں کمپلین کریں۔" میں نے مشورہ دیا۔

"نہیں... اس طرح وہ شخص بھڑک سکتا ہے۔" ناصر صاحب نے بدستور میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اس کی ڈیمانڈ کیا ہے سر؟" میں نے پوچھا۔

"اس کی ڈیمانڈ ختم نہیں ہو رہی..... میں اب تک اسے ستر لاکھ روپے دے چکا ہوں!!" ناصر صاحب نے بتایا... "اور بھی مزید رقم مانگ رہا ہے....."

"کتنی.....؟" میرا لہجہ یکدم بے چین ہو گیا۔

"ایک کروڑ!!!"

"کروڑ....." میں چلائی۔

"آہستہ..... چلاؤ مت....." ناصر صاحب نے مجھے ڈانٹا.....

"زاہدہ وہ آدمی میری ایک ایک حرکت پر نظر رکھ رہا ہے، میں کتنے بجے آفس آ رہا ہوں، کتنے بجے میٹنگز اٹینڈ کر رہا ہوں کس کس کے ساتھ میٹنگ ہے وغیرہ وغیرہ۔" اتنا کہہ کر ناصر صاحب رک کے پھر بولے۔ "مجھے ایسا لگ رہا ہے زاہدہ کہ آفس کا کوئی آدمی یقیناً اس کے ساتھ ملا ہوا ہے۔" ناصر صاحب نے کہا۔

"ہو سکتا ہے سر..... آپ کو کسی پر شک ہے۔" میں نے پوچھا۔

"ہوں....." انہوں نے گہری نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ "کس پر؟" میں نے پوچھا۔

"تم پر!!" ناصر صاحب نے کہا تو میں اپنی کرسی سے یوں اچھلی جیسے مجھے 440 وولٹ کا جھٹکا لگا ہو۔

"یہ..... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں سر؟" میں پریشانی کے باعث ہکلائی۔

"جس دن سے مجھے اس آدمی کا فون آیا ہے، میں غور کر رہا ہوں، آفس کے اسٹاف میں تم ہی ہو جو مجھ پر خاص نظر رکھ رہی ہو، میں جب فون پر کسی سے بات کرتا ہوں تب بھی تم فون پر میری بات سنتی ہو....." ناصر صاحب نے کہا۔ "اور اب جب میں نے تم سے 20 لاکھ کا ذکر کیا تو میں نے تمہاری آنکھوں میں صاف لالچ دیکھی....."

"بس..... بس..... سر واقعی میں کچھ دنوں سے آپ پر غور کر رہی ہوں۔" میں نے اعتراف کیا۔ "لیکن اس کا مطلب ہرگز نہیں کہ یہ سب کچھ میں کسی کے کہنے پر کر رہی ہوں بلکہ میں کچھ دنوں سے غور کر رہی تھی کہ آپ کافی پریشان ہیں اسی لئے میں آپ پر غور کر رہی تھی، میں نے آپ سے پوچھا بھی تھا لیکن آپ نے بتانا مناسب نہیں سمجھا اور جہاں تک پیسوں کا سوال ہے سر..... تو پیسوں کی ضرورت کسے نہیں ہوتی..... اسی لئے میں نے ہاں کر دی۔"

"ہوں....." ناصر صاحب نے گہری سانس کھینچی اور جیب سے ایک تہہ شدہ کاغذ نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔

"یہ کیا ہے سر؟" میں نے پوچھا۔

"یہ 20 لاکھ کا چیک ہے اسے رکھ لو۔" ناصر صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہ..... یہ سر اتنی بڑی رقم میں کیسے رکھ سکتی ہوں..... آپ یہ احسان مجھ پر کس لئے کر رہے ہیں؟" میں نے حیرانگی سے کہا۔

"مجھے معلوم ہے چند مہینوں بعد تمہاری شادی ہے، مجھے ثانیہ نے بتایا تھا، اس میں کام آئیں گے۔" ناصر صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"لیکن سر یہ تو بہت زیادہ ہیں۔" میں نے گھبراتے ہوئے کہا۔

"دھوم دھام سے اپنی شادی کرنا..... اور اب چپ چاپ یہ چیک رکھ لو ورنہ میں سمجھوں گا کہ تم واقعی اس آدمی کا ساتھ دے رہی ہو۔" ناصر صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا تو میں نے مسکراتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر وہ چیک پکڑ لیا۔

"سر واقعی کوئی آپ کو فون پر جان سے مارنے کی دھمکیاں دے رہا ہے؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"ہاں....." ناصر صاحب نے افسردہ لہجے میں کہا۔ "کوئی بات نہیں..... میں اب پولیس سے رابطہ کروں گا۔" انہوں نے کہا۔

"یہ ہے انسپکٹر صاحب ساری کہانی۔" اتنا کہہ کر زاہدہ خاموش ہو گئی، انسپکٹر نے دیکھا اس مرتبہ وہ سچ بول رہی تھی۔ "20 لاکھ..... میرا تو ذہن یہ نہیں مان رہا....." انسپکٹر الجھن آمیز لہجے میں بولا۔

"جو حقیقت تھی انسپکٹر صاحب وہ میں نے آپ

کے آگے بیان کردی ہے، باقی آپ مانیں یا نہ مانیں۔" زاہد نے کہا۔

انسپکٹر تھانے پہنچا اور اپنی میز پر آ کر بیٹھ گیا، انسپکٹر ابھی تک کسی بھی طریقے سے اس کیس کو حل نہیں کرسکا تھا، کیس کا کوئی بھی سرا ملتا تو ساتھ کئی الجھنیں لے آتا تھا، یہ کیس حل ہوتا ہوا محسوس نہیں ہورہا تھا، انسپکٹر نے اپنی میز کی دراز کھولی اور اس میں سے ایک شاپر نکالا اور اس میں موجود چیزوں کو نکال کر میز پر رکھ دیا، وہ تقریباً ساری کی ساری جلی ہوئی تھیں، انسپکٹر کی نگاہوں نے ان چیزوں میں سے جس چیز پر کراس کا نشان لگایا وہ ایک وزیٹنگ کارڈ تھا جو آدھا جل چکا تھا۔ کارڈ میں اوپر نیچے دو کلر تھے پیلا اور نیلا، پیلے حصے پر نیلے حروف میں DZ لکھا ہوا تھا۔ نیچے ایڈریس بھی لکھا ہوا تھا جو آدھا جل چکا تھا۔ "آفس نمبر 3..... بس اتنا ہی لکھا ہوا تھا باقی ایڈریس جل چکا تھا۔

"یہ کس کا کارڈ ہوسکتا ہے اور DZ کا کیا مطلب ہوسکتا ہے؟" انسپکٹر بڑبڑایا، اس نے میز پر پڑی بیل بجائی تھوڑی دیر بعد مراد اندر داخل ہوا۔ "مراد یہ کارڈ دیکھو... کس کا ہوسکتا ہے؟" انسپکٹر نے وہ جلا کارڈ مراد کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا، مراد نے کارڈ غور سے دیکھنے کے بعد کہا۔ "سر پتہ کرنا پڑے گا کہ یہ کس کا کارڈ ہے۔"

"ٹھیک ہے...... تو پھر پتہ کرو...... ایک کام اور کرو، ناصر صاحب کے وکیل کو بھی میرے پاس جلد سے جلد بھیجو۔" انسپکٹر نے تاکید کرتے ہوئے کہا تو مراد اثبات میں سر ہلاتا کمرے سے باہر نکل گیا۔

تقریباً ایک گھنٹہ بعد ناصر کا وکیل انسپکٹر کے آفس میں تھا، ناصر کے وکیل سے ملاقات سودمند ثابت ہوئی، اس کے جانے کے بعد مراد آفس میں آ گیا......

"مراد یہ ناصر صاحب کا کیس تو عجیب الجھن ہے یہ کیس بار بار گرگٹ کی طرح رنگ بدل رہا ہے۔" انسپکٹر نے پریشان کن لہجے میں کہا۔ "کیوں سر...... کیا ہوا؟" مراد نے حیرانگی سے پوچھا۔

"اس کیس کا ہر نیا ملنے والا سرا عجیب الجھن ساتھ لے کر آتا ہے۔" انسپکٹر نے کہا اور ساتھ ہی وکیل سے ہونے والی گفتگو مراد کے سامنے دہرادی، وہ بھی حیران ہوا اور "یہ تو واقعی حیرانگی والی بات ہے۔" مراد نے کہا۔

"خیر تم بتاؤ تم نے اس کارڈ کے بارے میں کچھ پتہ چلایا۔" انسپکٹر نے مراد کو یاد دلایا۔ "یس سر وہ کسی ڈیٹیکٹو زاہد کا کارڈ ہے۔" مراد نے بتایا۔

ہوں۔ "ڈیٹیکٹو" اس کا مطلب ہے کارڈ پر لکھے حروف کا مطلب (DZ) ڈیٹیکٹو زاہد ہے جو جاسوسی کا کام کرتا ہے۔" انسپکٹر نے کہا۔

"بالکل سر......" مراد نے اثبات میں سر ہلایا۔

"چلو..." انسپکٹر احمد نے لفظ چلو کو لمبا کرتے ہوئے کہا۔ "ایک ملاقات ڈیٹیکٹو زاہد سے بھی کر لیتے ہیں۔"

انسپکٹر احمد اور مراد جیپ میں آ کر بیٹھ گئے۔ انسپکٹر نے مراد کو کچھ سمجھاتے ہوئے کہا۔ "اگر گھی سیدھی انگلی سے نہ نکلا تب ہم یہ ڈرامہ کریں گے کیونکہ یہ جاسوس حضرات بہت تیز ہوتے ہیں۔" انسپکٹر نے کہا تو مراد نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

جلد ہی وہ دونوں ڈیٹیکٹو زاہد کے آفس میں پہنچے، مصافحے کے بعد وہ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ "زاہد صاحب کیا آپ مشہور بزنس مین ناصر کو جانتے ہیں۔" انسپکٹر نے زاہد کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔ ناصر کا نام سنتے ہی زاہد کے چہرے پر پریشانی کی ایک لہر واضح ہوئی لیکن زاہد نے جلدی سے اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا۔ "ج...... جی نہیں......" زاہد نے انسپکٹر کی توقع کے مطابق جواب دیا۔

"اچھا...... چلو مراد پھر چلتے ہیں......" انسپکٹر احمد نے اٹھتے ہوئے کہا، مراد بھی انسپکٹر کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا اور زاہد حیران و پریشان انسپکٹر احمد کی طرف دیکھنے لگا وہ حیران تھا کہ انسپکٹر اس سے صرف یہی سوال پوچھنے آیا تھا۔ "لیکن سر آپ نے زاہد صاحب سے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ آپ کو ناصر صاحب کے جلے ہوئے بنگلے سے زاہد صاحب کے" مراد نے انسپکٹر سے کہنے کی کوشش کی لیکن انسپکٹر زاہد کے آفس سے باہر نکل چکا تھا اور مراد بھی اس کے پیچھے

ہی باہر نکل گیا تھا۔ آفس سے باہر نکلتے وقت انسپکٹر نے کن انکھیوں سے زاہد کی طرف دیکھا تھا مرد کی اس بات سے زاہد کافی پریشان اور بے چین نظر آرہا تھا۔

☆ ... ☆ ... ☆

اس آدمی نے اپنی کار ناصر کے جلے ہوئے بنگلے کے سامنے روکی اور کار سے اتر کر بنگلے کی طرف بڑھا۔ وارننگ ٹیپ کراس کر کے وہ آگے بڑھا اور ایک طرف پڑے ملبے کی طرف بڑھا اور اس میں کچھ تلاش کرنے لگا۔ "ڈیمیکو زاہد آپ جو گھڑی ڈھونڈ رہے ہیں وہ میرے پاس ہے۔" اچانک اس آدمی کے کانوں میں انسپکٹر احمد کی آواز پڑی تو وہ آدمی جو کہ ڈیمیکو زاہد تھا، گھوم کر دیکھا، سامنے انسپکٹر احمد اور مرد ہاتھوں میں ریوالور لئے کھڑے تھے، انسپکٹر نے اپنے ہاتھ میں ایک گھڑی پکڑی ہوئی تھی، تھوڑی دیر بعد وہ تینوں تھانے کے ڈرائنگ روم میں موجود تھے۔ "ہاں تو زاہد صاحب آپ یہ بتانے کی تکلیف کریں گے کہ آپ نے یہ بھیانک جرم کیوں کیا؟" انسپکٹر نے سخت لہجے میں پوچھا۔

"انسپکٹر صاحب میں نے یہ جرم نہیں کیا۔" زاہد نے پختہ لہجے میں کہا۔

"تو پھر کس نے کیا؟" انسپکٹر نے بدستور سخت لہجے میں کہا۔

"خود ناصر صاحب نے!!" زاہد نے دھماکہ کیا اور انسپکٹر حیرت سے اچھلا۔

"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے! ناصر صاحب تو مر چکے ہیں۔" انسپکٹر نے غصے سے کہا۔

"میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں انسپکٹر صاحب۔" پیار جب نفرت میں بدل جائے تو ایسے حیران کن واقعات ہی ہوتے ہیں..... انسپکٹر صاحب میں آپ کو شروع سے ساری بات بتاتا ہوں..... ناصر صاحب اور ماریہ میڈم کی شادی بڑی خوشگوار جا رہی تھی دونوں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر پیار کرتے تھے، شادی کے بعد انسان کی یہی خواہش اولاد کا حصول ہوتی ہے چاہے وہ لڑکا ہو یا لڑکی انسان کا کام کوشش کرنا ہوتا ہے لیکن جب کوششوں کے باوجود کوئی نتیجہ نہ نکلے تو پریشانی انسان کا مقدر بن جاتی ہے اور ایسا ہی کچھ دونوں میاں بیوی کے ساتھ بھی ہوا۔

کافی عرصہ گزرنے کے باوجود جب کوئی بات نظر نہ آئی تو ماریہ میڈم پریشان رہنے لگیں، پھر کچھ عرصے بعد کاروبار کے سلسلے میں ناصر صاحب کو بیرون ملک جانا پڑا۔ اپنے کام سے فارغ ہونے کے بعد ناصر صاحب نے اس سلسلے میں ایک ڈاکٹر سے بات کی تو ڈاکٹر نے چیک اپ کا مشورہ دیا۔

چیک اپ کے بعد ناصر صاحب کو ایک دل خراش خبر ملی کہ ناصر صاحب میں کمی تھی، وہ کبھی بھی باپ نہیں بن سکتے تھے۔

ناصر صاحب بجھے بجھے سے اپنے ملک واپس پہنچے تو دوسری خبر نے ان کو چکنا چور کر دیا۔ ماریہ میڈم ماں بننے والی تھیں!!!

ناصر صاحب کو اپنے آگے اندھیرا ہی اندھیرا نظر آرہا تھا۔ ان میں تو باپ بننے والے جراثیم موجود نہیں تھے، پھر ماریہ کیسے پریگنینٹ ہوئی؟"

ناصر صاحب نے ابھی تک ماریہ سے اپنے چیک اپ والی بات نہیں کی تھی۔ "اب ناصر صاحب اندر ہی اندر گھلنے لگے۔" اس کا مطلب ہے کہ ماریہ ہرجائی ہے۔" ناصر صاحب نے سوچا۔ "یہ کسی غیر کا بستر گرم کرتی ہے، یہ بدچلن ہے۔"

طرح طرح کے خیالات انہیں سونے نہیں دیتے تھے، پھر ناصر صاحب نے میری خدمات حاصل کیں اور بولے۔ "تمہیں صرف اس عورت کی نگرانی کرنی ہے۔" ناصر صاحب نے میڈم ماریہ کی تصویر مجھے دکھاتے ہوئے کہا۔

"یہ کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میری بیوی۔" ناصر صاحب نے کہا مجھے حیرت ہوئی۔ "آپ کی وائف۔" میں حیرت کے ساتھ بولا۔

"ہاں میری وائف..... تم نے اس کا سایہ بننا ہے..... اس کی ہر حرکت نوٹ کرنی ہے..... یہ کس کس سے ملتی ہے؟؟"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا میں اپنے کام میں

اسی دن سے لگ گیا اور چند ہی دنوں میں ساری رپورٹ ناصر صاحب کے سامنے رکھ دی۔ "سر آپ کی وائف بے وفا ہے۔" میں نے دھماکہ کیا۔

"کون ہے وہ؟؟" ناصر صاحب نے پوچھا۔

"آپ کا خاص دوست سلمان۔" اس دفعہ کے دھماکے نے ان پر اثر کیا وہ کرسی سے جیسے اچھلے۔ "سلمان۔" ان کے منہ سے نکلا۔

"بالکل سلمان ہی ہے۔" میں نے پختہ لہجے میں کہا۔

ناصر صاحب کی آنکھوں میں، میں نے آنسو صاف دیکھے انہوں نے مجھے جانے دیا اور کچھ دنوں بعد پھر مجھ سے رابطہ کیا، ان کی اور میری ملاقات ہوٹلوں میں ہوتی تھی، "مسٹر زاہد ایک کام کے سلسلے میں مجھے آپ کی مدد درکار ہے۔" ناصر صاحب نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"جی فرمایئے...... کوئی بھی کام ہو۔" میں نے تہہ دل سے کہا، ناصر صاحب میرے کیریئر میں وہ انسان تھے جنہوں نے مجھے متاثر کیا تھا۔ "پہلے ایک بات بتاؤ۔" ناصر صاحب نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی پوچھیے۔" میں متوجہ ہوا، وہ کچھ دیر کے لئے چپ ہوئے اور پھر مجھ سے گویا ہوئے۔ "مسٹر زاہد پیار بھی بڑی عجیب چیز ہے۔ عجیب احساس ہے...... ایک دغا ہے ایک دھوکا ہے...... انسان جب کسی سے اتنا پیار کرے تو اسے بھی بدلے میں پیار ملنا چاہئے...... ملنا چاہئے ناں......؟" ناصر صاحب نے مجھ سے تصدیق چاہی......

"بالکل......" میں پھیکے لہجے میں بولا حالانکہ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ پیار میں بہت بڑا دھوکا کھا چکے تھے۔

"پھر میرے ساتھ کیوں دھوکا ہوا؟ میں نے تو پیار کے بدلے پیار مانگا تھا......" ناصر صاحب رکے وہ دلبرداشتہ تھے اور ان کی آنکھوں سے آنسو رواں دواں تھے۔ "تم بتاؤ زاہد جب پیار میں کوئی کسی کا دل توڑتا ہے تو دل توڑنے والے کا کیا کرنا چاہئے۔ میں نے تو اس سے کبھی اولاد کی خواہش نہیں کی تھی، کبھی اسے ظاہر بھی نہیں ہونے دیا کہ میں اولاد چاہتا ہوں۔ کیا شادی اور پیار کا حصول صرف اولاد ہی ہے۔ پیار تو ایک پاک رشتہ ہے جس میں انسان جواباً پیار ہی چاہتا ہے۔ لیکن جب دغا ملے تو انسان کو دغا دینے والے سے اتنی نفرت کیوں ہوجاتی ہے؟" ناصر صاحب کے لہجے میں یکدم غصہ آگیا۔

میں نے ان کی آنکھوں میں انگارے سے محسوس کئے میں خاموشی سے ناصر صاحب کی باتیں سن رہا تھا۔

"خیر...... میں سلمان اور ماریہ کا خون کرنا چاہتا ہوں۔"

آخر کار ناصر صاحب نے مجھے اپنے دھماکہ خیز مقصد سے آگاہ کیا۔ میرا انداز وہ بہت عجیب تھا۔

"ہاں میں ان دونوں کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔" ناصر صاحب نے پختہ لہجے میں کہا اور میں خود کو بھی ختم کرنا چاہتا ہوں۔"

اس مرتبہ میں کرسی سے جیسے اچھلا۔ "میں تمہیں اس کام کے ایک کروڑ روپے دوں گا۔" ناصر صاحب نے مجھے حیرت انگیز آفر پیش کی۔

"ایک...... ایک کروڑ......" میرا حلق خشک ہوگیا اور میں نے اپنے سامنے ٹیبل پر پڑے پانی کے گلاس کو اٹھایا اور ایک ہی سانس میں غٹاغٹ پی گیا۔ "لیکن مجھے کرنا کیا ہوگا؟"

"وہ میں تمہیں وقت آنے پر بتاؤں گا۔" ناصر صاحب نے کہا۔

"لیکن آپ خود کو کیوں مارنا چاہتے ہیں اگر آپ کی بیوی نے آپ کو دھوکا دیا ہے تو آپ اسے طلاق دے دیں۔" میں نے ناصر صاحب کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

وہ مسکرائے...... "میری دنیا میرا پیار میرا سب کچھ ماریہ تھی، میں اسے مکر و فریب کی سزا دینا چاہتا ہوں، سلمان میرا خاص دوست تھا اس نے دوست ہوکر مجھے اتنا بڑا دھوکا دیا اس پیار میں دھوکا کرنے والوں اور دوستی کے نام پر دھوکا کرنے والوں کو سزا دینا چاہتا ہوں۔ اور رہا میرا سوال تو مجھے اب اس دنیا سے نفرت ہوگئی ہے، میں اب جینا نہیں

چاہتا۔" انہوں نے بتاتے ہوئے اپنا اصل فیصلہ سنایا۔" ماریہ نے مجھے دنیا میں رہنے کے قابل نہیں چھوڑا ہے۔"

"لیکن سر پولیس؟" میں نے معنی خیز لہجے میں بات ادھوری چھوڑ دی۔

"پولیس کو کچھ پتہ نہیں چلے گا ان دونوں کو میں ہی ماروں گا اور خود کو بھی خود ہی ماروں گا۔ پولیس اندھیرے میں ہاتھ مارتی رہے گی اس کام کے لئے میں نے ایک گواہ بھی بنالیا ہے۔" یہاں تک کہہ کر ناصر صاحب رکے۔

"گواہ کیسا گواہ؟" میں حیران ہوا۔

"میری پرسنل سیکریٹری زاہدہ، میں اس کے سامنے کئی دنوں سے ایکٹنگ کر رہا ہوں کہ ایک شخص مجھے فون پر جان سے مارنے کی دھمکیاں دے رہا ہے، میں نے اسے شادی کے لئے 20 لاکھ روپے کی رقم بھی دی ہے، وہ تفتیشی آفیسر کو بھی بیان دے گی کہ کوئی مجھے فون پر جان سے مارنے کی دھمکیاں دے رہا ہے اور مجھ سے پیسوں کی مانگ بھی کر رہا ہے، اس کمینے سلمان سے بھی میں نے ایک کروڑ روپے کا چیک کیش کروایا ہے، منیجر بھی یہی گواہی دے گا کہ سلمان ہی بینک سے رقم کیش کروا کر گیا تھا، وہ رقم تم آج کسی بھی وقت اس کے گھر پہنچاؤ گے یعنی جو فرضی کہانی میں پولیس کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ سلمان مجھے فون پر بلیک میل کرتا ہے پھر وہ مجھ سے رقم کا مطالبہ کرتا ہے، میں جان کے ڈر سے اسے وہ رقم دے دیتا ہوں پھر وہ میرا اور ماریہ کا خون کرنے کے بعد میرے بنگلے کو آگ لگا دیتا ہے۔

پولیس اتنی گہرائی میں نہیں جائے گی تھوڑی بہت چھان بین کرے گی اور پھر اس کیس کو کلوز کر دے گی۔ میں نے اپنی ساری جائیداد بھی ٹرسٹ کے نام کر دی ہے کیونکہ یہ دولت ٹرسٹ کے کام آئے گی۔"

پھر حادثے والے دن ناصر صاحب نے مجھے اپنے گھر بلایا، وہ مجھے اندر لے آئے اور ٹی وی لاؤنج میں ایک پردے کے پیچھے چھپا دیا، میں اس پردے کے پیچھے سے ساری کارروائی دیکھنے لگا۔ میں نے ساری کارروائی پردے کے پیچھے سے دیکھی۔ تھوڑی دیر بعد میڈم ماریہ آ گئیں۔ "کہاں سے آ رہی ہو تم؟" ناصر صاحب نے سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

"ڈارلنگ میں اسپتال چیک اپ کے لئے گئی تھی۔" میڈم ماریہ نے ناصر صاحب کے گلے میں بانہوں کا ہار ڈالتے ہوئے کہا۔

"اچھا ایسا کرو کھانا لگاؤ۔ آج میں نے سلمان کو انوائٹ کیا ہے، وہ آج کا ڈنر ہمارے ساتھ کرے گا۔" ناصر صاحب نے میڈم ماریہ کے بانہوں کے ہار کو توڑتے ہوئے کہا۔

"سلمان..... لیکن کیوں؟" ماریہ نے ناگواری سے کہا۔

ناصر صاحب میڈم ماریہ کی اداکاری پر مسکرائے اور کہا۔ "بس ویسے ہی۔"

"لیکن ڈارلنگ کھانا تو ابھی پکانا ہے۔" ماریہ میڈم نے کہا۔

"کھانا میں بازار سے لے آیا ہوں تم ٹیبل پر لگاؤ۔" ناصر صاحب نے کہا تو میڈم ماریہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کچن کی طرف بڑھ گئیں تھوڑی دیر بعد سلمان بھی آ گیا، کھانا شروع ہوا، ناصر صاحب کھانے کے دوران کئی دفعہ سلمان کی طرف اشارہ کر گئے، کبھی اس کی پلیٹ میں کچھ ڈالتے، کبھی گلاس میں پانی بھرنے کے بعد اسے دیتے، کھانے سے فارغ ہونے کے بعد تھوڑی سی گپ شپ کے بعد سلمان وہاں سے چلا گیا۔

"ماریہ ... میں نے تم سے کون سی بے وفائی کی تھی جو تم نے مجھ سے اتنا بڑا دھوکا کیا۔ کبھی بھی تم سے اولاد کا تذکرہ کیا ہو؟" سلمان کے جانے کے بعد ناصر صاحب یکدم اصل موضوع کی طرف آ گئے اور میڈم ماریہ کا رنگ یکدم اڑ گیا۔ "ڈ... ڈار... لنگ... یہ یہ تم..." میڈم ماریہ سے پوری بات بھی نہ ہو سکی۔

"میں نے تم سے دل و جان سے محبت کی اور تم نے مجھے اتنا بڑا دھوکا دیا۔" اتنا کہہ کر ناصر صاحب نے جیب سے اپنی رپورٹ نکال کر ماریہ میڈم کی طرف پھینکی، جسے ماریہ میڈم اٹھا کر پڑھنے لگیں۔

"تم نے مجھے بہت بڑا دھوکا دیا ہے۔ ماریہ...... میں نے تم سے محبت کی تھی دل و جان سے...... لیکن تم نے...." ابھی ناصر صاحب نے اتنا ہی کہا تھا کہ ماریہ میڈم کی چیخ سنائی دی میڈم ماریہ نے اچانک میز پر پڑی ہوئی چھری اٹھا کر اپنے پیٹ میں گھونپ دی تھی۔

ناصر صاحب تیزی سے فرش پر گری میڈم ماریہ کی طرف بڑھے۔

"یہی...... مم...... میری توبہ...... کی راہ تھی۔ میں نے اس گندے وجود اور سامان کی نشانی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مٹا دیا ہے۔" میڈم ماریہ بس اتنا ہی کہہ سکیں۔

میں پردے کے پیچھے سے باہر نکل آیا۔ "اگر یہی ہوش میڈم ماریہ کو یہ گناہ کرنے سے پہلے آجاتا تو ایسی نوبت ہی نہ آتی۔" میں نے میڈم ماریہ کے مردہ جسم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"بعض اوقات انسان گناہ کررہا ہوتا ہے پر اسے گناہ کا احساس نہیں ہوتا......" ناصر صاحب نے کہا۔ ناصر صاحب نے میڈم ماریہ کی موت پر ایک بھی آنسو نہیں بہایا کیونکہ ان کی آنکھوں کے آنسو خشک ہوگئے تھے۔

"اب آپ مزید کچھ نہ کریں سر...... دوسری شادی کرلیجئے گا۔" میں نے ناصر صاحب کو دوبارہ مشورہ دیا۔

"نہیں زاہد...... مجھے عورت کے نام سے نفرت ہوگئی ہے باقی مجھ میں ایسا نقص ہے کہ ہر عورت کسی نہ کسی موڑ پر مجھ سے بے وفائی کرے گی...... میری زندگی ماریہ تھی اور اب مجھے زندگی سے بھی نفرت ہوچکی ہے، میں اب جینا نہیں چاہتا۔"

"لیکن آپ کا اصل مجرم تو ابھی زندہ ہے۔" میں نے کہا۔

"نہیں...... میں نے اس کے پانی میں زہر ملا دیا تھا وہ بھی چند لمحوں کا مہمان ہے۔" ناصر صاحب نے کہا۔

"اب آپ کا کیا پروگرام ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تم مجھے بے ہوش کرنے کے بعد باندھ کر دوسرے کمرے میں ڈال دو گے اس کے بعد پورے بنگلے میں مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دو گے... میں نہیں چاہتا کہ میری اور ماریہ کی کہانی کسی اور کو پتہ چلے... پولیس بس شک کرتی رہے گی مگر اسے کچھ پتہ نہیں چلے گا...." ناصر صاحب نے کہا۔

"لیکن ناصر صاحب... یہ... یہ تو غلط ہے۔" میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"غلط یا صحیح...... اس بات کو تم چھوڑو...... تمہیں اس کام کے میں نے ایک کروڑ روپے دیئے ہیں...... تم نے کچھ غلط نہیں کرنا، یہ سارا کام میری رضامندی سے ہورہا ہے...... اس بے وفا عورت نے خود کو ختم کرلیا ہے، نہیں تو میں اسے اپنے ہاتھوں سے ختم کرتا......" ناصر صاحب نے زمین پر پڑی میڈم ماریہ کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے پسٹل کے دستے سے ناصر صاحب کو بے ہوش کرنے کے بعد انہیں رسیوں سے باندھا اور پھر پورے بنگلے میں مٹی کا تیل چھڑکنے کے بعد بنگلے کو آگ لگادی۔" اتنا کہہ کر ڈیکو زاہد خاموش ہوگیا اور انسپکٹر احمد حیرت سے اس کا منہ تکنے لگا۔

انسپکٹر سوچ بھی نہیں سکتا تھا یہ کیسی کہانی عجیب نکلی تھی۔ ایک سیدھے سادے شخص نے ایسا بھیانک اور انوکھا ڈرامہ رچایا تھا کہ وہ خود کو مارنے پر تل گیا تھا۔ پیار میں دھوکا ایسا عمل انسپکٹر احمد نے اپنی زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔

انسپکٹر احمد نے جب ناصر کے وکیل سے ملاقات کی تو وکیل نے بتایا تھا کہ ناصر نے اپنی ساری جائیداد ٹرسٹ کے نام کردی تھی وہ اس بات پر کافی حیران ہوا تھا وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کے پیچھے یہ کہانی نکلے گی۔

انسپکٹر احمد کو ناصر کے بنگلے سے ملنے والے ملبے سے زاہد کی گھڑی بھی ملی تھی جس پر DZ لکھا ہوا تھا اسی گھڑی کی بنیاد پر انسپکٹر احمد ڈیکو زاہد تک پہنچا تھا اور انسپکٹر کو اس خونی واقعہ کا پتہ چلا تھا جو کہ کافی ہٹ ہوگیا تھا...... لیکن انسپکٹر احمد یہ فیصلہ نہیں کرپارہا تھا کہ ناصر نے غلط کیا تھا یا صحیح......؟

انجام حرص

آصفہ سراج۔لاہور

جلتے ہوئے الاؤ کے سامنے عامل کھڑا تھا کہ ایک نوجوان بھاگتا ہوا آیا اور اس الاؤ میں نوٹوں کی گڈیاں پھینک دیں کہ اچانک آگ کے شعلے بھڑکے اور عامل کے جسم کو جھلسانے لگے پھر ایک منظر جو کہ ــــ

جو لوگ اپنی لامحدود خواہشات پر کنٹرول نہیں کر پاتے، ایسے لوگوں کے لئے سبق آموز کہانی

سکینہ نے گھر میں آ کر بہت خوش تھی اسے یہ گھر بہت پسند آیا تھا، بالائی منزل پر کھڑے ہو کر صبح ہی صبح سورج کی پہلی کرنوں کو دیکھنے کا منظر بہت اچھا لگتا تھا۔ یہ خوشی اسے بہت عرصے کے بعد میسر آئی تھی۔ پچھلے پانچ سالوں سے میاں بیوی کرائے کے مکان میں رہتے تھے۔ کوئی اس سے پوچھتا کہ آج کے مہنگائی کے سخت ترین حالات سے وہ لوگ کیسے ہر ماہ کرایہ نکالتے تھے، اس پر بجلی کے بل بجلی گرا دیتے، پھر بھی جیسے تیسے کر کے حالات سے سمجھوتہ کر کے کمیٹی ڈال کر اور بچت کر کے وہ اپنا ایک چھوٹا سا گھر لینے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ فاروق بھی اپنی بیوی سکینہ کو خوش دیکھ کر بہت خوش تھا۔

وہ بھی سکینہ کے دل میں چھپی خواہش کو جان گیا تھا کہ ہر عورت کی طرح سکینہ کے دل میں بھی اپنے گھر کی چاہ تھی اس لئے وہ دل و جان سے محنت کرنے لگا اور اس طرح آج وہ اپنے ذاتی مکان کے خود مالک تھے، سکینہ بچوں کی طرح خوش ہو رہی تھی وہ بار بار گھر میں گھوم پھر کر گھر دیکھ رہی تھی۔ اس کی خوشی اس کے لہجے سے چھلک رہی تھی، فاروق بھی سکینہ کو خوش دیکھ کر دل ہی دل میں مسکرا رہا تھا۔

فاروق ویلڈنگ کا کام کرتا تھا۔ مگر مزدوری میں وہ بات کہاں جو اپنے کام میں تھی، سکینہ کے بار بار اصرار کرنے پر

فاروق نے دو سال پہلے ہی اپنی دکان کرائے پر لے کر اپنا کام شروع کیا۔ تھوڑے ہی دنوں میں اس کی دکان چل نکلی، یوں اس نے دو سال کے عرصہ میں اپنا مکان خرید لیا، ان لوگوں کو نئے گھر میں شفٹ ہوئے ایک ماہ ہو گیا تھا اور سکینہ نے تو پاس پڑوس میں سہیلیاں بھی بنالی تھیں۔

صابرہ، سلمیٰ، نادیہ اور نورین سب ہی بہت اچھی تھیں۔ گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر وہ سب ایک جگہ مل کر بیٹھتیں...... ان سب کے گھر ساتھ ساتھ جبکہ نورین اور نادیہ کا گھر آمنے سامنے تھا۔ گلی سے باہر نکل کر تھوڑی دوری پر ایک بہت بڑا کھلا میدان تھا۔ جس کے بیچوں بیچ ایک بہت بوڑھا برگد کا درخت براجمان تھا۔ جو بہت ہی پراسرار لگتا تھا، گلی میں کھڑے ہو کر دیکھو تو برگد کا درخت بالکل صاف نظر آتا۔ درخت کی شاخیں بہت دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔

عام روٹین میں وہ میدان بالکل ہی سنسان رہتا تھا۔ مگر جمعرات کو بہت ہی عورتیں درخت کے پاس آتی رہتیں اور رنگ برنگی کپڑے کے ٹکڑے اور دھجیاں، درخت کی شاخوں پر باندھ کر چلی جاتیں۔

پہلے پہل تو سکینہ اس درخت کو دیکھ کر بہت حیران ہوئی کہ اس پر رنگا رنگ ہرے نیلے لال، پیلے رنگ کے کپڑے کون باندھ کر جاتا ہے۔

یہ سوال اس نے صابرہ سے کیا جو اس نے جواب دیا کہ "یہ بہت ہی پرانا درخت ہے اس پر کپڑا باندھ کر جو بھی منت مانی جائے تو وہ پوری ہو جاتی ہے۔"

وہ سب روزانہ ہی مل کر بیٹھتیں اور نت نئے موضوع پر گفتگو کرتی رہتیں۔ وہ ہر موضوع پر بات چیت کرتیں اور بات بات پر کھلکھلانے لگتیں۔

ایک دن وہ سب مل کر بیٹھی ہوئی تھیں کہ اچانک ہی ان کی باتوں کا ذکر درخت پر آ کر رک گیا، ہر کوئی اس درخت کے بارے میں نئی بات سنا رہی تھی۔ ان چاروں کا کہنا تھا کہ "ہم نے تو آج تک کبھی کوئی منت نہیں مانی۔ اگر مانگنا ہی ہے تو اللہ سے مانگنا چاہئے یہ تو ہم پرست لوگوں کا کام ہے ہمیں نماز پڑھ کر اللہ سے مانگنا چاہئے۔"

بس کچھ لوگوں کی رائے اس درخت کے بارے میں کچھ اور تھی ان لوگوں کا کہنا تھا کہ "یہ درخت خونی ہے جہاں سب کی مرادیں پوری کرتا ہے تو وہیں ان کا سب کچھ چھین بھی لیتا ہے۔"

کچھ لوگوں کا یہ بھی کہنا تھا کہ کچھ بھی ہو یہ درخت ان کی مراد پوری کرتا ہے۔ اور سچ بھی یہی تھا کہ واقعی جس چیز کی لوگ منت مانتے تھے وہ پوری ضرور ہوتی تھی، غرض کہ جتنے منہ اتنی باتیں۔

سکینہ کچھ تو ہم پرست واقع ہوئی تھی، ویسے تو اس نے بھی اس قسم کی منت نہیں مانی تھی۔

مگر سکینہ کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ "کیا ہے اگر میں کچھ اس درخت سے مانگ کر دیکھ لوں تو......"

ان چاروں کے سامنے وہ خاموش ہی رہی...... مگر روز گزرتے دن کے ساتھ ہی وہ بے چین ہو رہی تھی اور جمعرات کا انتظار کر رہی تھی، پھر یہ بھی سوچ رہی تھی کہ کیا منت مانوں اس کے پاس بہت کچھ تھا۔

اللہ جتنا انسان کو دیتا ہے وہ اس سے زیادہ کی تمنا کرنے لگتا ہے، انسانی فطرت بس اپنی خواہشات کا حصول ہے اگر اسے دولت مل جائے تو وہ اس سے زیادہ کی طلب کرتا ہے، اگر اسے محبت مل جائے تو وہ اس سے زیادہ کی خواہش کرنے لگتا ہے اگر اسے مقدر کا اختیار مل جائے تو انسان جنت کی خواہش کرنے لگے۔

دن گزرے اور جمعرات آئی، سکینہ چادر لپیٹے منہ ڈھانپ کر درخت کے پاس پہنچ گئی، عورتیں عموماً صبح 8 بجے سے آنا شروع کرتی تھیں۔

درخت کے پاس آ کر وہ خوفزدہ بھی ہوئی، پھر بھی درخت پر اپنے دوپٹے کا تھوڑا سا حصہ باندھتے ہوئے بولی۔ "فاروق کا کاروبار پھل جائے۔"

کام تو فاروق کا ٹھیک تھا مگر جس دکان میں وہ کام کرتا تھا وہ دکان بہت زیادہ چھوٹی تھی، بہت زیادہ تنگی ہوتی تھی، پھر اس نے کام کے لئے ایک لڑکا بھی رکھا ہوا تھا۔

منت مان کر سکینہ تیز تیز قدموں سے گھر آ گئی۔

ابھی اس نے فاروق کو اس بارے میں نہیں بتایا تھا وہ

اپنی منت پوری ہونے کا انتظار کررہی تھی۔
ابھی تین دن ہی گزرے تھے کہ فاروق بہت خوش خوش گھر میں آیا اور بتایا "اسے ایک دکان مل رہی ہے جو کہ نہ صرف بہت بڑی ہے بلکہ بارونق علاقے میں ہے اور دکان کا مالک نہ صرف اس کو دکان دینے پر مان گیا ہے بلکہ ایڈوانس کی رقم اکٹھی دینے کی ضرورت بھی نہیں، بلکہ ماہانہ قسطوں کی صورت میں ادا کرنا ہے۔
فاروق حیران بھی تھا کہ اتنی بڑی دکان اسے نہایت مناسب رقم میں کیسے مل گئی تھی۔
فاروق کا کام تیزی سے چمک رہا تھا۔ اب تو فاروق نے دکان پر چار لڑکے اور رکھ لئے تھے کام کے لئے۔
پھر سکینہ نے ایک دن فاروق کو اپنی منت کا بتایا۔ یہ سن کر فاروق کو بہت غصہ آیا اور وہ کہنے لگا۔ "کتنی وہمی ہو تم۔ ہم مسلمان ہیں ہندو نہیں جو تم منت مان رہی ہو، وہ بھی ایک درخت سے۔۔۔۔۔ کیا فرق رہ گیا ہے تم میں اور ایک ہندو میں، آج ایک درخت سے، اور کل تم کالی ماتا کی پوجا کرو گی، اور مندر میں جاؤ گی، سکینہ ہوش میں آؤ ہمیں جو کچھ دیتا ہے اللہ ہی دیتا ہے۔"
فاروق کے بگڑتے موڈ کو دیکھ کر سکینہ خاموش ہوگئی، مگر اس کے دل میں یہ بات گھر کر گئی کہ اس کی درخت سے مانی ہوئی منت پوری ہوگئی ہے اور اس طرح سکینہ اس درخت کی پیروکار بن گئی۔
پھر کچھ دن اور گزرے تھے کہ ایک دن پھر سکینہ جمعرات کی صبح کو خود بخود درخت کے قریب پہنچ گئی۔ وہ حیران تو ہوئی مگر پھر ایک اور منت مان بیٹھی۔
کچھ دن پہلے اس کے گھر صابرہ، سلمٰی، نادیہ اور نورین آئی تھیں، تو باتوں باتوں میں ذکر چل نکلا، نادیہ بولی۔ "سکینہ تمہارے پاس 15000 روپے ہیں۔ تو کچھ دنوں کے لئے دو مجھے بہت ضرورت ہے۔ یہ 15000 روپے کا بونڈ ہے یہ تم رکھ لو جیسے ہی میرے پاس پیسے ہوں گے، میں تمہیں دے کر یہ بونڈ لے لوں گی۔"
"کیا تمہارا کبھی انعام نکلا ہے بونڈ سے؟" سکینہ نے پوچھا۔
نادیہ ہنسنے لگی۔ "نہیں کبھی نہیں۔۔۔۔۔ یہ انعام بھی قسمت والوں کا ہی نکلتا ہے۔"
"اچھا 15000 روپے میں تمہیں دیتی ہوں مگر ایک شرط پر کہ یہ پرائز بونڈ میں تمہیں واپس نہیں کروں گی تم رقم لے لو اور مجھے بونڈ دے دو۔"
یوں 15000 کا وہ پرائز بونڈ سکینہ نے لے لیا اور آج وہ اسی پرائز بونڈ کے لئے منت ماننے گئی تھی کہ اس کے بانڈ کا انعام نکل آئے۔ یہ منت مان کر وہ گھر آ گئی۔
کچھ دن اور گزرے۔۔۔۔۔ کہ اسے نادیہ نے بتایا کہ "15000 کے پرائز بونڈ کی قرعہ اندازی ہوگئی ہے تم بھی لسٹ منگوا کر چیک کرلو۔"
پھر تو سکینہ نے تین چار دن تک فاروق کا دماغ کھایا اور لسٹ منگوائی۔۔۔۔۔ مگر یہ سن کر کہ سکینہ نے پھر سے منت مانی ہے وہ خاموش ہوگیا۔
"مگر یہ کیا" لسٹ دیکھ کر پرائز بونڈ کا نمبر میچ کرتی ہوئی سکینہ یکدم خوشی کے مارے چیخنے لگی۔۔۔۔۔ "میری منت پوری ہوگئی، فاروق میرا پرائز بونڈ لگ گیا، پورے 28 لاکھ کا۔"
فاروق بھی حواس باختہ ہوگیا یہ سن کر، سکینہ کا چہرہ تمتما رہا تھا اس کی خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔
"دیکھا میں نہ کہتی تھی کہ وہ درخت مرادیں پوری کرتا ہے۔۔۔۔۔ پہلے بھی تمہارے کام کے لئے میں نے منت مانی تھی، وہ پوری ہوئی اور دیکھو۔۔۔۔۔ آج۔۔۔۔۔ یہ انعام لو خدا تو کتنا مہربان ہے۔"
اب کی بار تو فاروق بھی خاموش ہوگیا۔۔۔۔۔ اور سوچنے لگا کہ "کیا واقعی ایسی بات ہے؟"
پھر اگلے دن ہی وہ بینک گیا اور انعام کی رقم لے آیا۔ اس بارے میں اس نے سکینہ کو بھی ہدایت کی کہ وہ انعام کے بارے میں کسی سے ذکر نہ کرے۔ انعام کی رقم کو انہوں نے بڑی حفاظت کے ساتھ الماری میں لاک لگا کر رکھ دیا۔ ان دونوں کا ارادہ ان پیسوں سے بڑا گھر خریدنے کا تھا۔
اب تو انہیں اپنا یہ گھر بہت ہی چھوٹا لگتا تھا۔۔۔۔۔ اس بارے میں یعنی گھر خریدنے کے بارے میں وہ پراپرٹی ڈیلر کو اپنی رائے بتا چکے تھے کہ "بڑا سا گھر ہو جس میں کم از کم

4 کمرے تو ضرور ہوں اور بڑا سا صحن بھی ہو، وہ ہمیں دکھاؤ۔" پراپرٹی ڈیلر کو کہہ کر وہ پرسکون ہوگئے۔

☆......☆......☆

مگر پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا...... اس طرح سے لئے گئے مال کا یہی انجام ہونا تھا۔ کچھ دن ہی سکون سے گزرے تھے کہ ایک رات سکینہ ہڑبڑا کر نیند سے جاگی۔ اس کا حلق خشک ہو رہا تھا...... "پ...... پ...... پانی" فاروق بھی سکینہ کی گھبرائی ہوئی آواز سن کر یکدم ہی نیند سے جاگا اور جگ میں سے پانی انڈیل کر سکینہ کو گلاس پکڑا دیا۔

اس وقت اچانک ان کے گھر کا دروازہ زور زور سے بجنے لگا، ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی دونوں ہاتھوں سے دروازے کو پیٹ رہا ہو، سکینہ اور فاروق یکدم ہی بوکھلا گئے۔ فاروق نے گھڑی میں ٹائم دیکھا، رات کے ساڑھے تین بجے کا ٹائم تھا۔ "اس وقت کون ہوسکتا ہے؟" فاروق اٹھتے ہوئے بولا۔

"اچھا میں دیکھتا ہوں تم پانی پیو۔"

وہ جیسے ہی مڑا سکینہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "ن...... نہیں...... وہ...... وہی ہوگا تم دروازہ مت کھولو......" وہ بڑبڑانے لگی۔

"تم گھبراؤ نہیں میں دیکھتا ہوں، تم پانی پیو" دروازے کے پاس آیا اور دروازہ کھول دیا۔

مگر یہ کیا...... باہر تو بالکل ہی سناٹا تھا، دور دور تک کسی ذی روح کے آثار نظر نہ آ رہے تھے گلی میں اچھی طرح دیکھتے ہوئے جوں ہی اس کی نظر اس پراسرار درخت کی طرف گئی تو وہ کانپ کر رہ گیا۔ چاندنی رات پورے شباب پر تھی۔

ایک شخص جو کہ کالے لباس میں ملبوس تھا اس نے رنگ برنگے موتیوں کی مالا گلے میں پہنی ہوئی تھی، اسے دیکھ کر قہقہہ لگا رہا تھا، رات کے اس پراسرار ماحول میں وہ شخص قہقہہ لگاتا ہوا بہت ہی بھیانک لگ رہا تھا پھر دیکھتے ہی دیکھتے ایک اور خوفناک منظر رونما ہوا۔

اچانک درخت کے اوپر سے ایک رسی لٹک کر نیچے آ گئی اور جیسے ہی اس آدمی نے رسی اپنے گلے میں ڈالی رسی کو اوپر کھینچ لیا گیا اور وہ آدمی پھندے میں جھول کر رہ گیا، یوں لگتا تھا جیسے اس نے خودکشی کی ہو، پھر پلک جھپکتے ہی وہ منظر غائب ہوگیا وہ آدمی رسی سمیت غائب ہو چکا تھا۔

فاروق نے اپنی آنکھیں ملیں اور درخت کی طرف دیکھا مگر وہاں کچھ بھی نہ تھا، اس نے چاروں طرف دیکھا مگر اسے کوئی نظر نہیں آیا، وہ دروازہ بند کرکے اندر آیا اور پھر سوچنے لگا۔ "یہ پراسرار ہوسکتا ہے یا پھر میرا وہم ہے۔"

سکینہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا، فاروق جب بستر پر بیٹھا تو وہ کہنے لگی۔ "ایک خوفناک سا آدمی اس کے پیچھے پڑ گیا ہے۔" وہ بدحواس ہو رہی تھی پھر بولی۔ "میں نے خود اسے اپنے پلنگ کے پاس کھڑے دیکھا ہے اس نے کالے کپڑے پہنے ہوئے تھے......"

کالے کپڑوں کا سن کر فاروق چونک گیا۔

"و...... وہ مجھے مارنا چاہتا ہے، وہ کہتا ہے کہ وہ مجھے مار دے گا، مجھے چھوڑے گا نہیں، وہ آگ جلا کر کچھ پڑھ رہا ہے۔ ن...... نہیں مجھے مت مارو۔" سکینہ ہذیانی انداز میں چلانے لگی...

فاروق نے اسے سنبھالا اور بولا۔ "دیکھو کوئی نہیں ہے یہاں پر، یہ ہمارا گھر ہے، بس میں ہی ہوں۔ تم نے کوئی برا خواب دیکھا ہوگا۔"

وہ کہنے لگی۔ "میں نے خواب نہیں دیکھا میں ہوش میں ہوں میں نے اسے یہاں...... یہاں کھڑے ہوئے دیکھا......"

"اچھا...... چھوڑو سو جاؤ۔" اس نے سمجھا بجھا کر سکینہ کو سلا دیا۔

مگر یہ تو روز کی بات ہوگئی وہ روزانہ ہی سوتے میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتی... کبھی اسے کوئی مردہ دکھائی دیتا، کبھی اسے کوئی بھیڑیا، اب تو کچھ دنوں سے وہ خواب میں اسی پراسرار درخت کو دیکھ رہی تھی... اس کا ذکر اس نے فاروق سے کیا تو وہ بھی سوچ میں پڑ گیا کہ ہو نہ ہو کچھ تو گڑبڑ ہے۔

ابھی وہ اس بارے میں سنجیدگی سے سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک ہی وہ واقعہ رونما ہوگیا جس نے اسے اندر تک ہلا کر رکھ دیا۔

رات کے پچھلے پہر اچانک اس کی آنکھ کھلی تو سکینہ

اپنے بستر پر موجود نہ تھی وہ پریشان ہوگیا، اگر اسے باتھ روم بھی جانا ہوتا تھا تو وہ فاروق کو اٹھا دیتی تھی، کیونکہ باتھ روم صحن میں تھا، اور اکیلے باہر جانے سے اسے ڈر لگتا تھا، پورے گھر میں ڈھونڈنے پر بھی سکینہ نہ ملی تو اس کا پریشان ہونا فطری بات تھی، وہ سچ میں پریشان ہوگیا تھا۔ وہ اسے آوازیں دے دے کر ڈھونڈ رہا تھا مگر گھر بھی اتنا بڑا نہ تھا کہ وہ کہیں گم ہوجاتی اور اس کے آواز دینے پر بھی نہ آتی، پریشان ہونا ہوا۔

وہ گلی کا دروازہ کھول کر باہر آگیا، جیسے ہی اس کی نظر کھلے میدان کی طرف گئی تو وہ بوکھلا کر رہ گیا اور درخت کے نیچے وہ کالے لباس والا آدمی آگ جلا کر بیٹھا تھا۔ اور کوئی منتر پڑھ رہا تھا۔ اس کے قریب ہی سکینہ ٹرانس کی سی کیفیت میں بیٹھی ہوئی تھی، جیسے اسے کسی نے ہپناٹائز کیا ہو، کسی بھی مزاحمت کے بغیر۔ فاروق نے سکینہ کو آواز لگاتے ہوئے میدان کی طرف دوڑ لگادی، وہ مسلسل آوازیں دے رہا تھا، جب وہ اس کے قریب پہنچا تو اس آدمی نے یکدم آنکھیں کھول دیں اور اپنی خوفناک سرخ آنکھوں سے اسے گھورنے لگا، جیسے بتا رہا ہو کہ ”یہاں سے چلے جاؤ۔“

مگر فاروق اس سے بے نیاز سکینہ کو جھنجھوڑ رہا تھا۔

”چلے جاؤ یہاں سے۔“ وہ آدمی بولا۔ وہ غصے میں کسی خوفناک بھیڑیے کی مانند ہی نظر آرہا تھا۔

مگر فاروق مسلسل سکینہ کو آوازیں دے رہا تھا، سکینہ ہوش میں آؤ، اٹھو یہاں سے، کیا کررہی ہو؟“

یکدم ہی وہ شخص اٹھ کر کھڑا ہوا اور غصے میں فاروق کی طرف بڑھنے لگا۔ ”کیوں میری محنت برباد کررہا ہے، چلا جا یہاں سے۔“ وہ پھنکارا۔ ”میرا آخری شکار ہے۔“ اس نے سکینہ کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس کے بعد میں پھر سے کالے جادو کا ماہر بن جاؤں گا۔“

اس نے آگے بڑھ کر فاروق کے ہاتھ سے سکینہ کا ہاتھ چھڑانا چاہا مگر فاروق کی گرفت بہت سخت تھی۔

”یہ میری بیوی ہے کیا کررہے ہو تم یہ سب کس لئے کررہے ہو؟“ فاروق غصے سے برہم ہوگیا، مگر وہ کچھ نہ بولا اور ہنسنے لگا۔ ”جانتا ہوں..... سب کچھ! بس تم یہاں سے جاؤ، میں تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا۔“ وہ بولا۔

اسی بحث و تکرار میں مسجد سے اذان کی آواز سنائی دی.....

”اللہ اکبر..... اللہ اکبر۔“

یکدم ہی کالے لباس والا خاموش ہوگیا پھر کہنے لگا۔

”آج تو کام ختم ہوگیا مگر یاد رکھنا کل اس کا آخری دن ہوگا۔“ اس نے سکینہ کی طرف اشارہ کیا اور غائب ہوگیا۔

سکینہ جیسے ہوش میں آگئی۔ ”فاروق تم..... میں یہاں.....“ فاروق اسے کچھ بولنے کا موقع دیئے بغیر اسے گھر لے آیا..... اور گھر آکر اسے ساری بات بتائی۔ وہ دونوں میاں بیوی بہت پریشان تھے کہ اس مصیبت سے کیسے جان چھڑائی جائے، اسی پریشانی میں اگلا دن بھی پورا نکل گیا۔

رات کا اندھیرا پھیلتے ہی دل کو دھڑکا لگا، فاروق نے اچھی طرح گھر کے دروازے کو لاک کیا۔ رات گئے تک دونوں جاگتے رہے مگر کہتے ہیں ناں۔ نیند تو سولی پر بھی آجاتی ہے۔ صرف دس منٹ کے لئے ہی فاروق کی آنکھ لگی اور وہی ہوگیا جس کا ڈر تھا، اچانک جھٹکے سے اس کی آنکھ کھلی تو سکینہ غائب تھی۔ وہ دیوانہ وار پاگلوں کی طرح دروازے کی طرف دوڑا، اور دروازہ کھول کر میدان کی طرف بھاگا، جب وہ وہاں پہنچا تو دیکھا آج بھی کالے لباس والا آگ جلائے منتر پڑھ رہا تھا۔

سکینہ کے قریب فاروق پہنچا تو اسے کسی نے زور سے دھکا دیا۔ وہ گر پڑا، پھر اٹھا اور سکینہ کی طرف بڑھا، پھر اسے دھکا لگا، کوئی ان دیکھی طاقت اسے سکینہ کی طرف جانے سے روک رہی تھی اور پھر فاروق نے اس آدمی کی طرف جانے کی کوشش کی کہ اسے یہ منتر پڑھنے سے روک سکے مگر جیسے ہی اس کے بنائے ہوئے حصار میں داخل ہونے کی کوشش کی تو درد کی شدت سے بلبلا اٹھا، یوں لگا جیسے اس کے پاؤں پر کسی نے انگارے رکھ دیئے ہوں، وہ پاگلوں کی طرح چیختا چلاتا رہا، کبھی سکینہ کی طرف کبھی اس آدمی کی طرف جانے کی کوشش کرتا رہا مگر ناکام رہا۔

اب اس نے چیخنا شروع کردیا وہ سکینہ کو نہیں بچا سکے گا۔

بے اختیار ہی اس کے دل سے ”یا اللہ“ نکلا!

انسان اللہ کو صرف مصیبت میں یاد کرتا ہے، خوشیوں میں نہیں مگر اللہ کی شان دیکھو کہ وہ دل سے نکلی ہوئی آواز کا

بھی جواب دیتا ہے۔

فاروق پاگلوں کی طرح بھاگنے لگا، کبھی اس طرف کبھی اس طرف کہ اچانک گلی کی طرف نظر پڑی تو دیکھا کہ کوئی سفید کپڑوں والا کھڑا ہے وہ بھاگتا ہوا اس کے قریب آ گیا۔

وہ باریش بزرگ تھے جن کے چہرے سے نور برس رہا تھا وہ بہت پرنور لگ رہے تھے۔ اچانک وہ بولے۔ ”سکینہ کو بچانا ہے تو اپنی مانی ہوئی منت کو جلا دو یا ضائع کردو۔“

فاروق کچھ نہیں سمجھا تو وہ بزرگ دوبارہ پیار سے بولے۔ ”بیٹا اٹھارہ سال پہلے یہاں ایک آدمی رہتا تھا، جس کا نام جیش تھا وہ کالے علم کا ماہر تھا۔ کہاں سے آیا، کون تھا کوئی نہیں جانتا تھا، بس ہر وقت کالے لباس میں رہتا اور موٹے موٹے موتیوں کی مالائیں پہنے، وہ ہر وقت اس درخت کے نیچے آگ جلا کر پڑا رہتا تھا۔ پھر اس کے پاس لوگ آنے لگے اپنی مرادیں لے کر۔

یہ سچ تھا کہ وہ لوگوں کی منتیں پوری کرتا تھا۔ لوگوں کی تعداد بڑھتی رہی مگر یہ بھی سچ تھا کہ اگر وہ پہلے ان کی منت پوری کرتا تھا تو پھر ان سے ان کا سب کچھ چھین بھی لیتا تھا، اپنی شکتیوں کو بڑھانے کے لئے پہلی منت میں تو وہ کچھ نہیں کرتا تھا مگر منت پوری ہونے کے بعد وہ لوگ دوسری منت کے لئے آتے تھے تو پوری تو وہ ضرور کرتا تھا مگر اس کے بعد انہیں کنگلا کردیتا تھا، ہر چیز چھین لیتا تھا حتیٰ کہ جان تک جانے لگی لوگوں کی۔

جب یہ بات بزرگوں کی سمجھ میں آئی تو ایک دن سارے لوگ اسے مارنے کے لئے گروہ کی شکل میں آ گئے۔

لوگوں نے دور سے ہی چلانا شروع کردیا...... ”وہ رہا... مارو... مارو... اسے چھوڑنا نہیں... جان سے ماردو......“

لوگ بھاگتے ہوئے اس کے قریب آرہے تھے کہ یکدم ہی اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور پھر ایک منتر پڑھا جس سے درخت پر سے ایک رسی لٹک کر نیچے آئی اور اس نے گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کرلی۔

جب لوگ اس کے قریب پہنچے تو وہ درخت پر جھول رہا تھا۔ وہ مرچکا تھا۔ لوگوں نے اس کے مرنے پر شکر ادا کیا اور بہت خوشیاں منائیں۔ کچھ عرصہ تک خاموشی رہی، پھر اکا دکا وہ لوگ جو کم عقیدہ تھے وہ درخت کے پاس آتے اور اس درخت سے منت ماننی شروع کردی، پھر یہی ہوا کہ پہلی منت تو ضرور پوری ہوتی مگر دوسری منت......

وہ انتالیس لوگوں کو برباد کرچکا ہے۔ اور چالیسویں سکینہ ہے، جس نے اسی درخت سے منت مانی ہے، پھر دوسری منت بھی مانی اس سے پہلے کہ وہ سکینہ کو بھی ماردے تم اس کی منت اس کی آگ میں ضائع کردو، ورنہ وہ پھر سے زندہ ہوکر کالے علوم کا ماہر ہوجائے گا اور اب کی بار اس کا علم زیادہ طاقتور ہوگا۔

”جاؤ جلدی کرو۔“ یہ کہہ کر وہ بزرگ غائب ہوگئے۔

فاروق نے گھر کی طرف بھاگنا شروع کردیا۔ مگر ایسا لگتا تھا کہ جیسے اسے کوئی ان دیکھی طاقت روک رہی ہو، وہ مسلسل اللہ کا پاک کلام پڑھتا رہا اور جیسے تیسے کرکے انعام کے روپوں تک جا پہنچا اور پھر سارے روپے لے کر اس نے میدان کی طرف دوڑ لگادی، اب اس نے دیکھا کہ وہ آدمی آگ کے پاس سے اٹھ چکا ہے۔ اور سکینہ کے گلے میں رسی کا پھندا ڈال چکا ہے۔

فاروق نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور آیت الکرسی بلند آواز میں پڑھتا اور ہانپتے کانپتے گرتا پڑتا آگ کے الاؤ کے قریب پہنچ گیا۔ بس یہ وہ لمحہ تھا جب وہ آدمی رسی کو کھینچتا اس سے پہلے ہی فاروق نے انعام کے سارے روپے آگ میں ڈال دیا، اس کے ساتھ ہی اس نے دیکھا کہ اس آدمی کے جسم میں بھی آگ لگ گئی اور وہ چیخنے چلانے لگا۔ آناً فاناً میں وہاں سب کچھ ختم ہوگیا، کسی بھی چیز کا نام ونشان باقی نہ رہا۔ بس وہاں سکینہ اور فاروق کھڑے تھے۔

اتنے میں مسجد سے آواز سنائی دی۔ ”اللہ اکبر...... اللہ اکبر......“ پھر دونوں میاں بیوی گھر کی طرف چل دیئے۔ گھر میں آکر انہوں نے نماز فجر ادا کی اور شکرانے کی نفل بھی۔

کچھ عرصہ بعد ایک صبح جب لوگ اس طرف گئے تو انہوں نے دیکھا کہ برگد کا وہ عظیم درخت جل کر خاکستر ہوکر زمین بوس ہوچکا تھا۔

لذت

رضوان بھٹی۔محراب پور

اچانک عامل بدحواس ہوگیا اس کی شکل بدھیت ہوگئی، اس کے منہ سے نکلا جادو الٹا ہوگیا، میرے موکل بپھر گئے وہ اب میری طرف آنے ہی والے ہیں۔ اور یہاں آتے ہی مجھ پر جھپٹ پڑیں گے اور میرا کام تمام کردیں گے۔

نفسانیت کی تکمیل اکثر انسان کو زندہ درگور کر کے نشان عبرت بنا دیتی ہے۔تحیر انگیز کہانی

"جو بھی ہوجائے میں تمہیں چھوڑ نہیں سکتی۔" شازیہ نے اپنا اٹل فیصلہ سنا ہی دیا اور چائے کے برتن لے کر کمرے سے نکل گئی۔

ارحم بدستور سر پکڑے بیٹھا رہا...... وہ اپنی مایوسی اور بے بسی کا اظہار شازیہ کے سامنے آسان الفاظ میں کرتو چکا تھا...... لیکن ایسا کئی بار ہونے کے باوجود بھی شازیہ محبت کے ہاتھوں مجبور تھی...... ارحم...... کے ذہن میں اس وقت پانچ سال پرانے واقعات کسی فلم کی طرح رواں تھے...... رات گئے شازیہ کے گھر جانا کالی چادر میں لپٹی ہوئی شازیہ کا اس کا انتظار کرنا بے چینی، بے تابی...... چاہت کے ہاتھوں مجبور اور پھر ایک گٹھری سمیت دونوں کا گاؤں سے شہر تک چار گھنٹے طویل پیدل سفر...... وہ ریلوے اسٹیشن کا منظر...... وہ گاڑی کی آمد...... وہ جلد بازی میں ٹکٹ نہ

لینا...... ٹرین پر سوار ہونا...... اور ان دیکھی منزل کی جانب سفر......

"یہ کیس پانی پئیں...... اور آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ آپ کی الماری میں سگریٹ کا یہ آخری پیکٹ ہی تھا۔ اب صبح سویرے کچھ نہ نکلی تو شاید ناشتہ بھی نہ ملے...... کیونکہ چینی پتی بھی اس آخری چائے میں ڈال دی ہے......" شازیہ نے کمرے میں آکر گلاس ٹیبل پر رکھا...... اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ سگریٹ کا پیکٹ دیتے وقت وہ اتنا کچھ بولے...... مگر حالات...... مجبور کر بھی دیتے ہیں انسان کو...... بند منہ کھلوا بھی دیتے ہیں۔

"آپ گھبرائیں نہیں ارحم...... میں نے فیصلہ کرلیا ہے...... صبح سویرے محلے میں کوئی کام دھندا ڈھونڈنے جاؤں گی...... خدا کوئی نہ کوئی سبیل تو پیدا کریں گے...... اب آپ اٹھیں اور آرام کریں۔ دیکھیں رات کے تین بج چکے ہیں......!" شازیہ نے پیار سے ارحم کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا...... ارحم کا منہ نیچے ہونے کی وجہ سے وہ شازیہ کی آنکھوں میں آنسو نہ دیکھ سکا۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ بھوک میں پیار بھی نہیں ہو پاتا۔

شازیہ کمرے سے چلی گئی...... ارحم نے سگریٹ سلگایا اور دو لمبے لمبے کش لئے...... وہ سگریٹ کے دھوئیں کو اپنے اندر موت کی مانند سرایت کروانا چاہتا تھا...... مگر نہیں ابھی نامۂ اعمال میں اس کی زندگی باقی تھی۔

ذہن میں موجود فلم ایک بار پھر چل پڑی...... وہ دونوں رات بھر سفر کے بعد ایک اسٹیشن پر اترے، نہ کوئی یار نہ مددگار...... صرف خدا کے سہارے...... محبت کے مارے...... شازیہ اور ارحم...... گھر، گاؤں، گلیاں، ماں باپ، بہن بھائی، ہنستے بستے گھر چھوڑ کر تن تنہا اسٹیشن پر اس آس پر کھڑے کہ کوئی تو سبیل نکلے......"تمہارے پاس رقم کتنی ہے......؟" ارحم نے شازیہ سے پوچھا۔

"پانچ ہزار تک ہو جائیں گے...... سونے کی چین، بالیاں اور انگوٹھی بھی ساتھ لائی ہوں"

"اور آپ...... آپ کے پاس کتنے ہیں......؟"

"میرے پاس اتنے ہو جائیں گے کہ ایک ماہ عیش مارلیں...... لیکن گھبراؤ نہیں، میرے پاس ہمت ہے، کچھ نہ کچھ کرنے کی...... کام دھندا ڈھونڈ نکالوں گا۔"

رکشہ ڈرائیور...... "کہاں جانا ہے صاحب......؟" ایک ادھیڑ عمر آدمی پاس آکر بولا......

شازیہ اور ارحم ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ ان کی منزل تھی ہی کہاں، جہاں جانا تھا......!

"دوست...... ہم اس شہر میں نئے ہیں، نہ کوئی رشتے دار اور نہ ہی کوئی جان پہچان والا...... برا نہ مانو تو تھوڑا سا وقت نکالو اور ہمیں کرائے پر کوئی گھر دلوا دو......!" ارحم نے بلا جھجک اپنے دل کی بات کہہ دی۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ چپ رہنے سے کچھ بنتے نہ دکھائی دے گا۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں...... شہر کے آخری سرے پر صفیہ بیگم نے ایک کالونی بنوائی ہے...... نہایت ہی مناسب کرایہ پر وہاں مکان مل جائے گا...... اور ویسے بھی صفیہ بیگم نے وہ کالونی اسی مقصد سے بنائی ہے کہ متوسط طبقے کے لوگ آرام سے رہ سکیں...... اگر آپ کہیں تو آپ کو لے چلتا ہوں......" رکشہ والے نے تو گویا ان دونوں کے مسئلے کا حل چٹکیوں میں نکال پھینکا تھا۔

"ہاں...... کیوں نہیں!" ارحم نے جلدی سے کہا۔

"ٹھیک ہے دوست...... لیکن میں وہاں جانے کے چار سو روپے لوں گا اور ایک سو روپیہ اضافی...... وہ اس لئے کہ آپ کو جلد ہی اس شہر میں گھر دلوا دیا......؟"

"ٹھیک ہے...... لے لینا۔" ارحم نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا۔ اسے غصہ تو آ رہا تھا۔ ایک تو کرایہ اتنا زیادہ اوپر سے کھلم کھلا بدمعاشی...... لیکن وہ کر بھی کیا سکتا تھا، بے یار و مددگار...... رکشہ میں سوار ہو ہی گئے۔

صبح کا وقت ہونے کی وجہ سے شہر کی اکثر دکانیں بند تھیں، ٹاؤن کے نوکر، سڑکوں کی صفائی ستھرائی میں

معروف تھے۔

"یہ صفیہ بیگم کون ہیں......؟" ارحم نے رکشے والے سے پوچھا۔

"بڑی زندہ دل خاتون ہیں...... آج سے بیس سال پہلے غریب گھرانے میں رہتی تھیں، ماں باپ ایک حادثے میں گزر گئے تو دو بھائیوں کی کفالت ان کے ذمے آ گئی۔ "پڑھی لکھی تھیں...... کوئی نوکری ڈھونڈنے کی کوشش کی تو جبران آغا کے ہاں ملازمت مل گئی...... دنوں میں ہی چالیس سالہ جبران آغا بائیس سالہ صفیہ پر فدا ہو گئے...... اور بات نکاح تک پہنچ گئی۔

خیر سے نکاح ہوا، کچھ عرصہ بعد صفیہ کے بھائیوں کی تعلیم مکمل ہوئی تو جبران آغا نے انہیں بیرون ملک بھیج دیا...... وہاں جا کر انہوں نے ملازمت تو کی...... مگر دونوں گوروں کے رنگ میں رنگ کر وہاں کے ہو گئے۔

جبران آغا کے پاس بیش بہا دولت تھی، دو شادیاں پہلے کیں تھیں، ان کی اولادیں بھی اپنے اپنے حصے کے فرائض انجام دے رہی تھیں...... صفیہ بیگم کے لئے جبران آغا نے اچھا خاصا محل نما گھر تیار کروایا تھا...... وہ حقیقت میں وہاں کی رانی بن گئیں...... مگر گزشتہ سال شدید علالت کے باعث جبران آغا فوت ہو گئے۔

بندہ سمجھدار تھے...... اپنی تمام دولت و جائیداد بانٹ کر تینوں بیویوں کو راضی کر کے بیوہ بنا گئے......

صفیہ بیگم کے حصے میں شہر کے اختتام والی زمین آئی...... خدمت خلق کے جذبے نے صفیہ بیگم کو جھنجھوڑا تو سارا بینک بیلنس اس زمین پر لگا کر اسے کالونی بنا دیا...... غریب غربا اور متوسط طبقے والوں کو نہایت کم کرایہ پر کالونی میں رہنے کی اجازت دے دی

صفیہ بیگم کے پاس اس وقت کسی چیز کی کمی نہیں...... جبران آغا کے بزنس کا بڑا حصہ ہر ماہ رقم کی صورت میں صفیہ بیگم کے اکاؤنٹ میں جمع ہوتا ہے، اور شہر سے باہر آموں اور لیموں کے باغات کی رقم بھی ٹھیک ٹھاک بن جاتی ہے...... اگر کمی ہے تو بس اولاد کی......؟" رکشہ والے نے ساری کہانی اسے سنا ڈالی، جیسے وہ کئی بار سنا چکا ہو...... کہیں بھی جھجک، جھجک یا رکاوٹ نہ آئی۔

"اچھا جی...... پھر تو کافی اچھی خاتون ہیں وہ......؟"

"ہاں جی...... کیوں نہیں......؟" رکشہ والے نے کہا۔

تھوڑی ہی دیر میں شہر کی عمارتیں ختم ہو گئیں...... گویا شہر کا اختتام ہو گیا...... اور کچھ ہی فاصلے پر سفید رنگ کی ایک بلند و طویل دیوار نظر آئی...... ارحم کو یہ بات عجیب محسوس ہوئی۔

"یہ دیوار کیسی ہے......؟"

"یہی تو صفیہ بیگم کی کالونی ہے...... کالونی کے چاروں طرف ایسی ہی دیوار ہے...... کالونی میں داخلے کے لئے چاروں طرف بڑے بڑے گیٹ ہیں...... اور ان میں باقاعدہ چوکیاں بنی ہوئی ہیں......؟" رکشہ والے نے کہا تو ارحم کا تجسس اور بڑھا۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ دیوار تک پہنچ گئے...... اور ایک بڑے سے جہازی سائز گیٹ کے سامنے رکشہ روک لیا گیا۔ رکشے والا اتر کر گیٹ کے اندر گیا، کچھ ہی دیر میں وہ واپس آیا تو وہ خوش دکھائی دے رہا تھا۔

"مبارک ہو صاحب...... ایک گھر کرایہ پر مل گیا ہے...... آئیں!"

ایک کمرے کا گھر، برآمدہ اور صحن...... مناسب گھر اور مناسب کرایہ...... ارحم اور شازیہ واقعی بہت خوش تھے، رات سے لے کر اب تک انہیں اب تنہائی میسر آئی۔

"تمہارے نصیب تو بہت اچھے ہیں شازیہ......!"

"جی...... کیوں نہیں...... آپ جب ساتھ ہیں تو نصیب اچھے ہی ہوں گے!"

"بناوٹ...... تم ایسا کرو کہ مجھے بتاؤ...... ناشتہ کے لئے کیا کیا چاہئے...... بھوک سے جان نکلی جا رہی ہے......" ارحم نے پوچھا اور شازیہ نے بتا دیا...... ابھی وہ نکلنے کے لئے اٹھا ہی تھا کہ دستک ہوئی......!

"کون آ گیا یہاں......!" شازیہ نے پریشان

ہوتے ہوئے کہا۔

اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ گئی تھیں۔۔۔۔۔ اس کالونی میں آئے ہوئے بمشکل انہیں دس پندرہ منٹ ہوئے تھے۔

"کہیں۔۔۔۔ گاؤں سے تو کوئی ہمارا پیچھا کرتے نہ آ گیا ہو۔۔۔!"

شازیہ نے اپنا وہم ظاہر کیا۔۔۔۔ تو ارحم بھی پریشان دکھائی دیا۔

"بات تو سچ ہے۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔!" وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ دروازے پر ایک بار پھر دستک ہوئی۔

"ک۔۔۔۔ کک۔۔۔۔ کون ہے۔۔۔۔!" ارحم نے اونچی آواز میں پوچھا۔

"صفیہ بیگم۔۔۔۔!" ایک مترنم سی نسوانی آواز آئی۔۔۔۔ دونوں نے سنی تو ان کی جان میں جان آئی۔

شازیہ نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔

"کیوں بھئی۔۔۔۔ گھر سے بھاگے ہوئے ہو۔ جو اتنا گھبرا رہے ہو۔" صفیہ بیگم نے اندر داخل ہوتے ہی مسکراتے ہوئے کہا۔۔۔۔ اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی۔۔۔!

ارحم نے غور سے صفیہ بیگم کو دیکھا۔۔۔۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ آخر صفیہ بیگم ہے کیا چیز، جبران آغا جیسا دولت مند، چٹکیوں میں اس پر فدا ہو گیا۔ لیکن واقعی۔۔۔ وہ حسن کا پیکر تھی۔۔۔۔ عمر کے ادھیڑ ہونے کے باوجود بھی وہ نوخیز دوشیزاؤں سے کم نہیں تھی۔

"ارے نہیں صفیہ آپی۔۔۔۔ آیئے۔۔۔۔ اندر آیئے۔۔۔۔!" شازیہ نے مسکراتے ہوئے اسے اندر آنے کی دعوت دی۔

"لیکن تمہارے انداز سے تو یوں ہی لگتا ہے تو بیاہتا ہو؟"

"نہیں۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔ دراصل۔۔۔۔!" شازیہ نے ارحم کی جانب دیکھا۔۔۔۔ جیسے کہہ رہی ہو کہ اس مصیبت کو تم ہی سنبھالو۔

"ارے دروازے پر کھڑے کھڑے تفتیش کریں گی یا اندر بھی آئیں گی آپ۔۔۔۔!" ارحم نے مسکراتے ہوئے کہا۔۔۔۔

"میں تمہارے لئے ناشتہ لائی ہوں۔۔۔۔ مجھے ابھی کالونی منیجر نے بتایا کہ نئے کرایہ دار آئے ہیں۔۔۔۔ سوچا کہ یہاں کے اصول وضوابط بھی بتا آؤں۔۔۔۔ مل ملا آؤں۔۔۔ اور ناشتہ بھی دے آؤں۔۔۔!" صفیہ بیگم نے ٹرے شازیہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔۔۔۔ اور ایک پاس پڑی کرسی پر بیٹھ گئیں۔۔۔۔

"اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔۔۔۔ میں جا ہی رہا تھا لینے۔۔۔۔!" ارحم نے کہا اور سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

ناشتہ کے دوران ارحم نے ساری حقیقت صفیہ بیگم کو بتا دی۔۔۔۔ پہلے تو اس نے ڈانٹا۔۔۔۔ کہ ایسا نہیں کرنا تھا۔۔۔۔ لیکن پھر ہنس کر ٹال گئیں اور چلی گئیں۔

دو ماہ کا عرصہ پلک جھپکتے میں گزر گیا، ارحم کو نوکری مل گئی، دونوں نے نکاح بھی کر لیا۔۔۔۔ اور شازیہ کا صفیہ بیگم سے دوستانہ کافی بڑھ گیا۔۔۔۔!

صفیہ بیگم کالونی کے ہی ایک گھر میں تن تنہا رہتی تھیں۔۔۔۔ شازیہ نے کئی بار پوچھا کہ وہ عیش وعشرت سے بھرپور گھر چھوڑ کر یہاں کیوں رہ رہی ہیں۔۔۔۔ لیکن ہر بار جواب ہنسی میں ٹل جاتا۔

ذہن میں چلتی ہوئی فلم کا سب سے بھیانک سین ارحم کے سامنے آ ہی گیا۔۔۔۔ جی ہاں۔۔۔۔ حادثے صفیہ بیگم کی کالونی میں آنے کے چار سال بعد۔۔۔۔

ایک رات کام سے واپس آنے پر ارحم بخار میں نڈھال سا چارپائی پر گر گیا۔۔۔۔ بروقت علاج ہوا۔۔۔۔ مگر کوئی افاقہ نہ ہوا۔۔۔۔ دس دن، پندرہ دن۔۔۔۔ ایک ماہ۔۔۔۔ دو ماہ بعد بھی ارحم کی کیفیت وہی رہی۔۔۔۔ ساری جمع پونجی ختم۔۔۔۔ لیکن جسم۔۔۔۔ بخار سے گرم۔۔۔۔ ٹانگوں میں یوں جیسے سانس تک نہ ہو۔۔۔۔ نوکری بھی گئی صحت بھی گئی۔۔۔ اور جمع پونجی بھی گئی۔۔۔ رہی شازیہ تو وہ اس پراسرار بیماری کے خلاف ڈٹی رہی۔۔۔۔ ارحم نے

صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ "اب تم چاہو تو مجھے چھوڑ کر جاسکتی ہو۔" مگر شازیہ نہ گئی۔ !

"آپ اب تک سوئے نہیں.....؟" شازیہ کی آواز سن کر ارحم ذہن کے سینما سے باہر نکلا..... رات گزر گئی تھی..... فلم بھی پوری ہوگئی تھی..... لیکن ابھی اختتام باقی تھا..... اور یہ اختتام حقیقت میں ہونا تھا۔

"نہیں شازیہ..... بس نیند نہیں آئی !" ارحم نے پھیکی مسکراہٹ لبوں پر بکھیری۔

"آہ..... آج پورے دو ماہ بعد..... پورے دو ماہ بعد آپ کے منہ سے اپنا نام سن کر دل کو کتنا سکون ملا ہے....." شازیہ نے مسرت سے کہا۔

"نام تو روزانہ پکارتا ہوں.....!"

"نام لینے اور پکارنے میں فرق ہوتا ہے!"

"اب کہاں کی تیاری ہے؟"

"آپ کے ناشتے کی فکر کھائے جارہی ہے..... صفیہ بیگم کے ہاں جارہی ہوں۔ میں نے سوچا کہ ان سے دل کا حال کہہ ہی ڈالوں، بہت عرصہ ہوگیا، کہتے ہوئے کہ سب ٹھیک ہے..... اب سب بتا ہی دیتی ہوں۔"

"شازیہ..... تم ایسا نہیں کروگی..... کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا مجھے منظور نہیں۔"

"منظور تو مجھے بھی نہیں..... لیکن میں ہاتھ نہیں پھیلاؤں گی..... محنت کی بات کروں گی..... اجرت حاصل کروں گی....."

"تمہاری مرضی..... لیکن دیکھو.....!" ارحم نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"جی....."

"بس کچھ نہیں..... تم جاؤ.....!" ارحم نے کہا اور ایک بار پھر منہ نیچے کرلیا..... شازیہ آنسو پیتے ہوئے چلی گئی۔

☆.....☆.....☆

جلتے ہوئے کوئلوں پر پانی کے چھینٹے پڑنے سے کی آواز تو نکلی مگر ساتھ ساتھ دھوئیں کا ایک گہرا ہیولہ پیدا ہوا اور چھت کی سمت رواں ہوگیا۔

"اچھا..... اب تم جاسکتے ہو..... تمہارا شکار اتنا مجبور ہوگیا ہے کہ اب جمع پونجی ختم ہوچکی ہے اور شازیہ کمانے کے لئے گھر سے نکل گئی ہے۔" لمبے بالوں والے بھدے سے، موٹے سے شخص نے بارعب انداز میں کہا تو جلتے کوئلوں کے دوسری سمت بیٹھے عورت اور مرد نے ایک دوسرے کو بغور دیکھا..... اور ایک مسکراہٹ کا تبادلہ کیا۔

"اب تم جاسکتے ہو..... چاہو تو اپنی بیٹی شازیہ کو واپس لے آؤ..... ارحم کا کام تو ویسے بھی تمام ہوگیا ہے..... بس دو دن بعد ڈاکٹر اسے جواب دے دیں گے..... اور.....!" اسی بھدے شخص نے کہا اور مکروہ قہقہہ لگا کر پانی کے چھینٹے انگاروں پر ایک بار پھر دے مارے..... "اب پتہ چلا کہ کیسے گھروں کی عزتیں بھگا کر لے جایا کرتے ہیں.....؟" مرد نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"کالے جادو کا اثر..... اب کیا کروگے ارحم میاں..... اور شازیہ تو واپس آجا..... تیرا تو کلیجہ میں چباؤں گی..... چاہے ماں ہی کیوں نہ ہوں تیری.....!" عورت نے کہا..... اس کے چہرے پر وحشیانہ پن صاف عیاں تھا۔

☆.....☆.....☆

شازیہ نے صفیہ بیگم کو ساری صورت حال سے آگاہ کردیا..... پہلے تو صفیہ بیگم حیران ہوئیں، پھر غصہ کیا اور پھر معاملہ کی سنگینی کو سمجھتے ہوئے سنجیدہ ہوگئیں۔

"شازیہ..... تمہیں یاد ہوگا کہ کافی مرتبہ تم نے اور ارحم نے مجھ سے پوچھا ہے کہ میں اپنے عیش و عشرت والے محل کو چھوڑ کر یہاں..... اس کالونی میں کیوں رہ رہی ہوں.....؟"

"جی..... مجھے یاد ہے.....!"

"لیکن میں ہمیشہ اس بات کا جواب ہنسی میں ٹال دیتی تھی، آج..... تمہیں میں جواب دیتی ہوں، تمہارے اس سوال کا.....!"

شازیہ حیرت سے صفیہ بیگم کا منہ تکنے لگی کہ "عجیب عورت ہے..... میں یہاں اپنا رونا لئے بیٹھی ہوں اور یہ

تمہید یں باندھ رہی ہے۔"

"تو سنو...!اس دنیا میں لذت نامی ایک چیز پائی جاتی ہے....امیر غریب، چھوٹے بڑے، عورتیں، مرد، سب ہی اسے حاصل کرنے کے لئے کوشاں ہیں.... ہر کسی کو کہیں نہ کہیں سے یہ لذت مل ہی جاتی ہے.... بچوں کو کھانے پینے، اچھلنے کودنے میں، غریبوں کو سونے میں، امیروں کو اپنی دولت میں، عورت کو مرد میں یا مرد کو عورت میں۔ لیکن مجھے یہ سب وقتی لذت لگتی ہے۔ میں اس لذت کی پیاسی ہوں جو دیر پا ہو.... اور جب ملے تو بھی لذت، نہ ملے تو بھی لذت.... اس لذت کی تڑپ ہی کچھ اور ہے...؟" صفیہ بیگم کہیں دور ہاتوں کے جال میں کھو گئیں....

شازیہ کی حیرت بے پناہ تھی، اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ صفیہ بیگم کس قسم کی باتیں کر رہی ہیں... وہ کیا چاہتی ہیں۔ ؟ بلکہ شازیہ چاہ رہی تھی کہ اس بیکار کی فلاسفی لذت سے بھاگ جائے۔ مگر ہائے رے بے بسی، وہ لاکھ چاہ کر بھی ایسا نہ کر سکی، اور صفیہ بیگم کا نیا روپ دیکھنے لگی۔

"شازیہ... تو سنو آج میں تمہیں بتائے دیتی ہوں کہ اس چھوٹے گھر میں محلوں کی رانی کیوں رہ رہی ہے.... جس لذت کی بات میں نے کی ہے.... اس لذت کا حصول یہیں سے ہوتا ہے۔"

"مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔ آپ کیا کہنا چاہتی ہیں...!" شازیہ نے سر پر ہاتھ رکھ کر آخر بول ہی دیا۔

"میں مردہ عورتوں کو غسل دیتی ہوں... !اور اپنی لذت پوری کرتی ہوں....!" صفیہ بیگم نے بالآخر اپنا راز فاش کر ہی دیا....

شازیہ کو ایک لمحہ یوں لگا جیسے وہ کسی سحر زدہ نگری میں گم ہو... اسے بھاگنے کا ارادہ ترک کرنا پڑا۔ مگر مجبوری.... پیٹ.... شوہر....! یہ سب چیزوں نے اس کی ٹانگوں پر فالج گرا دیا... وہ اٹھ نہ پائی... سکتے میں صفیہ بیگم کو دیکھے گئی۔

"ارے میری شہزادی.... تمہیں کام چاہئے.... مجھے غسل کے لئے ایک ہیلپر چاہئے.... تمہارا بھی کام بن جائے گا اور میری لذت دو بالا ہو جائے گی....!بولو منظور...؟" صفیہ بیگم نے پوچھا اور بے بسی کی ماری شازیہ نے اپنا سر ہلا دیا۔

☆....☆....☆

اگلے دن شازیہ کو صفیہ بیگم کا سارا کھیل سمجھ میں آ گیا.... وہ عورتوں کی میت کو غسل دیتی تھی، اور اس کام کے لئے بہشتاں بی بی کے نام سے مشہور تھی، بہشتاں بی بی... جو سر سے پاؤں تک کالے پردے میں ڈھکی ہوتی تھی، صرف ہاتھ اور آنکھ کے علاوہ جسم کا کوئی حصہ کسی نے آج تک نہ دیکھا تھا.... سب کی نظر میں بہشتاں بی بی بہت نیک اور پردہ دار خاتون تھیں.... لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی، وہ مردہ عورتوں، لڑکیوں، خاص طور پر خوبصورت مردہ لڑکیوں کو غسل دیتی تھی، اور اپنی لذت پوری کرتی تھی۔

شازیہ کو ایک کام اور عجیب لگا.... وہ ایسے کہ صفیہ بیگم نے اگلے دن ہی اسے کہہ دیا کہ "آج شام چار بجے تیار رہنا"

"مگر کیوں... کہیں جانا ہے....؟"

"ایک میت کو غسل دینا ہے...؟"

شازیہ اس بات سے حیرت زدہ تھی کہ کسی نے کوئی رابطہ نہیں کیا، نہ کوئی اعلان ہوا... پھر اسے کیسے خبر ملی کہ فلاں جگہ میت ہونے والی ہے....؟"

☆....☆....☆

شازیہ دوسری مرتبہ میت نہلانے صفیہ بیگم کے ساتھ جا رہی تھی۔ وہ عجیب وسوسوں میں تھی کہ "بھلا اس عورت کو کیسے معلوم ہوا...؟"

جب یہ دونوں وہاں پہنچیں تو واقعی وہاں معاملہ برعکس نہ تھا اور جب شازیہ نے لڑکی کو دیکھا تو حیرت سے ششدر رہ گئی۔ اسے فوراً یاد آ گیا کہ یہ لڑکی کل والی میت میں تھی۔ ...اور صفیہ بیگم کام سے فارغ ہونے کے بعد اس سے ملی بھی تھیں....! "یہ.... یہ لڑکی تو کل....؟" شازیہ نے دھیرے سے کہا.... مگر پردہ

نوشی بیگماں بی بی نے غضب ناک آنکھوں سے اسے دیکھا اور خاموش رہنے کا کہا۔۔۔!

شازیہ کو اب یہ معاملہ بہت الجھا ہوا محسوس ہوا۔۔۔ جیسے تیسے کر کے وہ کام سے فارغ تو ہوئی لیکن اندرونی طور پر وہ بہت کچھ سوچ رہی تھی۔ اور جیسے ہی شازیہ صفیہ بیگم سے دور ہوئی تو فٹ سے گھر کی سمت دوڑی۔

☆.....☆.....☆

ارحم کی موت کے منتظر وہ تینوں جشن کی تیاری میں مصروف تھے..... ان کے چہرے مسرتوں سے لبریز تھے اور وہ سب ایک بڑے برتن میں پڑے ساکت پانی میں ارحم کے کمرے کا منظر دیکھ رہے تھے..... جہاں ارحم اپنا گلا مضبوطی سے تھامے ہوئے تھا، اس کی آنکھیں حلقوں سے باہر آرہی تھیں اور چہرہ بے جان ہو رہا تھا۔۔۔

”بس اب چند لمحے..... پھر یہ ہی اپنے گلے کو دبا کر خود کو مار دے گا..... لوگ سمجھیں گے کہ بیماری کے باعث اس نے خودکشی کر لی ہے، مگر اسے میرے موکل مار رہے ہیں۔۔۔ اب یہ پورے کا پورہ میرے رحم و کرم پر ہے.....!“ لمبے بالوں والے بھدے شخص نے کہا۔ اور شازیہ کے ماں باپ ہنس پڑے.....

”ایسا ہی ہونا چاہیے.....؟“ دونوں نے کہا اور مسکرا کر پانی میں دیکھنے لگے۔۔۔ اور پھر اچانک دروازہ کھلا اور شازیہ برآمد ہوئی..... شازیہ کو دیکھتے ہی ارحم نے ہاتھ گلے سے نیچے کر لیے۔ اور اس کے ساتھ ہی لمبے بالوں والے جادوگر کو ایک زور کا جھٹکا لگا..... وہ اوندھے منہ گر پڑا.....!

”کیا ہوا..... کیا ہوا آپ کو.....؟“ دونوں ماں باپ پانی کے عکس میں ارحم اور شازیہ کو چھوڑ کر جادوگر کی سمت متوجہ ہو گئے۔

”سارا..... سارا کام..... گڑبڑ ہو گیا۔۔۔“

”کیا ہوا۔۔۔؟“

”بہت برا ہوا.....!“

”ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا.....؟“ وہ بدستور بڑبڑا رہا تھا۔

”آخر ہوا کیا ہے..... ہمیں بھی تو پتہ چلے.....؟“ شازیہ کا والد چیخا۔

”میرے موکل..... ارحم کو چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں۔..... نجانے شازیہ میں ایسا کیا ہے کہ میرے موکل وہاں سے بھاگ نکلے اور..... اب واپس نہیں جائیں گے..... وہ یہاں میرے پاس آتے ہی ہوں گے..... اب۔۔۔ اب وہ مجھے نہیں چھوڑیں گے، مجھے مار دیں گے۔۔۔ جادو الٹا ہو گیا..... موکل بگڑ گئے..... وہ بچ گیا..... اور میں مر گیا.....!“ کالے لمبے بالوں والا جادوگر کمرے میں بے ہنگم طریقے سے دوڑنے لگا۔ اور ان دونوں نے دیکھا دیکھی..... جادوگر نے اپنا منہ پانی کے برتن میں دے ڈالا..... اور بھمک بھمک سے بلبلے نکالنے لگا۔

”شاید..... اسے موکلوں نے آن پکڑا ہے..... کہیں ہم بھی نہ مارے جائیں.....!“ شازیہ کے والد نے کہا۔ اور کہانی کو الٹا ہوتے دیکھ کر وہ دونوں اٹھ بھاگے..... جب وہ کمرے سے نکل رہے تھے تو بلبلے بننے کی آواز دم توڑ گئی تھی۔ ! اور شاید جادوگر بھی مارا گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

بڑبڑائی ہوئی شازیہ جیسے ہی کمرے میں داخل ہوئی تو ارحم کو خود اپنا گلا دباتے دیکھ کر فوراً اس کے پاس پہنچی.....! لیکن جب تک وہ ہاتھ واپس پیچھے لا چکا تھا۔

”یہ کیا کر رہے ہو۔۔۔؟“ شازیہ نے فوراً ارحم کے ہاتھ پکڑ لیے۔

”ارحم..... ارحم..... کیا ہوا آپ کو۔۔۔! اٹھو۔۔۔ آنکھیں کھولو.....!“ اس کی آنکھیں اب بند تھیں، شازیہ نے نبض دیکھی..... وہ چل رہی تھی..... وہ فٹ سے اٹھی اور پانی کا گلاس اس کے منہ پر الٹا کر دیا..... ارحم ایک جھرجھری لے کر اٹھا..... سامنے شازیہ کو دیکھا اور مسکرا دیا۔

"کچھ کھانے کو ملے گا ۔۔۔!" ارحم نے کہا اور شازیہ نے اسے سینے سے لگا لیا……

"شکر ہے خدا کا…… تم ٹھیک ہو…… میں ابھی لاتی ہوں……!" شازیہ اٹھی اور کمرے سے باہر چلی گئی۔

کھانا کھانے کے دوران شازیہ نے یہ بات نوٹ کی کہ جیسے ارحم اب مجبور نہیں ہے، کھل کر بول رہا ہے، ہاتھ پیر ہلا رہا ہے…… اور پھر ایک خیال ایک بجلی کے کوندے کی طرح اس کے ذہن میں آیا……

"کہیں…… ارحم پر کوئی جادوئی اثر نہ ہو……!" اور پھر واقعی اسے کڑی بہ کڑی سوچنے سے اپنے خیال کی تصدیق کرنی پڑی۔

کھانے سے فراغت کے بعد وہ صفیہ بیگم کے پاس گئی، اپنی دو دن کی محنت کی اجرت لی، اور مسکراتے ہوئے گھر آ گئی۔ لیکن ساتھ میں ایک خدشہ بھی لائی تھی۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ مسجد کے پیش امام صاحب کے سامنے تھی، شازیہ نے سارا حال انہیں سنایا اور اپنا خدشہ بھی بیان کیا۔

"بیٹی۔ آپ ٹھیک کہتی ہو۔ تمہارے شوہر یعنی ارحم پر واقعی خطرناک قسم کا کالا جادو کیا گیا تھا، اور نہ صرف یہ بلکہ اس کے ساتھ موکل بھی لگائے گئے تھے جو دھیرے دھیرے ارحم کو دیمک کی طرح کھا رہے تھے…… لیکن اب خدا کا کرم ہو گیا……

جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے کی مصداق، تم ٹھیک وقت پر پہنچیں…… اللہ تعالیٰ نے تمہیں ہدایت دی۔

پیش امام صاحب نے ارحم پر دم کیا، پینے اور باندھنے کے لئے تعویذ وغیرہ دیئے…… اور ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا۔

☆ ☆ ☆

ایک سال بعد زندگی پھر پہلے کی طرح رواں دواں ہو گئی تھی، ارحم صحت یاب ہو گیا تھا، کام کاج کے قابل تھا اور پرانی نوکری دوبارہ کر رہا تھا، جبکہ شازیہ گھریلو کام کاج کے علاوہ کالونی کے ہی اسکول میں پڑھانے لگی تھی…… البتہ صفیہ بیگم اب بستر سے لگ گئی تھیں…… اور خدا کے عذاب کے زیر عتاب تھیں…… انہیں نجانے کون سی ایسی بیماری تھی کہ بظاہر وہ بول اور سن رہی تھیں…… لیکن نیچے کا جسم مفلوج تھا……

شازیہ کو یہ پتہ یقین تھا کہ ان پر جو برے دن آئے تھے، وہ خود اس کی ذمہ دار تھیں، اور اب اپنے کئے کی سزا بھگت رہی تھیں…… لیکن ایک کسک پھر بھی، شازیہ کے من میں تھی کہ صفیہ بیگم کو یہ کیسے پتہ چلتا تھا کہ "آج فلاں جگہ فلاں کی میت ہوگی……" اس سوال کے جواب میں وہ کئی بار پیش امام صاحب کے پاس گئی…… مگر بے مراد واپس آ گئی…… وہ دل کی بات نہ کہہ پائی تھی ان سے

مگر آج نجانے کیسے دل باندھ کر اپنی بات کہہ ہی ڈالی۔

"مجھے تو یوں لگتا ہے کہ ارحم کی بیماری کی ذمہ دار صفیہ بیگم ہی ہیں……!" پیش امام صاحب ہنسے اور مخاطب ہوئے……

"بیٹا…… دلوں کے حال خدا تعالیٰ ہی جانتے ہیں…… اس دنیا میں بہت سے راز صرف راز ہی ہوتے ہیں انسان لاکھ چاہے ان رازوں سے پردہ نہیں اٹھا سکتا…… لیکن کچھ راز انسان کے سامنے عیاں کرنے کے لئے ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے تو ارحم کی بیماری کے ذمہ دار صفیہ بیگم نہیں بلکہ تمہارے ماں باپ تھے، انہوں نے کالے علم کے ذریعے دھیرے دھیرے ارحم کو موت کے دہانے پر پہنچایا تھا۔

اور دوسری بات یہ کہ صفیہ بیگم کے پاس کوئی جادوئی ٹونا نہیں تھا بلکہ میڈیکل کی ایک ایسی زہریلی دوا تھی جو چوبیس گھنٹے بعد اثر کرتی تھی…… یعنی وہ جسے چاہتی اسے وہ دوا کسی کھانے والی شے میں ملا کر دے دیتی اور چوبیس گھنٹے بعد اس کی موت ہو جاتی…… صفیہ بیگم نفسیاتی مریضہ ہے…… ایسی مریضہ جو کہ جان لینے اور غسل دینے میں اپنی لذت تلاش کرتی تھی۔"

عشق ناگن

ایم الیاس

قسط نمبر:07

چاہت خلوص اور محبت سے سرشار دلوں کی انمٹ داستان جو کہ پڑھنے والوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دے گی کہ دل کے ہاتھوں مجبور اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے یہ شعلہ جان لیوا اور ناقابل فراموش مراحل سے گزرتے ہوئے بھی خوشی محسوس کرتے ہیں اور اپنے وجود کے مٹ جانے کی بھی پروا نہیں کرتے۔ یہ حقیقت کہانی میں پوشیدہ ہے۔

یہ دنیا رہے نہ رہے لیکن کہانی محبت کی زندہ رہے گی۔ انمٹ الفاظ کو احاطہ کرتی دلگداز کہانی

آکاش کو کچھ خبر نہیں تھی کہ وہ کتنی دیر تک بے ہوشی کی حالت میں پڑا رہا۔

جب اسے ہوش آیا تو اس نے اپنے آپ کو ایک نہایت شان دار، خوب صورت اور ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں پایا۔ فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا، کھڑکیوں پر خوب صورت اور ہلکے رنگ کے پردے پڑے ہوئے تھے، اس کی نظروں کے سامنے جو دیوار تھی اس کے اسٹینڈ پر ایک چھبیس انچ کا رنگین ٹی وی تھا..... اس کے سرہانے کی میز پر ٹیلی فون اور دیوار پر نصب اطلاعی گھنٹی کا بٹن تھا۔ پانی کا ایک صاف و شفاف جگ تھا جس میں سے صاف و شفاف پانی چمک رہا تھا۔

وہ ایک لمبے چوڑے بستر پر دراز تھا ایسا گداز اور آرام دہ بستر اسے بچپنے میں بھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ اس وقت اس کا ذہن خالی تھا۔ اس نے سوچا ’’کہیں وہ سندر سپنا تو نہیں دیکھ رہا ہے؟ وہ کمرے میں اکیلا تھا۔ یہ کس کا گھر ہے.....؟ وہ یہاں کیسے.....؟‘‘

دوسرے ہی لمحے اس کے ذہن میں بیتے واقعات تازہ ہونے لگے، اس نے محسوس کیا کہ وہ زخمی حالت میں ہے..... اس کا بازو زخمی ہے جس پر مرہم پٹی کی ہوئی تھی اور سر کے عقبی حصے میں درد محسوس ہو رہا تھا..... اسے یاد آیا کہ اس نے ایک نوجوان اور حسین لڑکی کو تین غنڈوں سے اغوا ہونے سے بچانے کی کوشش کی تھی، وہ تینوں اس پر بیک وقت حملہ آور ہوئے تھے۔ اسے اتنا یاد آیا کہ ایک بدمعاش نے عقب سے اس کے سر پر آہنی ضرب لگائی تھی تو اس کی کھوپڑی گھوم گئی وہ اندھیرے میں ڈوبتا چلا گیا، اسے اتنی مہلت بھی نہیں ملی تھی کہ وہ چپا کو پکارتا اور رابطہ کرتا.....

لیکن اسے اتنے شان دار گھر کے کمرے میں کون لے آیا.....؟

کہیں وہ لڑکی تو نہیں جسے بچانے کی کوشش کی تھی.....؟ وہ لڑکی شاید کسی بڑے گھرانے سے تعلق رکھتی ہوگی.....! اس کے سوا کوئی اور نہیں ہوسکتا.....؟ اور ہو بھی کون سکتا ہے..... اگر وہ لڑکی اس کے احسان کا بدلہ اتارنے کے لئے اپنے ہاں لے آئی..... اس کی جگہ کوئی اور اتنا بے لوث، بے غرض اور خلوص کار نہیں ہوسکتا.....

اگر لڑکی اسے یہاں لے کے نہیں آتی تو وہ بے ہوش اور زخمی حالت میں پڑا ہوتا..... شاید پولیس کو بھی اس نے اطلاع نہیں دی کہ پولیس اسے کس کس میں ملوث کر دیتی..... اس غریب کو لینے کے دینے پڑ جاتے۔

وہ سوچ ہی رہا تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا.....

ایک نہایت خوبرو، نوجوان اور حسین لڑکی داخل ہوئی، جس نے سفید براق لباس پہن رکھا تھا وہ ایک نرس کے یونی فارم میں ملبوس تھی۔ اس نے بڑی آہستگی سے دروازہ بند کیا اور آکاش پر نظر پڑتے ہی دل کش انداز سے مسکرائی اور بستر کے پاس آکے اس نے مترنم لہجے میں کہا۔

"آپ ہوش میں آگئے..... اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

"لگتا ہے کہ میں پھر بے ہوش ہو جاؤں گا....." آکاش نے جواب دیا۔

"وہ کیوں.....؟" نرس کے حسین چہرے پر استعجاب سا چھا گیا۔ "کیا زخموں میں ناقابل برداشت درد ہو رہا ہے؟"

"آپ کو دیکھ کے.....؟" اس نے جواب دیا۔

"میں تو اپنا درد اور تکلیف بھول گیا ہوں۔"

"مجھے دیکھ کے.....؟ کیا میں اتنی بدصورت ہوں؟" وہ مسکرادی۔

"نہیں..... آپ نہایت خوب صورت اور پرکشش ہیں۔" آکاش نے شوخی سے کہا۔

"اچھا....." وہ ایک دم سے کھل کھلا کے ہنس پڑی۔ "اس حالت میں بھی آپ زندہ دل ہیں۔"

"اچھا..... آپ یہ بتائیں کہ آپ کون ہیں.....؟ میں کہاں ہوں، مجھے یہاں کون لایا ہے؟"

"میں نرس ہوں، میرا نام کرن دیوی ہے۔" اس نے مترنم لہجے میں جواب دیا۔ "آپ مٹ فورڈ اسپتال میں ڈاکٹر تل مکرجی کے زیر علاج ہیں..... آپ کو ایک نہایت حسین لڑکی نے لاکے داخل کرایا ہے۔

ان کا نام مس چھایا ہے.....؟"

"یہ مٹ فورڈ اسپتال ہے.....؟"

آکاش نے اسپتال کا نام سنتے ہی چونکا، کیوں کہ یہ صرف اس شہر کا ہی نہیں بلکہ اس پورے صوبے کا سب سے بڑا اور مہنگا ترین اسپتال تھا۔ اس میں صرف وزراء، اراکین اسمبلی، سرمایہ دار، صنعت کار، اسمگلر اور کالے دھن والے ہی اپنا علاج کرواسکتے تھے۔ اس کے جنرل وارڈ میں مریض سے یومیہ دو ہزار اور عام سے ایک کمرے کا کرایہ پانچ ہزار روپے تھا..... اس میں وی آئی پی کمرے کا کیا تھا اس کے علم میں نہیں تھا۔

اور پھر اس اسپتال کے جو فزیشن، ڈاکٹرز اور ماہرین تھے، ان کے معائنہ کی فیس دو ہزار روپے سے کم نہیں تھی۔ کم از کم پچاس ہزار روپے مریض کو داخلہ کے وقت جمع کرانے پڑتے تھے۔ جو ایک عام آدمی کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس اسپتال کے ڈاکٹرز اور لیڈی ڈاکٹرز بڑے معروف تھے۔ غیر ممالک سے ڈگریاں لے کر آئے ہوئے، یہاں ٹیسٹ کے نام پہ لوٹ کھسوٹ ہوتی تھی..... نرسیں..... سسٹرز جو تھیں وہ نہایت حسین اور جواں سال ہوتی تھیں۔

اسے سوچتا ہوا پاکے نرس نے پوچھا۔ "مس چھایا کیا آپ کی پتنی ہیں؟"

"نہیں....." آکاش نے نفی میں سر ہلایا۔ "اگر وہ میری پتنی ہوتیں تو مس نہیں بلکہ مسز ہوتیں۔"

"اچھا....." نرس کا چہرہ تر و تازہ پھول کی طرح کھل اٹھا۔ "کیا آپ کی منگیتر ہیں؟"

"جی نہیں..... ایک مخلص دوست ہیں۔" آکاش بولا۔ "آپ اس قدر فکرمند اور پریشان کیوں ہو رہی ہیں؟"

"میں یہ سوچ رہی ہوں کہ آپ کی جیون ساتھی کتنی خوش نصیب ہوں گی، دنیا کی خوش ترین ہستی جسے آپ کی محبت اور رفاقت ملے گی۔" نرس نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔

"وہ کس لئے.....؟" آکاش نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"اس لئے کہ آپ بہت وجیہہ اور تصوراتی محبوب کی طرح ہیں..... اس اسپتال میں کیا میں نے اپنی زندگی میں اور سپنوں میں آپ جیسا سندر راج کمار نہیں دیکھا۔ ایسا لگتا ہے کہ بھگوان نے آپ کو فرصت میں اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے۔" وہ اس کے بستر کے

اور قریب آ گئی۔

"آپ نے اسپتال، زندگی اور سپنوں میں نہیں دیکھا ہے مجھ جیسا تو اب آپ دیکھ لیں۔" وہ شوخی سے بولا۔

نرس نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں خمار خود سپردگی اور تیکھا پن سا ابھر آیا۔ کہ پھر اچانک انٹر کام کی گھنٹی بجی تو وہ چونک گئی۔ اس نے فوراً ہی انٹر کام کا ریسیور اٹھا کے بات کرنے لگی۔

"جی سر......! مسٹر آکاش! ہوش میں آ گئے ہیں۔ وہ بہتر نظر آ رہے ہیں۔ میں چارٹ لے کر آ رہی ہوں۔"

نرس نے ریسیور رکھ کے آکاش کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں نشہ سا چھایا ہوا تھا۔

وہ حیا آلود ہو گئی اور اس قدر حسین لگی کہ آکاش نے اس کا ہاتھ پکڑ کے قریب کر لیا۔ پھر دوسرے لمحے اس نے پوچھا۔

"کیا آپ دوسرے مرد مریضوں کا دل بھی خوش کرتی رہتی ہیں؟"

"میں نہیں کرتی بلکہ وہ دل خوش کرتے ہیں۔" وہ سرخ ہو کے بولی۔ "وہ اس اسپتال کی نرسوں اور سسٹروں سے من مانیاں کرتے ہیں اور مٹھیاں بھی گرم کرتے ہیں۔ ہم سب کا بھلا ہو جاتا ہے۔ اسپتال کا جو مالک بھوجن داس ہے وہ ایک نمبر شیطان اور خبیث فطرت کا ہے۔ مارواڑی بنیا ہے۔ ہمیں تنخواہ بھی کم دیتا ہے۔ ہر طرح سے ہراساں کر کے فائدہ اٹھاتا ہے۔ ہم اس لئے مجبور ہیں کہ اس کی ہر بات مانیں۔"

"وہ بڑی دکھی اور جذباتی ہو گئی تھی۔ اس کی خوب صورت آنکھوں کے کناروں میں موتی دکنے لگے تھے۔ وہ خاموش ہو گئی۔ اس لئے کہ اس کے گلے میں آواز رندھ گئی تھی۔

کیا یہ دولت مند جب صحت مند ہو کے جاتے ہیں تو کیا وہ راتیں کالی کرنے کے لئے بلاتے ہیں؟" آکاش نے دریافت کیا۔

"جی ہاں۔" نرس نے گہری سانس لیتے ہوئے سر ہلا دیا۔

وہ پلنگ پر لگے چارٹ کو اٹھا کے آکاش کو غور سے دیکھا اور چند لمحوں کے بعد کمرے سے نکل گئی۔ اس کے جاتے ہی کمرے میں چمپا نو وارد ہوئی۔ دلبرانہ انداز سے مسکرائی۔

"آکاش جی......! بڑا زبردست رومانس چل رہا تھا۔ نرس بڑی خوش قسمت واقع ہوئی ہے۔"

"خوش قسمت تو تم بھی ہو سکتی ہو......" آکاش نے کہا۔ "تم نے جو مجھے اتنے بڑے اور مہنگے اسپتال میں داخل کر دیا......؟ تم نے اتنی بڑی رقم کا کہاں سے اور کیسے اس کا بندوبست کیا......؟ پھر تمہیں کس نے میرے زخمی اور جان کے لالے پڑنے کی اطلاع دی۔ مجھے یاد ہے کہ بے ہوش ہے...... مجھے اتنا ہوش کہاں تھا کہ تم سے رابطہ کرتا ہے۔"

"میرے لئے کون سا مشکل تھا، تمہیں اس اسپتال میں علاج کے لئے داخل کرنا۔" وہ کہنے لگی۔ "میں تمہیں دنیا کے کسی بھی ملک کے اسپتال میں لے جا سکتی تھی...... امریکہ اور یورپ بھی...... وہاں اتنا اندھیر نہیں ہے۔ ایسا سلوک اور انسانیت سوز برتاؤ نہیں ہے...... وہ انسانوں کو انسان سمجھتے ہیں...... یہاں جو اسپتال اور نام ور ڈاکٹرز ہیں...... وہ ان انسانوں کو نالی کے کیڑے سمجھتے ہیں جو غریب ہوتے ہیں...

ہاں تو میں یہ کہہ رہی تھی کہ تم جو بے ہوش ہوئے تھے تھوڑی دیر کے لئے۔ پھر نیم بے ہوشی کی حالت میں۔ درد اور تکلیف کے عالم میں تم نے مجھے پکارنا شروع کیا تھا... "چمپا... چمپا...!" میں فوراً ہی پہنچی۔ پھر میں تمہیں ٹیکسی میں لے کے اسپتال پہنچی۔ وہاں کے ملازمین نے تمہاری حالت دیکھتے ہوئے تمہیں اسٹریچر پر لٹا دیا۔ میں نے اندر جا کے کہا کہ میرا دوست شدید زخمی حالت میں ہے۔ غنڈوں نے اسے اس بری طرح اس لئے مارا ہے کہ وہ لڑکی کو اغوا کر کے لے جانا چاہتے تھے۔ اس کی زندگی خطرے میں ہے..."

استقبالیہ کاؤنٹر کے پاس اسپتال کا مالک بھوجن داس کھڑا ہوا ایک ڈاکٹر سے باتیں کررہا تھا۔ اس نے کہا کہ ”ایک لاکھ رقم جمع کرادیں۔“

”ایک لاکھ کی رقم۔ ۔ ؟ وہ کس لئے۔ ؟“

”اس لئے کہ پچاس ہزار روپے ڈپازٹ کرے کی مد میں اور پچاس ہزار روپے ٹیسٹ کے مد میں.....“

میں نے کہا کہ ”مریض کی حالت سخت خطرے میں ہے، پہلے تو اس کی جان بچانے کی کوشش کریں، پھر میں اتنی دیر میں رقم لے کے آتی ہوں۔“

اس خبیث نے کہا کہ ”ہمیں اس کی زندگی سے نہیں رقم سے لگاؤ ہے..... اس اسپتال کا قاعدہ اور دستور ہے کہ پہلے رقم ڈپازٹ لیتے ہیں۔“

میں نے بھڑک کے برہمی سے کہا کہ.....

”آپ لوگوں میں شرافت اور انسانیت نہیں ہے.....! کیا پیسہ انسان کی زندگی سے زیادہ قیمتی ہیں۔“

اس نے جواب دیا ”انسانیت اور شرافت کی ماں کو مرے صدیاں ہوگئی ہیں۔ یہ کوئی سرکاری اسپتال یا خیراتی دواخانہ نہیں ہے..... آپ مریض کو وہاں لے جائیں.....“ اس کا جواب سن کے میرا خون کھول گیا۔

اسی وقت اس کی پتنی آگئی جو کسی چڑیل کی طرح لگ رہی تھی۔ اس نے آتے ہی اپنے پتی سے کہا کہ ”کیا ہوا تین لاکھ روپے کا...؟“

پتی نے کیشیئر سے کہا کہ ”وہ بریف کیس دے دو جس میں بیگم صاحبہ کو دینے کے لئے بھی ہے۔“

جب کیشیئر نے بریف کیس بڑھایا تو ڈاکٹر بھوجن داس نے پوچھا کہ ”کتنی رقم ہے؟“ اس نے بریف کیس کھول کے دکھایا۔ بریف کیس نوٹوں کی گڈیوں سے بھرا ہوا تھا۔ ”یہ پورے تین لاکھ روپے ہیں۔“ پھر اس نے بریف کیس بند کرکے اس بریف کیس کو پتنی کی طرف بڑھادیا۔ پھر اس خبیث کی پتنی بریف کیس لے کر باہر کی طرف بڑھی تو میں نے بھوجن داس سے کہا ”میں نے فون کردیا ہے۔ میرے بھائی رقم لے کر آرہے ہیں۔ مریض کو فرسٹ ایڈ تو دے دیں.....“ میں اتنا کہہ کے باہر لپکی۔

وہ چڑیل مرسڈیز گاڑی میں پچھلی نشست پر بریف کیس رکھ کے گاڑی اسٹارٹ کررہی تھی۔ وہ تھوڑی دور گئی ہوگی۔ میں جو پچھلی نشست پر بیٹھ گئی تھی اسے دکھائی نہ دیتی تھی۔ میں نے اس کا بریف کیس اڑالیا اور گاڑی سے غائب ہوگئی، وہ گنگناتی ہوئی گاڑی چلارہی تھی۔ پھر میں نے وہ بریف کیس ایک جگہ چھپادیا۔ ایک لاکھ کی رقم ساڑی کے پلو میں رکھ لی۔ پھر اس اسپتال کے سامنے جو دکان تھی۔ وہاں سے پرس اٹھالیا اور اس میں رقم رکھ کے اسپتال میں ایک لاکھ کی رقم جمع کرائی۔ ان سے وی آئی پی کمرا لیا۔ پھر ڈاکٹر نے فوری توجہ دی۔ اور تمہیں آپریشن تھیٹر میں لے جانے کے تھوڑی دیر بعد مجھ سے کہا کہ ”مریض کی حالت خطرے سے باہر ہے۔ میں نے اسے انجکشن دے دیئے ہیں۔ ہوش میں آنے کے بعد علاج شروع ہوگا۔“

جب چمپا تفصیل بتاچکی تو آکاش نے خوش ہوکے کہا۔ ”تم نے بڑا زبردست کارنامہ انجام دیا؟“

”میرے اور کارنامے سنو۔“ چمپا کہنے لگی۔

”میں اسپتال کے مالک کے دفتر میں گھس گئی۔ وہ اندر سے دروازہ بند کرکے تجوری میں نوٹوں کی گڈیاں رکھ رہا تھا۔ جب وہ تجوری مقفل کرکے کمرے سے نکلا اور کمرا بھی مقفل کرتا گیا تو میں نے اس کی تجوری میں جھاڑو پھیردی اور اس کے خالی بریف کیس میں رقم لے کر نکل گئی..... اس کی بیوی نے گاڑی چلاتے ہوئے اپنا بریف کیس پچھلی نشست پر نہیں پایا تو بدحواس ہوگئی اور گاڑی بجلی کے کھمبے سے ٹکرادی۔ اس کی شاندار اور نئے ماڈل کی تیس لاکھ مالیت کی گاڑی کا بیڑا غرق ہوگیا۔ اور وہ شدید زخمی حالت میں اسپتال لائی گئی ہے۔ اس کی حالت بڑی تشویشناک ہے۔ آپریشن تھیٹر میں ڈاکٹر اس کی جان بچانے کی جدوجہد کررہے ہیں۔ اسپتال میں کہرام مچا ہوا ہے۔“

”ابھی تو ایک اور کارنامہ باقی رہ گیا ہے۔“ چمپا بولی۔

"آکاش پوچھنا چاہتا تھا کہ اب کون سا کارنامہ باقی رہ گیا ہے؟ کمرے کا دروازہ کھلا۔ نرس ہنستی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی، اسے ہنستا ہوا دیکھ کے آکاش نے کہا۔

"آپ ہنستی ہوئی کتنی پیاری لگ رہی ہیں......؟ خیریت تو ہے کیوں ہنس رہی ہیں؟"

"ہوا یہ کہ وی آئی پی روم نمبر گیارہ میں شیو اجی جو زیر علاج ہیں انہوں نے آن ڈیوٹی نرس شکنتلا کو دبوچ لیا، اور من مانیاں کرنے اور ایک بڑی رقم کا لالچ دینے لگے تو اس نے ان کے منہ پر تھوک دیا اور اس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کرنے لگی تو مریض صاحب نے غصے میں آکے اس کا لباس پھاڑ دیا۔ موصوف کی بدنصیبی کہ ان کی پتنی آگئی...... پھر ان کی پتنی نے جوتی سے ان کی عزت بخشی، شکنتلا فوراً کمرے سے نکل گئی۔ یہ کوئی نئی بات اور واقعہ نہیں...... ایسا ہوتا رہتا ہے۔"

چمپا ہنسنے لگی۔ "اب تو گھر میں بھی ان کی خوب مزاج پرسی ہوگی۔"

"آپ کی ایکسرے، خون اور دیگر رپورٹس آگئی ہیں۔" نرس کہنے لگی۔ "ڈاکٹر رام لعل کا کہنا ہے کہ آپ کے آپریشن اور ہڈیوں کی سنگ اور چلنے کے قابل بنانے پر چار لاکھ ساٹھ ہزار روپے کا خرچ آئے گا۔ آپ چار لاکھ کی رقم کیشئیر کے پاس جمع کرادیں۔ فوری آپریشن کی اس لئے ضرورت ہے کہ انجکشن کا اثر ختم ہونے والا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" چمپا بولی۔ "ڈاکٹر سے کہہ دیں دو گھنٹے کے بعد رقم جمع کرادیں گے۔"

جب وہ نرس چلی گئی تو چمپا بستر پر بیٹھ گئی۔ اس کے ہونٹوں پر جو دل کش تبسم تھا اس میں لگاوٹ بھی تھا اور ادائے دلربانہ بھی...... اس نے پرکیف نظروں سے آکاش کی آنکھوں میں جھانکا تو آکاش کہنے لگا۔

"میں محسوس کر رہا ہوں کہ انجکشن کا جو اثر ختم ہو رہا ہے...... میرے زخموں میں کسک شدید ہونے لگی ہے۔ میری دائیں پسلیوں میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی ہیں...... ایسا لگتا ہے کہ یہ ناقابل برداشت ہو جائے گا۔ آپریشن بھی ناگزیر ہو جائے گا...... اس اذیت سے میرا دل ڈوب رہا ہے۔ تم نے جو رقم ادائی ہے وہ ڈاکٹر کو دے دو۔"

چمپا نے اپنا نرم و نازک اور گداز اور خوب صورت ہاتھ اس کی زخمی پیشانی پر رکھ دیا۔ پھر پوچھا۔

"تمہارے پاس ناگ رانی کا منکا تو ہے نا......؟ پھر فکر کس بات کی ہے۔"

آکاش چونک پڑا۔ "کیا تم میری مجبوری اور پریشانی سے فائدہ اٹھا کے اس کا منکا واپس لینا چاہتی ہو؟"

آکاش لمحے کے لئے خاموش ہو گیا تو چمپا نے کہا۔ "خاموش کیوں ہو گئے ہو؟"

"چمپا......! ناگ رانی میری زندگی میں اس وقت تک اپنا منکا نہ پاسکے گی جب تک میری نیلم مجھے نہ مل جائے...... میری نیلم جو میری زندگی جان اور محبت ہے۔"

"آکاش......!" چمپا کہنے لگی۔ "میں چاہتی تو منکا تمہارے جسم سے الگ کرسکتی...... جب تم بے ہوش تھے۔ کوئی حرکت تک نہیں کرسکتے تھے۔ بے بس تھے...... میں نے ایسا نہیں کیا...... یہ دیکھو مرہم پٹی کے باوجود تمہارے زخموں سے خون رسنے لگا ہے...... تمہاری ایک آدھ پسلی ان بھیڑیوں نے توڑ ڈالی ہے...... میں نے ان کا کیا حشر کیا یہ تو میں تمہیں بعد میں بتاؤں گی...... تم چنتا نہ کرو۔ ناگ رانی کیا...... میں بھی منکا چھین نہیں سکتی...... تم اسے فوراً منہ میں ڈال لو۔ یہ منکا تمہاری ملکیت ہی رہے گا...... تم صرف چند لمحوں میں تندرست اور توانا ہو جاؤ گے۔ زخم اور گھاؤ بھر جائیں گے۔ تمہیں ذرہ برابر بھی درد اور تکلیف نہ ہوگی۔"

چمپا سچ کہہ رہی تھی یہ اس کے لہجے، چہرے اور آنکھوں سے عیاں تھے۔ وہ ریاکاری اور منافقت سے کام نہیں لے رہی تھی۔ اس نے قدرے تذبذب سے چمپا کو اشارہ کیا، گلے کی طرف...... جہاں وہ منکا ایک طلائی زنجیر کے ذریعے گلے میں لٹکا ہوا تھا۔

آکاش کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اس میں بدوضع اور بدرنگ پتھر میں کیا تاثیر تھی کہ اسے منہ میں

ڈالتے ہی اس کی نقاہت، اذیت، ناتوانی دور ہوتی گئی۔ اب درد اور زخموں کا دور تک پتا نہیں رہا تھا۔ اب اس کی رگوں میں ایک نیا خون گردش کرنے لگا تھا۔

وہ چند ہی لمحوں میں اپنے آپ کو چاق و چوبند محسوس کرنے لگا۔ بستر سے اتر کے فرش پر کھڑا ہو گیا۔ اس نے پسلیوں اور زخموں کو چھو کے دیکھا...... سب صحیح سلامت تھے۔ پھر اس نے منکا واپس گریبان میں ڈال لیا۔ اس نے بے اختیار چمپا کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ اس نے بڑی مصیبتوں میں اس کی رہنمائی کی تھی۔ اس کی محسن تھی۔ وہ ناگ رانی کے منکے کے اس استعمال سے باخبر نہ کرتی تو شاید وہ ایک طویل مدت کے لئے صاحب فراش بلکہ معذور رہتا۔

"اب ہمیں چل دینا چاہئے۔" چمپا بولی۔ "وہ نرس آتی ہوگی۔ تمہاری اچانک صحت یابی کا راز اس کے علم میں نہیں آنا چاہئے تم کیا کہتے ہو۔"

جب وہ دونوں کمرے سے نکل کے اسپتال کے دفتر استقبالیہ میں آئے تو وہاں ایک افراتفری اور ہنگامہ سا مچا ہوا تھا۔ پولیس انسپکٹر اور اس کے ماتحت بھوجن داس کے کمرے کے سامنے کھڑے تھے۔ بھوجن داس صدمے سے نڈھال اور نیم جان ہو رہا تھا۔ اس کی الماری میں جو بارہ لاکھ کی رقم تھی وہ غائب تھی اور کیشئر کی رقم بھی جو دس لاکھ تھی وہ بھی پراسرار طور پر اس کی تجوری سے غائب۔ پولیس کی سمجھ میں یہ معمہ نہیں آ رہا تھا۔ وہ دونوں تماشا دیکھتے ہوئے کینٹین میں آ گئے تھے۔

آکاش نے ویٹر کو دودھ اور چائے کا آرڈر دیا۔ اس لئے کہ چمپا دودھ پیتی تھی۔

"چمپا...... تم نے ان لاکھوں کی رقم کا کیا کیا...... ؟ وہ کہاں ہے؟"

"میں نے ان سماجی کام کرنے والی دس خواتین میں اس شرط پر دے دیئے کہ وہ مریضوں کے علاج معالجے پر خرچ کریں گی۔ میں نے بیس ہزار کی رقم تمہارے لئے اٹھا رکھی ہے تاکہ تمہارے کام آسکے۔"

"ہاں تو اس لڑکی کا کیا بنا جسے غنڈے اغوا کرنا چاہتے تھے۔" آکاش بولا۔ "میں نے مداخلت کی تو میرا حشر نشر کر دیا۔"

"تمہیں اسپتال میں داخل کرانے کے بعد میں وہاں پہنچی جہاں ان تین غنڈوں نے اس لڑکی کو اغوا کر کے پہنچایا ہوا تھا۔" چمپا کہنے لگی۔ "مجھے وہاں موجود لوگوں نے اس لڑکی کے اغوا اور تم پر قاتلانہ حملے اور تمہارے بے ہوش اور زخمی ہونے اور ان غنڈوں کے بارے میں بتایا کہ کالو میاں کے آدمی ہیں۔ کالو میاں اس شہر کا سب سے بڑا اور خطرناک ترین بدمعاش ہے۔ اس نے جو تین غنڈے پال رکھے ہیں وہ بھی قاتل اور جرائم پیشہ ہیں۔ کالو میاں کے نام سے نہ صرف بڑے خطرناک جرائم پیشہ بلکہ پولیس بھی کانپتی ہے۔ پولیس کی مجال نہیں کہ اسے گرفتار کر کے جیل میں ڈال دے۔ جو عدالت اسے سزا دیتی ہے۔ اس کے جج یا مجسٹریٹ کو اغوا کر کے تشدد کر کے زخمی حالت میں سڑک پر پھینک دیتا ہے۔ ایک جج نے ایک عورت کی آبروریزی کر کے قتل کرنے پر اسے سزائے موت سنائی۔ دوسرے دن اس نے رات کے وقت اس جج کو شہر کے بیچ چوراہے پر پھانسی دے دی۔ پولیس اسے اس لئے گرفتار نہ کر سکی وہ نہ صرف بردہ فروش، اسمگلر اور منشیات فروش ہے۔ شہر میں اس کے قمار خانے اور شراب کی بھٹیاں ہیں۔ وزرا اور اعلیٰ پولیس افسران اس کی پشت پر ہیں کیوں کہ وہ انہیں عورتیں اور شراب سپلائی کرتا رہتا ہے۔

جس لڑکی کے اغوا ہونے کے سے تم نے مداخلت کی اس لڑکی کا نام قلفی ہے۔ اس کی دو بہنیں بھی ہیں جو جوان ہیں۔ وہ ایک مزدور کی بیٹیاں ہیں۔ ایک روز بازار میں کالو میاں نے قلفی کو دیکھ لیا تھا۔ اس روز اس کی رات کی نیند حرام ہو گئی۔ قلفی کا حسن اس کے دل پر قیامت بن کر ٹوٹا تھا۔ اس نے سوچا کہ قلفی سے جی بہلانے کے بعد بھی وہ اسے بازار حسن میں فروخت کر دے گا تو اس کی ایک نایاب اور انمول ہیرے کی قیمت ملے گی۔

اس کے کارندوں نے لڑکی کے باپ کو پیغام

بھیجا کہ دس ہزار روپے کے عوض اپنی بیٹی کو بیچ دے۔ اس کے باپ کو کالو میاں کے متعلق معلوم تھا کہ وہ کس قدر خطرناک جرائم پیشہ ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی اس نے صاف انکار کردیا۔ اس کے کارندوں نے جاکر کلثنی کے باپ کا پیغام سنایا۔ اسے یہ بتایا کہ کلثنی کی جو دو بہنیں وہ بھی نایاب اور انمول نگینہ ہیں...... "کالو میاں نے کہا کہ "پہلے کلثنی کو اٹھا کے لے آؤ۔"

میں کالو میاں کے ہاں سیدھے اس حصے میں پہنچی جہاں بارہ لڑکیاں اور سات عورتیں تھیں۔ وہ انہیں فروخت کرنے کے لئے رکھا ہوا تھا۔ لیکن پہلے وہ فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ اب تک کسی وجہ سے ان پر آنچ نہیں آئی تھی۔ یہ سب غریب گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں۔

اتفاق سے اس نے اب تک کلثنی سے فائدہ نہیں اٹھایا تھا۔ اس وقت اس نے اپنی تجوری اتاری اور کھول کے کلثنی کو دکھا رہا تھا...... اس میں دو بڑے خانے تھے...... ایک خانے میں سونے جواہرات کے زیورات بھرے ہوئے تھے جو آنکھوں کو چکا چوند کررہے تھے...... دوسرے خانے میں نوٹوں کی گڈیاں بھری ہوئی تھیں۔ وہ انہیں دکھا کے نرم لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"میری جان کلثنی! تو پہلی لڑکی ہے جسے میں پیار اور محبت سے پیش آرہا ہوں۔ میں تجھے دل کی رانی بنانا چاہتا ہوں۔ یہ سب کچھ تیرا ہے...... میں یہ چاہتا ہوں کہ تو مجھ پر فیاضی ...... وارفتگی اور والہانہ پن سے مہربان ہوجا ...تو یہ سمجھ لے کہ یہ ملن کی رات ہے؟ میرے سینے سے لگ جا......"

"کیا تم نے مجھے آوارہ سمجھ رکھا ہے؟" کلثنی تنک کے بے خوفی سے بولی۔ "میں تم پر تمہاری اس دولت پر تھوکتی ہوں۔ میں مرجاؤں گی مگر اپنی عزت پر آنچ آنے نہیں دوں گی۔"

وہ قہقہہ مار کے بڑے زور سے ہنسا۔ پھر اس نے اپنی لمبی، نوکیلی اور گھنی مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا استہزائیہ لہجے میں بولا۔

"مجھے تم جیسی باغی لڑکیوں کو قابو کرنا آتا ہے

میں دیکھتا ہوں تمہیں بے آبرو ہونے سے کون بچاتا ہے؟"

"میں..." میں نے نمودار ہوکے کہا۔ ان میں سے کسی نے مجھے نمودار ہوتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

میری آواز سن کے وہ حیرت اور خوف سے اچھلا۔ اس لئے کہ کمرے کا دروازہ بند اور مقفل تھا۔ ایسا کوئی راستہ نہیں تھا جو کوئی اندر داخل ہوسکے۔

اس نے جو مجھے دیکھا تو بھونچکا سا رہ گیا۔ اسے اپنی نظروں پر جیسے یقین نہیں آیا۔ اس کے بشرے سے ایسا ظاہر ہورہا تھا جیسے وہ کوئی رنگین اور سندر سا سپنا دیکھ رہا ہو۔ وہ ایک لمحے کے لئے مجھے مبہوت ہوکے گھورنے لگا۔ کیوں کہ میں انتہائی حسین دوشیزہ کے روپ میں اور بے حجابانہ حالت میں تھی۔ جس نے میرے حسن کی کرشمہ سازیاں واضح کردی تھیں۔ اس کی حریصانہ نگاہیں مجھے دیکھ کے اس کے جذبات بھڑکا رہی تھیں۔ کیوں کہ میرے بدن پر صرف دھجیاں تھیں...... وہ لڑکی بھی مجھے حیرت اور خوشی سے دیکھ کے میری طرف بڑھی۔

"آپ مجھے اس موذی سے بچا لیں......" وہ میرے قریب آکے میرا بازو تھام کے التجا آمیز لہجے میں بولی۔ "لیکن آپ اس حالت میں کیوں آئیں... کہیں یہ شیطان آپ پر قابو نہ پالیں...... پھر مجھ پر اس کے پاس پستول بھی ہے۔ لیکن کمرے میں کیسے آئیں! کہاں تھیں...!"

"میں مسہری کے پیچھے چھپی ہوئی تھی تاکہ تمہاری عزت بچاؤں اور یہاں سے نکال کے لے جاؤں......" میں نے جواب دیا۔ "تم دروازہ کھول کے فرار ہوجاؤ...... میں اس مردود سے نمٹتی ہوں۔"

"لیکن باہر اس کے چار مسلح غنڈے پہرہ دے رہے ہیں۔" کلثنی سراسیمگی سے بولی۔ "اس کے علاوہ ایک کمرے میں اور بھی قسمت کی ماری لڑکیاں اور عورتیں بند ہیں۔ ان کا کیا ہوگا؟"

"تم کسی بات کی چنتا نہ کرو... چار کیا... دس مسلح غنڈے بھی ہوئے تو بال بیکا نہیں ہوگا۔" میں نے اسے دلاسا دیا۔ "پہلے اس حرام زادے سے نمٹ

لوں۔ تم یہاں کھڑے ہو کے تماشا دیکھو۔"

کالو میاں نے مجھ سے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ تم یہ دھجیاں اتار کے میرے قریب آجاؤ..... پھر کلفتی سے میں نمٹوں گا۔"

"انگور کھٹے ہی نہیں بلکہ بہت زیادہ کھٹے ہیں۔" میں نے کہا۔ "کیوں نہ میں تمہاری دھجیاں اڑا دوں؟"

"جب گھی نکالنا ہو تو اس وقت ٹیڑھی انگلی سے نکالنا پڑتا ہے جب سیدھی انگلی سے نہ نکلے۔" وہ ہنس کے بولا۔ "تم ایک نوجوان، نازک اندام دوشیزہ ہو۔ بڑی زبان درازی کر رہی ہو۔ ؟ سیدھی طرح راستے پر آجاؤ..... میں نہیں چاہتا کہ جبر و زبردستی سے کام لوں..... تم اپنے دل میں جو حسرت لے کے آئی ہو وہ پوری نہیں ہو سکتی۔

"سنو" میں نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ "تم اپنی خیریت چاہتے ہو تو سیدھی طرح نہ صرف کلفتی بلکہ دوسری قید لڑکیوں، عورتوں کو عزت سے جانے دو... ورنہ"

"ورنہ کیا.....؟" وہ تمسخر سے بولا۔

"یوں تو میں تمہیں ایک لمحے میں موت کی نیند سلا سکتی ہوں..... لیکن یہ سزا اس لئے دینا نہیں چاہتی کہ تم فوراً مر جاؤ گے..... لیکن میں ایسی دردناک اور عبرت ناک سزا دینا چاہتی ہوں کہ تم ساری زندگی ایڑیاں رگڑ کے بھیک مانگتے رہو۔ لوگ تم پر تھوکتے ہوئے گزر جائیں اور کوئی تمہیں پانی بھی نہ پلائے..... تمہارے جرائم کی فہرست بہت طویل ہے....."

"بڑا ناز، غرور اور گھمنڈ ہے تمہیں اپنے آپ پر....." کالو میاں مجھے دبوچنے کے لئے آگے بڑھا۔

میں نے اپنی عریاں بانہیں فضا میں پھیلا دیں..... اسے وارفتگی اور خود سپردگی کی نظروں سے دیکھا اور پھر بولی۔

"میں تو مذاق کر رہی تھی..... تم کتنے سندر ہو..... مجھے اپنی آغوش میں اور گود میں لے لو....."

وہ احمق میرے قریب میں آکے خوش ہو گیا۔ جب وہ میرے قریب آیا تاکہ مجھے آغوش میں لے لے، میں اپنا گھٹنا نازک اور حساس مقام پر دے مارا۔ وہ ایک دل خراش چیخ مار کے فرش پر گر کے درد اور تکلیف سے دوہرا ہو گیا۔ پھر فرش پر ہی بے ہوش ہو کے ساکت اور بے حرکت ہو گیا۔

دوسرے لمحے جب وہ ہوش میں آیا تو اس نے دوسرا اور ناقابل یقین منظر دیکھا۔ کرسی پر اس کی مشکیں کسی ہوئی تھیں اور اس کے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا۔ تمام قیدی لڑکیاں اور عورتیں کمرے میں موجود تھیں۔ کسی کے ہاتھ میں ڈنڈا تھا، جوتیاں اور لاٹھیاں تھیں۔ وہ نفرت اور حقارت اور غضب ناک نظروں سے اسے اس طرح گھور رہی تھیں جیسے اسے کچا چبا جائیں گی۔

"بہنو.....!" میں نے انہیں مخاطب کر کے کہا۔

"تمہارا مجرم اور میزبان تمہارے سامنے ہے..... دستور تو یہ ہے کہ مہمانوں کی خاطر تواضع میزبان کرتا ہے..... اس روایت کو توڑ دو..... اپنے میزبان کی خوب خاطر مدارت کرو اور اسے بستر کی زینت بنا دو..... اس نے جو تمہاری معصوم بہنوں کو اس بستر کی زینت بنا کے ان کی عزت و آبرو خاک میں ملا دی۔ اب تم اپنی معصوم بہنوں کا بدلہ لو جی بھر کے..... جس طرح چاہو..... تمہیں آزادی اور اجازت ہے۔"

کالو میاں نے دہشت زدہ ہو کے سر ہلا دیا اور آنکھوں سے جیسے التجا کرنے لگا تھا۔ میں نے ایک لمحے کے لئے ان لڑکیوں اور عورتوں کو ہاتھ کے اشارے سے روکا۔ وہ اس لئے نہیں بول سکتا تھا کہ اس کے منہ میں کپڑا ٹھونسا ہوا تھا۔ تب میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

"کالو میاں.....! تم کس لئے التجا اور منت سماجت کر رہے ہو..... تم جن لڑکیوں عورتوں کو بستر کی زینت بناتے تھے، وہ گڑگڑاتی تھیں... منت سماجت کرتی تھیں..... ہاتھ جوڑتی تھیں کہ انہیں بے آبرو اور پامال نہ کرو..... لیکن تم درندے بن جاتے تھے..... بھیڑیے اور گدھ بن کے نوچتے اور کھسوٹتے تھے..... خون کا بدلہ خون..... جیسے کو تیسا..... اب تم بدلہ لینے سے انہیں

روک نہیں سکتے......"

میرے ایک اشارے کی دیر تھی۔ وہ سب اس درندے اور سفاک ترین کالومیاں پر ٹوٹ پڑیں۔ کسی نے اس کے منہ پر تھوکا۔ کسی نے لاٹھی اور ڈنڈے...... لاتوں، جوتوں سے اس کی درگت بنانا شروع کی...... ہڈیاں اور پسلیاں توڑ دیں۔ پھر بھی ان کی بھڑاس نہ نکلی تھی۔ لیکن میں نے انہیں باز رکھا۔ ان لڑکیوں سے کہا کہ اسے جان سے نہ مارو...... زندہ رہنے دو، اس لئے کہ ساری زندگی اپاہج اور معذور بن کے ایک دردناک اور عبرت ناک زندگی فٹ پاتھوں پر گزار سکے۔ یہ بات ان کی سمجھ میں آ گئی، وہ بے ہوش ہو چکا تھا، مرا نہیں تھا۔ سانسیں لے رہا تھا۔

پھر جب ہم باہر نکل رہی تھیں باہر دروازے پر چار غنڈے چاقو اور خنجروں سے مسلح کھڑے تھے۔

ان بدمعاشوں میں سے ایک نے تھوڑی دیر پہلے چابی کے سوراخ میں سے حسب معمول کالومیاں کے کمرے میں جھانک کے دیکھا تھا کہ کہاں بہک رہے ہیں؟ یہ بدمعاش چابی کے سوراخ میں سے اور چھت پر سے یہ سنسنی خیز فلم دیکھتے تھے اور کالومیاں کو ہوا نہیں لگتی تھی۔ لیکن آج کی فلم تو سابق فلموں کے برعکس تھی۔ یہ حسین، نوجوان اور جواں سال لڑکیاں اور عورتیں کالومیاں کے پرخچے اڑا رہی تھیں۔ اور پھر ان کی نگاہیں مجھ پر جم گئی تھیں۔ جو میں نامناسب حالت میں تھی۔ وہ حیران بھی تھے کہ میں کون ہوں اور کہاں سے آ گئی ہوں...... انہوں نے فیصلہ کیا کہ کیوں نہ وہ مجھے اور ان تمام لڑکیوں کو قابو میں کر کے گلچھرے اڑائیں...... اس کے بعد کالومیاں کی خبر گیری کریں۔ کیوں کہ کالومیاں بے ہوشی کی حالت میں پڑا تھا۔ انہیں کالومیاں سے کوئی غرض نہ تھی۔

ان میں سے ایک نے تیزی سے آگے بڑھ کر میرے گلے کے نیچے خنجر رکھ دیا اور میرا بازو پکڑ کے کھینچ لیا۔ پھر کرخت لہجے میں بولا۔

"تو ہمارے ساتھ شرافت سے چل ورنہ یہ خنجر تیرے سینے میں اتار دوں گا۔"

"چلتی ہوں...... چلتی ہوں...... بھگوان کے لئے یہ خنجر ہٹا لو ورنہ میرا گلا کٹ جائے گا۔ میں درد اور تکلیف سے مر جاؤں گی" پھر میں کمرے سے باہر آ گئی۔

دوسرے بدمعاش نے جس کے ہاتھ میں چاقو تھا اس نے لڑکیوں اور عورتوں کو کرخت لہجے میں کہا۔

"کمرے میں ہمارا انتظار کرو...... ہم باری باری تمہیں لے جائیں گے۔" اس نے پھر دروازہ بند کر کے باہر سے کنڈی لگا دی۔

اب لڑکیاں اور عورتیں کمرے میں محبوس ہو گئی تھیں۔ مجھے تلسی کی آواز سنائی۔ اس نے کہا۔

"ہم کتنی بدبخت لڑکیاں ہیں۔ اس نوجوان لڑکی نے ہماری مدد کی لیکن عین وقت اس کی کوشش ناکام ہو گئی...... یہ بھیڑیے بڑے خطرناک ہیں۔ اب ہماری آبرو بچتے سے رہی۔"

"بھگوان ہماری رکھشا کرے گا......؟ دوسری عورت نے اسے دلاسا دیا۔ "ہمت اور حوصلہ نہ ہارو...... مایوس اور دل شکستہ نہ ہو...... ہم یہاں سے نکلنے کی کوئی تدبیر کرتے ہیں۔"

وہ چاروں مجھے لے کر زینے کے پاس والے کمرے کی طرف بڑھے جو خواب گاہ تھی۔ ایک نے کہا۔

"یار کالومیاں...... کہیں مر تو نہیں گیا۔ اس کا تیا پانچہ ہو گیا ہے۔ کیا کریں۔"

"یہ حرام زادہ اتنی جلدی مرنے والوں میں سے نہیں ہے...... مرتا ہے تو مرنے دو...... اس نے کبھی بھی کسی لڑکی سے بھی دل بہلانے نہیں دیا...... ہم اغوا اور جان پر کھیل کے لڑکیاں لاتے تھے...... خود مزے کرتا اور بیچ دیتا تھا۔"

جس بدمعاش نے میرا ہاتھ پکڑا ہوا تھا اس نے خواب گاہ کا دروازہ کھولا اور مجھے اندر سفاکی سے دھکیل دیا۔ اس کے ساتھیوں نے اندر آ کے دروازہ بھیڑ دیا۔

میں بستر کے قریب کھڑی ہو کے انہیں دیکھنے لگی۔

"گوپال......! کیا مال ہے......؟ آج تک ہم نے ایسا مال کہاں دیکھا......؟" ایک بولا۔

"دیکھو یارو......!" دوسرے نے کہا۔ "ہم ٹاس کرلیتے ہیں تاکہ آپس میں جھگڑا نہ ہو۔"

پھر تینوں نے آپس میں ٹاس کیا۔ خنجر والا جیت گیا۔ پھر میرے پاس آکر بولا۔

"یہ دھجیاں اتار کے پھینک دو......ورنہ میں خنجر سے انہیں اتار دوں گا۔"

میں نے اس کی بات نہ مانی تو وہ میرے اور قریب آیا تاکہ اپنے ہاتھوں سے میری دھجیاں اتار دے......میں نے اس کے پیٹ پر اتنے زور سے لات رسید کی کہ وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا الٹ کے اپنے ساتھیوں کے اوپر گرا۔

وہ بھونچکا ہوگیا۔ اسے یقین نہیں آیا کہ ایک نوجوان سی دوشیزہ کی سوت اتنی زوردار ہوسکتی ہے۔ اسے ایسا لگا تھا کہ جیسے کسی نے اس کے پیٹ میں لاٹھی دے ماری ہو۔ وہ اپنا پیٹ پکڑ کے رہ گیا۔

"یار......اوہ کراہتے ہوئے بولا۔ "تم سب مل کے اسے لباس سے بے پردہ کرو......اس حرام زادی نے میری لسی کی تیسی کردی ہے۔" وہ تینوں میری طرف بڑھے......میں چشم زدن میں ناگن کے روپ میں آگئی۔ وہ ایک دم سے ٹھٹک کے رک گئے۔ پھر ان کی آنکھیں خوف و دہشت سے پھٹی پھٹی رہ گئیں۔ ان کے چہرے سفید پڑتے گئے۔ وہ ساکت و جامد ہوگئے تھے۔

"ناگن......ناگن......" ان میں سے ایک نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ "بھاگو......بھاگو......"

میں اپنا پھن لہراتی ان کی طرف بڑھی تو وہ چاروں حواس باختہ ہوکے دروازہ کھول کے باہر نکلے اور زینے کی طرف بڑھے۔ ان میں ایسی افراتفری بچی کہ وہ سیڑھیاں اترتے ہوئے خود کو قابو میں نہ رکھ سکے۔ آپس میں ٹکرا کے سیڑھیوں پر گرے......پھر وہ چاروں گرتے چلے گئے۔ سب نے نیچے جاکے گرے تو نہ صرف اس کے منہ اور سر لہولہان ہوگئے تھے۔ دانت بھی باہر آگئے تھے۔

منہ سے اور سر کے زخموں سے خون رسنے لگا۔ نہ صرف جبڑے بلکہ جسم کی ہڈیاں اور ہاتھ پیر بھی ٹوٹ گئے۔ وہ سب سے نیچے فرش پر بے ہوش پڑے تھے۔

پھر میں اصلی حالت میں آکے کمرے میں پہنچی تو لڑکیاں عورتیں دہشت زدہ اور مایوس ہوکے رو رہی تھیں۔ کالو میاں بے ہوش پڑا تھا۔ لڑکیاں اور عورتیں مجھے دیکھ کے خوش ہوگئیں۔ مجھ سے لپٹ کے رونے لگیں۔

"وہ بدمعاش کہاں ہیں؟" کلثمی نے حیرت اور خوف سے پوچھا۔ "آپ ان کے چنگل سے کیسے نکل آگئیں۔"

وہ چاروں نیچے والے زینے پر شدید زخمی حالت میں پڑے......بے ہوش ہیں......وہ اپاہج اور معذور ہوچکے ہیں، چلنے کی حرکت کے قابل بھی نہیں رہے ہیں۔"

پھر میں نے ان سب میں کالو میاں کی ساری رقم اور سونے ہیرے جواہرات کے زیورات کی مساویانہ تقسیم کردی۔ پھر انہیں بڑی حفاظت سے ان کے گھروں کو پہنچادیا۔ انہیں سختی سے تاکید کہ رقم اور زیورات کے بارے میں کسی کو نہ بتائیں۔ نہ اپنے رشتہ داروں کو۔ اگر پولیس کے علم میں یہ بات آگئی تو وہ کسی بڑی مصیبت میں گرفتار ہوجائیں گی۔ پولیس نہ صرف مال لوٹ لے گی اور چوری کا الزام لگا کے ان کی عزت بھی تباہ کردے گی۔ پولیس سے زیادہ سور اور لٹیرا کوئی نہیں ہے۔"

"چمپا!" آکاش نے کہا۔ "تم نے کالو میاں اور اس کے پالتو غنڈوں سے جو سلوک کیا وہ اس کے مستحق بھی تھے۔ تم نے نہ صرف اس شہر کی لڑکیوں، عورتوں پر احسان کیا بلکہ ان کے گھر والوں پر بھی......وہ لڑکیاں عورتیں سوچتی ہوں گی کہ ہماری محسنہ کون ہے......! اور تم نے مجھ پر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔ منکے کی خصوصیت بتا کے......مجھے ایک نئی زندگی اور صحت دی......ورنہ میں اس منکے کی خوبی سے بے خبر رہتا تو جانے کب تک بستر پر پڑا رہتا۔"

"کیسا ہی گھاؤ ..... مہلک زخم ..... بیماری یا کسی بھی قسم کی کمزوری کیوں نہ ہو، منکے کو منہ میں رکھ کے چوس لو..... پل بھر میں ٹھیک ہو جاؤ گے۔" چمپا بولی! اس کی جان سے زیادہ حفاظت کرنا۔"

"اگر میں تمہیں چوم لوں تو.....؟" آکاش شوخی سے بولا۔" چمپا سرخ ہو کے اس کی نظروں کے سامنے سے غائب ہوگئی۔

☆.....☆.....☆

چمپا نے اسے چوبیس ہزار کی رقم دی تھی اس کی جیب میں تھی۔ چمپا نے اس سے کہا تھا کہ جب بھی بھی کتنی ہی رقم کی ضرورت کیوں نہ پڑے وہ اسے لا کے دے سکتی ہے۔ اس نے مذاق میں کہا تھا کہ کروڑ دو کروڑ کی ضرورت پڑے گی.....؟ چمپا نے جواب دیا کہ دو کروڑ تو کیا دس کروڑ بھی لا سکتی ہوں..... اس نے حیرت سے پوچھا تھا کہ کیسے اور کہاں سے.....! وہ بولی بینکوں سے..... ان کے اسٹرانگ روم میں کروڑوں کی رقم ہوتی ہے۔

آکاش کو دولت کی کوئی ہوس اور خواہش نہ تھی۔ اس کے خیال میں دولت سے بڑی لعنت سکون اور صحت ہے..... جتنی زیادہ دولت ہوتی ہے اتنی پریشانی کا سبب بنتی ہے۔ سکون چھین لیتی ہے۔

آکاش اتنا خوب صورت، وجیہ اور دراز قد تھا کہ لڑکیاں عورتیں اس پر جان دیتی تھیں، لیکن اس نے کبھی بھولے سے بھی انجانا راستہ اختیار نہیں کیا تھا۔

اسے اچانک ایک ستم رسیدہ سی لڑکی نظر آئی جو اسے بس کے اڈے پر دکھائی دی تھی۔ اسے دیکھ کے آکاش کو محسوس ہوا تھا کہ وہ بڑی پریشان، ہراساں اور غم زدہ سی ہے..... کسی مصیبت میں گھری ہوئی۔ وہ اس کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ اسے پتا جی اور گھر والے یاد آئے تو وہ ان کی تلاش میں نکل گیا۔ اس کے پاس پتا بھی نہیں رہا تھا۔ لیکن اسے پتا جی اور گھر والوں کی ایک دھندلی سی تصویر اور یادیں تھیں، ان میں اسے اس لڑکی کا بھی ایک دھندلا سا عکس تھا۔ اسے ایسا لگا تھا جیسے اس کا ایک دھندلا سا عکس ہو۔ اس نے جیسا چمپا کو بلا کے اس لڑکی کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے کہا کہ ایسی ستم زدہ لڑکیاں صرف اس شہر میں نہیں بلکہ ہر قصبے، قریہ اور گاؤں میں ہوں گی۔ جب تک اس کا صحیح حلیہ معلوم نہ ہو، اس لڑکی کو تلاش کرنا مشکل ہے۔ کیوں کہ ایسی سینکڑوں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں ہوں گی۔ تاہم وہ کوشش کرے گی۔

اسے نہ صرف اس لڑکی بلکہ اپنے پتا جی، بھائی اور بہنوں کو بھی تلاش کرنا تھا۔ اس نے اپنا حلیہ ایک ہوٹل کے آئینے میں دیکھا، جس میں چائے پینے گیا تھا۔ اس کا حلیہ ایک بھکاری سے بھی بدتر ہو رہا تھا۔ اس کا شیو اور بال بڑھے ہوئے تھے، اس نے سب سے پہلے ایک دستی بیگ خریدا، تین جوڑے، زیر جامے اور چپل خریدیں، پھر اس نے ایک نائی کی دکان پر جا کے شیو اور حجامت بنوائی اور کپڑے تبدیل کیے تو اس کا رنگ روپ ایک تصوراتی محبوب کا ہو گیا تھا۔

پھر وہ مارا مارا پھرتا اور آوارہ گردی کرتا ہوا ایک ایسے محلے میں آ گیا جو اس کی دھندلی یادوں میں مانوس سا تھا۔ اسے ایسا لگا تھا کہ وہ اس محلے میں اپنے پتا جی کے ساتھ لڑکپن میں آ چکا ہے۔ یہاں شاید پتا جی نے مکان لے رکھا تھا اور اس کے گھر والے رہتے تھے۔ وہ اس محلے سے مانوس سا ہے۔ اس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ کاش! اس کے پتا جی مل جائیں۔

پھر وہ محلے کے بازار میں آ گیا کہ شاید کسی دکان دار سے اس کے پتا جی کے بارے میں معلوم ہو جائے۔ اور پھر شاید اس لڑکی کے بارے میں بھی..... یہ اس کا دل کہہ رہا تھا۔ پھر اس نے سموسے پکوڑے تل کے فروخت کرنے والے ایک بوڑھے کو دیکھا جس کی عمر ستر برس کے لگ بھگ ہوگی، اس کی عمر کا اندازہ اس کے سفید براق بالوں اور سفید داڑھی سے ہو رہی تھی۔ چہرے پر جو نقوش اور جھریاں تھیں۔ اس نے خوانچے پر جا کے بوڑھے کو نمسکار کیا اور کہا۔

"بابا! گرم گرم دو سموسے تو دیں.....؟"

بوڑھا سموسے تل رہا تھا۔ جب وہ پکوڑے تل

پکا تو اس نے ایک صاف ستھری پلیٹ میں گرم گرم سموسے رکھ کے...... دوسری پلیٹ میں پودینہ کی چٹنی ڈال کے اس کی طرف بڑھا دی، معاً آکاش کی نظر اس لڑکی پر پڑی وہ جس کی تلاش میں تھا۔ اس نے چونک کے سموسے والے بابا کو اس لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"بابا! کیا آپ اس لڑکی کو جانتے ہیں......؟ کیا نام ہے اس کا......!"

"کیوں نہیں......" بابا سموسے والے نے سر ہلایا۔ "اسے سارا محلہ جانتا ہے۔ اس کا نام کانتا ہے۔ بڑی بدنصیب لڑکی ہے۔ غریب ہونا ہی بڑی بدنصیبی کی بات ہے۔ غریب، حسین اور جوان لڑکیاں عذاب ہو جاتی ہیں...... لوگ انہیں راستے کا مال سمجھتے ہیں......

"کانتا بے چاری ایک سبزی فروش کی بیٹی ہے۔ باپ کا نام بنرجی ہے۔"

سبزی فروش بنرجی کا نام سنتے ہی آکاش لمحے کے لئے سانس لینا بھول گیا۔ پھر اس کے چشم تصور میں بے اختیار اس کی نگاہوں میں اپنی بہنوں شانتی اور کملا کی اٹھارہ برس قبل کے چہرے گھوم گئے۔ پھر اس کا دل اس خیال سے دھڑکنے لگا کہ اب اسے ہر قسم کی خبر سننے کے لئے ذہنی طور پر تیار رہنا چاہئے۔ سموسے والے نے توقف کرکے اپنی بات جاری رکھی۔

"بنرجی کے مالی حالات بد سے بدتر ہونے لگے تو اسے کاروبار چلانا مشکل ہوگیا اور اسے کاروبار کے لئے رقم کی ضرورت تھی۔ کاروبار اس لئے متاثر ہوا تھا کہ وہ دو ماہ سخت بیمار رہا تھا۔ مقروض بھی ہوگیا تھا...... پھر موتی لال نے اس کی مجبوری کمزوری اور ضرورت سے فائدہ اٹھایا...... وہ کانتا کے حسن پر مرمٹا...... تم نے کانتا کو دیکھا...... کس قدر حسین ہے۔ موتی لال نے کانتا کے باپ سے کہا کہ اگر وہ اس کی شادی کانتا سے کردے، وہ نہ صرف اس کا تمام قرض ادا کردے گا۔ بلکہ کاروبار کے لئے دس ہزار روپے بھی دے گا۔ اس وقت کانتا کی عمر سولہ برس کی تھی، کانتا کے باپ نے اس کی بات مان لی۔ موتی لال کی عمر چالیس برس سے زیادہ تھی۔ اگر اس کا باپ مقروض نہ ہوتا تو وہ کبھی بھی قرض کے جال میں پھنستا نہیں۔ موتی لال نے شادی کے بعد بھی اپنی بری عادتیں ترک نہیں کیں...... جوا اور شراب اس کی کمزوریاں تھیں...... اس کے علاوہ اور لڑکیوں، عورتوں سے بھی دل بہلاتا تھا جب کانتا بے مثال حسن کی مالک تھی۔ پھر اس کے شوہر کی بری عادتوں نے اسے تباہ و برباد کردیا...... وہ مالی پریشانیوں کا شکار ہوگیا۔

ایک روز اس نے جوئے میں اپنی بیوی کو داؤ پر لگا دیا۔ وہ بازی ہار گیا۔ پھر اسے ایک رات کے لئے اس جواری کے ہاں جانا پڑا...... کانتا نے جب انکار کیا تو اس نے دھمکی دی کہ اگر وہ نہیں گئی تو اس کے منہ اور جسم کو بے پردہ کرکے تیزاب ڈال دے گا...... آخر اس بے چاری کی غلاظت کے دلدل میں کودنا پڑا...... وہ اسے نہ صرف جسم بیچنے پر مجبور کرتا رہا اور جوئے پر بھی لاتا رہا۔ جب بھی وہ اپنے شوہر کی بات ماننے سے انکار کرتی تو وہ اسے بے لباس کرکے تیزاب کی بوتل دکھا کے دھمکی دیتا۔ چھڑی سے مارتا جس سے اس کے بدن پر نیل پڑ جاتا...... آخرکار لڑکی نے حالات سے سمجھوتہ کرلیا۔ کیوں کہ اس کے سوا چارہ نہیں تھا...... وہ اپنی بیوی کو جسم بیچنے پر مجبور کرتا ہے۔ رات کے اندھیرے میں گاہک آتے ہیں یا پھر وہ گاہک کے ہاں رات میں لے جاکے صبح لے آتا ہے۔ بنرجی مر اپڑوسی تھا۔ آج اس بے چارے کی آتما پرلوک میں بے چین ہوگی...

اس شہر میں کئی محلے ایسے ہیں جہاں غلاظت کے دلدل ہیں...... بے غیرت، بے شرم اور بے ضمیر ہیں، اپنی بہنوں، بیویوں کی شرمناک زندگی پر مجبور کئے ہوئے ہیں۔ انہیں موت بھی تو نہیں آتی ہے...... اس محلے میں ایک نہایت خوب صورت عورت تھی۔ وہ ایک روز بھاگ گئی۔ اس کے شوہر نے مشہور کردیا کہ اسے اغوا کرلیا گیا ہے...... حالاں کہ اصل بات یہ تھی کہ اس کا شوہر بیوی کو گھناؤنی زندگی گزارنے پر مجبور کرتا تھا۔ اس

لئے اس کی بیوی بیس ہزار کی رقم...... ساٹھ لاکھ روپے
کے زیورات لے کر بھاگ گئی۔"

بابا خاموش ہوا تو آکاش نے پوچھا۔ "کاننا
کے بارے میں آپ کو کس نے بتایا؟"

"کاننا نے میری بیوی کو اپنے اعتماد میں لے
کے بتایا ہے۔" بابا نے جواب دیا۔ "بیٹا! میں نے تمہیں
اچھی اور شریف آدمی جان کے بتایا ہے۔ بھگوان کے
لئے کسی سے یہ بات اور راز نہ کہنا......"

آکاش کو یاد آیا۔ بنرجی اس کے چچا کا نام تھا
اور کاننا اس کی بیٹی کا نام...... دونوں بچپن میں بہت شریر
تھے اور ایک دوسرے سے بنتی نہ تھی۔ لیکن اس کے باوجود
وہ دونوں کھیلے بغیر نہ رہتے تھے۔

"دو سموسے اور دے دیں بابا!" اس نے کہا۔
سموسے بہت شاندار اور لذیذ تھے۔ اسے مزا آگیا
تھا۔ کاننا کی دکھ بھری کتھا سن کے اس کا سینہ کٹ کے رہ
گیا تھا۔ پھر اس نے پوچھا۔ "بابا! کیا آپ رام دیال کو
جانتے ہیں جو رنگ پور میں رہتے تھے۔ پھر وہ کلکتہ
آگئے...... وہ بڑے ماہر سنگ تراش تھے......"

"رام دیال......؟" بابا نے چونک کے حیرت
سے اس کی طرف دیکھا۔ ان کے سینے میں جیسے آہوں
کا غبار بھر گیا تھا۔ "وہ بڑے بدنصیب تھے...... وہ
بنرجی کے بڑے بھائی اور کاننا کے تایا تھا۔ وہ بے
چارے یہاں مستقل آباد ہونے کے بعد ساری زندگی
کسمپرسی میں کاٹ دی۔ مالی پریشانیوں نے ان کی
زندگی اور صحت کو بڑا متاثر کیا...... تم انہیں کیسے اور
کیوں کر جانتے ہو؟"

"کیا رام دیال حیات ہیں؟" آکاش ان کی
بات کا جواب دینے کے باوجود ان سے سوال کر دیا۔

"جو نیک اور اچھے کردار کے مالک ہوتے ہیں
ان کا جیون کم ہوتا ہے...... بھگوان انہیں پاپی سنسار سے
اٹھا لیتے ہیں۔" بابا نے بڑے حسرت بھرے لہجے میں
کہا۔ "ان کی دو بڑی لڑکیاں رہ گئی تھیں۔ لڑکے کو بستی
میں کسی نے گود لے لیا تھا۔ وہ وہیں رہ گیا۔ اور اپنے
باپ کو ایسا بھولا کہ اسے نہ تو باپ یاد آتا تھا نہ ماں اور
بہنیں...... وہ طوطا چشم نکلا...... اس صدمے سے ان کو
روگ لگ گیا۔ وہ سات مہینے تک بستر پر پڑے رہے پھر
سورگ باش ہو گئے۔ اگر بیٹا سامنے ہوتا تو شاید وہ
برسوں زندہ رہتے۔"

"اور اماں جی......! میں نے رندھی ہوئی آواز
میں پوچھا۔ "وہ کیسی ہیں؟"

بابا نے چونک کے سر اٹھا کے اس کی پرنم
آنکھوں میں جھانکا تو وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔
وہ بولے۔

"تم کون ہو بچے...... جو بھی بات ہو وہ صاف
صاف بتاؤ۔ محلے میں تین چار اماں جی ہیں...... تم کس
اماں جی کی بات کر رہے ہو؟"

آکاش کو ایسا محسوس ہوا تھا کہ اس کے سینے میں
خلش کا خنجر گھونپ دیا گیا ہو۔ اسے اپنے جذبات پر
قابو پانا ناممکن سا ہو رہا تھا۔ اسے پتا جی کی المناک
موت کی خبر نے نڈھال اور نیم جان کر دیا تھا...... کتنا
افسوس تھا کہ اس کے پتا جی اسے دیکھنے اور سینے سے
لگانے کی حسرت لئے دنیا سے چل بسے...... یہ بڑی تلخ
اور اذیت ناک حقیقت تھی کہ وہ نیلم کے عشق میں اپنے
باپ کو بھلا بیٹھا تھا۔

"تم نے بتایا نہیں کہ تم کون ہو......؟" وہ
آکاش کو ذہنی کشمکش میں مبتلا دیکھ کے بولے۔

اس میں اتنا حوصلہ نہیں رہا تھا کہ وہ بابا کے
سامنے اپنا سر اٹھا سکے۔ وہ نہ صرف اپنے پتا جی کا مجرم تھا
بلکہ اپنا بھی...... وہ کیسے اپنی شرمناک ذات کا اس ہستی
کے سامنے اعتراف کرتا کہ یہ وہی نابکار، ناہنجار، اور خود
غرض بیٹا ہے۔ پھر وہ بولا۔

"ان کے بیٹے کا نام آکاش تھا؟"

"ہاں...... ہاں......" بابا نے سر ہلایا۔ تجسس اور
بے تابی سے سوال کیا۔

"وہ میرا دوست ہے۔" آکاش نے اپنے
امڈتے ہوئے جذبات پر بہ وقت تمام قابو پا کے بولا تو

اس کا لہجہ بے جان سا تھا۔

”کہاں ہے…… تم بتا سکتے ہو؟“ بابا کے لہجے میں اپنائیت کا جذبہ تھا اور وہ جذباتی ہو رہے تھے۔

آکاش کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ اس بنچ پر بیٹھ گیا جو گاہکوں کے لئے تھی۔ پھر وہ بتانے لگا۔

”وہ بستی میں ہی رہتا ہے۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ اب اپنا کیا منہ لے کے جائے گا…… تم سے بڑا شرمسار ہے۔ جب بھی وہ مجھ سے ملتا ہے تو اپنے ماں باپ اور بہنوں کے قصے سناتا رہتا ہے۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میں کولکتہ جا رہا ہوں تو اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اس کے گھر والوں کو ڈھونڈ لاؤں۔ جب میں اسے جا کے بتاؤں گا تو وہ پھر یہاں اپنے گھر والوں سے ملنے آئے گا۔ اس کی ماں میرے لئے بھی میری ماں سے بڑھ کے ہیں…… اور اس کی بہنیں بھی میری بہنوں کی طرح ہیں۔“ لہٰذا مجھے بھی آکاش ہی سمجھ لیا جائے۔ میں انہیں راکھی کا بندھن بھی باندھوں گا۔“

”اچھا…… اچھا۔“ بابا کا چہرہ دمک اٹھا اور اس کی آنکھوں میں طاقتور برقی قمقمے جیسے جل اٹھے۔ پھر یک لخت وہ اور پریشان سا ہو گیا۔ ”لیکن بیٹے! ایک صدمے والی خبر ہے، تمہارا دوست سن کے غم زدہ ہو جائے گا۔“

”کیا خبر ہے بابا……؟!“ آکاش کا دل اندر سے ڈوبنے لگا۔ ”جو خبر بھی ہے سنا دیں۔ میں اپنا دل مضبوط کر لوں گا۔ آکاش بھی یہ غم سہہ لے گا۔ اسے سہنا پڑے گا۔“

”آکاش کی ماں بھی اپنے اکلوتے بیٹے کی جدائی کا صدمہ برداشت نہ کر سکی…… بڑی بیٹی شانتی کی شادی کے بعد وہ بھی اس پاپی سنسار سے ہمیشہ کے لئے روٹھ گئی۔ آؤ تم میرے ساتھ چلو میں تمہیں آکاش بیٹا سمجھ کے گھر لے جاؤں گا۔ تم میرے بیٹے کی طرح آکاش کی بہن شانتی میری بہو ہے…… وہ تم سے مل کے اس طرح خوش ہو گی جیسے تم اس کے بھائی آکاش ہو…… لیکن تم اسے ایک دم سے یہ خوش خبری نہ سنا دینا کہ تم آکاش کے دوست ہو۔“

بابا کے پاس چھ عدد کپ سموسے بچے تھے۔ ایک گاہک آیا تو اسے تل کے دے دیا۔ پھر اس نے اپنا سامان سمیٹا۔ اسے اپنے ہمراہ لے کے اپنے گھر کی طرف روانہ ہوا۔

راستے میں بابا اسے اپنی غربت وفاداری کی کہانی سناتا رہا۔ پھر اس سے کہنے لگا۔

”کاش! میرے پاس پچاس ہزار کی رقم ہوتی۔ اس بازار میں بہت اچھی جگہ جو موقع کی ہے وہاں نکڑ کی دکان کھولوں۔ پھر میرے دلدر دور ہو جائیں گے۔ اور میں مال لگا سکوں گا۔“

”بابا……!“ آکاش نے دل میں انہیں دلاسا دیا۔ ”آپ چنتا نہ کریں، آپ پچاس ہزار کی بات کر رہے ہیں۔ میں آپ کو پانچ لاکھ روپے دوں گا۔ پھر آپ کو اتنی محنت اور مشقت کرنا نہیں ہو گی۔ آخر آپ میری بہن کے سسر جو ہیں۔“

پھر قدرے پس و پیش کے بعد آکاش نے سرگوشی میں آہستگی سے پوچھا۔

”کانتا کہاں رہتی ہے…؟ کیا آپ بتا سکتے ہیں؟“

”اس کا مکان میرے مکان سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر ہے۔“ بابا نے جواب دیا۔ ”جس سے بھی پوچھو کہ کالو میاں کا مکان، کسی سے بھی پوچھ لو۔ شیطان کی طرح وہ مشہور ہے۔ ہر کوئی بتا دے گا۔“

کانتا کی پریشانیوں اور دکھ بھری زندگی کا پس منظر اس کے علم میں آ چکا تھا۔ اس بدنصیب کی بدنصیبی کی کہانی کا آغاز اس کے باپ کے گھر سے ہو چکا تھا…… پھر اس کی سب سے بڑی مصیبت اس کے آوارہ شوہر کی عیاشی اور مفلسی تھی۔ وہ جس راہ پر چل رہا تھا اس کے لئے بے حساب دولت بھی اور قارون کا خزانہ بھی ناکافی تھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ دو ایک مہینے بھی چل نہیں سکتا

تھا۔ اس لئے اس نے کانتا کو ذریعہ آمدن بنالیا۔ اس کے حسن وشباب اور بھرپور جوانی سے فائدہ اٹھا رہا تھا۔ آکاش کانتا کو غلاظت کے دلدل سے نکالنا چاہتا تھا۔ لیکن اس گھناؤنی زندگی سے نجات دلانے کے لئے وہ کانتا سے تنہائی میں ایک بار ملنا چاہتا تھا۔ اسے شوہر سے چھٹکارا دلانا کچھ مشکل نہ تھا۔

اس ذہنی کشمکش میں بابا کا مکان آگیا۔ آکاش کو محسوس ہوا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس محلے میں بڑی نمایاں تبدیلیاں آچکی ہیں۔ یا اجنبی بن گیا ہے اور پہچانا نہیں جاتا ہے۔ لیکن لوگوں کے دلوں میں جو اخلاص، محبت اور جذبے تھے وہ آج بھی بدرجہ اتم موجود تھے۔ جس کا واسطہ اسے بچپن میں پڑتا رہا تھا۔

"آجاؤ بیٹا......! چلے آؤ...... یہ تمہارا گھر ہے۔ سب تمہاری ماں اور بہنیں ہیں۔"

"ماں......؟" ماں کے لفظ نے اس کے کانوں میں رس ٹپکا دیا تھا اور اس کے دل میں ایک کسک سی پیدا کردی تھی...... یہ کیسا انمول، مقدس اور عظیم ترین رشتہ تھا جس سے وہ محروم رہا تھا۔ ماں بھی کیا چیز ہوتی ہے۔ اور اس کا سایہ کیسا گھنا ہوتا ہے...... ماں کی محبت جو سنگلاخ چٹانوں کو موم کردیتے کیسی قدرت رکھتی ہے۔

وہ بابا کے پیچھے پیچھے مکان میں داخل ہوا تو ایک جوان لڑکی جو شرمیلی تھی اور اسے دیکھ کے حیا آلود ہوگئی تھی وہ لپک کے بابا کے پاس آئی اور اس کے سر سے خوانچہ اتارنے میں مدد دینے لگی۔ بابا تیل کا ڈبا، چولہا اور دیگر سامان ایک لکڑی کے صندوق میں رکھ کے اسے منتقل کررہا تھا۔ لڑکی نے اسے تعجب سے دیکھا تو بابا نے کہا۔

"بیٹی شانتی...... انہیں نمسکار کرو۔ یہ صرف میرے نہیں ہم سب کے مہمان ہیں۔"

اس کی بہن شانتی نے اجنبیوں کی طرح لجا کے اسے نمسکار کیا۔

آکاش کے دل میں آیا کہ سارے فاصلے مٹا دے۔ اپنی بہن کو سینے سے لگا کے جذب کرلے۔ وہ چاہتے ہوئے بھی اپنی بہن کو گلے لگانے سے باز رہا۔ کیوں کہ اس کی حالت ایک مجرم کی سی تھی۔ ندامت اور جذبہ محبت اور بے خوفی شرمساری میں ڈھل چکی تھی۔ اس نے اپنی بہن کو محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے اس کے نمسکار کا جواب دے دیا۔

وہ بڑی بے چینی سے اپنی دوسری بہن بملا کو متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ لیکن اس گھر میں اسے ایسی کوئی صورت دکھائی نہیں دی جسے وہ بملا سمجھ لیتا۔

کچھ دیر بعد بابا کا صحت مند، نوجوان اور خوب صورت بیٹا اس کی نظروں کے سامنے کھڑا اسے حیرت اور محبت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اسی وقت اپنے کام سے تھکا ماندہ لوٹا تھا۔ مسرت وشفقت کے باوجود اس کی آنکھوں میں محبت کے ان گنت دیئے جل اٹھے تھے۔ جب بابا نے آکاش سے اس کا تعارف سرگوشی میں کرایا تو اس نے والہانہ انداز میں آکاش کو سینے سے لپٹا کر اس کے گالوں کے بوسے لے لئے۔ اس کا ہاتھ تھام لیا۔

اس وقت تک شانتی کے علم میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ وہ کون ہے اور اس کے بارے میں کوئی خبر لایا ہوں۔ جب وہ اپنے بہنوئی اور شانتی کے شوہر نرنجن سے بات کررہا تھا۔ تب وہ دروازے کی اوٹ میں چھپی کھڑی تھی۔ جب اس نے اپنے بھائی کی فرضی کہانی سنی تو اسے اپنے آپ پر اختیار نہ رہا وہ اندر گھس آئی اور پھر اس نے اپنی نگاہیں آکاش کے چہرے پر مرکوز کردیں۔

"کہاں ہے میرا بھائی بھیا اسے یہاں لے آؤ......" وہ والہانہ محبت سے بولی۔ "میں برسوں سے اس کے لئے ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی ہوں۔ کاش! بھیا! آپ جان سکتے ایک بہن کے دل پر کیا گزر رہی ہے......؟ وہ کیسا ہے؟ کس حال میں ہے......؟ بھگوان کے لئے بتاؤ۔"

آکاش کے دل میں آیا کہ اس سے کہے کہ اس کا بھائی اس کی نظروں کے سامنے کھڑا ہے...... برسوں کی گمشدہ محبت نے آخر اپنی کھوئی ہوئی منزل تلاش کرلی تھی۔ لیکن وہ اسے پہچان نہ سکی۔ ابھی بھی وہ بھٹک ہی رہی تھی۔

"تمہارے بھیا آکاش کسی کام سے شملہ گئے ہوئے ہیں۔" شانتی کے شوہر نرنجن نے کہا۔ ادھر شانتی کی جذباتی کیفیت دیکھ کے آکاش کے دل پر چابک سی لگ رہی تھی۔ نرنجن نے کہا تو اس کے لہجے میں مٹھاس تھی۔ "شانتی! بڑے زور کی بھوک لگ رہی ہے۔ جاکے کھانا تیار کرو...... اور پھر مہمان کو بھی بھوک لگ رہی ہوگی۔"

شانتی فوراً پلٹ کر رسوئی کی طرف بڑھ گئی تاکہ کھانا تیار کرسکے۔

آکاش کو بملا نظر نہ آنے پر تشویش سی ہونے لگی تھی۔ لیکن وہ اس کے بارے میں معلوم کرنے کا حوصلہ نہ کرسکا۔

آخر آکاش سے رہا نہ گیا۔ اس نے ہمت کرکے پوچھ ہی لیا۔

"بابا...... ! کیا بات ہے۔ بملا بہن نظر نہیں آئی۔ کیا وہ کسی کام سے گئی ہوئی ہے۔"

پھر بابا نے شانتی کو آواز دے کر بلایا اور پوچھا۔

"بملا کہاں ہے بیٹی؟ دیر ہوگئی۔ نظر نہیں آرہی ہے۔"

"وہ اپنی ایک قریبی سہیلی کے ہاں ایک تقریب میں گئی ہوئی ہے۔ تھوڑی دیر میں آتی ہوگی۔"

وہ دن ڈوبنے کے بعد دیر تک بملا کی راہ دیکھا رہا۔ وہ لوٹی نہیں تھی۔ اس نے سوچا کہ کیوں نہ وہ کانتا سے مل آئے۔ وہ چہل قدمی کے بہانے نکلا۔ پھر اس نے کانتا کے گھر کا رخ کیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ کانتا کے شوہر کے محلے میں پہنچ گیا۔ کالو میاں کا گھر اس محلے کا بچہ بچہ جانتا تھا۔ وہاں دروازے کے باہر اس نے ایک لمبا چوڑا شخص چارپائی ڈالے بیٹھا ہوا تھا۔ گلی میں نیم اندھیرا تھا۔ وہ چہرے مہرے اور وضع قطع سے نمبری بدمعاش دکھائی دیتا تھا۔ جب وہ قریب پہنچا تو وہ سگریٹ کے لمبے لمبے کش لے رہا تھا۔ وہ شاید نشہ کی سگریٹ پی رہا تھا۔ اس کے منہ سے بو کے بھبکے اڑ رہے تھے۔ اس کی حالت بتا رہی تھی کہ وہ نشے میں دھت ہے۔

"کیا مال کی تلاش میں آیا ہے......" میرے پاس ایسا مال ہے کہ تو نے خواب میں بھی نہیں دیکھا...... سولہ برس کی چھوکری ہے...... تجھے ہر طرح سے خوش کردے گی۔ سو روپے دے دے۔"

چوں کہ آکاش تنہائی میں کانتا سے بات کرنا چاہتا تھا اس لئے غصہ ضبط کرکے سو روپے دے دیئے۔

یہ شخص کالو میاں ہی تھا۔ کانتا کا بے ضمیر، بے غیرت اور ذلیل شوہر، وہ اندر گھس گیا۔

جب وہ دروازے سے گزر کے صحن میں آیا تو سامنے والے کمرے میں اس کی نظر پڑی۔ اس میں روشنی ہورہی تھی۔ اسے بستر پر کانتا بیٹھی ہوئی دکھائی دی۔ آکاش اس کمرے کی طرف بڑھا۔ اس کے قدموں کی آہٹ پاکے اس نے جھکا ہوا سر اٹھایا۔ جیسے ہی اس نے ایک اجنبی کو دیکھا تو اسے لگا کہ یہ کوئی درندہ صفت ہے...... اس کے جو گاہک آتے تھے اور اسے کھلونا بنالیتے تھے۔ وہ درندہ صفت ہی تو ہوتے تھے۔

"چلے جاؤ...... ایشور کے لئے چلے جاؤ......" وہ ہذیانی لہجے میں بولی۔ "آج میرے بدن کا جوڑ جوڑ درد کررہا ہے...... اس لئے کہ میں آج کوئی پھانس کے نہیں لاسکی اور نہ اسے کوئی گاہک ملا...... اس کے پاس شراب پینے کے لئے پیسے نہ ہوسکے۔ اس لئے اس نے آج مجھے خوب مارا...... میرے حال پر رحم کھا کے لوٹ جاؤ۔ میں تمہیں خوش نہ کرسکوں گی۔ تمہارے پیسے برباد ہوجائیں گے۔" وہ دردبھرے لہجے میں کہتی چلی گئی۔

آکاش کو یاد آیا کہ کانتا کے کان کے پاس دو تل تھے۔ روشنی میں وہ تل نظر آتے ہی اس کی طرف بڑھا۔

"کانتا...... ! میری بہن......!" آکاش نے اسے مزید کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا اور سینے سے لگالیا۔

کانتا نے چونک کے آکاش کو حیرت سے دیکھا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ یہ پہلا گاہک جس نے اسے بہن کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ وہ آکاش کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

''کانتا ۔ میں تمہارا چچا زاد بھائی۔۔۔۔ آکاش ہوں۔'' آکاش جذباتی ہوگیا تھا۔

''آکاش بھیا۔۔۔۔!'' اس کی آواز گلے میں رندھ گئی اور اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب امنڈ آیا۔ آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔۔۔۔ یہ لمحات جو جذبے لئے ہوئے تھے وہ اسے متاثر کررہے تھے۔ کانتا کی خوب صورت اور جھیل جیسی آنکھوں میں آنسوؤں کو دیکھ کر اس سے برداشت نہیں ہو پا رہا تھا۔ اس کا سینہ اندر سے جیسے کوئی کاٹ رہا تھا۔ درد کی لہریں رگ و پے میں سرایت کررہی تھیں۔

اپنے خاندانی خون کی حرارت پاکے آکاش کا دل یک بارگی بڑے زور سے دھڑکا۔

اس کے جی میں تو آیا کہ کیوں نہ وہ رسوئی سے چھری اٹھا کے اس ذلیل اور کمینے شخص کے سینے میں نہ صرف بھونک دے بلکہ اس کے جسم کی بوٹیاں کرکے کتوں کو کھلادے۔۔۔۔ یہ حرام زادہ اپنی بیوی کا جسم بیچتا ہے۔ نفسانی خون آشام بھیڑیوں سے اپنی شراب اور ان کی خواہشات کی قیمت وصول کرتا ہے۔ وہ صرف سوچ کے رہ گیا۔ وہ چاہتے ہوئے بھی نہ کرسکا۔ اس لئے کہ ساری مصیبت کانتا پر آجاتی۔

کانتا دبی دبی سسکیوں پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ جیسے اس طرح رونے اور سسکیاں بھرنے کی عادی ہوچکی تھی۔ آنسوؤں کی جھڑی تھمنے لگی۔

چند لمحوں کے بعد ابلتے ہوئے جذبات میں ٹھہراؤ آنے لگا۔

''کانتا۔۔۔۔! تم کہو تو میں اس ذلیل شخص کو لمحوں میں موت کی ایسی عبرتناک سزا دوں کہ زندگی بچا نہ سکے۔'' آکاش نے نفرت، غصے اور کرخت لہجے میں کہا۔

''نہیں۔۔۔۔ آکاش بھیا!'' اس نے چونک کے آکاش کی طرف دیکھا۔ ''میں اس بات کے سخت خلاف ہوں کہ سکون کی دنیا انسانی خون کی بنیادوں پر کھڑا کرنا نہیں چاہتی ہوں۔ اگر میں چاہتی تو بڑی آسانی سے اسے قتل کرکے اس ذلیل شخص سے نجات پالیتی۔ لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔''

''کیا تم اس بات کے لئے تیار ہو کہ میں تمہیں اس شخص سے سدا کے لئے نجات دلادوں اس سے تمہیں خریدلوں۔'' آکاش بولا۔

''ہاں۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن یہ کام تمہارے لئے آسان نہیں ہے۔'' کانتا نے کہا۔ ''اس لئے کہ میں سونے کا انڈا دینے والی مرغی ہوں۔ اس نے میرے باپ سے دس ہزار روپے قرض کے عوض خریدا تھا۔۔۔۔ لیکن بھیا! تم اتنی بڑی رقم کہاں سے لاؤ گے۔ کیا تمہارے نزدیک کوئی اور صورت اور راستہ نہیں ہے؟''

''میرے پاس کچھ غیر مرئی قوتیں ہیں جن کی مدد سے میں تمہارے شوہر کو معذور اور اپاہج بنا سکتا ہوں۔'' آکاش نے جواب دیا۔ ''اسے دس کیا بیس ہزار روپے بھی دے کے خرید سکتا ہوں۔ اگر وہ تیار نہ ہوا تو میں اسے کسی نہ کسی طرح آمادہ کرلوں گا۔ سیدھی انگلی سے گھی نہ نکلا تو ٹیڑھی انگلی سے نکالنا آتا ہے۔''

''مجھے اپنے شوہر سے جتنی نفرت ہے اتنی محبت بھی ہے۔ اس نے مجھے بڑا عرصہ ایک مہارانی کی طرح رکھا اور مجھ سے بے پناہ محبت بھی کرتا رہا تھا۔۔۔۔ بری صحبت، جوا اور شراب نوشی نے اسے تباہ کردیا۔ اب وہ اس قابل نہیں کہ محنت مزدوری کرکے گھر چلا سکے۔ اس لئے وہ میری جسم فروشی کرتا ہے۔ اگر وہ سدھر جائے تو میں محنت مزدوری کرکے عزت سے اور اس کا پیٹ پالتی رہوں گی۔۔۔۔ میں سلائی کڑھائی کے ہنر سے واقف ہوں۔ میری ماں نے مجھے اس میں بڑا ماہر کردیا

ہے۔ اس پیشے سے میں اتنا کما سکتی ہوں کہ عزت سے دو وقت کی روٹی کما سکوں...... میں چاہتی ہوں کہ وہ اتنا لنگڑا ہو جائے کہ چند قدم چلنا بھی اس کے لئے محال ہو جائے۔ اور اس کی قوت گویائی سلب ہو جائے تو وہ نہ تو میرے جسم فروش کر سکے گا۔ کسی بری عادت کا شکار ہو جائے گا۔ سارا دن گھر پر پڑا رہے گا۔"

آکاش نے لمحے کے لئے سوچا کہ کانتا کتنی عظیم اور ہندوستانی لڑکی ہے۔ اس کی زندگی کو کالو میاں نے دو تین برس سے اسے کھلونا بنایا۔ اسے ذلت آمیز زندگی اور گاہکوں کے لئے بستر کی زینت بننے اور سجانے کے لئے مجبور کیا۔ مارتا پیٹتا اور تشدد بھی کرتا تھا اس کی بات نہ ماننے پر...... پھر بھی وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے شوہر کو موت کی بھینٹ چڑھا دیا جائے گا۔ اس کا دل کیسا ہم تھا اور اس کے کونے میں شوہر کے لئے محبت موجود تھی...... اگر ایک مرد ہوتا تو اپنی بیوی کی بدچلنی کو برداشت کرتا...... وہ بڑے جذباتی انداز سے یہ سب کچھ سوچ رہا تھا۔ اسے یقین نہیں آیا تھا کہ کانتا کیسی شوہر پرست عورت ہے۔ اذیت...... تحقیر، تذلیل اور بردہ فروشی کی گرداب میں رہنے کے اسے اپنے شوہر کا خیال تھا...... اب تو اس پر نہ کوئی دباؤ تھا اور نہ کوئی پابندی اور جبر...... اس کے باوجود وہ یہ رشتہ چاہنے کی رزومند تھی۔

وہ ساری رات کمرے میں کانتا کے ساتھ رہا اور سے اپنے گھر کے اور کانتا اپنے اور بابا کے گھر کے بارے میں بتاتی رہی۔ اسے چائے بھی بنا کے پلائی۔ اس نے کالو میاں کو نصف رات کے پیسے دیئے تھے۔ کانتا کی کالی راتوں میں آنے والا یہ پہلا مرد تھا جس نے اسے ہاتھ نہیں لگایا۔ یہ اس کا بھیا تھا جو اس سے محبت بھری باتیں کرتا اور اس کے زخموں پر محبت کے پھاہے رکھتا تھا۔ پھر وہ ریلوے اسٹیشن کے پاس والے سرائے میں آ گیا اور رات صبح تک پرسکون گزری۔

سورج طلوع ہونے سے کچھ دیر پہلے وہ سرائے سے نکلا۔ پھر اس نے ایک ویرانے میں آ کے چیپا کو طلب کیا اور اس سے کہا کہ وہ کانتا کے پتی کو طبی طور پر ایسا مفلوج کر دے کہ چند قدم چلنا بھی دشوار ہو جائے اور اسے سماعت سے محروم کر دے۔

جب وہ کانتا کے گھر کے سامنے سے گزرا تو کالو میاں ایک پیر سے معذور ہو چکا تھا اور سماعت سے محروم بھی...... وہ رو پیٹ رہا تھا۔ اس کے گھر کے سامنے بھیڑ تھی۔ وہ اشاروں کنایوں میں رو رو کے اپنا حال زار سنا رہا تھا۔ جن لوگوں کو اس کی گھناؤنی زندگی کے بارے میں علم تھا وہ خوش تھے۔ لیکن جو لوگ متنفر تھے اس کے کرتوتوں سے وہ بھی خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ ان میں سے کسی کو بھی کالو میاں کی سماعت زار پر ترس نہیں آیا تھا۔ اسے لوگ سہارا دے کر مکان کے اندر لے جا رہے تھے، کانتا کے کہنے پر...... اس نے کانتا کا سامنا نہیں کیا...... لیکن اس نے کانتا کے بشرے سے محسوس کر لیا تھا کہ وہ دل ہی دل میں خوش ہو رہی ہے کہ اب اس کی زندگی میں کبھی بھی جسم فروشی کی رات نہیں آئے گی۔

پھر میں نے چیپا کو طلب کر کے اس سے مشورہ کیا۔ "تم یہ تو بتاؤ کہ میں بابا کی کس طرح مالی مدد کروں...... میں چاہتا ہوں کہ اس کی ضرورت پوری کروں...... وہ پچاس ہزار کی رقم کے سپنے دیکھ رہا ہے لیکن میں پانچ لاکھ رقم سے اس کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔"

"میں ٹھیک دو دن بعد اس کے سپنے میں آ کے کہوں گی کہ وہ بنگال ریلیف کمیٹی کی پانچ لاکھ کی ریفل لاٹری کا ٹکٹ خریدے جو سو روپے کا ہے...... اس کا پہلا انعام پانچ لاکھ روپے نکل آئے گا۔"

"وہ اس گلی میں گھسا ہی تھا جس میں بابا کا مکان تھا۔ اس کی نگاہ بابا کے مکان پر پڑی تو وہ ٹھٹک کے رک گیا۔

بابا کے مکان میں سے شور شرابا کی آوازیں آ رہی تھیں اور اس کا شور گلی میں گونج رہا تھا۔ ...مرد اور عورتوں کا ملا جلا شور تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیسا کہرام ہے۔ جیسے ہی وہ بھیڑ کو چیرتا گھر میں گھسا بابا نے اسے دیکھ کے دروازہ بند کر لیا۔

پہلے تو آکاش یہ سمجھا کہ شاید یہ ہنگامہ اس وجہ سے ہے کہ شانتی کو اس کی اصلیت کا کس طرح علم ہوگیا ہے۔ شاید شادی مرگ سے اس کی حالت بگڑ گئی ہو۔ اس لئے اڑوس پڑوس کے لوگ جمع ہوگئے۔

"کیا ہوا بابا......! خیریت تو ہے!" اس نے پریشان ہوکے سوال کیا۔

بابا نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے اپنا سر کسی مجرم کی طرح جھکالیا۔ ان کے جھریوں دار چہرے پر ندامت کی سرخی کی لہر دوڑ گئی۔ ان کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ وہ رندھی ہوئی آواز میں بولے۔

"کیا بتاؤں بیٹا...... برسوں سے عزت کی جو پونجی میں نے سنبھالے رکھی تھی وہ لٹ گئی۔ ہم اس کی حفاظت نہ کرسکے۔ منہ پر ساری دنیا کی کالک لگ گئی۔ اب تو میں اور میرے گھر والے...... باہر نکلنے اور سر اٹھا کے چلنے کے قابل نہیں رہے۔" وہ سسک پڑے۔

"بابا......! کیا ہوا......؟" اس نے ان کا ہاتھ پکڑ کے کہا۔

"وہ میری بھابھی کی بیٹی کی امانت تھی۔ میں نے وچن دیا تھا کہ اس کی حفاظت کروں گا۔ لیکن میں اس کی رکھشا نہ کرسکا۔"

آکاش کو اس کی الجھن سی ہونے لگی۔ اسے لگا کہ بابا کسی صدمے سے دوچار ہوکے ہذیان بک رہے ہیں، اس کے ذہن میں اندیشوں کے زہریلے سانپ پھنکارنے لگے۔ آکاش نے سوالات کی بوچھاڑ کردی۔

"آپ کس پونجی کی بات کررہے ہیں......! کیا کسی کی امانت تھی۔ ؟ کیا وہ رقم تھی یا زیورات۔ ؟"

"پونجی...... پونجی......" بابا اپنے بال نوچنے لگے۔ "میں رام دیال کو کیا منہ دکھاؤں گا...... میں قابل نہیں رہا ہوں...... میں آکاش کے سامنے جانہ سکوں گا...... اس کی بہن لاپتہ ہے۔ وہ صبح جو گئی تھی اب تک نہیں لوٹی...... نہ ہی اپنی سہیلی کے ہاں پہنچی۔ وہ ایسی لڑکی نہیں کہ کسی لڑکے کے ساتھ بھاگ گئی یا رنگ رلیاں منا سکے۔ .. کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کبھی گھر سے ایک گھنٹہ بھی غائب رہی ہو۔"

"شانتی......؟" آکاش ایک دم سے ہذیانی لہجے میں چیخ کے بولا۔ غم و غصے سے کھولنے لگا۔ "نہیں ایسا تو نہیں کہ وہ کسی لڑکے کے ساتھ بھاگ گئی ہو...... آج کل زمانہ کتنا خراب ہے۔ لڑکیوں کا کوئی بھروسا نہیں رہا ہے۔"

اس وقت شانتی کا شوہر اپنے کمرے سے نکل کے صحن میں آگیا۔ اس نے آکاش کا تلخ لہجہ اور الفاظ سن لئے تھے۔ اسے آکاش کا تلخ لہجہ اور باتیں زہر لگی تھیں۔

اس نے لپک کے آکاش کا گریبان پکڑلیا۔ اس کی آنکھیں بھٹی کی طرح دہک رہی تھیں۔ وہ بگڑ کے برہمی سے بولا۔

"سدھیر کپور ! تم آکاش بھیا کے دوست اور ہمارے مہمان ضرور ہو۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تم بملا کی ذات پر نشتر زنی کرو۔ غریب کی آبرو شفاف و شفاف آئینے کی مانند ہوتی ہے۔ بملا کیا معلوم غنڈوں کے ہتھے چڑھ گئی ہو... وہ بڑی معصوم اور پوتر ہے...... اگر تم نے اس کے بارے میں کسی قسم کے الفاظ استعمال کئے تو میں برداشت نہ کرسکوں گا۔ وہ مجھے اپنی بہن سے بھی زیادہ عزیز ہے۔"

آکاش سکتے میں رہ گیا۔ اسے اپنی سماعت اور نرنجن کے لہجے پر یقین نہ آیا۔ اس نے بابا اور نرنجن کو سدھیر کپور کے نام سے متعارف کرایا تھا کہ وہ آکاش کا ہم جماعت اور محلے میں پڑوسی بھی ہے۔ ایک دوست کے ناتے ہونے کی حیثیت سے اسے حق نہیں پہنچتا تھا کہ ان کے ذاتی معاملات میں مداخلت کرے۔

"میں اس لئے جذباتی ہوگیا تھا کہ آکاش کی بہن میری بھی بہن ہے... مجھے اس بات کا کوئی ادھیکار نہ تھا کہ میں اپنی رائے کا برملا اظہار کرتا...... پلیز! مجھے شما کردیں۔"

آکاش نے اس بات کو محسوس کیا تھا کہ ایک

طرف یہ لوگ جہاں خود دار، باعزت اور تند خو ہیں اور دوسری طرف بے حد سیدھے سادے، بے لوث، مخلص اور سچے بھی ہیں..... آکاش کی معذرت نے ماحول کی بدمزگی کو اور ان کی دل کی کدورت صاف کردی تھی۔ فضا ایسی ہوگئی تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

اس کی رگوں میں لہو ابلنے لگا اور اس کی حالت غم وغصے سے غیر ہورہی تھی..... نہ جانے کیسی بدبختی اور نحوست تھی کہ جس کے عفریت نے اس گھر کی عزت، سکون اور خوش نصیبی پر اپنا سایہ ڈال دیا تھا..... اس کی چچا زاد نوجوان بہن ..... ایک شرابی، ذلیل اور غنڈے کے شکنجے میں جکڑی گئی تھی..... اور پھر اس کی سب سے چھوٹی بہن اس کے پہنچنے سے پہلے اغوا کرلی گئی تھی..... یا نجانے کس کے عشق کے چکر میں بھاگ گئی تھی

شانتی بھی ایسی آسودہ حال دکھائی نہیں دی جس سے اندازہ ہوتا کہ وہ ایک پرسکون اور اطمینان کی زندگی بسر کررہی ہو جس کا اندازہ اسے پژمردہ چہرے اور آنکھوں کی وحشت سے ہوا تھا، اس لئے بابا خوانچہ لگاتے تھے کہ گھر چل سکے اور خود اس کی زندگی کیسی اذیت اور کرب سے گزر رہی تھی۔ وہ در بدر کی خاک چھان رہا تھا..... اس کی نہایت حسین ترین وفاکش بچی کو چھین کے کالی دنیا کے کسی عقوبت خانے میں قید کردی گئی، جہاں وہ اس کے انتظار میں بدترین اور روح فرسا زندگی گزارنے پر مجبور تھی۔

کچھ دیر بعد اس نے فضا قدرے سازگار دیکھ کے بابا سے بملا کے بارے میں پوچھ گچھ کیا تو بابا نے بتایا کہ بملا صبح جس سہیلی سے ملنے گئی تھی وہ وہاں پہنچی ہی نہیں تھی۔ شانتی کے سسرال والوں نے اس وقت جب وہ کانتا کے گھر کی طرف گیا بملا کے اتنی دیر تک واپس نہ آنے کے باعث سہیلی کے گھر بابا نے کسی آدمی کو بھیجا تھا تو یہ پتا چلا کہ بملا آئی نہیں..... پھر بملا کو تلاش کیا گیا..... اس کا سراغ کہیں نہ مل پایا۔

یہ واقعہ آکاش کے لئے رنج وغم کا باعث بنا۔ کلکتہ شہر اس کے لئے بڑا منحوس ثابت ہوا تھا۔ ایک ہی دن میں وہ کئی المناک حادثات کی زد میں رہا۔ اگر شیوناگ معصیت میں ہونے کے متعلق اس نے سنا نہ ہوتا تو یہ سمجھتا کہ یہ شیوناگ کی حرکت ہے۔ لیکن شیوناگ کے تعاقب میں امرتا رانی تھی اس لئے اس کے آنے کا ذرہ برابر امکان نہ تھا۔

پورے گھر میں ایک عجیب سی سوگواری اور وحشت سی ماحول پر مسلط ہوگئی تھی۔ بملا کی پراسرار گمشدگی نے ہر کسی کو ہراساں اور غم زدہ کیا ہوا تھا۔ ان حالات میں اس کا یہاں ایک لمحہ بھی رکنا فضول تھا، کوئی اس کی طرف متوجہ تھا اور نہ اس سے بات کررہا تھا..... اور پھر وہ جلد از جلد چچا کو بلاتا۔ اس کے لئے گھر سے رخصت ہونا بہتر تھا۔ اگر وہ کسی کے علم میں لائے بغیر نکل جاتا تو اس کی روپوشی کو بملا سے تعلق جوڑ دیتی اور اس کے متعلق جانے کیا کیا رائے قائم کی جاتی اور پھر اغوا کا الزام دھر دیا جاتا۔ اور پھر کانتا کو اس ہنگامے کی بھنک پڑگئی تو پھر کانتا آن کے بتادیں کہ یہ آکاش بھیا ہیں جو سدھیر کپور کے پردے میں ہیں۔ کیوں کہ وہ کانتا کو اعتماد میں لے چکا تھا۔

آکاش نے ایک لحظہ میں یہ سوچ کے فیصلہ کیا کہ اس کا یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں ہے۔ کانتا سے انہیں علم ہوجائے گا کہ سدھیر کپور دراصل آکاش بھیا تھے۔ اس لئے کہ اس نے بابا کے گھر میں اور بابا سے بھی وہ سدھیر کپور کی شخصیت سے متعارف ہوا تھا۔ وہ ابھی اپنی شخصیت کو راز رکھنا چاہتا تھا۔

اس نے اندر جا کے بابا کو ساتھ لیا اور صحن میں آگیا۔ اس وقت وہاں کوئی نہیں تھا۔ اس نے وہاں سے رخصت ہونے کی اجازت چاہی تو اس ندامت، پریشانی اور ماحول میں بدمزگی ہونے کے باوجود اسے جانے دینا نہیں چاہتے تھے۔ اس نے ایک لمحے کے لئے سوچا یہاں اسے کسی قیمت پر رکنا نہیں چاہئے۔ پھر اس نے ان سے کہا کہ اس کے چاچی کے ایک دوست یہاں ایس پی ہیں۔ وہ ان سے مل کے بملا کے اغوا کے بارے میں بتائے گا۔ وہ باآسانی بملا کا کھوج لگالیں

گے۔ تب بابا نے اسے بادل نخواستہ جانے کی اجازت دے دی۔

گھر سے نکلتے وقت اس نے شانتی پر ایک الوداعی نگاہ ڈالی جو رسوئی کی طرف جارہی تھی۔ وہ غریب پہلے تو اس خبر سے مسرور ہوگئی تھی کہ اس کا بڑا بھائی زندہ سلامت ہے۔ وہ اس خبر سے پوری طرح سرشار بھی نہیں ہوئی تھی کہ اس کی خوشیوں کو بملا کی اچانک، غیر متوقع اور پراسرار گمشدگی نے تاخت و تاراج کردیا تھا۔ ابھی تک اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی جنہیں وہ ساڑی کے پلو میں جذب کررہی تھی۔ پلو تھا کہ بھیگ چکا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اداسی کے گھرے بادل تیر رہے تھے۔

پھر وہ ایک ہوٹل تلاش کرنے کے لئے چل پڑا۔ اس نے سوچا کہ وہ چمپا سے کہے گا کہ پانچ لاکھ روپے کا بندوبست، کسی اور صورت سے کردے کیوں کہ بابا پر اوران کے گھر پر جو غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا کیا وہ خواب دیکھ کے ٹکٹ خریدیں گے۔ ؟ لیکن اسے امید تھی کہ چمپا انہیں کسی بھی حاقت سے ٹکٹ خریدنے پر مجبور کردے گی۔

ایک درمیانہ درجے کے ہوٹل میں اسے ایک بہت اچھا بستر والا کمرا مل گیا۔ بملا کی پراسرار گمشدگی نے اس کے وجود کو تہہ و بالا کردیا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہورہا تھا کہ اسے جیسے انگاروں پر دھکا دے دیا گیا ہو۔ دوسری طرف اس گھپ اندھیرے میں چمپا امید کی ایک کرن تھی۔ اسے توقع تھی کہ چمپا بملا کا پتا چلالے گی۔

اس نے پہلے تو خوب اچھی طرح غسل کیا۔ اس سے پہلے اس نے شیو بھی کرلیا تھا۔ پھر لباس بدل کے اس نے ویٹر سے چائے منگوائی۔ چائے پینے کے بعد ویٹر برتن لے گیا۔ تب وہ سوچنے لگا کہ اسے اب کیا کرنا چاہئے۔

اس کی جان تمنا نیلم اس سے بچھڑ چکی تھی۔ اس کی نظروں کے سامنے ایسا گھپ اندھیرا تھا کہ نیلم جلد ملنے کے آثار دکھائی نہیں دیتے تھے۔ اس لئے کہ امرتا رانی..... جب تک شیوناگ کو ختم نہ کرلیتی۔ اس مکار اور ذلیل کا وجود جب تک خاک میں نہیں مل جاتا امرتا رانی اسے زندہ چھوڑ کے اس لئے آنا نہیں چاہتی تھی کہ وہ بے حد خطرناک اور موذی تھا۔

پھر اسے کانتا کا خیال آیا تو اس کی آتما نے ایک عجیب سی شانتی محسوس کی تھی۔

اس لئے کہ اس نے اس عظیم لڑکی کو عزت سے زندگی گزارنے کے قابل بنادیا تھا۔ دو تین دن میں شانتی کے گھر میں بہار آنے والی تھی۔ بابا کے نام جب پانچ لاکھ روپے کا پہلا انعام نکلے گا ان کے تمام دلدر دور ہوجائیں گے۔ اب وہ ایک خوش حال اور آسودہ زندگی گزاریں گے۔

لیکن اس کے سینے میں جو خلش کا خنجر پیوست تھا وہ بملا کا تھا۔

آکاش کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کی نوجوان بہن بملا کی روپوشی اور پراسرار گمشدگی بملا کے کردار کی کسی ناپسندیدہ حرکت کا پہلو تھا یا وہ واقعی غنڈوں کا نشانہ بن گئی تھی۔

جب اس کا دل کسی سوال اور بات سے مطمئن نہ ہوا تو اس نے سوچا کہ کیا چمپا کے پاس اس کے سوالوں کا جواب ہوگا۔

ادھر چمپا کا خیال آیا اور ادھر چمپا ہنستی، مسکراتی، چہکتی اور رقص کے انداز میں تھرکتی آگئی تو وہ مبہوت سا ہو کے اسے دیکھتا رہ گیا۔ کیوں کہ وہ جس ہوش ربا حالت میں نمودار ہوئی تھی اس نے آکاش کو مسحور سا کردیا تھا۔ اس کا حسین اور پرشباب گداز جسم اس کے صبر و ضبط کی آزمائش کرنے لگا۔

اس کی محویت کا لطیف اور برما دینے والا تاثر زیادہ دیر قائم نہ رہا۔ چمپا کی نامناسب حالت اور جسم کی دل کشی اور رعنائیاں بے وقت کی راگنی لگیں۔ اس کے بدن پر دھجیاں سی تھیں۔ آکاش برہم سا ہو کے بولا۔

''چمپا.....! تم کبھی ایسی حالت میں نہیں آئیں۔ یہ دعوت اور نظارہ کیوں اور کس لئے؟''

"تم اس وقت بے حد متفکر، پریشان اور بہت ہراساں دکھائی دے رہے ہو۔" وہ مسکرا دی۔ "میری یہ ناقدری......"

"یہ مذاق کا وقت نہیں ہے......" آکاش نے تلخی سے کہا۔ "اس وقت مجھ پر قیامت جو پڑی ہے، تم اس کا اندازہ نہیں کرسکتی۔"

وہ آکاش کے قریب آگئی۔ وہ اس کے چہرے پر ایک لمحے کے لئے جھک گئی۔ پھر اس کی آنکھوں میں جھانکتی ہوئی بولی۔

"میں ایک ایک بات سے باخبر ہوں...... تم اپنی بہن کی پراسرار گمشدگی سے پریشان اور متفکر ہونا...؟ میں تمہیں کیا بتاؤں۔ یہ خبر لانے کے لئے مجھے کیسے جوکھم سے گزرنا پڑا ہے۔"

پھر وہ بڑی بے تکلفی سے بستر پر اس طرح اس کے پاس بیٹھ گئی جیسے کسی پکے پھل کی طرح اس کی جھولی میں ٹپکنا چاہتی ہو۔ اور پھر اسے تیکھی نظروں سے دیکھنے لگی۔

"کیا خبر لائی ہو......؟" آکاش نے اس کی بہکانے والی حرکت کو نظر انداز کرتے ہوئے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"تمہاری بہن بملا کا سراغ مل گیا ہے۔" چمپا نے بڑے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔

یہ خبر اس خوش خبری کی طرح تھی لیکن اس پر کسی بجلی کی طرح گری تھی۔ "کیا خبر لائی ہو؟"

"وہ بدقسمتی سے ایک بدمعاش پجاری شنکر سوامی کے چیلوں کے ہتھے چڑھ گئی ہے۔" چمپا سنجیدہ سی ہوگئی۔ "تمہارا پورا گھرانہ ایک نئی افتاد کا شکار ہوگیا ہے۔ شاید وہ ناگوں کے آسیب کا مسکن بن چکا ہے...... کیوں کہ شنکر سوامی کوئی معمولی اور عام قسم کا پجاری نہیں ہے...... اور بڑی مہان شکتی کا مالک ہے۔ ایسی شکتی کسی کسی پجاری کو نصیب ہوتی ہے...... وہ کوئی دس برسوں سے کالا ناگ دیوتا کے درشن کے لئے تپسیا کررہا ہے۔"

"لیکن میری بہن بملا کا دشمن کیوں...! اس معصوم کو کس لئے اغوا کیا گیا ہے......؟"

"اس لئے کہ اس برس ناگ پوجا کا تہوار ہونے والا ہے...... شنکر سوامی پجاری کو اسی صورت میں کالا ناگ دیوتا کا درشن ہوسکتا ہے، کوئی نہایت حسین، سندری کی بھینٹ دے...... تمہاری بہن بملا سینکڑوں اور ہزاروں میں نہیں بلکہ لاکھوں میں ایک سندری ہے۔ اس لئے اس نے تمہاری بہن کو اغوا کروایا۔ پھر اس نے اس مقصد کے لئے مرہٹہ مندر کمار کے قید خانہ میں پہنچا دیا ہے تاکہ کوئی اس کی بھنک نہ پاسکے۔"

"یہ مرہٹہ مندر کمار کہاں پر واقع ہے؟"

"وہ یہاں سے تقریباً دو تین سو میل کے فاصلے پر ہوگا۔" چمپا اسے بتانے لگی۔ "یہ مندر پانچ ہزار برس قدیم ہے۔ جب مرہٹہ کمار گزرا تھا تو اس نے بنایا تھا...... لیکن آج اجڑا اور ویران پڑا ہوا ہے۔"

اتنی دور کے مندر میں کیوں اسے قید کیا گیا؟

"اس لئے کہ اس کے پاپی چیلے وہیں رہتے ہیں۔ کیوں کہ وہاں ایک خزانہ دفن ہے اس کی حفاظت پر مامور ہیں۔"

"تو تم مجھے ابھی اور اسی وقت وہاں پہنچا دو؟"

"یہ ناممکن ہے۔"

"وہ کیوں۔؟"

"اس لئے کہ وہاں بھانت بھانت کے موذی اور زہریلے سانپوں کی بہتات ہے۔ ان کے ڈر سے کوئی بھول کے بھی قدم نہیں رکھ سکتا۔"

"لیکن اس میں اس قدر ڈر اور خوف کی کیا بات ہے تمہارے لئے......؟ زہریلے ناگ اور سانپ تمہارا بال تک بیکا نہیں کرسکتے... تم وہاں جانے سے ہچکچا کیوں رہی ہو...؟"

"تمہیں بتاتی ہوں...... سنو..." چمپا ایک گہرا سانس لے کے بولی۔ "میں اس کے جال میں کیا پھنسی... مجھ پر کیا گزری! یہ بڑی دردناک کتھا ہے۔"

(جاری ہے)

قوسِ قزح

قارئین کے بھیجے گئے پسندیدہ اشعار

کوئی دور ہے تو کوئی پاس ہے
یہ وقت وقت کی بات ہے
ہم ملتے نہیں تو کیا ہوا
ہماری دعا تو آپ کے ساتھ ہے
(بلقیس خان۔۔۔۔پشاور)

وہ کھیل تھا، مذاق تھا، یا خوف تھا کوئی
اک چال چل کے، اس نے مہرہ بدل دیا
کرتا رہا اسیری کے احساس کو شدید
زنجیر کھول دی، بھی چہرہ بدل دیا
(ساحل دعا بخاری۔۔۔۔بصیر پور)

جاگے جذبات تو پھر دل بھی مچل جائے گا
پیار کی آنچ سے پتھر بھی پگھل جائے گا
یہ تو سچ ہے کہ سورج ہے اجالوں کا امیں
شام ہوتے ہی جو اندھیروں میں ڈھل جائے گا
(محمد اسلم جاوید۔ فیصل آباد)

کہاں وفا کا بدلہ وفا سے دیتے ہیں لوگ
اب تو محبت کی سزا دیتے ہیں لوگ
پہلے تو سجاتے ہیں چاہتوں کے خواب
پھر تعبیروں کو آگ لگا دیتے ہیں لوگ
(ندا غوری لاہور)

کبھی ہمت بھی حوصلے سے ہار گئے
ہم بدنصیب تھے جو ہر کسی سے ہار گئے
عجیب کھیل کا میدان ہے یہ دنیا بھی
کہ جس کو جیت چکے تھے اسی سے ہار گئے
(شرف الدین جیلانی ٹنڈوالہ یار)

دکھ میں گم، تھکی ہوئی ہوں، پاؤں میں چھالے ہیں
ماں، کچھ دیر تیری گود میں سر رکھ کر سو جاؤں میں
جب بھی ساون کے بادل برسائیں، ڈھیروں اداسی
اتنا برسیں آنکھیں کہ ساون کو بھگو جاؤں میں
(سلمیٰ ٹنڈوالہ یار)

میں اک پل بھی اسے بھولوں تو مر جاؤں فراز
اس کے پیار کا پہرہ ہے میری سانسوں پر
(اکبر احمد ٹنڈوالہ یار)

اک ٹوٹی ہوئی زنجیر کی فریاد ہیں ہم
اور دنیا سمجھتی ہے کہ آزاد ہیں ہم
اس دنیا نے ہمیں دیا ہی کیا ہے فراز
کل بھی برباد تھے اور آج بھی برباد ہیں ہم
(انتخاب۔ طاہرہ عبدالغفور جھنڈو)

ہوا کے دوش پہ رکھے ہوئے چراغ ہیں ہم
جو بجھ گئے تو ہوا سے شکایتیں کیسی!
(محسن عزیز۔۔۔۔کوٹھ کلاں)

ہم کریں گے ترک وفا، چلو یوں ہی سہی
اور اگر ترک وفا سے بھی رسوائی نہ گئی
(آصف شہزاد الہ آباد)

ہم سے روشن ہیں زمانے میں وفا کی راہیں
ہم نے دنیا میں جلائے ہیں محبت کے چراغ
(محمد اسحاق انجم۔۔۔۔کنگن پور)

مجھے زندگی کی دعا نہ دے میری زندگی سے بنی نہیں
کوئی زندگی پہ کرے یقین مجھے زندگی پر یقین نہیں
(فیضان ملک۔۔۔۔رحیم یار خان)

وہ میری پہلی محبت وہ میری پہلی شکست
پھر تو پشیمان وفا سو مرتبہ میں نے کیا
وہ ٹھہرتا کیا کہ گزرا تک نہیں جس کے لئے
گھر تو گھر ہر راستہ آراستہ میں نے کیا
(راحل بخاری۔۔۔۔محبوب شاہ)

ہر کسی کو دل کا حال سنانا چھوڑ دیا
ہم نے بھی گہرائی میں جانا چھوڑ دیا
(سہیل ماہین طاہر۔۔۔۔سرگودھا)

چھپ جاتی ہیں آئینہ دکھا کر تیری یادیں
سونے نہیں دیتی مجھے شب بھر تیری یادیں
(عثمان حنیف دلی۔۔۔۔کنگن پور)

میرے چاہنے والے مجھ کو بھول گئے تو کیا
موسم ہو تبدیل تو پتے جھڑنے لگتے ہیں
(طیب کنول۔۔۔۔کنگن پور)

☆☆

آنکھ سے آنسو بے تاب تھے گرنے کے لئے
ہم نے جب قصہ درد کا اسے سنایا ہے
لوٹ آئے ہیں اپنے ہی شہر میں ہم
کسی نے جلتا ہوا چراغ اک بجھایا ہے
گزرے دنوں کا سفر رائیگاں تو نہیں
نئی منزل سے اک جذبہ شوق نیا ہے
دے کے جدائی کا غم مجھے تنہا کردیا
اپنے ہی خیالوں میں ذہن الجھا پایا ہے
ڈھلتے سورج کا منظر دیکھ رہے ہیں ہم جادہ
کسی دوشیزہ کے کاندھے پہ زلفوں کا سایا ہے
(محمد اسلم جاوید...... فیصل آباد)

ہے دعا یاد مگر حرف دعا یاد نہیں
میرے نغمات کو انداز دعا یاد نہیں
ہم نے جن کے لئے راہوں میں بچھایا تھا لہو
ہم سے کہتے ہیں وہی، عہد وفا یاد نہیں
زندگی جبر مسلسل کی طرح کاٹی ہے
جانے کس جرم کی سزا پائی ہے یاد نہیں
میں نے پلکوں سے در یار پہ دستک دی ہے
میں وہ سائل ہوں جسے کوئی صدا یاد نہیں
کیسے بھر آئیں سر شام کسی کی آنکھیں
کیسے صحرائی چراغوں کی ضیاء یاد نہیں
صرف دھندلاتے چراغوں کی ستاروں کی چمک دیکھی ہے
کب ہوا، کون ہوا، مجھ سے جدا یاد نہیں
آؤ اک سجدہ کریں واجد عالم مدہوشی میں
لوگ کہتے ہیں کہ واجد کو خدا یاد نہیں
(پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی...... کراچی)

غریبوں کی یہ دنیا بھی جدا دنیا ہے مولا
مکاں بیچے، مکیں بیچے، ستم یہ کہ بدن بیچے
کوئی اولاد بیچے ہے تو کوئی اس بیتی ماں کو...!
خدایا چند ہی ٹکڑوں میں یہ گل بیچے، چمن بیچے
بھی عزت کو داؤ پہ لگا کے پیٹ بھرتے ہیں!
یہاں کتنے ہی گھر اجڑے، سہاگن نے چلن بیچے
اگر شاعر بھی نہ ہو صاحب ثروت، اثر پھر کچھ نہیں اس کا
قلم بیچے تو ترکاری ملے، اس نے سخن بیچے
یہاں چاندی کے چند سکوں کی خاطر جانیں لیتے ہیں
ہماری مملکت نے اب کہاں علم امن بیچے......؟؟
(عمران فائق...... کامل پور موسیٰ)

میں نے مجبوری میں تلوار اٹھائی سی
ہاتھ بڑھتا ہوا دستار تک آگیا تھا
اب میں خاموش اگر رہتا تو عزت جاتی
میرا دشمن، میرے کردار تک آگیا تھا
عشق کچھ سوچ کے خاموش رہا تھا، ورنہ......!
حسن بکتا ہوا، بازار تک آگیا تھا
عین اس وقت "مقدر" نے بغاوت کردی
جب میں اس شخص کے معیار تک آگیا تھا
میرے اندر کے کسی ہجر نے روکا ہے مجھے......
ورنہ میں عشق کے انکار تک آگیا تھا
رات آنکھوں سے کوئی اشک، بغاوت کرکے
مسکراتا ہوا رخسار تک آگیا تھا!
ہجر، مضبوطی سے عشق کا دامن پکڑے
کوئے وصل سے تختہ دار تک آگیا تھا!
(انتخاب۔ دعا عالم بخاری بصیر پور)

جب بھی اندھیری رات ہوتی ہے
یہی چاندنی یہی تارے میرا ماتم مناتے ہیں
مجھ سے ہمیشہ یہی سوال کرتے ہیں
تمہیں کیوں نیند نہیں آتی!
تمہیں کیوں چین نہیں آتا
تیرے خاموش سے یہ لب بہت کچھ کہہ جاتے ہیں
تیری یہ منتظر آنکھیں نجانے کس کو ڈھونڈتی ہے
تیری غمگین سی حالت
تیری یہ دکھ بھری داستان نجانے کب سناؤ گی
تیرا یوں ہاتھ پھیلانا
اپنی پلکیں جھکا کر یوں خدا سے مانگتے رہنا

بہت اچھا بھی لگتا ہے
تیرے یہ ہاتھ پھیلا کر خدا سے مانگتے رہنا
میرے خاموش سے یہ لب
کچھ بھی نہیں کہہ پاتے
پھر ایک برسات ہوتی ہے
اور اس برسات میں غم کی گھٹا
آنکھوں سے برستی ہے
(بلقیس خان۔ پشاور)

ہم کیسے بدنصیب تھے اپنے یاروں سے روٹھ گئے
موسم ہم سے روٹھے اور ہم بہاروں سے روٹھ گئے
میرے ہاتھوں سے میری قسمت کی لکیریں تک چلی گئیں
کس کو دکھاتے اپنے زخم ہم غم گساروں سے روٹھ گئے
رات بھر کرتے تھے جس سے اپنے دل کی باتیں ساری
وہ چاند ہم سے روٹھا اور ہم ستاروں سے روٹھ گئے
وہ شخص جس کی خاطر ہم نے دنیا والوں سے بغاوت بھی کی
وہ ایک ہم سے روٹھا اور ہم ہزاروں سے روٹھ گئے
وہ اب منائیں بھی تو ہم نہ مانیں گے کبھی
کہ اس ایک شخص کی وجہ سے موسم سارے ہم سے روٹھ گئے
(صبا محمد اسلم۔ گوجرانوالہ)

چمن میں پھول کھلنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی
کسی کے ساتھ رہنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی
نہیں پڑتا کوئی بھی فرق ان کے دور جانے سے
محبت میں تو ملنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی
سلگتی آگ ہو دل میں یا درد ناگہانی ہو
کوئی دل ٹوٹ جانے کی ضرورت ہی نہیں رہتی
بیاں کر دوں بھی خاموش رہ کر حال دل اپنا
کہ آنکھوں کو برسنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی
صلہ کب تک کسی کے پیار میں جلتی رہو گی تم
شمع بن کر پگھلنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی
(شگفتہ ارم درانی۔۔۔۔ پشاور)

اے دل محبت کی ہے تو کچھ نہ کرنا!
لاکھ آئیں گے درد لیکن آنکھ نم نہ کرنا!
ہر کٹھن مرحلہ شوق سے کئے جائیں گے عبور!
بھولے سے تم بھول جانے کا ستم نہ کرنا!
ہم نے تو راہ الفت میں یہی سیکھا ہے!
درد جدائی میں آہ! خدا کی قسم نہ کرنا!
ان کی کج ادائی بے رخی دیکھ کر لگتا ہے!
جیسے ان کی شرست میں ہو کرم نہ کرنا!
رنگ بدلتی رتوں کا کیا ہے اے مری جاں!
ان کو دیکھ کر بھی ادائے موسم نہ کرنا!
وہی امر ہوتے ہیں جو یہ جانتے ہیں صباء
کسی بھی حالات میں محبت کا سر خم نہ کرنا!
(صباء جدان ساغر۔۔۔ کھرڑیانوالہ)

اندھیرے میں جو گھبراؤں مجھے تم یاد آتی ہو
اکیلے میں جو ڈر جاؤں مجھے تم یاد آتی ہو
تیری یادیں ہیں اب سہارا زندگی کا
جہاں بھی میں چلی جاؤں مجھے تم یاد آتی ہو
خلوت ہو یا جلوت ساتھ ہو تم ہر لمحہ میرے
میں جاگوں یا سو جاؤں مجھے تم یاد آتی ہو
میرے گرنے پہ تھامے گا لپک کر کون اب مجھ کو
میں جب بھی لڑکھڑا جاؤں مجھے تم یاد آتی ہو
مجھے معلوم ہے تم اب نہ لوٹو گی کبھی پھر بھی
میں روؤں اشک برساؤں مجھے تم یاد آتی ہو
تمہیں ملنے کو یہ دل ہر گھڑی بے چین رہتا ہے
میں اس کو کیسے سمجھاؤں مجھے تم یاد آتی ہو
(انتخاب: مسز آسیہ اسلم۔ گوجرانوالہ)

اے بھٹکے ہوئے انسان سوچ ذرا کچھ دیر کیلئے
آج وقت تیرے ہاتھ میں کل نکل گیا تو کیا ہوگا؟
آخری وقت کی تو اس کو توبہ بھی نہیں قبول
ڈھیر گناہوں کا لے جائے گا تو کیا ہوگا؟
آج تو دوست تیرے ہیں ساتھ سبھی
کل تو اکیلا رب کے سامنے کھڑا ہوگا تو کیا ہوگا؟
ظالم لوگوں کے ظلم سہہ کر بھی ان کو ظالم نہیں کہتا
اگر مسلمان ایسا ہوگا تو کیا ہوگا؟
غلط کا ساتھ دینے والا سچ نہیں

یہ بات مسلمان سمجھ لیں تو کیا ہوگا؟
اول تو دنیا کو اتنا مضبوط نہ سمجھ لیتا
سب ایک پھونک کی مار ہیں پھر کیا ہوگا؟
(سنبل ماہین ملک۔۔۔۔سرگودھا)

غمزہ نہیں ہوتا کہ اشارہ نہیں ہوتا
آنکھ ان سے جو ملتی ہے تو کیا کیا نہیں ہوتا
جلوہ نہ ہو معنی کا تو صورت کا اثر کیا
بلبل گل تصویر کا شیدا نہیں ہوتا
اللہ بچائے مرض عشق سے دل کو
سنتے ہیں کہ یہ عارضہ اچھا نہیں ہوتا
تشبیہ تیرے چہرے کو کیا دوں گل تر سے
ہوتا ہے شگفتہ مگر اتنا نہیں ہوتا
ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہوجاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا
(انتخاب: عرفان محمود۔۔۔۔بدین ملز)

سرد راتوں کو میرے پاس آتی ہیں تیری یادیں
ہر شب تنہائی میں ستاتی ہیں تیری یادیں
لوٹ کر اب بھی نہ آئے گا تیرے پاس
ہر شب یہی کہہ کر مجھے رلاتی ہیں تیری یادیں
روز و شب تجھے بھلانے کی کوشش کرتا ہوں
تیرا نام لے کر مجھے تڑپاتی ہیں تیری یادیں
میں جب بھی بجھ جاتا ہے تیرے پیار کا دیا
مجھ سے پوچھے بغیر اسے جلاتی ہیں تیری یادیں
عبادت بھلانا چاہتا ہو جس صورت کو
ہر شب مجھے صورت وہی دکھاتی ہیں تیری یادیں
(شرف الدین جیلانی۔ ٹنڈوالہ یار)

دنیا کے دھندلکوں میں روشنی کا در تلاش کرتا ہوں
جو نقش ہو چاہتوں کا پیام بر تلاش کرتا ہوں
اپنے لئے تو کانٹوں کو منتخب کرلیا ہے میں نے!
تمہارے لئے پھولوں کے گجرا تلاش کرتا ہوں!
جو بھردے میرا دامن میں اجالوں کے خزانے!
میں برسوں سے ایسے خاور تلاش کرتا ہوں!

پھر سے پیدا کر وہ حسن و ناز اور ادائے قاتلانہ
میں بھی وہی ذوق نظر تلاش کرتا ہوں
جل چکا ہے رفتہ رفتہ میرا آشیانہ الفت
بیٹھنے کو اب نئے شاخ و شجر تلاش کرتا ہوں
بے مثل تو نہیں ہے یہ پیکر صنم خانہ ساغر
حسن بتاں میں، میں تو بت گر تلاش کرتا ہوں
(علی وجدان ساغر۔۔۔۔کھرڑیانوالہ)

عجیب دور ہے ہر شخص کا یقین ٹوٹا
قسم بھی کھائے تو لگتا ہے آدمی جھوٹا
غریب پھرتا ہے انصاف کو مارا مارا
سفارشوں نے ہے ہر بار ان کا حق لوٹا
کرے نہ شکر کوئی لاکھ نعمتیں پاکر
ذرا سا کم ہو تو کہتا ہے "مقدر پھوٹا"
گیا وہ وقت جس میں صبر بہت تھا پر اب
ہر ایک ہاتھ سے ہے صبر کا دامن چھوٹا
کوئی خفا نہ ہو نصیب سے، دعا ہے میری
منایا ایک کو خبر ہوئی وہ جا روٹھا
(فرحان احمد نصیب۔۔۔کراچی)

سنو جاناں۔۔۔۔!!
جدائی موت ہوتی ہے
کبھی فرصت سے تو دیکھنا چوں کا کرنا تم
کہ جب یہ شجر سے گر کر زمیں پر آن پڑتے ہیں
تو کیسے روندتے جاتے ہیں؟؟
کبھی اندھی رات کے خاموش لمحوں میں
کبھی بے بس، اکیلی، یا دوتا لڑکی کی بھی تم سسکیاں
سننا !
کبھی قطار سے بچھڑی ہوئی کونجوں کے نوحے پر
غور کرنا !
کہ کیسے ایک دوجے کی جدائی پر تڑپ کر بین کرتی
ہیں۔۔۔۔!
کبھی رخصت کے لمحوں میں کسی کی آنکھ سے
ٹوٹتے ہوئے آنسو دیکھنا تم
تو شاید جان پاؤ گے۔۔۔۔!

جدائی موت ہوتی ہے۔
ابھی تم نے محبت کے برستے، بھیگتے موسم نہیں دیکھے ...!
ابھی تم تتلیوں کے رنگ مٹھی میں چھپاتے ہو
ابھی تم مسکراتے ہو جب کوئی جدا ہوتا تو پتا چلے کا جدائی
موت ہوتی ہے
سنو جاناں......!!
جدائی موت ہوتی ہے
جدائی موت ہوتی ہے......

(فیضان فلک ......رحیم یار خان)

تمہارے خواب آنکھوں میں سجانا چاہتا ہوں
تمہاری صورت دل میں بسانا چاہتا ہوں
بے قرار دل کو قرار دینے کیلئے
تمہیں اپنے سینے سے لگانا چاہتا ہوں
آ کر تیری قربت میں جاناں
خوشبو تیرے بدن کی لینا چاہتا ہوں
کھو کر تمہارے حسن میں
خود کو میں بھولنا چاہتا ہوں
لے کر تجھے اپنی بانہوں میں جاناں
تبسم تیرے ہونٹوں سے چرانا چاہتا ہوں
ڈوب کر تمہاری جھیل سی آنکھوں میں
پھر بھی نہ میں ابھرنا چاہتا ہوں
تم سے ملنے کے لئے اے دلبر
میں ہر روز نیا بہانہ چاہوں
دے کر تجھے میں ساری خوشیاں
تمہارے درد و غم خود لینا چاہتا ہوں
(محمد ابراہیم کھوکھر......جہرہ ہٹی)

جب سے بیگم نے مجھے مرغا بنا رکھا ہے
میں نے نظروں کی طرح سر بھی جھکا رکھا ہے
برتنوں آج میرے سر پہ برستے کیوں ہو
میں نے تم کو ہر دم دھلا رکھا ہے
پہلے بیلن نے بنایا میرے سر پہ گومڑ
اور چمٹے نے میرا گال سجا رکھا ہے
سارے کپڑے تو جلا ڈالے بیگم میرے
زیب تن رکھنے کو بنیان بچا رکھا ہے
اے کنوارو! شاد رہو آباد رہو
ہم کو بیگم نے سولی پہ چڑھا رکھا ہے
وہی دنیا میں مقدر کا سکندر ٹھہرا
جس نے خود کو یہاں شادی سے بچا رکھا ہے
پی جا اس مار کی تلخی کو بھی ہنس کر امتیاز
مار کھانے میں بیوی کی قدرت نے مزہ رکھا ہے
(ایس امتیاز احمد......کراچی)

شامل تھا یہ ستم بھی کسی کے نصاب میں
تتلی ملی جو کسی پرانی کتاب میں
دیکھوں گا کس طرح سے کسی کو عذاب میں
سب کے گناہ ڈال دیئے میرے حساب میں
پھر بے وفا کو پھر محبت سمجھ لیا
پھر دل کی ناؤ ڈوب گئی ہے شراب میں
پہلے گلاب اس میں دکھائی دیا مجھے
اب وہ مجھے دکھائی دیا ہے گلاب میں
وہ رنگ آنکھیں وہ دہکتا ہوا شباب
چہرے نے جیسے آگ لگا دی نقاب میں
اس سنگدل کو میں نے تو پکارا تھا بہت
اپنی ہی صدا لوٹ کر آئی جواب میں
(عثمان غنی... پشاور)

اندھیری رات کو یہ معجزہ دکھائیں گے ہم
گر نہ ملا، دل جلائیں گے ہم
ہماری کوہ کنی کے ہیں مختلف معیار
پہاڑ کاٹ کے رستے نئے بنائیں گے ہم
جو دل دکھاتے ہیں تو یہ عزم بھی ملا ہے ہم کو
تمام عمر کسی کا دل نہ دکھائیں گے ہم
بہت نڈھال ہیں، سستا تو لیں گے پل دو پل
الجھ گیا کہیں دامن تو کیوں چھڑائیں گے ہم
اگر ہے موت میں کچھ لطف، بس تو اتنا ہے
کہ اس کے بعد خدا کا سراغ پائیں گے ہم
(عاصمہ رمضان......پنڈ دادن خان)

☆☆

یوں نگاہیں چرانا بری بات ہے
دل کسی کا دکھانا بری بات ہے
تم کو چاہتے ہیں ہم پیار ہم سے کرو
پاس غیروں کے جانا بری بات ہے
جاتے جاتے تسلی تو دیتا مگر
لوٹ کر پھر نہ آنا بری بات ہے
رنج و غم ہی جیون میں ہے دلکشی
دیکھو آنسو بہانا بری بات ہے
بات سن اے فلک، بجلیوں سے ہے
گھر کسی کا جلانا، بری بات ہے
اب تو کہنے لگی ہے، یہ خلق خدا
کام لوگوں کے آنا بری بات ہے
(حکیم خان حکیم خان.....کامل پور موسیٰ)

پانی پہ کاشانے تھے
آخر بہہ ہی جانے تھے
بند کہاں سمانے تھے
ہاتھوں میں پیمانے تھے
آن پڑی تھی مشکل کیا
اپنے بھی بیگانے تھے
تیز ہوا میں تیرے لئے
ہم کو دیپ جلانے تھے
پھیلے ہوئے یادوں کی تیری
تیرے کچھ دیوانے تھے
ہجر میں ان کی اے رانا
سارے رنج اٹھانے تھے
(قدیر رانا.....راولپنڈی)

زمانے کی روش پہچانتا ہو
طبیعت کا تغیر جانتا ہو
خیال اثبات سے لبریز ہو کر
چلے احساس دل میں تیز ہو کر
اسے معلوم ہوں حرفوں کے بھاؤ
نہ چھلی ہوں کسی بھی دل کے گھاؤ

نظر رکھتا ہو اپنے دل پہ ہر دم
سمجھتا ہو ہرا ک انسان کو غم
بنا ہے اس سے انسان کا پیکر
وہی انسان جو ہے الفت کا خوگر
(چوہدری قمر جہاں علی پوری.....ملتان)

اے دوست.....
سنا ہے ہائی منتھ کا پھول
علامت ہے!
افسوس اور دکھ کا
مدفن ہے محبت کا
کہانی ہے جدائی اور تڑپ کی
مثال ہے اپالو کے آنسوؤں کی
دقا ہے حسین ہائی منتھ کی
پر.....
جب تم بنے اپالو
اور.....میں.....
ہائی منتھ.....
تو.....میری
قبر.....سے
ارغوانی پھول
نہیں.....بلکہ
نکلے گا سفید پھول
جو علامت ہوگا
تمہاری میری
پاکیزگی کی داستان
کا.....!
(علینہ ابرو.....لاہور)

در قفس سے برے جب صبا گزرتی ہے
کسے خبر کہ اسیروں پہ کیا گزرتی ہے
تعلقات ابھی اس قدر نہ ٹوٹے تھے
کہ تیری یاد بھی دل سے خفا گزرتی ہے
وہ اب ملے بھی تو ملتا ہے اس طرح جیسے

بجھے چراغوں کو چھو کر ہوا گزرتی ہے
یہ اہل ہجر کی بستی ہے احتیاط سے چل
مصیبتوں کی یہاں انتہا گزرتی ہے
یہ پوچھ اپنی انا کی بجائے محسن
در قبول سے بچ کر دعا گزرتی ہے
(انتخاب: زاہل بخاری.....مجیب شاہ)

خاموش آسمان
مایوس پرندے
ویران وادیاں
سرد عالم
اور یہ اف!
تمہاری یادوں کا سلسلہ!
اف!!
یہ دسمبر بھی تنہا کیوں
نہیں آتا
(بجیس خان.....پشاور)

تپتی دھوپ میں چلتے چلتے ننگے پاؤں
تھوڑی دیر کو رک کر اور.....
اوپر آسمان کی وسعتوں سے
برستی تپش اور گرمی کو
اپنی ناراضگی بھری آنکھوں سے
تکتے.....ہوئے
اک لڑکی تپتی دھوپ میں
ننگے پاؤں سوچتی ہے اور
شکوہ کناں ہے
یہ دشمنی میری زندگی کا
اندھیرا تو دور نہ کر سکی
لیکن اب
مجھے اک نہ ختم ہونے والی
پیاس ضرور دے گئی ہے
علی ایک لڑکی
تپتی دھوپ میں

بچے چلتے تھے پاؤں
(علی صبا ۔۔۔ حیدرآباد)

ہم چھوڑ چلے ہیں محفل کو
یاد آئے تو مت رونا
اس دل کو تسلی دے لینا
گھبرائے بھی تو مت رونا
اک خواب سا دیکھا ہے ہم نے
جب آنکھ کھلی تو ٹوٹ گیا
یہ پیار تمہارا سپنا بن کر ۔۔
تڑپے بھی تو مت رونا.....
جیون کے سفر میں تنہائی
ہم کو زندہ نہ چھوڑے گی
مرنے کی خبر دوستو!
مل جائے تو مت رونا ۔۔
(ایم عبداللہ ۔۔ اٹک)

ترک تعلق کے بعد آرام کہاں
بیتے ہوئے وہ صبح شام کہاں
یاد ماضی عذاب ہے یارو
گزرے ہوئے منظر و ایام کہاں
پوچھتی ہیں مجھ سے وہ راہیں
چلے ہو تم بھی دو گام کہاں
کچھ یاد ہیں بچی یادیں تجھے
ریت کے گھروندے در بام کہاں
میں تو مفلس ہوں یقین کرو
تو کہاں، اب تیرا انجام کہاں
(محمد اسحاق انجم ۔۔ کنگن پور)

اتر ہی گیا
یہ بھوت کا عشق
نہیں یہ تو میری روح میں اتر گیا
وہ مجھے اچھا لگا
دل کو بھی سچا لگا

پھر نہیں بس ہو گیا
پیار جیسے کھو گیا
عشق ہم کو ہو گیا
دل میں بس وہ ہو گیا
سب کچھ ہم بھول گئے
دل میں اس کو یاد رکھا
مگر اس نے کہا
جاؤ ہم عشق نہیں کرتے
کہیں کسی اور سے دل لگاؤ
مگر یہ بھوت کا عشق
اتر ہی گیا،
ہماری روح میں
بس اس کو اپنے
روح کے اندر اتار دیا
(عثمان غنی ۔ پشاور)

کمال کا ضبط ہے میں خود کو آزماؤں گا
اپنے ہاتھوں سے اس کو ڈولی میں بٹھاؤں گا
وقت رخصت اسے مسکرا کر وداع کروں گا
جاتے ہی اس کے آنسوؤں کو میں بہاؤں گا
سپرد کر کے اسے اسکے جانشینوں کو
میں خود گھر کے اندھیروں میں لوٹ جاؤں گا
شام کے سائے میں منڈیر پر بیٹھ کر
اداس لمحوں میں کھو سا جاؤں گا
کاظمی اس کے سامنے نہ میں غم زدہ ہوں گا
جاتے ہی اس کے زندگی سے روٹھ جاؤں گا
(سید عبادت کاظمی ۔ ڈیرہ اسماعیل خان)

روتے روتے ہنس پڑتی ہیں
ہنستے ہنستے دل میں ہی رو لیتی ہیں
خوشی کی خواہش کرتے کرتے
خواب اور خاک میں اٹ جاتی ہے
گھر کے دروازے پر بیٹھی امیدوں
کے ریشم بنتے

ساری عمر گنوا دیتی ہے
میں جو گئے دنوں میں ماں کی خوشی تھی
پر بنس دیتی
اب خود بھی دیوار سے ٹیک لگائے فصل
خوشی بوتی ہوں
اور خوشی بھی کاٹ رہی ہوں، جانے
کیسی رسم ہے زمانے کی
ہر ماں ورثے میں بیٹی کو
اپنا مقدر دیتی ہے!
(افشاں رمضان ۔۔ سرگودھا)

سوچنا چھوڑ دو عمل کرنا سیکھو
محبت کیلئے تم ہاتھ بڑھانا سیکھو
گلے لگا کر مجھے آنسو بہانا سیکھو
دوستی کرنا ہو تو دل لگانا سیکھو
نفرتیں دل کی انہیں مٹانا سیکھو
قربتیں قائم کرو فاصلے ہٹانا سیکھو
نظارۂ قدرت چاندنی رات میں دیکھو
عیش بہت کر چکے اب شکر کرنا سیکھو
گزار لی زندگی اندھیروں میں بہت
اب آخری وقت ہے بندگی کرنا سیکھو
(سلیم بیگ ہمدانی ۔ کراچی)

بن بلائے تیرے گھر آ جاتے ہیں
محبت کے ستائے تیرے گھر آ جاتے ہیں
روز خیرات میں ہم کو ملتی ہے ڈانٹ
مگر نظر جھکائے تیرے گھر آ جاتے ہیں
جب حد سے بڑھ جاتا ہے درد جفا گر
درد کو چھپا کے تیرے گھر آ جاتے ہیں
جب اچھلتا ہے دل وہ وہ ہاتھ
دست پا اٹھا کے تیرے گھر آ جاتے ہیں
گناہوں کا جام مختار پینے کے لئے
ساغر کو اٹھائے تیرے گھر آ جاتے ہیں
(سلیم مختار امیر پوری ۔۔ کھروڑپکا)

☆☆

موت کی وادی

شہزادہ جانزیب عباسی

حسن بے مثال خوبرو حسینہ نے اچانک بلی کا روپ دھار لیا اور پھر اس کی گونجدار خونخوار غراہٹیں قرب و جوار کو دہلانے لگیں، پھر اس نے چھلانگ لگائی اور۔۔۔

خوف و ہراس کے گرداب میں بل کھاتی ہوئی ایک ہوس پرست شخص کی سہا دینے والی حقیقی روداد

خاور پلیٹ فارم پر موجود بے تابی سے ٹرین کا انتظار کر رہا تھا۔ آج وہ اپنی تعلیم مکمل کر چکا تھا۔ اور گاؤں اپنی ماں کے پاس جا رہا تھا۔ ٹرین کے آنے میں ابھی کافی وقت تھا۔ وہ بنچ پر بیٹھ کر ماضی کی تلخ یادوں میں کھو گیا۔ اس کے والد ایک کثیر الاشاعت اخبار کے کرائم رپورٹر تھے۔ خاور ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ان دنوں حشمت بیگ کی ٹوہ میں خاور کے والد حامد صاحب لگے پڑے تھے۔ حشمت بیگ جو کہ نہایت ہی امیر کبیر اور اثر رسوخ کا حامل تھا۔ اور ایک فیروز خان نامی شخص نے فنانس کمپنی کھول رکھی تھی، ملک بھر کے لاکھوں لوگوں نے اس کے پاس منافع کی لالچ میں اپنی عمر بھر کی کمائی جمع کروا رکھی تھی۔ پھر ایک روز فیروز خان غائب ہو گیا۔ عوام کے اربوں روپے ڈوب گئے۔ لوگ دیوانوں کی طرح فیروز خان کو ڈھونڈ رہے تھے، جو گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہو چکا تھا۔

حامد کو خاص ذرائع سے معلوم ہوا کہ اس فنانس کمپنی کا اصل مالک حشمت بیگ تھا۔ جبکہ فیروز خان اس کا دست راست تھا۔ اصل مالک کی حیثیت سے حشمت بیگ سے کوئی بھی واقف نہ تھا۔ حامد کو حشمت بیگ کے خلاف ثبوت کی تلاش تھی۔ حامد نے ایک روز حشمت بیگ سے اپنے اخبار کے لئے انٹرویو کا وقت لیا۔ اور اس کی شاندار کوٹھی میں جا پہنچا۔ انٹرویو لینے کے دوران اس نے بڑی ہوشیاری سے جس صوفے پر وہ خود بیٹھا تھا، اس کی پشت پر چپکنے والی مائیکرو چپ نصب کر دی۔ یہ جدید ترین حساس ڈیوائس تھی جس کی مدد سے وہ اس کمرے میں ہونے والی گفتگو سن سکتا تھا۔ اسی ڈیوائس کی مدد سے وہ جان گیا کہ فیروز خان ملک بھر سے اغوا کی جانے والی خوب صورت لڑکیوں کو منہ مانگی قیمت پر عیاش امراء اور رئیسوں کو فروخت کرتا ہے۔ اس گھناؤنے کاروبار کا سرپرست بھی حشمت بیگ تھا۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے ایک وسیع عمارت لے رکھی تھی، جہاں اغوا کی جانے والی لڑکیوں کو رکھا جاتا تھا۔

ایک روز اس ڈیوائس کے ذریعے اسے معلوم ہوا کہ کچھ دیر بعد حشمت بیگ کو فیروز خان کے اڈے پر جانا ہے۔ یہ ایک سنہری موقع تھا حشمت بیگ کے خلاف ثبوت حاصل کرنے کا۔ جیسے ہی حشمت بیگ کی کار باہر نکلی۔ حامد نے مناسب فاصلہ رکھ کر اس کا تعاقب شروع کر دیا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد حشمت بیگ کی گاڑی ایک کوٹھی کے دروازے پر رکی۔ اس نے ہارن بجایا، گیٹ سے متصل ذیلی کھڑکی سے کسی نے جھانکا۔ اور گیٹ کھل گیا۔ حشمت بیگ کی گاڑی اندر داخل ہوتے ہی گیٹ دوبارہ بند ہو گیا۔

حامد نے اپنی موٹر کار عمارت سے کافی فاصلے پر روکی اور عمارت کی پچھلی سمت جا پہنچا۔ احاطے کی دیوار پھلانگ کر

اندر داخل ہونا کوئی مشکل نہ تھا۔ اندر داخل ہونے کے بعد وہ قطار میں بنے کمروں کی کھڑکیوں کی طرف بڑھا۔ خوش قسمتی سے پہلے کمرے کی سلائیڈنگ ونڈو ہلکی سی کھلی ہوئی تھی اور اندر سے باتوں کی آوازیں آرہی تھی اس نے جھری سے جھانکا۔

کمرے میں حشمت بیگ اس کا دست راست فیروز خان اور دو رائفل بردار موجود تھے۔ ان سے کچھ فاصلے پر ایک خوب صورت لڑکی سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ "اس کے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟" حشمت بیگ نے پوچھا۔

"اس لڑکی نے دو مرتبہ فرار ہونے کی کوشش کی۔ اور کل اسے عابد صاحب نے پسند کیا تھا۔ انہوں نے دو لاکھ روپے بھی ادا کردیئے تھے، لیکن اس نے انکار کرتے ہوئے ہنگامہ کھڑا کردیا اور خودکشی کرنے کی دھمکی دی۔" فیروز خان نے جواب دیا۔

"جب یہ خود ہی مرنا چاہتی ہے تو اسے زندہ کیوں چھوڑ دیا اسے بتاؤ کہ یہاں حکم عدولی کی سزا کیا ہوتی ہے؟" حشمت بیگ سفاک لہجے میں بولا۔

فیروز خان آگے بڑھا اور چیختی چلاتی لڑکی کے کپڑے پھاڑنے لگا، کچھ دیر بعد لڑکی عریاں حالت میں گھٹنوں میں سر دیئے سسک رہی تھی۔ فیروز خان سب کے سامنے اس پر پل پڑا وہ اسے درندے کے ساتھ ساتھ دانتوں سے اس کے جسم کے مختلف حصوں کو کسی وحشی درندے کی طرح نوچ رہا تھا۔

حامد کا خون کھول اٹھا لیکن اس وقت ان سفاک درندوں کو للکارنا اپنی جان گنوانے کے مترادف تھا اس نے اپنا چھوٹا سا ڈیجیٹل کیمرہ نکالا اور تصویریں بنانے لگا۔ کمرہ لڑکی کی چیخوں سے گونج رہا تھا۔ اسے فیروز خان جھنجھوڑ رہا تھا دانتوں سے اس کے جسم کا گوشت نوچ نوچ کر ایک طرف تھوکتا جارہا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد لڑکی کی چیخیں ختم ہوگئیں وہ اپنی عزت اور زندگی دونوں سے محروم ہوچکی تھی۔

اچانک حشمت بیگ چونکا اور کھڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔

"کھڑکی کے پیچھے کوئی ہے؟" وہ چلایا اور حامد اپنا کیمرہ سنبھال کر احاطے کی دیوار کی طرف بھاگا۔ دونوں رائفل بردار احاطے میں پہنچ چکے تھے۔ رائفل برداروں نے گولی چلائی، لیکن ان سے پہلے حامد احاطے کی دیوار پھلانگ کر اپنی گاڑی تک بھاگتا ہوا پہنچا۔ اور تیز رفتاری سے گاڑی دوڑا دی۔ وہ گاڑی چلاتے ہوئے پیچھے دیکھتا بھی جارہا تھا کہ اس کے پیچھے تو کوئی نہیں آرہا تھا لیکن خوش قسمتی سے اسے ایسی کوئی گاڑی اپنے پیچھے نظر نہ آئی جس پر شبہ ہوتا کہ اس کا پیچھا کیا جارہا ہے۔ کچھ دیر بعد وہ اپنے گھر پہنچ گیا۔ "خیریت تو ہے آپ گھبرائے ہوئے نظر آرہے ہیں۔" حامد کی بیگم ثریا نے پوچھا۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ میں ذرا اپنے کمرے میں جارہا ہوں، ایک خصوصی رپورٹ تیار کرنی ہے۔" اس نے کہا اور اپنے کمرے میں جاتے ہی لیپ ٹاپ کے سامنے جا بیٹھا۔ اس کے ہاتھ حشمت بیگ اور فیروز خان کے خلاف ٹھوس ثبوت آچکا تھا۔

ابھی اس نے کام شروع ہی کیا تھا کہ ڈور بیل کی آواز سنائی دی، اس نے جلدی سے ڈیجیٹل کیمرہ میز کے نیچے اپنی مخصوص خفیہ جگہ میں چھپایا اور کمرے سے باہر نکلا۔ اسے شبہ تھا کہ آنے والوں کا تعلق حشمت بیگ سے نہ ہو۔ اس کا یہ شک درست نکلا، لیکن وہ کمرے سے نکلنے میں تاخیر کرچکا تھا۔ ثریا بیگم دروازہ کھول چکی تھی، حشمت بیگ، فیروز خان اور دو مسلح افراد اسے دھکیلتے ہوئے گھر کے اندر داخل ہوچکے تھے۔ "تم نے کیا سمجھا کہ ہماری اصلیت جان جانے کے بعد تم بچ جاؤ گے تمہارا کیمرہ کہاں ہے؟" حشمت بیگ غرایا۔

"میرے پاس کوئی کیمرہ نہیں ہے، تمہیں ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔" حامد نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

"اس کے گھر کی تلاشی لو۔" حشمت بیگ نے حکم دیا اور دونوں رائفل بردار گھر کی تلاشی لینے لگے جبکہ فیروز خان نے ہولسٹر سے پسٹل نکال کر حامد کو گن پوائنٹ پر رکھا ہوا تھا۔

کچھ دیر بعد ہی وہ دونوں رائفل بردار میز کی خفیہ دراز سے ڈیجیٹل کیمرہ نکال کر لاچکے تھے۔ حشمت بیگ نے کیمرہ ان کے ہاتھوں سے لیا اور فیروز خان نے پے در پے کئی فائر کیے، گولیاں حامد کے سینے میں لگیں وہ چیختا ہوا گرا اور چند لمحے تڑپنے کے بعد ساکت ہوگیا۔

ثریا چیختی ہوئی اپنے شوہر کی طرف لپکی، گولیوں کی آواز سن کر آٹھ سالہ عادل بھی کمرے سے باہر آچکا تھا اور پھٹی پھٹی نگاہوں سے خون میں لت پت اپنے باپ کی لاش اور بے دم

قاتلوں کو دیکھ رہا تھا۔ "ہاں میرا خیال ہے ماں اور بیٹے کو بھی اڑادیں۔" فیروز خان سفاک لہجے میں بولا۔

"نہیں اس کی ضرورت نہیں ہم اپنے خلاف ثبوت حاصل کر چکے ہیں۔" حشمت بیگ لاپروائی سے بولا اور اپنے ساتھیوں سمیت ان کے گھر سے باہر نکل گیا۔

حامد کے بہیمانہ قتل کے بعد پولیس نے حشمت بیگ کے اثر رسوخ کی وجہ سے روایتی تفتیش کے بعد فائل داخل دفتر کردی تھی۔

ثریا بیگم ننھے خاور کے ساتھ گاؤں چلی گئی۔ خاور نے گاؤں کے پرائمری اسکول سے پڑھا۔ پھر سیکنڈری اسکول سے میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ اور مزید تعلیم کے لئے شہر کے ایک کالج میں ایڈمیشن لیا۔

آج وہ تعلیم مکمل کرکے گاؤں واپس جارہا تھا۔ ٹرین کے آتے ہی پلیٹ فارم پر ہلچل مچ گئی۔ قلی سامان اٹھانے کے لئے مسافروں کی طرف لپکے۔ خاور کے پاس صرف ایک چھوٹا سا اٹیچی کیس تھا۔ جس میں اس کے کپڑے اور کتابیں تھیں۔ اس نے اٹیچی کیس اٹھایا اور مطلوبہ بوگی میں سوار ہوگیا۔ اس کے اردگرد کی تمام سیٹیں اس وقت خالی تھیں۔ اس نے اٹیچی کیس برتھ پر رکھا اور سیٹ پر بیٹھ گیا۔

کچھ دیر بعد ایک بزرگ جوڑا بوگی میں داخل ہوا اور اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ٹرین چلنے ہی والی تھی کہ دو نوجوان لڑکیاں بوگی میں داخل ہوئیں۔ ایک دبلا پتلا بارہ تیرہ سالہ لڑکا بھی ان کے ساتھ تھا۔ ان میں سے ایک لڑکی دراز قد اور سانولی رنگت کی تھی۔ جبکہ دوسری کھلتی ہوئی گندمی رنگت اور درمیانے قدوقامت کی تھی۔ متناسب جسم، نیلی آنکھیں اور لمبے لمبے براؤن بال، خاور کی نظر ایک بار اس کے چہرے پر پڑی، پھر پلٹنا بھول گئی۔ لڑکی نے اس کی محویت دیکھ کر شرما کر پلکیں جھکالیں۔ اتفاق سے وہ خاور کے سامنے والی سیٹ پر بیٹھی تھی۔

خاور اب بھی دیوانوں کی طرح اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک شرمیلا نوجوان تھا۔ صنف نازک سے دور دور رہتا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں اس لڑکی کی طرف آج اس کا دل کھنچا جارہا تھا۔ اس کی ساتھی لڑکی نے خاور کی محویت بھانپ لی اور مسکرا کر مخاطب ہوئی۔ "لیلیٰ تمہارا مجنوں تمہیں مل گیا۔"

خاور نے جھینپ کر لڑکی کے چہرے سے نظریں ہٹائیں اور کھڑکی سے باہر لہلہاتے کھیتوں اور درختوں کو دیکھنے لگا جو تیز رفتاری سے چلتی ٹرین سے پیچھے دوڑتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

"اپنی چونچ بند رکھو لبنیٰ۔" اس لڑکی نے سانولی لڑکی کو سرگوشی میں ڈانٹا۔

خاور اب بھی کن انکھیوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"کہیں پہ نگاہیں کہیں پہ نشانہ۔" لبنیٰ نامی شریر لڑکی گنگنانے لگی۔

"میں اب تمہیں مار بیٹھوں گی۔" دوسری لڑکی کا چہرہ شرم سے سرخ ہوچکا تھا۔

"لیلیٰ یہ تمہاری جھکی جھکی پلکیں بتارہی ہیں کہ دال میں کچھ کالا ہے بلکہ پوری دال ہی کالی ہے۔" لبنیٰ بدستور شوخ لہجے میں بولی۔ نوعمر لڑکا ان کی گفتگو سے بے نیاز ٹرین سے باہر کے دلفریب مناظر دیکھنے میں مشغول تھا جبکہ بزرگ جوڑا بھی ان کی نوک جھونک سے محظوظ ہورہا تھا۔

لیلیٰ کی نگاہیں بدستور جھکی ہوئی تھیں۔ کبھی کبھار وہ بھی چوری چھپے نظریں اٹھا کر خاور کی طرف دیکھ لیتی تھی۔ کچھ دیر وہ آپس میں مختلف موضوعات پر گفتگو کرتی رہیں۔ ٹرین کی رفتار قدرے کم ہونے لگی تھی۔ شاید کوئی اسٹیشن آنے والا تھا۔ خاور سیٹ سے اٹھا اور دروازے پر کھڑا ہوکر باہر کے مناظر دیکھنے لگا۔

اسی وقت لیلیٰ اور لبنیٰ کی باتوں کی آواز سنائی دی۔ وہ دونوں اسی طرف آرہی تھیں۔ لبنیٰ کی آواز سنائی دی۔ "تم کوئی بچی ہو تمہیں جوائنٹ میں اکیلی نہیں جاسکتیں، تمہیں خود معلوم ہے۔"

"اس سے پہلے میں نے ٹرین کا سفر نہیں کیا، اس لئے مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" لیلیٰ نے جواب دیا وہ ٹوائلٹ کے دروازے تک پہنچ چکی تھیں۔ لبنیٰ خاور کے قریب سے گزرتے ہوئے ہولے سے کھنکھاری۔ خاور گھبرا کر دوبارہ ٹرین سے باہر دیکھنے لگا۔

لبنیٰ نے ٹوائلٹ کا دروازہ کھولا اور کہا۔ "جاؤ اندر" لیلیٰ نے ہچکولے لیتی ٹرین کے ٹوائلٹ میں ڈرتے ڈرتے اپنے قدم رکھے اور اندر سے دروازہ بولٹ کردیا جبکہ لبنیٰ باہر کھڑی شریر نگاہوں سے خاور کی طرف دیکھ رہی تھی، اسی وقت لبنیٰ کا

موبائل فون بجا۔ "جی آنٹی ہم لوگ ٹرین میں ہیں، عاطف بھی ہمارے ساتھ ہے۔" وہ باتیں کرتی ہوئی وہاں سے دور چلی گئی۔ شاید اسے بھی بعض لوگوں کی طرح موبائل فون پر چلتے ہوئے باتیں کرنے کی عادت تھی۔

اچانک خاور چونک پڑا ٹوائلٹ سے لبنیٰ کی گھبرائی ہوئی آواز آرہی تھی۔ "لبنیٰ کی بچی یہ دروازہ کیوں نہیں کھل رہا؟" وہ بولتی جارہی تھی۔ اور ساتھ ہی ساتھ دروازہ پیٹ بھی رہی تھی۔

ٹرین میں عموماً ٹوائلٹ کے دروازے باہر کی طرف کھلتے ہیں۔ لبنیٰ کا زندگی میں پہلی مرتبہ ٹرین میں سفر کرنے کا اتفاق ہوا تھا۔ وہ اسے عام دروازوں کی طرح کھینچ کر اندر کی طرف کھول رہی تھی۔ ادھر لبنیٰ موبائل فون پر باتیں کرتی ہوئی بوگی میں کافی آگے جاچکی تھی۔ خاور کچھ دیر سوچتا رہا، ادھر لبنیٰ کی چیخ و پکار بڑھ چکی تھی۔ مجبوراً وہ دروازے کی طرف بڑھا اور اسے باہر کی طرف کھینچ کر کھولنا چاہا۔ مگر دروازہ پھر بھی نہ کھلا، کیونکہ لبنیٰ دروازہ اندر کی طرف کھینچ رہی تھی جبکہ خاور باہر کی طرف کھینچ رہا تھا۔ آخرکار تنگ آکر خاور نے زوردار جھٹکے سے دروازہ کھینچا دروازہ کھلا اور لبنیٰ دروازے کے ساتھ ہی گھسٹتی ہوئی اس سے ٹکرائی، اس سے پہلے کہ وہ ٹرین کے فرش پر گرتی خاور کی مضبوط بانہوں نے اسے جکڑ لیا۔

وہ گلاب کی طرح نرم و نازک خوشبو میں نہایا ہوا وجود تھا۔ بھلا خاور کیسے گرنے دیتا۔ اس لئے وہ اسے سینے سے لگائے اس کے دل کی بے ترتیب دھڑکنیں سن رہا تھا۔

ادھر لبنیٰ اس کی مضبوط بانہوں کے گھیرے میں سوچ رہی تھی۔ "اس کی گرفت کتنی مضبوط ہے۔" وہ بالکل اس کے سپنوں کے شہزادے کی طرح تھا وہ سوچ رہی تھی۔ "کاش! وقت یہیں تھم جائے اور وہ اس کی بانہوں میں جکڑی رہے۔" وہ سوچتی جارہی تھی۔ اور ساتھ ہی ساتھ شرم سے سمٹتی جارہی تھی۔

"واہ! کیا رومانٹک سین ہے۔" شوخ و چنچل لبنیٰ واپس آکر انہیں ایک دوسرے سے لپٹتے دیکھ کر بولی اور وہ دونوں چونک کر ایک دوسرے سے الگ ہوگئے، اب وہ شرم کے مارے ایک دوسرے کی طرف دیکھ بھی نہیں رہے تھے۔ لبنیٰ ان کی چوری پکڑ چکی تھی۔

"مسٹر یہ میری فرسٹ کزن لبنیٰ علی ہے۔ ہم شہر اپنے کزن کی شادی میں شرکت کرنے گئے تھے اور اب اپنے گھر جارہے ہیں۔ ویسے آپ کا نام کیا ہے؟ جلدی سے بتادیں۔ بیچاری تو شرمارہی ہے۔" لبنیٰ شوخ لہجے میں بولی۔

"م۔۔۔۔۔م۔۔۔۔۔ میرا نام خاور ہے۔" اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں جواب دیا اور اپنی سیٹ کی طرف بڑھ گیا۔

ان کا سفر کافی خوشگوار گزرا، اگرچہ انہوں نے آپس میں کوئی بات نہیں کی، لیکن چوری چھپے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے اور لبنیٰ ان کی اس آنکھ مچولی سے محظوظ ہوتی رہی۔ بزرگ جوڑا ایک اسٹیشن پر اتر چکا تھا۔

"تم دونوں کب تک چور نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہوگے، میں ذرا ٹہل کر آتی ہوں، جب تک گپ شپ کرلو۔" لبنیٰ نے کہا اور سیٹ سے اٹھ کر ایک طرف چلتی ہوئی نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔

چند لمحے ان کے درمیان خاموشی چھائی رہی۔ آخر جرأت کرکے خاور نے پہل کی۔ "میرا تعلق ایک چھوٹے سے گاؤں سراں ہانڈی سے ہے۔ بابا کا میرے بچپن میں ہی انتقال ہوگیا تھا۔ میری امی بہت ہی شفیق اور پیار کرنے والی ہیں۔" وہ بولتے بولتے رک گیا۔ دل کی بات لبوں پر لانے کا حوصلہ جو نہیں تھا۔ "آپ نے کچھ نہیں بتایا اپنے بارے میں۔۔۔۔۔ وہ آپ نہیں، تم مجھے بہت اچھی لگی ہو، سچ تو یہ ہے کہ میرا دل۔۔۔۔۔" وہ کہتے کہتے رک گیا۔

لبنیٰ بلی کی سی چال چلتی ہوئی اتنی خاموشی سے لوٹ آئی تھی کہ انہیں خبر ہی نہ ہوسکی وہ تو اچانک خاور نے اسے دیکھ لیا تھا۔ "کے مسٹر ایک گھنٹے سے خواہ مخواہ ہکلا رہے ہو، سیدھی طرح کہہ کیوں نہیں دیتے کہ آئی لو یو۔" لبنیٰ نے ان کی مشکل آسان کرتے ہوئے کہا اور وہ دونوں جھینپ گئے۔

خاور ان سے بے تکلف ہوچکا تھا۔ ان کا یہ حسین سفر جلد ہی اختتام پذیر ہوگیا۔ راولپنڈی ریلوے اسٹیشن پر وہ ان کے ساتھ ہی پلیٹ فارم پر اترا۔ پلیٹ فارم پر لبنیٰ کے پیرنٹس ریسیو کرنے آچکے تھے۔ وہ ان سے کچھ فاصلے پر تھا۔ خاور نے دیکھا کہ لبنیٰ جاتے جاتے بھی پلٹ کر اسے نم آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے الوداعی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور گاڑی میں سوار ہوگئی۔

خاور کا باقی سفر بور گزرا۔ وہ اپنے گھر اپنے آبائی گاؤں پہنچ گیا۔ ثریا بیگم اپنے بیٹے کو دیکھ کر خوش ہوگئی تھیں۔ اب خاور کے شب و روز گاؤں میں گزرنے لگے۔ لیلیٰ کی جب یاد آتی تو اس کے دل میں عجیب سی کسک اٹھتی۔

خاور نے پولیس ڈپارٹمنٹ میں نوکری کے لئے اپلائی کر رکھا تھا۔ پھر وہ اپنی صلاحیتوں کی بدولت سلیکٹ ہوگیا اور ٹریننگ پر چلا گیا۔ پھر وہ دن بھی آ گیا جب وہ ٹریننگ سے واپس لوٹ رہا تھا۔ اس کی پوسٹنگ بطور اے ایس آئی اسی شہر کے پولیس اسٹیشن میں ہوئی تھی، جہاں اس کے والد قتل کیے گئے تھے۔ اس نے کرائے پر مکان لیا اور ثریا بیگم کو لینے گاؤں روانہ ہوگیا۔

شام کا وقت تھا۔ وہ ٹرین سے اتر کر گاؤں جانے والی بس میں سوار تھا۔ اس کا گاؤں پہنچتے پہنچتے اس بس میں صرف دو مسافر بچے تھے، ایک خود خاور اور دوسری ایک نوجوان برقع پوش لڑکی، آخری اسٹاپ پر وہ دونوں ساتھ ہی اترے۔ خاور لڑکی پر توجہ دیے بغیر اپنی منزل کی طرف چل پڑا۔

"سنیے!" اسے عقب سے ایک مترنم نسوانی آواز سنائی دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا، یہ وہی برقع پوش لڑکی تھی جو اس سے کچھ فاصلے پر کھڑی تھی۔

"جی فرمایئے۔" خاور نے پوچھا۔ خاور کو نہ جانے کیوں اس لڑکی کی آواز شناسا سی لگ رہی تھی۔ اس کی نیلی آنکھیں دیکھ کر اسے لیلیٰ یاد آ گئی۔ اچانک لڑکی نے برقع کا نقاب الٹ دیا۔ خاور کے سامنے جیسے چاند طلوع ہوگیا اور اس پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ یہ اور کوئی نہیں، بلکہ ماہ جبیں اس کی ٹرین کی ہمسفر اس کی زندگی لیلیٰ تھی۔ "لیلیٰ تم؟ اور یہاں؟" وہ حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ اسے وہ خوشگوار لمحہ یاد آ رہا تھا۔ جب لیلیٰ ٹرین میں اس کے سینے سے آ لگی تھی۔ "تم یہاں کیسے؟ اور تمہاری کزن لبنیٰ کہاں ہے؟" خاور نے پوچھا۔

"میرے گھر والے لبنیٰ سمیت ایک ٹریفک حادثے میں انتقال کر گئے، میں تنہا رہ گئی تھی، کچھ اوباش قسم کے لوگ میرے پیچھے پڑ گئے تھے، جن سے میں چھپتی پھر رہی۔ میرا اس دنیا میں کوئی نہیں رہا۔" وہ رونے لگی۔

"پلیز رو مت میرے گھر چلو، میری امی تم سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔" خاور نے کہا اور اسے لے کر گھر پہنچ گیا۔

ثریا بیگم اس کے ساتھ ایک خوب صورت لڑکی کو دیکھ کر حیران رہ گئیں، ان کے استفسار پر خاور نے انہیں لیلیٰ کی روداد سنا ڈالی۔ ثریا بیگم نے لیلیٰ کو گلے سے لگا لیا۔ "آج سے تم میری بیٹی ہو۔"

دوسرے روز وہ شہر چلے گئے، ثریا بیگم ایک جہاندیدہ عورت تھیں، ان کی نظریں ایک دوسرے کے لئے چاہت کو بھانپ گئیں، انہیں وہ پیاری سی لڑکی پسند آ گئی تھی اور پھر انہوں نے سادگی سے ان دونوں کا نکاح پڑھوا دیا۔ شادی والے روز لیلیٰ بہت خوب صورت لگ رہی تھی، شب عروسی میں خاور نے لیلیٰ کا گھونگھٹ اٹھایا۔ اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ شاعر نہیں تھا لیکن اس کے بے مثال حسن کو دیکھ کر شعر کہتا چلا گیا۔

ان کے شب و روز بہت ہی حسین گزر رہے تھے وہ اسے لے کر ہنی مون کی غرض سے ملکہ کوہسار مری گیا۔ ان دنوں برف باری کا موسم تھا۔ انہوں نے اس موسم کو خوب انجوائے کیا۔ خاور نے رہائش کے لئے ایک ہوٹل میں کمرہ لے رکھا تھا۔ اس روز صبح وہ ہوٹل سے نکلے اور مری چیئر لفٹ کی سیر کے لئے گئے۔ لیلیٰ چیئر لفٹ کی سیر سے بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ اس کے بعد وہ برف کے گولے بنا کر ایک دوسرے پر برسانے لگے۔

اچانک خاور چونک پڑا ان سے کچھ فاصلے پر ایک ملنگ ان دونوں کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر تک وہ ملنگ کی نظروں کو نظر انداز کرتا رہا پھر لیلیٰ کو وہیں رکنے کی تاکید کی اور ملنگ کی طرف بڑھا۔ "السلام علیکم بابا جی۔" اس نے ملنگ کے قریب پہنچ کر مودب انداز میں سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔" ملنگ نے اسے سرخ سرخ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"بابا جی میں کافی دیر سے نوٹ کر رہا ہوں کہ آپ ہمیں غور سے دیکھ رہے ہیں۔" خاور نے ہمت کر کے پوچھا۔ نہ جانے اسے اس ملنگ سے کیوں خوف محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی نظروں میں انجانی کشش تھی۔ خاور کے لئے اس سے نظریں ملانا ناممکن تھا۔

"یہ لڑکی کون ہے؟" ملنگ نے اسے گہری نظروں

سے دیکھا۔

"میری بیوی ہے بابا جی۔" خاور نے حیرت سے جواب دیا۔

"سنو بیٹا تم بہت بڑی مشکل میں پھنسنے والے ہو؟"

"کیسی مشکل بابا جی؟" خاور نے پوچھا۔

"مجھے جتنی اجازت تھی تمہیں بتا دیا یہ پتھر اپنے پاس رکھ لو تمہارے کام آئے گا۔" ملنگ نے اپنے چغے سے ایک عجیب ساخت کا پتھر نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا اور اللہ ھو کا نعرہ لگا کر تیزی سے چلتا ہوا نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

خاور اس پتھر کو اپنی جیب میں ڈالتا ہوا لیلیٰ کی طرف بڑھا۔ "کیا ہوا؟" لیلیٰ نے پوچھا۔

"کچھ نہیں ویسے ہی اس ملنگ سے گپ شپ کر رہا تھا۔" خاور نے بہانہ بنایا، وہ اصل بات بتا کر لیلیٰ کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کچھ دیر کی سیر سپاٹے کے بعد وہ ہوٹل کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہوٹل وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا اس لئے انہوں نے یہ سفر پیدل ہی طے کیا۔

اچانک خاور کی چھٹی حس نے اسے خبردار کیا اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کا پیچھا کیا جا رہا ہے۔ اس نے مڑ کر دیکھا ان سے کچھ فاصلے پر ایک جوگی صورت کا شخص چل رہا تھا۔ وہ جوگی دراز قد قوی ہیکل لمبے لمبے بال اور ننگے پاؤں تھا۔ گلے میں مختلف اقسام کی مالائیں تھیں۔

"کیا یہ واقعی ہمارا پیچھا کر رہا ہے؟" یہ جاننے کے لئے خاور نے بلا مقصد ادھر ادھر گھومنا شروع کر دیا، اس کا شک درست نکلا وہ جوگی واقعی ان کا پیچھا کر رہا تھا۔ لیکن لیلیٰ کے سامنے اس نے جوگی سے الجھنا مناسب نہیں سمجھا۔ اور ہوٹل پہنچ گیا۔

شام کے قریب وہ تنہا ہوٹل سے باہر نکلا، اس کا مقصد اس جوگی کو تلاش کرنا تھا۔ لیکن اسے وہ نہ ملا، دوسرے روز وہ ایوبیہ کی چیئر لفٹ کے قریب گھومنے گئے۔ سہ پہر کے قریب اسے وہ جوگی نظر آ گیا۔ وہ ان سے کچھ فاصلے پر موجود تھا۔ اس وقت وہ بندروں کے غول کو کیلے کھلا رہے تھے۔ اس علاقے میں بندر کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ وہ سیاحوں سے ڈرنے کے بجائے ان سے گھل مل جاتے ہیں کیونکہ سیاح انہیں کھانے پینے کی مختلف چیزیں دیتے رہتے ہیں۔

خاور جوگی کی طرف لپکا۔ "میں کچھ روز سے دیکھ رہا ہوں کہ آپ مسلسل ہمارا پیچھا کر رہے ہیں۔" خاور نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "جوان اس لڑکی کا پیچھا چھوڑ دو، میرا خیال ہے یہ تمہاری بیوی ہے۔ لیکن تمہارے لئے بہتر یہی ہے کہ اس سے پیچھا چھڑا لو۔" جوگی نے کہا۔

"تمہارا دماغ تو درست ہے، دوبارہ ایسی بات کی تو تمہارا منہ توڑ دوں گا۔" خاور آپ سے تم پر آ گیا۔

"جوان یہ انسان نہیں بلکہ" جوگی نے کچھ کہنا چاہا۔

"بس خبردار مزید ایک لفظ بھی ادا کئے بغیر تم یہاں سے دفع ہو جاؤ۔" خاور اس پر بگڑ گیا۔

"جوان تم بہت پچھتاؤ گے۔" جوگی اسے دھمکیاں دیتا ہوا ایک طرف چلا گیا۔

خاور کا موڈ خراب ہو گیا تھا، اسے اس جوگی پر غصہ آ رہا تھا۔ اس بار بھی اس نے لیلیٰ کو اصل بات نہ بتائی۔ دوسرے روز وہ واپس اپنے گھر لوٹ آئے۔ خاور نے ڈیوٹی پر جانا شروع کر دیا۔

اس روز بھی خاور ڈیوٹی پر گیا ہوا تھا۔ لیلیٰ اپنے کمرے میں تھی جبکہ ثریا بیگم صحن میں بیٹھی ہوئی تھیں کہ دروازے پر دستک ہوئی، انہوں نے اٹھ کر دروازہ کھولا، دروازے پر ایک جوگی کھڑا تھا۔ گلے میں مختلف اقسام کی مالائیں تھیں، وہ اپنی لال سرخ آنکھوں سے انہیں گھور رہا تھا۔ "ٹھہرو بابا، میں تمہارے لئے کچھ لے کر آتی ہوں۔" ثریا بیگم اسے عام جوگیوں کی طرح بھکاری سمجھ کر بولیں۔

"مجھے تم سے کچھ لینا نہیں بلکہ میں تمہیں اور تمہارے گھر کو بچانے آیا ہوں۔ تم سب کی زندگی خطرے میں ہیں۔ تمہارے اس گھر میں ایک بہت ہی خطرناک جن موجود ہے۔" جوگی کرخت آواز میں بولا۔

"بابا ضرور تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو ہم یہاں سکون سے نہیں رہ رہے ہوتے۔" ثریا بیگم بولیں۔

"میری ساری زندگی چڑیلوں اور جنوں بھوتوں میں گزری ہے۔ میں دور ہی سے ان کی خوشبو سونگھ لیتا ہوں۔ مجھے

اندر آنے دو۔ ابھی سب کچھ تمہارے سامنے آجائے گا۔"

ثریا بیگم اس کی بات سن کر پریشان ہو گئیں، اور ایک طرف ہٹ کر اسے اندر آنے کا اشارہ کیا۔

جوگی نے ابھی گھر میں قدم رکھا ہی تھا کہ لیلیٰ اپنے کمرے سے نکلی اور ثریا بیگم کے قریب آکر کھڑی ہو گئی۔ جوگی کو دیکھ کر اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے جبکہ اسے دیکھ کر جوگی کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "امی جان یہ کون ہے؟" اس نے ناگواری سے پوچھا۔

"بیٹی ان کا کہنا ہے کہ ہمارے گھر میں کوئی خطرناک جن موجود ہے، جو ہمیں نقصان پہنچا سکتا ہے۔" ثریا بیگم نے جواب دیا۔

"امی جان یہ کوئی فریبی ہے نکالیں اسے گھر سے باہر۔" لیلیٰ چلائی۔

"تو کیا سمجھتی ہے۔ مجھ سے بچ پائے گی، میں نے برسوں تپسیا کی ہے۔ اس روز کوہ مری میں میری نظر جیسے ہی تجھ پر پڑی میں جان گیا تو انسان نہیں۔ بلکہ جن زادی ہے، تیری بہتری اسی میں ہے کہ اصل روپ میں آجا...... ورنہ میں تجھے یہیں جلا کر بھسم کردوں گا۔" جوگی قہر آلود لہجے میں بولا۔

"آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں یہ میری بہو ہے۔" ثریا بیگم کے لہجے میں حیرت تھی۔

"یہ ایک جن زادی ہے۔ جس نے انسانی روپ میں آکر چکنی چپڑی باتوں سے تمہارے بیٹے کو پھنسالیا۔"

جوگی کی بات سن کر ثریا بیگم ششدر رہ گئی۔ اور خوف زدہ نظروں سے لیلیٰ کو دیکھنے لگیں۔ "امی اس کی باتوں میں نہ آئیں کالا جادو کرنے والا کسی بھی انسان کا ہمدرد نہیں ہو سکتا۔" لیلیٰ مضطرب لہجے میں بولی۔

"کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ اس کا فیصلہ ابھی ہو جاتا ہے۔" جوگی نے کہا اور اپنے گرد حصار کھینچ کر منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنے لگا۔ شاید وہ کوئی منتر پڑھ رہا تھا۔

لیلیٰ کو ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے اس کی جان نکل رہی ہو۔ اس کے چہرے پر اذیت کے تاثرات نمایاں نظر آنے لگے۔ اس کا سانس رکنے لگا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے کوئی اس کا گلا دبا رہا ہو۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے گلے پر رکھ لئے اور جوگی کی طرف بڑھی، لیکن ٹھٹک کر رک گئی، کوئی نادیدہ قوت اسے آگے بڑھنے سے روک رہی تھی۔ اب وہ اپنی جگہ پر رک کر خوف زدہ نظروں سے جوگی کو دیکھ رہی تھی۔ جو اسے فاتحانہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کوئی منتر پڑھ رہا تھا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" دروازے سے خاور کی آواز سنائی دی۔ وہ گھر کے اندر داخل ہو چکا تھا اور حیرت سے وہ منظر دیکھ رہا تھا۔ ثریا بیگم نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ جبکہ جوگی اب تک منتر پڑھنے میں مصروف تھا۔ اب اس کی آواز بتدریج بلند ہوتی جارہی تھی۔

خاور لیلیٰ کی بدلتی ہوئی کیفیت دیکھ چکا تھا۔ جو ادھر ادھر ڈولتے ہوئے اپنے گلے کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے ہوئے تھی۔ اس کے چہرے پر بے پناہ تکلیف کے تاثرات تھے۔

"بند کرو یہ ڈرامہ۔" خاور طیش میں آکر آگے بڑھا اور جوگی کو ایک طرف دھکیلا۔ جوگی نے اپنے عمل میں خلل پڑتا دیکھ کر غصے سے اسے دیکھا۔ "یہ تم نے کیا کردیا، یہ ایک بہت خطرناک جن ہے۔ میں تم لوگوں کو اس سے بچانے اور اسے قید کرنے آیا ہوں۔"

"بکواس بند کرو۔ اس روز بھی تم نے اس قسم کی بے ہودہ بکواس کی تھی۔ اب اگر تم نے میری بیوی کے بارے میں الٹی بات کی تو میں تمہیں گولی ماردوں گا۔" خاور نے اپنے ہولسٹر سے پسٹل نکال کر اسے دروازے کی طرف دھکیلا تو جوگی نے اسے غصے سے دیکھا اور کوئی منتر پڑھ کر خاور کی طرف پھونکا۔ جو اپنی جگہ پر اطمینان سے کھڑا اسے غصے سے دیکھ رہا تھا۔ جوگی نے اپنے منتر کو بے اثر ہوتے دیکھ کر اپنے لباس میں سے مٹی نما کوئی چیز نکالی اور اس پر کچھ پڑھ کر خاور کی طرف پھینک دیا۔ مگر اس کا یہ ہتھکنڈا بھی ناکام ہو گیا۔ "ناممکن یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ میرا جادو تم پر اثر کیوں نہیں کر رہا۔" وہ حیرت سے بولا۔

"تو ڈھونگی دفع ہو جا یہاں سے۔" خاور نے اس کے منہ پر تھپڑ رسید کردیا تو وہ دروازے کے قریب گرا اور کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھا۔ "تم نے مجھ پر ہاتھ اٹھا کر خود کو اور اپنے خاندان کو مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ اب تم میں سے کوئی بھی نہیں بچے گا۔" جوگی اسے دھمکیاں دیتے ہوئے گھر سے نکل چکا تھا۔

"امی جان ایسے فریبی لوگوں کی باتوں میں نہ آیا

کریں۔" وہ نا گوار لہجے میں بولا اور لیلیٰ کا ہاتھ تھام کر اسے اپنے کمرے میں لے آیا۔ "جان تم ٹھیک تو ہو نا۔" وہ اسے سینے سے لگاتے ہوئے بولا۔

"شکر ہے تم آگئے۔ ورنہ نہ جانے وہ خبیث جادوگر ہمارے ساتھ کیا سلوک کرتا، امی جان بھی اس کی باتوں میں آگئی تھیں۔" لیلیٰ نے کہا۔

"گھبراؤ مت میں امی جان کو سمجھا دوں گا، بلکہ گھر پر کوئی چوکیدار بھی رکھ لوں گا تاکہ آئندہ یہ خبیث مجھے نظر آ گیا تو میں اسے گولی مار دوں گا۔" خاور نے اسے تسلی دی۔

لیلیٰ نے کچھ کہنے کے لئے لب کھولے ہی تھے کہ خاور نے اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر رکھ کر چپ کی مہر لگا دی۔

"کم از کم دروازہ تو بند کر دیں امی جان آ جائیں گی۔" لیلیٰ نے خود کو چھڑاتے ہوئے خمار آلود لہجے میں کہا اور پھر خاور نے دروازہ بند کر دیا اور اسے لئے ہوئے بیڈ پر گر گیا۔

خاور نے دوسرے روز ہی گھر پر چوکیدار رکھ لیا تھا۔ لیکن اس کے بعد جوگی نے ادھر کا رخ نہیں کیا۔ خاور اس کی طرف سے مطمئن ہو گیا تھا کہ اب جوگی ادھر کا رخ نہیں کرے گا اگر کیا بھی تو مسلح چوکیدار اس سے اچھی طرح نمٹ لے گا۔

اس روز خاور شام کے وقت ڈیوٹی سے واپس لوٹ رہا تھا کہ ایک سنسان سڑک پر ایک ہائی روف تیز رفتاری سے اس کی آلٹو کے قریب سے گزری اور ایک نسوانی چیخ سنائی دی۔ اس نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ آلٹو ہائی روف کے قریب ہوتی جا رہی تھی۔ اسی وقت ایک بار پھر نسوانی چیخ سنائی دی۔ اب شک وشبے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ اس نے بھانپ لیا کہ ہائی روف میں کسی لڑکی کو اغوا کر کے لے جایا جا رہا ہے۔ اب لڑکی کی چیخوں کی آواز بھی نہیں سنائی دے رہی تھی۔ شاید اغوا کنندہ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ لیا تھا، یا پھر اس کی چیخ و پکار سے تنگ آ کر اسے کسی طرح بے ہوش کر دیا تھا، اس کی آلٹو لمحہ بہ لمحہ ہائی روف سے قریب آتی جا رہی تھی، پھر ہائی روف کی رفتار بھی تیز ہو گئی۔ وہ بھانپ گئے تھے کہ آلٹو ان کا پیچھا کر رہی ہے۔ پھر ہائی روف کی پچھلی نشست سے کسی نے ہاتھ باہر نکال کر فائر کیا۔

گولی آلٹو کے قریب سے گزری۔ پھر دوسرا فائر ہوا اس بار گولی آلٹو کے بونٹ پر لگی۔ خاور نے ہولسٹر سے پسٹل نکالا اور ہائی روف کے پچھلے ٹائر پر فائر کیا، خوش قسمتی سے گولی نشانے پر لگی۔ ہائی روف کا پچھلا ٹائر دھماکے سے پھٹا اور تیز رفتار ہائی روف ڈرائیور کے کنٹرول سے باہر ہو گئی اور لہراتی ہوئی سڑک کے کنارے نصب بجلی کے پول سے جا ٹکرائی، خاور نے گاڑی روکی اور ایک پول کی آڑ میں مورچہ زن ہو گیا۔ ہائی روف کا دروازہ کھلا اور اس میں سے ایک اسمارٹ سا نوجوان باہر نکلا۔ اس کے ہاتھ میں پسٹل موجود تھا۔ خاور نے گولی چلا دی جو اس شخص کی ٹانگ میں لگی اور وہ چیختا ہوا گر گیا۔ ہائی روف کی کھڑکی سے ایک رائفل کی نال نکلی اور فائر ہوا گولی بجلی کے پول پر لگی، خاور نے بھی جوابی فائر کیا۔ گولی ہائی روف کی کھڑکی سے ہوتی ہوئی دوسری طرف نکل گئی۔ باہر زخمی پڑے شخص کی طرف سے کوئی مزاحمت نہیں ہو رہی تھی۔ شاید وہ زخموں کی شدت سے بے ہوش ہو چکا تھا۔ ہائی روف سے وقفے وقفے سے اس پر فائرنگ ہو رہی تھی۔ خاور پیچھے ہٹتا ہوا پول کی آڑ سے نکلا۔ اور کرالنگ کرتا ہوا ہائی روف کی دوسری طرف جا پہنچا۔

وہ دراز قد ادھیڑ عمر شخص تھا۔ جو اب بھی پول کی طرف وقفے وقفے سے فائر کر رہا تھا۔ پول کی طرف سے مسلسل خاموشی دیکھ کر وہ ہمت کر کے ہائی روف سے باہر نکلا اور اپنے زخمی ساتھی کی طرف بڑھا۔

اسی وقت خاور برق سرعت سے لپکا اور اس کی کنپٹی سے پسٹل کی نال لگا دی۔ "اپنی رائفل خاموشی سے پھینک دو۔" رائفل بردار نے رائفل ایک طرف پھینک دی۔

"اب میری طرف مڑو۔" اس نے دوسرا حکم صادر کیا۔

وہ شخص خاور کی طرف مڑا۔ اس کا چہرہ دیکھتے ہی خاور کے جسم کا سارا خون سمٹ کر اس کی آنکھوں میں اتر آیا۔ وہ کبھی بھی اس چہرے کو نہیں بھول سکتا تھا۔ اس نے اس شخص کو کئی برس پہلے صرف ایک بار دیکھا تھا۔ لیکن وہ چہرہ پوری جزئیات کے ساتھ اس کے ذہن میں نقش تھا۔ یہ اس کے باپ کا قاتل فیروز خان تھا۔

حیرت کے اس جھٹکے نے اسے فیروز خان کی طرف سے غافل کر دیا تھا۔ فیروز خان نے خاور کی اس غفلت سے فائدہ

اٹھایا اور زوردار گن اس کے پسٹل والے ہاتھ پر ماری تو پسٹل اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ ابھی وہ سنبھلا بھی نہ تھا کہ فیروز خان نے اچھل کر اس کے سینے پر جمپ سائیڈ کک رسید کی، خاور ایک طرف جا گرا۔ وہ گرتے ہی پھرتی سے اٹھ چکا تھا۔ لیکن فیروز خان غیر متوقع طور پر ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ خاور اس کے پیچھے دوڑنے والا تھا کہ ہائی روف کی پچھلی نشست سے کسی کے کراہنے کی آواز سنائی دی۔ وہ ہائی روف میں داخل ہو گیا۔ ہائی روف کی پچھلی نشست پر ایک نسوانی وجود پڑا ہوا تھا۔ وہ کراہتے ہوئے اٹھی اس کا چہرہ دیکھتے ہی خاور ششدر رہ گیا، وہ لبنیٰ تھی۔ لیلیٰ کی کزن جبکہ لیلیٰ کا کہنا تھا کہ لبنیٰ ایک حادثے میں اس کے والدین کے ساتھ ہلاک ہو گئی تھی، لیکن لیلیٰ نے جھوٹ کیوں بولا تھا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔

"خاور بھائی شکر ہے آپ پہنچ گئے۔" وہ سسکتے ہوئے اس سے لپٹ گئی۔

"کیسی ہو تم؟ اور یہ لوگ تمہیں اغوا کر کے کہاں لے جا رہے تھے؟" خاور اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

"میں سپر مارکیٹ گئی تھی۔ شاپنگ کر کے باہر نکلی اور اپنی کار کی طرف بڑھی ہی تھی کہ ان دونوں نے سرعام مجھے گن پوائنٹ پر اغوا کر لیا۔ یہ مجھے نامعلوم مقام کی سمت لے جا رہے تھے کہ اس سنسان سڑک پر آپ کو پولیس کی وردی میں دیکھتے ہی میں چیخ پڑی۔ دوسری چیخ پر ان میں سے ایک نے میرے سر پر پسٹل کا دستہ مارا اور میں بے ہوش ہو گئی۔ اس خطرناک سچویشن میں بھی آپ کو دیکھ کر مجھے خوشگوار حیرت ہوئی۔ میری کزن لیلیٰ اب تک آپ سے ہونے والی پہلی ملاقات کو نہیں بھولی۔" لبنیٰ اس سے الگ ہوتے ہوئے روانی سے کہتی چلی گئی اور خاور کو حیرت کا دوسرا جھٹکا لگا۔ وہ سوچنے لگا۔ "لیلیٰ میری بیوی تو میرے گھر پر ہے پھر یہ کس لیلیٰ کی بات کر رہی ہے؟"

ابھی خاور نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ پیچھے پڑے زخمی کے کراہنے کی آواز سن کر ہائی روف سے باہر نکلا۔ زخمی ہوش میں آ چکا تھا۔ "چلو اٹھو۔" وہ اس کی خون آلود ٹانگ پر ٹھوکر مارتے ہوئے بولا۔ زخمی شخص اسے گالیاں دیتے ہوئے بمشکل اٹھا۔ "اپنا منہ بند رکھو۔ اب اگر تم نے گالی دی تو میں تمہیں گولی مار دوں گا۔" خاور ٹریگر پر انگلی رکھتے ہوئے بولا۔

"یہ تم اچھا نہیں کر رہے۔ شاید تم مجھے نہیں جانتے۔" زخمی تند لہجے میں بولا، وہ کافی سرکش لگ رہا تھا۔ "فی الحال تو تم پولیس اسٹیشن چلو، وہاں ہم خود ہی جان جائیں گے کہ تم کون ہو؟" وہ اسے دھکیلتا ہوا آلٹو کے قریب لایا اور اسے فرنٹ سیٹ پر دھکیل دیا۔

لبنیٰ پچھلی نشست پر جا بیٹھی اور وہ خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کرنے لگا۔ زخمی کا خون کافی بہہ چکا تھا۔ وہ سیٹ کی پشت سے سر ٹکائے ہوئے ہونے کراہ رہا تھا۔ خاور نے اس کے باوجود بھی ایک ہاتھ سے پسٹل کی نال اس کے پہلو میں رکھی۔ کچھ دیر بعد آلٹو تیز رفتاری سے سڑک پر دوڑنے لگی۔

"مجھے یہیں اتار دیں، گھر والے پریشان ہوں گے۔" لبنیٰ نے پررونق سڑک پر گاڑی کے پہنچتے ہی کہا اور خاور نے گاڑی روک دی۔ "لبنیٰ زندگی رہی تو پھر ملیں گے اور ہاں میں گھر جا کر اپنی بیوی لیلیٰ کو بھی بتاؤں گا کہ آج تم سے ملاقات ہوئی تھی۔" خاور نے کہا اور لبنیٰ کے چہرے پر حیرت کے تاثرات دیکھے بغیر گاڑی آگے بڑھا دی۔

قانونی کارروائی کے بعد زخمی کو اسپتال روانہ کر دیا گیا۔ اسپتال پہنچتے ہی ڈاکٹروں نے زخمی کی دیکھ بھال شروع کر دی۔

زخمی اس وقت اسپتال کے بیڈ پر موجود تھا۔ اس کی ٹانگ سے گولی نکال دی گئی تھی۔ اور وہ ہوش میں تھا۔ اس نے اپنا نام الیاس بیگ بتایا تھا۔ "ہاں تو مسٹر الیاس دو تین روز میں تمہیں یہاں سے ڈسچارج کر دیا جائے گا۔ پھر تم سرکاری مہمان خانے میں ہمارے مہمان ہو گے۔ اگر خود کو مزید ٹوٹ پھوٹ سے بچانا چاہتے ہو تو سب کچھ صاف صاف بتا دو کہ فیروز خان کا ٹھکانہ کہاں ہے اور تم کب سے اس کے ساتھ یہ کام کر رہے ہو؟" اس کے قریب کھڑا خاور بولا۔ دروازے پر دو مسلح سپاہی موجود تھے۔ "مسٹر اے ایس آئی تمہارے افسران اعلیٰ صبح شام ہمارے پاس سلام کرنے آتے ہیں تم کس کھیت کی مولی ہو۔ اب تک میرے باپ کو اطلاع پہنچ چکی ہوگی اور اس کے آتے ہی تمہیں پتہ چل جائے گا کہ تم نے کتنی سنگین غلطی کی ہے۔ تم مجھے لاک اپ میں ڈالنے کا خواب دیکھنا

چھوڑ دو۔" الیاس نے استہزائیہ انداز میں کہا۔

اسی وقت اسپتال کے کمرے میں دو ادھیڑ عمر افراد داخل ہوئے۔ ایک نے وکیل کا کوٹ پہن رکھا تھا اور ہاتھ میں فائلیں تھیں جبکہ دوسرا گرانڈیل شخص قیمتی تھری پیس سوٹ میں تھا۔ وہ الیاس کے بیڈ کے قریب پہنچے۔ "کیسے ہو بیٹا؟" انہوں نے خاور کو قطعی طور پر نظر انداز کر دیا تھا۔ گویا اس کی ان کی نظر میں کوئی اہمیت ہی نہ تھی۔

دوسرے شخص کو دیکھ کر خاور کا خون کھول اٹھا۔ وہ حشمت بیگ تھا۔ "یہ سب کیا دھرا اس پولیس والے کا ہے۔" وہ نفرت سے ہونٹ سکیڑتے ہوئے بولا۔

"نوجوان تم نے اپنی زندگی میں آخری غلطی کی ہے تم شاید مجھے نہیں جانتے، میرا نام حشمت بیگ ہے۔" وہ خاور کا گریبان پکڑتے ہوئے بولا۔

"حشمت بیگ اپنا ہاتھ میری وردی سے ہٹا لو ورنہ اپنے بیٹے کی طرح اسی اسپتال کے کسی بیڈ پر پڑے ہوگے۔" خاور اس کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے درشت لہجے میں بولا۔

اسی وقت خاور کا موبائل فون بجا۔ "کال اٹینڈ کرو، پھر تم خود ہی معافی مانگ کر الیاس کو چھوڑنے پر مجبور ہو جاؤ گے" حشمت بیگ نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

خاور نے کال ریسیو کی۔ "خاور! حشمت بیگ ایک معزز شخص ہیں تم نے بلا جواز ان کے بیٹے کو زخمی کیا ہے۔ فوراً ان سے معافی مانگ کر الیاس کو جانے دو، تاکہ تم کسی بڑی پریشانی سے بچ جاؤ۔" دوسری طرف سے ایس ایس پی ناصر لودھی نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"سر الیاس پر ایک معصوم لڑکی کو سر عام اغوا کرنے کا ثبوت ہے، میں اس لڑکی سے گواہی بھی دلوا سکتا ہوں۔ اس کا ساتھی فیروز خان عادی مجرم ہے، میرے روکنے پر انہوں نے مجھ پر فائرنگ کی، جوابی فائرنگ میں ملزم زخمی ہو گیا اور فیروز خان فرار ہو گیا۔" خاور نے مودبانہ لہجے میں تفصیلات بتائیں۔

"میں کچھ نہیں جانتا، ان سے معافی مانگ کر الیاس کو چھوڑ دو یہ ہائی آرڈر۔" ایس ایس پی غصے سے بولا۔

"سوری سر میں یہ غیر قانونی کام نہیں کروں گا۔ چاہے اس کے نتیجے میں مجھے کچھ بھی بھگتنا پڑے۔" اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ اور رابطہ منقطع کر دیا۔

"حشمت بیگ تمہاری قسمت خراب ہے اس بار تمہارا واسطہ قانون کے اس سپاہی سے پڑا ہے جو فرض کی خاطر جان لے بھی سکتا ہے اور دے بھی سکتا ہے۔ اور ایک بات تمہیں تو میں دیکھتے ہی پہچان گیا تھا مگر تم نے مجھے نہیں پہچانا، میں کرائم رپورٹر حامد مرحوم کا بیٹا ہوں۔ اور جس دن تمہارے خلاف ثبوت ہاتھ میں آیا تو تمہیں گھسیٹتا ہوا اپنے پولیس اسٹیشن کے لاک اپ میں ڈال دوں گا۔"

"اوہ! تو تم حامد کے بیٹے ہو۔ گھبراؤ مت میں جلد ہی تمہیں تمہارے باپ کے پاس بھجوا دوں گا۔ مجھے اندازہ تھا کہ ہو سکتا ہے تمہارے دماغ میں ایمانداری کا کیڑا کلبلا رہا ہو اس لئے میں متبادل انتظام کر کے آیا ہوں، وکیل صاحب اسے ضمانت نامہ دکھائیں۔" حشمت بیگ نے کہا اور وکیل نے فائل سے ضمانت نامہ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

ضمانت نامے پر نظر پڑتے ہی خاور کے چہرے کا رنگ ماند پڑ گیا۔ "مسٹر خاور اپنا خیال رکھنا آنے والا وقت تمہارے لئے کٹھن ثابت ہوگا۔" حشمت بیگ نے سرد لہجے میں کہا۔ اور خاور نے دروازے کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ اب اس کا مزید یہاں رکنا بے فضول تھا۔ وہ کمرے کے دروازے پر موجود سپاہیوں کو پہرہ ختم کرنے کا کہہ کر باہر نکل گیا۔ وہ تھانے میں پہنچا اور کافی دیر تک اپنے کمرے میں اداس بیٹھا رہا۔ اس کی سمجھ میں قانون کا دہرا معیار نہیں آ رہا تھا۔ غریب لوگ بے گناہ سالوں جیلوں میں سڑتے رہتے جبکہ حشمت بیگ جیسے بااثر لوگ اثر رسوخ کی وجہ سے قانون کی پہنچ سے باہر تھے۔

وہ گھر پر رات نو بجے کے قریب پہنچا تو کافی اداس تھا۔ کھانا بھی اس نے بے دلی سے کھایا اور لیلیٰ کے ساتھ اپنے کمرے میں داخل ہو گیا۔ "کیا بات ہے! آج خلاف معمول خاموش ہو؟" خاور کے بالوں کو سہلاتے ہوئے لیلیٰ نے پوچھا۔

"آج عرصے بعد میرے باپ کے قاتل میرے سامنے آئے لیکن میں انہیں گرفتار نہیں کر سکا کیونکہ میرے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں اور وہ بااثر و رسوخ ہیں۔" خاور نے مایوس کن لہجے میں کہتے ہوئے پہلی بار اسے اپنی روداد سنا ڈالی اور

پھر بولا۔ "تم نے تو کہا تھا کہ تمہارے والدین کے ساتھ حادثہ پیش آیا تھا اور اس حادثے میں لیلیٰ بھی ہلاک ہوگئی تھی، لیکن آج اتفاق سے وہ مجھے ایک سنسان سڑک پر ملی، فیروز خان اور الیاس اسے اغوا کرکے لے جا رہے تھے، میں نے بڑی مشکل سے اسے ان کے چنگل سے بچایا۔ لیکن وہ بہکی بہکی باتیں کررہی تھی، کہہ رہی تھی کہ لیلیٰ پہلی ملاقات کے بعد سے مجھے ہر وقت یاد کرتی ہے اور ہر وقت میری منتظر رہتی ہے۔"

"دراصل اس حادثے میں مجھے سر میں شدید چوٹیں آئی تھیں اور کچھ عرصے کے لئے میں یادداشت کھو بیٹھی تھی، شاید لیلیٰ کے ساتھ بھی کوئی اس قسم کا معاملہ ہو۔" لیلیٰ نے خاور کے ہونٹ چومتے ہوئے کہا۔ پھر تو خاور کو ہوش ہی نہیں رہا کہ لیلیٰ کون ہے؟ اور لیلیٰ نے کیا جواب دیا۔ وہ جذبات کے سمندر میں بہتا چلا گیا۔ کبھی ڈوبتا کبھی ابھرتا ہوا کنارے پر آیا تو تھکن غالب ہو چکی تھی۔ وہ بے خبر سو گیا۔

جب کہ لیلیٰ مضطرب نظر آ رہی تھی، وہ کافی دیر تک کروٹیں بدلتی رہی، نصف شب کے قریب وہ بیڈ سے اتر کر کھڑی ہوگئی۔ اس نے خاور کو غور سے دیکھا وہ بے خبر سو رہا تھا۔ وہ دبے قدموں دروازے کی طرف بڑھی۔ اور چٹخنی کھول کر باہر نکل آئی اسے عجیب سی گھبراہٹ کا احساس ہو رہا تھا۔ کچھ دیر ایک جگہ رک کر اس نے گہرے گہرے سانس لئے اور تازہ ہوا پھیپھڑوں میں اتار کر سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر جا پہنچی، چھت پر جا کر اس نے اردگرد کا جائزہ لیا۔

اچانک اسے احاطے میں کچھ سائے متحرک دکھائی دیئے۔ لیلیٰ نے غور سے دیکھا وہ پانچ افراد تھے جن کے ہاتھوں میں جدید رائفلیں تھیں، وہ چھت سے اتری اور کوریڈور میں چلتی ہوئی دروازے پر جا پہنچی اور اندر سے دروازے کا لاک کھول کر باہر نکل آئی۔ وہ پانچوں رائفل بردار دروازے کے قریب پہنچ چکے تھے۔ لیلیٰ کو دیکھ کر وہ چونک پڑے۔ ان میں سے ایک بولا۔ "الیاس صاحب آج مجھے یقین ہوگیا کہ اوپر والا جب دیتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔ آپ فکرمند تھے کہ اندر سے بند دروازہ کھلوانے میں دشواری ہوگی۔ اب نہ صرف دروازہ کھل گیا بلکہ یہ پرستان کی پری بھی پھوکٹ میں مل گئی۔"

"تم واقعی ٹھیک کہہ رہے ہو اسے میں سنبھالتا ہوں۔ تم خاور کو ٹھکانے لگا کر آ جاؤ۔" الیاس نے قدم آگے بڑھائے۔

لیلیٰ نے دیکھا وہ لنگڑا کر چل رہا تھا۔ اس کے ساتھیوں نے دروازے کی طرف قدم بڑھائے ہی تھے کہ ششدر رہ گئے، ان کے سامنے کھڑی حسین و جمیل لڑکی کالے رنگ کی قد آور بلی میں تبدیل ہو چکی تھی۔ یہ ان سب کے لئے خوفناک اور ناقابل یقین منظر تھا۔

بلی نے جست لگائی۔ اور الیاس کی آنکھوں پر پنجے مارے تو اس کے حلق سے دلدوز چیخ نکلی، وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر چیختا ہوا گرا اور تڑپنے لگا۔ خونخوار بلی نے اپنے پنجوں سے اس کی آنکھوں کے ڈھیلے پھوڑ دیئے تھے۔ اس کے ساتھیوں نے خوف زدہ ہونے کے باوجود اپنی رائفلیں بلی کی طرف کرکے ٹریگر دبا دیئے۔ رائفلوں کی نال سے گولیاں نکلیں لیکن اس سے پہلے ہی بلی غائب ہو چکی تھی۔ وہ بوکھلا گئے ایک نئی افتاد ان کے سر پر آن پڑی تھی، کوئی نادیدہ ہستی ان میں سے ایک رائفل بردار سے رائفل چھین کر ان کے جسموں پر برسا رہی تھی۔ دو رائفل برداروں کی کھوپڑی رائفل کا دستہ سر پر پڑنے سے چٹخ چکی تھی۔ جبکہ دوسرے دو جان بچانے کے لئے بیرونی دروازے کی طرف بھاگے ان میں سے ایک باہر نکلنے میں کامیاب ہوگیا جبکہ دوسرے کے سر پر کسی نادیدہ ہستی نے پوری قوت سے رائفل کا دستہ مارا، اس بچارے کو چیخنے کی بھی مہلت نہ ملی۔ وہ کٹے ہوئے شہتیر کی مانند گر گیا، اس کی کھوپڑی کا پچھلا حصہ کسی پکے ہوئے تربوز کی طرح چٹخ چکا تھا۔

ادھر الیاس تکلیف کی شدت سے اب بھی چیختا ہوا تڑپ رہا تھا کہ کسی نادیدہ قوت نے اس کا گلا دبانا شروع کردیا، اس کی چیخیں خرخراہٹ میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ کچھ ہی دیر میں اس کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے۔

ادھر گہری نیند سونے والا خاور گولیوں اور چیخوں کی آواز سن کر بیدار ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے پہلو میں دیکھا وہاں لیلیٰ موجود نہ تھی۔

اسی وقت باہر سے چیخوں کی آواز سنائی دی۔ اس نے سرہانے رکھا پسٹل اٹھایا اور کمرے سے باہر نکلا، کوریڈور کے سرے پر موجود دروازہ کھلا ہوا تھا۔ جہاں کسی شخص کی لاش پڑی

تھی، وہ لاش کے قریب پہنچا تو اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے وہ الیاس کی لاش تھی۔ جس کی آنکھوں کے ڈھیلے تک مادہ نکل کر بہہ چکے تھے۔

خاور نے لاش کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ لاش اس قدر بھیانک ہو رہی تھی کہ اس کا جی متلانے لگا۔ خاور چند قدم آگے بڑھا، یہاں بھی دو افراد کی لاشیں پڑی تھیں جن کی کھوپڑی چٹخی ہوئی تھی، قریب ہی دو آٹومیٹک رائفلیں پڑی تھیں، دروازے کے قریب بھی ایک سیاہ شکل شخص کی لاش پڑی تھی، اسے بھی سر پر ضرب لگا کر ہلاک کیا گیا تھا۔ دروازے سے باہر چوکیدار کی لاش پڑی تھی۔ اس کے عین دل کے مقام پر خنجر پیوست تھا۔

وہ سوچنے لگا۔ الیاس اور اس کے ساتھی اسے مارنے کی غرض سے گھر میں داخل ہوئے، انہوں نے چوکیدار کو خنجر کے وار سے ہلاک کیا اور گھر میں داخل ہوگئے۔ لیکن گھر کے اندر، ان چاروں کو کس نے انتہائی بے دردی سے قتل کیا؟

خاص کر الیاس کی لاش کی حالت بہت بری تھی۔ اس کی آنکھیں نوچ لی گئی تھیں اور چہرے پر پنجوں کے نشان تھے۔ یوں لگتا تھا۔ گھر کے اندر داخل ہوتے ہی ان کا سامنا کسی درندے سے ہوگیا تھا۔ لیکن سب سے اہم سوال یہ تھا کہ وہ چاروں آٹومیٹک رائفلوں کے باوجود اتنی آسانی سے کیوں مارے گئے؟ سب سے زیادہ ذہن کو چکرا دینے والا یہی سوال تھا۔ "تو پھر کیا یہ کسی ماورائی قوت کا کام ہے؟ اور پھر لیلیٰ کہاں غائب ہوگئی؟"

اسی وقت اس کی سماعت سے ثریا بیگم کی آواز ٹکرائی۔

"خاور یہ چیخیں کس کی تھیں اور گولیاں کس نے چلائی ہیں؟"

اچانک ان کی نظر حملہ آوروں کی خون چکاں لاشوں پر پڑی، ان کے حلق سے بے ساختہ چیخ نکلی اور وہ ہکلاتے ہوئے خوفزدہ لہجے میں بولیں۔ "یہ کک کیا ہے؟"

"امی خود میری سمجھ میں یہ معاملہ نہیں آرہا۔ یہ ہمیں مارنے آئے تھے اور خود مارے گئے، لیکن لیلیٰ کہاں ہے؟ میری آنکھ کھلی تو وہ بستر پر نہیں تھی۔" خاور نے جواب دیتے ہوئے استفسار کیا۔

"میں یہاں ہوں اور یہ لاشیں کس کی ہیں؟" لیلیٰ کوریڈور سے نکلتی دکھائی دی۔ اس کے گیلے بالوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ اور گیلے جسم کی وجہ سے چپکے لباس سے اس کے نشیب و فراز سرکشی کرتے نظر آرہے تھے۔ لیکن اس وقت خاور کا ذہن الجھا ہوا تھا۔ اس نے اس منظر سے متاثر ہوئے بغیر پوچھا۔ "تم کہاں تھیں؟"

"مجھے گرمی لگ رہی تھی۔ نہانے چلی گئی۔ اچانک فائرنگ اور چیخوں کی آواز سنائی دی۔ کمرے میں آئی تو تم وہاں نہیں تھے۔ اسی کمرے میں گئی تو امی بھی کمرے میں موجود نہ تھیں لیکن یہ لاشیں کس کی ہیں اور انہیں کس نے مارا ہے؟" لیلیٰ نے معصومانہ انداز میں پوچھا۔

خاور نے نوٹ کیا اس سنگین صورتحال میں بھی لیلیٰ خوفزدہ ہونے کے بجائے مطمئن نظر آرہی تھی۔ "یہ الیاس اور اس کے ساتھی ہیں۔ انہوں نے گیٹ پر موجود چوکیدار کو قتل کیا اور ہمیں مارنے کی غرض سے گھر میں داخل ہوئے، لیکن پراسرار طریقے سے یہ چاروں بھی مارے گئے۔"

خاور کافی پریشان لگ رہا تھا۔ اس نے جیب سے موبائل فون نکالا اور پولیس ایمرجنسی کے نمبر ڈائل کیے، کچھ دیر بعد ہی فضا پولیس موبائل اور ایمبولنس کے ہوٹرز سے گونج اٹھی۔ لاشوں کو ضروری کارروائی کے بعد ایمبولنس میں شفٹ کردیا گیا۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق ان کی موت سر پر آہنی ضربات لگنے سے ہوئی تھی جبکہ الیاس کا گلا گھونٹ کر مارا گیا تھا۔ اور چہرے پر بلی کے پنجوں کے نشانات تھے۔ انہی پنجوں کی وجہ سے اس کی آنکھیں بھی ضائع ہوئی تھیں۔

الیاس بیگ کے ساتھیوں کی شناخت ہسٹری شیٹرز کے طور پر ہوئی تھی یہ جیل سے مفرور مجرم تھے۔ جبکہ چوکیدار کے سینے میں پیوست خنجر کے دستے پر الیاس کی انگلیوں کے نشان ملے تھے۔ انہی فنگر پرنٹس کی وجہ سے خاور کی گلوخلاصی ہوئی تھی اور پھر وہ چاروں غیر قانونی طریقے سے ناجائز اسلحے کے ساتھ خاور کے گھر میں گھسے تھے، اس لیے حشمت بیگ کے اثر و رسوخ کے باوجود خاور کے خلاف کوئی کارروائی نہ ہوسکی۔

☆......☆......☆

اس کا نام فتح تھا وہ لوگ الیاس کے کہنے پر خاور کے گھر

میں اسے مارنے کے لئے داخل ہوئے تھے۔ پھر وہاں جو کچھ ان کے ساتھ پیش آیا، وہ سب ناقابل یقین تھا۔ وہ بڑی مشکل سے اس خطرناک بلا سے جان بچا کر بھاگا تھا۔ وہ ٹیکسی میں اپنے ٹھکانے پر پہنچا۔ فیروز خان وہیں موجود تھا۔ "کیا بات ہے اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟" فیروز خان نے پوچھا اور اس نے وہاں پیش آنے والے واقعات فیروز خان کو سنا ڈالے۔ "کیا بکواس کر رہے ہو؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک عورت بلی کا روپ دھار کر الیاس صاحب کی آنکھیں نوچ ڈالے اور پھر غائب ہو کر ان سب کو قتل کردے۔ لگتا ہے تم نے آج شراب ضرورت سے زیادہ پی لی ہے۔" فیروز خان نے رفیق کا منہ سونگھا۔ "تمہارے منہ سے شراب کی بو نہیں آرہی، اس کا مطلب ہے کہ تم نشے میں نہیں ہو۔ لیکن تمہاری باتیں ناقابل یقین ہیں۔" وہ اسے لے کر حشمت بیگ کے گھر جا پہنچا۔

الیاس کی موت کی خبر سن کر وہ اشتعال میں آگیا۔ "تم اسے موت کے حوالے کر کے خود بھاگ آئے۔" وہ اسے تھپڑ رسید کرتے ہوئے بولا۔

"باس میں جنوں یا بھوتوں کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ خاور کی بیوی کوئی خونی بلا ہے۔" وہ خوف زدہ لہجے میں بولا۔

"اپنی بے سروپا کہانیوں سے مجھے بے وقوف مت بناؤ، بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی عورت بلی کا روپ دھارے اور پھر غائب ہوجائے؟" حشمت بیگ غرایا۔

لیکن کچھ گھنٹوں بعد پوسٹ مارٹم رپورٹ کا متن پڑھتے ہی اس کا سر چکرا گیا۔ حشمت بیگ سوچنے لگا۔ "کیا رفیق سچ کہہ رہا ہے؟" لیکن انسانی عقل اسے سچ تسلیم کرنے سے قاصر تھی۔

"بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی عورت بلی کا روپ دھار لے اور پھر نظروں کے سامنے سے غائب ہوجائے۔" پوسٹ مارٹم رپورٹ اور چوکیدار کے قتل میں استعمال ہونے والے خنجر پر پائے جانے والے الیاس کی انگلیوں کے نشانات کے بعد خاور کے خلاف قانونی کارروائی ناممکن تھی۔

الیاس کی خون آلود لاش دیکھ کر اس کا لہو کھول اٹھا، اس نے عہد کرلیا کہ الیاس کی موت کا انتقام لے گا۔

الیاس کی موت کے چوتھے روز وہ فیروز خان کے ٹھکانے پر موجود تھا۔ فیروز خان کہہ رہا تھا۔ "باس اگرچہ ان واقعات کو انسانی عقل تسلیم نہیں کرتی لیکن جنات اور اس قسم کی دوسری ماورائی طاقتوں کا وجود بھی ہے۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ خاور کی بیوی پہلے بلی بنی، پھر نظروں سے غائب ہوگئی، کیا وہ جن ہے یا چڑیل؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔ میں نے اپنے ذرائع سے معلومات کروائی ہیں۔ لیلیٰ نامی یہ لڑکی اسے پراسرار طور پر ملی۔ وہ کون ہے اور کہاں سے آئی ہے؟ اس کے ماں باپ کون ہیں اور کہاں ہیں یہ کوئی بھی نہیں جانتا؟ ہوسکتا ہے لیلیٰ جن یا چڑیل ہو؟" فیروز خان نے کہا۔

"کیا بکواس ہے، میں نہیں مانتا کہ اس کی بیوی جن یا چڑیل ہے، لیکن ہم خاور کی خوب صورت بیوی کا وہ حشر کریں گے کہ دونوں میاں بیوی کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔" حشمت بیگ نے سفاک لہجے میں کہا۔

"آپ بے شک ایسا ہی کریں لیکن میری ایک تجویز ہے اسے بھی سن لیں، ہمارے گاؤں سے کچھ فاصلے پر ایک جنگل ہے۔ جس میں ایک جادوگر رہتا ہے۔ اگر ہم اس لڑکی پر قابو پانے میں ناکام رہے تو اس سے مدد لیں گے۔" فیروز خان نے تجویز پیش کی، جسے نیم دلی سے حشمت بیگ نے مان لیا۔

☆ - ☆ - ☆

خاور نے چوک پر واقع مارکیٹ کے سامنے گاڑی پارک کی، اسے یہاں کے ایک میڈیکل اسٹور سے ثریا بیگم کے لئے میڈیسن لینی تھیں۔ میڈیکل اسٹور پر ایک دبلا پتلا نوجوان موجود تھا۔ جو ایک ادھیڑ عمر خاتون کے لئے میڈیسن نکال رہا تھا۔ خاور نے میڈیسن کی پرچی کاؤنٹر پر رکھی، اسی وقت کسی گاڑی کے بریک چرچرائے۔ خاور تیزی سے مڑا اور ششدر رہ گیا۔ سڑک کی دوسری طرف اس کی بیوی لیلیٰ موجود تھی۔ اس کے قریب ایک پراڈو آکر رکی اور دو افراد برد بار باہر نکلے اور چشم زدن میں ان میں سے ایک نے ہاتھ میں دبا رومال لیلیٰ کے منہ پر رکھا اور برق سرعت سے اسے اٹھا کر پراڈو میں ڈال دیا۔ وہاں موجود بہت سے افراد یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ مگر ان کے ہاتھ میں موجود راکفلوں کی وجہ سے کسی نے بھی مداخلت کی ہمت نہ کی۔ اس واقعہ کے رونما ہونے میں بمشکل چند سیکنڈ کا وقت لگا تھا۔

خاور میڈیسن کو بھول کر پراڈو کی طرف بھاگا مگر پراڈو تیز رفتاری سے نکل چکی تھی۔ خاور اپنی آلٹو کی طرف لپکا اور اسٹارٹ کر کے پراڈو کا پیچھا کرنے لگا۔ نئے ماڈل کی پراڈو کی رفتار بہت تیز تھی۔ خاور کوشش کے باوجود بھی اس کے قریب نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اب وہ شہری حدود سے نکل کر مضافات میں داخل ہو چکے تھے۔ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ اپنے تعاقب سے لاعلم ہوں لیکن وہ اسے یکسر فراموش کر کے اپنی منزل کی طرف گامزن تھے۔ وہ بھی انجام کی پرواہ کئے بغیر اندھا دھند پراڈو کے پیچھے گاڑی دوڑا رہا تھا۔

پراڈو ایک عمارت کے گیٹ کے قریب رکی۔ ڈرائیور نے مخصوص انداز میں ہارن بجایا اور گیٹ کھل گیا۔ پراڈو تیز رفتاری سے اندر داخل ہو گئی۔

خاور نے عمارت سے کچھ فاصلے پر آلٹو روکی اور بھاگتا ہوا عمارت کی پچھلی سمت جا پہنچا اور اچک کر احاطے کی دیوار پر چڑھ گیا۔ چند لمحے جائزہ لینے کے بعد پنجوں کے بل اندر کود گیا۔ اس کے کودنے سے پہلے ہلکی سی دھمک پیدا ہوئی لیکن آواز پر کوئی ردعمل نہ ہوا تو وہ احاطے کی دیوار کے ساتھ چلتا ہوا اندرونی عمارت کے دروازے پر جا پہنچا۔ اسے حیرت اس بات پر تھی کہ اب تک اس کا سامنا کسی بھی ذی نفس سے نہ ہوا تھا۔ کوریڈور بھی سنسان تھا۔ اندر قطار میں آمنے سامنے کمروں کے دروازے تھے۔

خاور نے ہولسٹر سے پسٹل نکال کر اپنے ہاتھ میں لیا اور ہر کمرے کا دروازہ چیک کرنے لگا۔ پہلے تینوں کمرے لاک تھے۔ چوتھے کمرے کا دروازہ ہلکا سا کھلا ہوا تھا۔ وہ آہستگی سے کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس کمرے میں ڈبل بیڈ پر کوئی نسوانی وجود اوندھے منہ پڑا تھا۔ وہ دھڑکتے دل سے آگے بڑھا اور لڑکی کو آہستگی سے سیدھا کیا۔ وہ اس کی بیوی لیلیٰ تھی۔

لیکن اسے تو کچھ مسلح افراد سرعام اغوا کر کے لائے تھے۔ پھر وہ کہاں غائب ہو گئے؟ وہ جذبات سے مغلوب ہو کر بنا سوچے سمجھے اندھا دھند اندر چلا آیا تھا۔

”یہ اسے گھیرنے کے لئے کوئی چال بھی ہو سکتا تھا۔“ یہ سوچتے ہی اس نے دروازے کی طرف مڑنا چاہا، مگر اب اسے دیر ہو چکی تھی۔

اچانک اسے گردن میں سوئی کی چبھن کا احساس ہوا اور وہ ہوش و خرد سے محروم ہو گیا۔

اسے جب ہوش آیا تو خود کو ایک کمرے کے فرش پر پڑے پایا۔ اس کے ہاتھ پشت پر مضبوطی سے بندھے ہوئے تھے جبکہ پاؤں بھی بندھے ہوئے تھے۔ اس سے کچھ فاصلے پر لیلیٰ بھی اسی پوزیشن میں بے دست و پا موجود تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ لیلیٰ کے منہ پر ٹیپ لپٹا ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ بولنے سے قاصر تھی۔

ان سے کچھ فاصلے پر ایک کرسی پر حشمت بیگ ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھا تھا۔

اس کے قریب ہی فیروز خان کھڑا تھا، جس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ ”وہ کیا کہتے ہیں وہ آئے ہمارے گھر میں خدا کی قدرت ہے، کبھی ہم ان کو اور کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں۔ جب میں تیری زوجہ محترمہ کو اغوا کر کے لایا تو تیری گاڑی کو اپنے پیچھے آتا دیکھ چکا تھا۔ میں نے جان بوجھ کر تجھ سے چھیڑ چھاڑ نہیں کی اور اس عمارت میں بھی تو ہماری مرضی سے داخل ہوا۔ اگر ہم چاہتے تو تو اندر آنے سے پہلے ہی مرحوم ہو جاتا۔“ فیروز خان نے استہزائیہ انداز میں کہا۔

”تمہاری دشمنی مجھ سے ہے۔ اسے چھوڑ دو، عورتوں پر ہاتھ اٹھانے والے بزدل ہوتے ہیں۔“ خاور نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

”اس کی بھی وجوہات ہیں، تیرے گھر میں میرا بیٹا مارا گیا، میرے کارندے رفیق کا کہنا ہے کہ ”تیری بیوی کوئی خطرناک چڑیل یا جن ہے اس نے الیاس کا قتل کیا ہے؟ دوسرا اسے تیری نظروں کے سامنے برباد کر کے تجھے خون کے آنسو رلانا ہے۔ اب جو بھی ہوگا تیری نظروں کے سامنے ہوگا۔“ حشمت بیگ نے کہا۔

”تم لوگوں نے اگر اسے بری نظر سے بھی دیکھا تو تم سب کی آنکھیں نکال دوں گا۔“ خاور غرایا۔

”میرے بیوقوف کارندے کا کہنا ہے کہ یہ لڑکی جن ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ جن لڑکی اپنی جان اور عزت کیسے بچاتی ہے؟“ حشمت بیگ نے ہنستے ہوئے کہا اور فیروز خان کو اشارہ کیا تو وہ لیلیٰ کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔

"خاور اسے تو تو جانتا ہی ہے، یہ فیروز خان ہے لیکن تو اس کی ایک خاص خوبی سے واقف نہیں، یہ عیش کرتے وقت عورتوں کے جسم سے اپنے دانتوں سے گوشت کی بوٹیاں آدم خور درندوں کی طرح نوچتا ہے۔ ہمارے عشرت کدے کی جو لڑکی نافرمانی کرتی ہے ہم اسے اسی کے حوالے کردیتے ہیں۔ چلو فیروز خان آج اسے بھی اپنا کمال دکھا ہی دو۔" حشمت بیگ نے سفاک لہجے میں کہا۔

اور فیروز خان نے لیلیٰ کے لباس کی طرف ہاتھ بڑھائے، اسی وقت باہر سے کسی کی دلدوز چیخ سنائی دی۔ فیروز خان اپنی جگہ پر ساکت رہ گیا۔ "یہ کیا ہوا؟" حشمت بیگ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

وہ دونوں کمرے سے باہر نکلے۔ کوریڈور میں ایک رائفل بردار ساکت پڑا تھا۔ اس کے قریب ہی رفیق اور تین دوسرے مسلح افراد موجود تھے۔ "باس اسے بھی اسی چڑیل نے میری نظروں کے سامنے مارا ہے۔" رفیق تھوک نگلتے ہوئے خوفزدہ لہجے میں بولا۔

"کیا بکواس کررہے ہو؟ خاور اس کی بیوی اندر بندھے پڑے ہیں جبکہ تم کہہ رہے ہو اسے اسی بلا نے مارا ہے۔" حشمت بیگ غصے سے دھاڑا۔

"باس خدا کی قسم میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میں اور خالد کوریڈور میں کھڑے تھے کہ اچانک ایک کالی بلی آئی اور ہلاک کرکے غائب ہوگئی، خالد چیخ کر کوریڈور میں گر پڑا۔" رفیق رونے کے سے انداز میں بولا۔ وہ سخت خوفزدہ نظر آرہا تھا۔

حشمت بیگ اور فیروز خان نے خالد کی لاش کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر بلی کے پنجوں کے نشان تھے اور زبان حلق سے باہر نکل پڑی تھی، اور گلا بھنبھوڑ ڈالا گیا تھا۔

اسی وقت سامنے والے کمرے سے کسی کے غرانے کی آواز سنائی دی۔ وہ رائفل برداروں سمیت دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوئے۔ اگلا ہی لمحہ نہایت حیرت انگیز تھا۔ کمرے کے عین وسط میں لیلیٰ کھڑی قہر آلود نگاہوں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ جبکہ وہ اسے خاور کے ساتھ کمرے میں باندھ کر آئے تھے۔ "کے کو مار دو۔" حشمت بیگ چیخا اور رائفل برداروں نے رائفلوں کی نال کا رخ اس کی طرف کردیا۔

اسی وقت لیلیٰ غائب ہوگئی اور وہ سب بھونچکے رہ گئے۔ ایک رائفل بردار کے ہاتھ سے رائفل نکلی اور اس کا دستہ اس کے سر پر پڑا تو وہ تیورا کر گرا اور ساکت ہوگیا۔ اس کی کھوپڑی کسی تربوز کی طرح چٹخ گئی تھی۔ ایک دوسرا رائفل بردار اڑتا ہوا سامنے دیوار سے جا ٹکرایا اور وہیں ڈھیر ہوگیا۔

"بھاگو۔" حشمت بیگ چیخا، فیروز خان اور زندہ بچ جانے والے ایک رائفل بردار سمیت کمرے سے باہر نکلا۔ رفیق اب تک کوریڈور میں کھڑا خوف سے کانپ رہا تھا۔

"فیروز خان جلدی سے اس عمارت سے نکلو۔ یہ واقعی کوئی خوفناک بلا ہے۔" حشمت بیگ خوفزدہ لہجے میں بولا۔ اور کوریڈور سے باہر بھاگا۔ جبکہ فیروز خان اس کمرے میں داخل ہوا جہاں خاور اور لیلیٰ قید تھے۔ وہ دونوں اب تک کمرے کے فرش پر بے دست و پا پڑے تھے۔

فیروز خان حیران تھا۔ "اگر یہ لیلیٰ ہے تو لیلیٰ کے روپ میں دوسری لڑکی کون ہے؟" سوچنے سمجھنے کا وقت نہیں تھا۔ اسے ڈر تھا کہ وہ بلا اس کے پیچھے یہاں تک نہ پہنچ جائے۔ اس مصیبت کے وقت بھی ہوس اس پر غالب تھی۔ اس نے لیلیٰ کو اٹھا کر کندھے پر ڈالا اور خاور کے چیخنے چلانے کی پروا کیے بغیر کمرے سے باہر نکلا اور بھاگتا ہوا پراڈو تک جا پہنچا۔ حشمت بیگ اپنے کارندوں سمیت پراڈو میں سوار ہوچکا تھا۔

فیروز خان نے لیلیٰ کو پراڈو کی پچھلی نشست پر پھینکا۔ اس کے سوار ہوتے ہی ڈرائیور نے تیز رفتاری سے گاڑی عمارت سے باہر نکال دی۔ "سمجھ نہیں آتا یہ کیا چکر ہے، یہ لڑکی اور ہو بہو اس بلا کی ہمشکل ہے، پتہ نہیں وہ چڑیل ہے یا کوئی جن؟ میں اگر یہ سب اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھتا تو کبھی یقین نہیں کرتا۔" حشمت بیگ پچھلی نشست پر بندھی پڑی لیلیٰ کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اب بھی اس لڑکی سے خوفزدہ تھا کہ نجانے کب یہ لیلیٰ غائب نہ ہوجائے وہ اپنے کارندوں کا اس کے ہاتھوں مرنا دیکھ چکا تھا۔

"میری مانو تو اس لڑکی کو کوئی مار کر راستے میں پھینک دو، یہی چڑیل ہے۔" رفیق خوفزدہ لہجے میں بولا۔

"نہیں یہ خاور کی بیوی ہے اسے برباد کرنے سے باس کا دل خوش ہوگا اور یہ خاور کے لئے ناقابل برداشت صدمہ

ہوگا۔" فیروز خان نے اپنے ناپاک عزائم واضح کیے۔ پراڈو اب مضافات سے نکل کر شہری حدود میں داخل ہو چکی تھی۔

اچانک انہیں پراڈو میں سانپ کی پھنکار سنائی دی۔ وہ خوف سے اچھل پڑے۔ "گاڑی روکو!" حشمت بیگ چلایا۔

ڈرائیور نے ایک جھٹکے سے گاڑی روک دی۔ پراڈو کی عقبی نشست سے ایک دہشت ناک سانپ نکلا، اور برقی سرعت سے صدیقی کی پنڈلی پر ڈس لیا، وہ دلدوز انداز میں چیختا ہوا نیچے گر پڑا۔

وہ لیلیٰ کو بھول کر پراڈو سے نکلے اور چیختے ہوئے ایک طرف بھاگنے لگے۔ سانپ اب لیلیٰ کے روپ میں آچکا تھا۔ عقبی نشست پر بندھی لیلیٰ حیرت اور خوف سے سانپ کو اپنی ہمشکل کے روپ میں دیکھ رہی تھی اس نے لیلیٰ کے ہاتھ پاؤں کھولے منہ پر سے ٹیپ ہٹایا اور بولی۔ "مجھ سے ڈرو مت میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گی۔ ہم اس وقت شہری حدود میں ہیں، تم گاڑی سے نکلو اور کسی ٹیکسی میں بیٹھ کر اپنے گھر چلی جاؤ، مجھے ابھی خاور کو بھی آزاد کرانا ہے۔"

یہ دیکھ کر لیلیٰ کا خوف سے برا حال تھا۔ اس کے ذہن میں بہت سے سوالات مچل رہے تھے کہ "اس کی ہمشکل یہ خوفناک لڑکی کون ہے؟ اس کا خاور سے کیا تعلق ہے؟"

خاور لیلیٰ کی محبت تھا۔ ٹرین میں پہلی ملاقات کے بعد سے وہ اسے چاہنے لگی تھی۔ اور دن رات دعائیں کرتی تھی کہ خاور سے اس کی دوبارہ ملاقات ہو جائے۔ پھر ایک روز اسے لیلیٰ کی زبانی معلوم ہوا "کچھ لوگ اسے اغوا کر کے لے جا رہے تھے کہ خاور نے اسے بچایا۔ اور یہ بھی بتایا کہ خاور عجیب بہکی بہکی باتیں کر رہا تھا کہ لیلیٰ اس کے گھر میں ہے اور اس کی بیوی ہے۔ آج لیلیٰ مارکیٹ گئی تھی کہ سڑک پر اسے زبردستی اغوا کر لیا گیا۔ اغوا کنندگان نے اسے گھوڑا فارم میں بھیگا رومال سونگھا کر بے ہوش کر دیا تھا۔ اسے جب ہوش آیا تو اس کے قریب ہی خاور بھی بندھا ہوا تھا۔ اسے حیرت اس بات پر بھی تھی۔ حشمت بیگ اور فیروز خان اسے خاور کی بیوی کہہ رہے تھے خوف کے باعث اس کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ اپنی ہمشکل سے کچھ پوچھتی۔ وہ خاموشی سے پراڈو سے اتر گئی۔

ادھر پراسرار لیلیٰ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی اور تیز رفتاری سے گاڑی چلا دی۔ عمارت کے سامنے پہنچ کر وہ پراڈو سے اتری اور اس کمرے میں جا پہنچی، جہاں خاور بندھا پڑا تھا۔

خاور حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے خاور کے ہاتھ پاؤں کھولے۔ "تم ان کے چنگل سے کیسے نکلیں؟ تمہیں تو فیروز خان اٹھا کر لے گیا تھا۔" خاور نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"یہ وقت ان باتوں کا نہیں، اس وقت یہاں سے نکلو، میں راستے میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گی، یہاں کسی بھی وقت حشمت یا اس کے کارندے آ سکتے ہیں۔" وہ دونوں عمارت سے باہر نکلے اور پراڈو میں سوار ہو گئے۔

خاور نے گاڑی تیز رفتاری سے آگے بڑھائی اور پوچھا۔ "اب بتاؤ میں تو تمہیں گھر چھوڑ کر آیا تھا پھر تم مارکیٹ کیوں گئی تھیں؟"

"میں وہاں ضرورت کا کچھ سامان لینے گئی تھی کہ یہ خبیث وہاں پہنچ گئے، آگے کے حالات تم جانتے ہی ہو۔ پھر یہاں سے یہ مجھے اغوا کر کے لے جا رہے تھے کہ راستے میں ایک سانپ نمودار ہوا، اور اس نے ان کے ایک ساتھی کو ڈس لیا۔ وہ مجھے چھوڑ کر بھاگ گئے، حیرت انگیز طور پر سانپ نے میری ہمشکل لڑکی کا روپ دھار لیا۔ وہ ہو بہو میری ہمشکل تھی، مجھے تو لگتا ہے وہ کوئی جن تھی، اس نے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا اور غائب ہو گئی۔" لیلیٰ نے کہا اور خاور اسے ناقابل یقین نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

"مجھے حیرت ہے یہ جن لڑکی کون ہے؟ لیکن ایک بات تسلی بخش ہے کہ وہ ہماری ہمدرد ہے اس روز اس نے ہمیں گھر پر فیروز خان کے کارندوں اور الیاس سے بچایا اور آج یہاں ہماری مدد کی۔"

"وہ تمہارے روپ میں گھومتی ہے شاید، اس لئے یہ لوگ تمہیں جن سمجھتے ہیں، اس روز وہ جوگی بھی یہی کہہ رہا تھا۔" خاور بولا۔ وہ اس صورت حال سے کافی پریشان تھا۔

"تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں، وہ ہمیں نہیں بلکہ ہمارے دشمنوں کو نقصان پہنچا رہی ہے۔" لیلیٰ نے کہا اور وہ خاموش ہو گیا۔

شہری حدود میں داخل ہوتے ہی خاور نے پراڈو روکی اور نیچے اتر کر ٹیکسی کے ذریعے گھر پہنچے۔ ثریا بیگم ان کی

طرف سے پریشان تھیں۔ ان کے استفسار پر بھی خاور نے سچ نہیں بتایا اور کہا کہ وہ گھومنے گئے تھے وہ سچ بتا کر انہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔

☆.....☆.....☆

فیروز خان اور حشمت بیگ اس دور دراز کے جنگل میں ایک جھونپڑی میں موجود تھے۔ ان کے سامنے جوگی بیٹھا اپنی سرخ آنکھوں سے انہیں گھور رہا تھا۔ فیروز خان کے اس جوگی سے دیرینہ تعلقات تھے۔ وہ کبھی کبھار جادو ٹونے کے لئے اس سے رابطہ کرتا تھا۔ اس وقت بھی وہ حشمت بیگ کو اصرار کرکے یہاں لایا تھا۔ "فیروز خان کیا مسئلہ ہے؟" جوگی نے پوچھا۔

جناب ہمیں ایک چڑیل نے پریشان کر رکھا ہے۔" فیروز خان نے کہا اور اسے تفصیل سے تمام واقعات سے آگاہ کیا۔

جوگی نے کچھ لمحوں کے لئے اپنی آنکھیں بند کیں اور پھر بولا۔ "وہ چڑیل نہیں ایک جن زادی ہے۔ وہ خاور پر عاشق ہے۔ اس نے خاور کو پانے کے لئے انسانی روپ دھارا اور اس کی محبوبہ لیلیٰ کی شکل اختیار کرلی، وہ جانتی تھی کہ خاور لیلیٰ سے محبت کرتا ہے۔ خاور اسے اپنے گھر لے آیا اور لیلیٰ سمجھتے ہوئے اس سے شادی کرلی۔ میں نے اس جوڑے کو کوہسار مری میں دیکھا تھا۔ میں لیلیٰ کو دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا کہ یہ انسان نہیں، جن زادی ہے۔ لیکن خاور اس کے معاملے میں کسی بات کو ماننے پر تیار نہیں تھا۔ میں اس جن زادی کو قابو کرنے کے لئے خاور کے گھر گیا۔ میں اسے قابو کرلیتا مگر اتنے میں خاور وہاں پہنچ گیا۔ نہ جانے خاور کے پاس ایسی کیا چیز ہے کہ میرا ہر جادو، ہر عمل اس پر بے اثر رہا۔ اس کے بعد سے میں نے ایک خصوصی جاپ شروع کیا، جو کل رات ہی مکمل ہوا ہے۔ اب اس جن زادی پر قابو پانا کوئی مشکل نہیں۔ کل دن میں جب خاور ڈیوٹی پر ہوگا، میں اس جن زادی پر قابو پاکر یہاں لے آؤں گا اور ایسی جگہ لے جاؤں گا کہ وہ کبھی تمہاری دنیا میں واپس لوٹ نہ سکے گی بلکہ وہ میری غلام بن جائے گی اور تمہیں ہمیشہ کے لئے اس سے آزادی مل جائے گی۔" جوگی نے کہا۔

حشمت بیگ شہر واپس لوٹ گیا جبکہ فیروز خان وہیں رکا۔ دوسرے روز سہ پہر کے قریب وہ خاور کے گھر کے سامنے موجود تھے۔

"ہاں صاحب کس سے ملنا ہے؟" چوکیدار نے فیروز خان سے پوچھا وہ حیرت سے ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ ان میں سے ایک جوگی دکھائی دے رہا تھا۔ گلے میں مختلف اقسام کی مالائیں تھیں جبکہ دوسرا جدید تراش کے سوٹ میں ملبوس تھا۔ دونوں پیدل چلتے ہوئے ایک طرف سے آئے تھے۔ "ہم خاور صاحب کے مہمان ہیں ان سے ملنا ہے۔" فیروز خان نے کہا۔

"صاحب تو گھر پر نہیں ہیں۔ وہ ڈیوٹی پر گئے ہیں۔" چوکیدار نے جواب دیا۔

"اچھا تم ایسا کرو یہ کارڈ بیگم صاحبہ تک پہنچادو۔" فیروز خان نے کہا اور اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اس کا ہاتھ باہر آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک عجیب ساخت کا پسٹل نما آلہ تھا، چوکیدار نے کندھے سے رائفل اتارنا چاہی مگر فیروز خان ٹریگر دبا چکا تھا۔ اس پسٹل نما آلے سے ایک چھوٹا سا غبارہ نکلا اور چوکیدار کے منہ سے ٹکرا کر پھٹ گیا۔ وہ سیکنڈوں میں نیچے گر کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوگیا۔

فیروز خان نے اسے گھسیٹ کر دیوار کے ساتھ ڈالا اور ڈور بیل پر انگلی رکھ دی۔ پھر دروازے کی طرف آتی قدموں کی چاپ سنائی دی۔ یہ ثریا بیگم تھیں، جنہوں نے سمجھا کہ چوکیدار نے کسی ضروری کام سے بیل بجائی ہوگی۔ انہوں نے جیسے ہی دروازہ کھولا، فیروز خان نے چوکیدار کی طرح انہیں بھی بے ہوش کردیا۔ وہ تیزی سے گھر کے اندر داخل ہوگئے۔

جوگی نے اپنے اور فیروز خان کے گرد حصار قائم کرکے اپنے چوغے سے ایک چھوٹی سی بوتل نکالی اور ڈھکن کھول کر ایک طرف رکھ دیا۔ اب وہ بلند آواز سے پڑھ رہا تھا۔ کسی انجان زبان میں کوئی عمل، کچھ ہی دیر گزری تھی کہ ایک کمرے کا دروازہ کھلا اور لیلیٰ باہر نکلی، ان دونوں کو دیکھ کر ٹھٹک گئی، جوگی نے اپنے چوغے سے راکھ نما چیز نکال کر اس پر پھینکی اور دوبارہ عمل پڑھنا شروع کردیا۔

لیلیٰ کا جسم بڑھنا شروع ہوگیا۔ اب وہ کئی گز لمبی ہو چکی تھی۔

فیروز خان کو اس کا چہرہ دیکھنے کے لئے سر اوپر اٹھانا پڑا۔ اب اس کا چہرہ بھی تبدیل ہو چکا تھا۔ اس دیو ہیکل مخلوق کو دیکھ کر فیروز خان کی گھگھی بندھ گئی، اگر جوگی ساتھ نہ ہوتا تو وہ

اس جن زادی کو اصل روپ میں دیکھ کر بے ہوش ہو جاتا۔ کچھ دیر بعد لیلیٰ کا وجود پارہ پارہ سکڑنے لگا اور پھر وہ دھوئیں کی صورت میں تحلیل ہو کر اس چھوٹی سی بوتل میں سمانے لگی۔ جب سارا دھواں بوتل میں سما گیا تو جوگی نے جلدی سے بوتل کا ڈھکن بند کر دیا۔

فیروز خان حیرت سے اس چھوٹی سی بوتل کو دیکھ رہا تھا۔ جس میں ایک چھوٹی سی چڑیل کی جسامت کی ننھی سی عورت نظر آ رہی تھی۔

جوگی نے بوتل چوغے میں ڈالی اور فیروز خان کے ہمراہ گھر سے باہر نکل گیا۔ "اب تم اس جن زادی سے بے فکر ہو اور خاور کے ساتھ جیسی مرضی سلوک کرو۔" جوگی نے کہا اور ایک سمت چل پڑا۔

اسی وقت سامنے سے اپنی گاڑی پر خاور گھر کی طرف آ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر فیروز خان نے اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا۔ جبکہ خاور جوگی کو سڑک سے گزرتا دیکھ کر حیران رہ گیا۔ لیکن اس وقت اس نے جوگی سے الجھنا مناسب نہیں سمجھا اور اپنے گھر کے دروازے کے قریب گاڑی روک دی۔ اسے کیا معلوم کہ جس جوگی کو خالی ہاتھ دیکھ کر اس نے نظر انداز کر دیا تھا۔ اس جوگی کے پاس بوتل میں اسے جان سے زیادہ چاہنے والی اور دشمنوں سے بچانے والی جن زادی قید ہے۔ جسے اب تک وہ لیلیٰ سمجھ رہا تھا۔

گاڑی سے اترتے ہی اس کی نظر گیٹ کے قریب بے ہوش پڑے چوکیدار پر پڑی تو وہ سمجھ گیا کہ اس کی غیر موجودگی میں کچھ غلط ہو چکا ہے۔ وہ تیزی سے گھر میں داخل ہوا۔ صحن میں ثریا بیگم بے ہوش پڑی تھیں، انہیں ہوش میں لانے کی اس کی تمام کوششیں بے سود ہیں سب سے لیلیٰ کی فکر تھی۔ "لیلیٰ! لیلیٰ! کہاں ہو تم؟" وہ لیلیٰ کو پکارنے لگا مگر جواب میں خاموشی تھی۔

اس نے پورا گھر چھان مارا مگر لیلیٰ گھر پر موجود نہیں تھی وہ سوچ میں پڑ گیا۔ "چوکیدار اور ثریا بیگم کو کس نے بے ہوش کیا اور لیلیٰ کہاں ہے؟" جوگی کو وہ تنہا پیدل جاتے ہوئے دیکھ چکا تھا، پھر لیلیٰ کہاں گئی؟ کیا اسے کوئی دوسرا اغوا کر کے لے گیا ہے؟ یا وہ اپنی مرضی سے کہیں گئی ہے؟ تو پھر ماں جی اور چوکیدار کو کس نے بے ہوش کیا؟ لیکن اگر لیلیٰ اپنی مرضی سے گئی ہے تو پھر اس کی ماں اور چوکیدار بے ہوش کیوں پڑے ہیں؟" وہ سوچنے کے ساتھ ساتھ ان دونوں کو ہوش میں لانے کی تدبیر کرنے لگا، ہلانے جلانے کے علاوہ وہ ان پر پانی ڈال کر بھی دیکھ چکا تھا۔ مگر اس کے باوجود بھی ان دونوں کو ہوش نہیں آیا۔

مجبوراً اسے ان دونوں کو اسپتال لے جانا پڑا۔ ان دونوں کو کافی کوششوں کے بعد چار گھنٹے بعد ہوش آیا تھا۔

چوکیدار نے خاور کو بتایا کہ "گیٹ پر ایک اسمارٹ سا ادھیڑ عمر اور ایک جوگی آئے تھے، اس شخص نے کوئی عجیب ساخت کی گن نکال کر ٹریگر دبایا تھا اور وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔"

یہی بیان ثریا بیگم نے بھی دہرایا۔ ان کے بتائے ہوئے حلیے فیروز خان اور جوگی سے مشابہت رکھتے تھے۔ ایف آئی آر ان دونوں کے نام درج کی گئی۔

خاور کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ لیلیٰ کو کہاں ڈھونڈے، فیروز خان اور جوگی گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب تھے۔ لے دے کر حشمت خان کا نام ذہن میں آتا تھا لیکن اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں تھا اور بغیر کسی ٹھوس ثبوت کے اس پر ہاتھ ڈالنا ناممکن تھا۔ اس نے اس عمارت کو بھی چیک کیا جہاں ایک بار اسے اور لیلیٰ کو اغوا کر کے لے جایا گیا تھا۔ لیکن اس عمارت کے دروازے پر موجود بڑا سا تالا اس کا منہ چڑا رہا تھا۔

وہ احاطے کی دیوار پھلانگ کر عمارت میں داخل ہوا اور پوری عمارت کی تلاشی لی مگر یہاں کوئی بھی ذی نفس موجود نہ تھا۔ وہ مایوس ہو کر عمارت سے باہر نکل گیا، اس نے پولیس کے مخبروں کی مدد بھی حاصل کی، جنہوں نے اسے بتایا کہ لیلیٰ حشمت بیگ کے کسی ٹھکانے پر نہیں جبکہ فیروز خان روپوش ہے۔

وہ حیران و پریشان تھا کہ لیلیٰ کو زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ جوگی بھی غائب تھا۔

لیلیٰ کو غائب ہوئے دو روز گزر چکے تھے ان اڑتالیس گھنٹوں میں اس نے زندہ رہنے کے لئے برائے نام کھایا۔ کپڑے وہی پہن رکھے تھے۔ انسان کی کوئی قیمتی چیز کھو جائے تو وہ پریشان ہو جاتا ہے۔ لیلیٰ تو پھر اس کی بیوی اور محبت تھی۔ انسان مرے ہوئے کو بھول سکتا ہے لیکن دنیا کی بھیڑ میں کھو جانے والوں کو نہیں بھول سکتا۔ دو روز بعد وہ انجام

سے بے پرواہ ہو کر حشمت بیگ کے آفس جا پہنچا۔

"دیکھو حشمت بیگ دشمنی ہمارے درمیان ہے تم میرے باپ کے قاتل ہو، جس روز میرے ہاتھ ثبوت لگا تم جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہو گے تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ اگر لیلیٰ کو تم نے اغوا کروایا ہے تو اسے چھوڑ دو۔" وہ حشمت بیگ کے سامنے میز اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہہ رہا تھا۔

ان دونوں کے درمیان میز حائل تھی۔ "مسٹر خاور میں تمہاری گیدڑ بھبکیوں سے ڈرنے والا نہیں، اگر لیلیٰ میرے پاس ہوتی تو میں تمہیں چیلنج دے کر کہتا کہ ہمت ہے تو اسے چھڑا لو، پہلے ہی میں نے جب اسے اغوا کروایا تھا تو سرعام ایسا کیا تھا اس کے تم خود گواہ ہو، نہ ہی میں تم سے ڈرتا ہوں اور نہ ہی تمہارے جیسا معمولی پولیس آفیسر میرا کچھ بگاڑ سکتا ہے۔" حشمت بیگ نے کہا۔

خاور خاموشی سے اس کے آفس سے نکل گیا۔ وہ لیلیٰ کی تلاش میں سچ مچ کا مجنوں بن چکا تھا۔ غرض کہ اس نے لیلیٰ کو ہر جگہ ڈھونڈا۔ چھٹے روز اسے یاد آیا ٹرین میں پہلی ملاقات میں لیلیٰ نے اسے بتایا تھا کہ وہ اور لبنیٰ فاطمہ جناح یونیورسٹی میں زیر تعلیم رہ چکی ہیں۔ وہ لیلیٰ کے ماضی کے بارے میں جاننا چاہتا تھا کہ شاید اس طرح اسے لیلیٰ کی تلاش میں مدد ملے، وہ یونیورسٹی جا پہنچا، پرنسپل ایک ادھیڑ عمر اسمارٹ سی خاتون تھیں۔ خاور ان کے سامنے جا بیٹھا۔ "میڈم اس یونیورسٹی میں میری وائف لیلیٰ اور اس کی فرسٹ کزن لبنیٰ زیر تعلیم رہ چکی ہیں، وہ لیلیٰ کے ماضی کے بارے میں جاننا چاہتا تھا کہ شاید اس طرح اسے لیلیٰ کی تلاش میں مدد ملے۔ "میری وائف پچھلے چند روز سے لاپتہ ہے، میں لیلیٰ اور لبنیٰ کے پیرنٹس کا ایڈریس جاننا چاہتا ہوں۔" خاور نے اپنا مدعا بیان کیا۔

"مسٹر مجھے حیرت ہے آپ کا کہنا ہے کہ لیلیٰ آپ کی بیوی ہے اور آپ اس کا ایڈریس جاننے کے لئے یونیورسٹی آئے ہیں۔" میڈم حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے بولی اور خاور نے اسے مختصر الفاظ میں لیلیٰ کی روداد سنا ڈالی جسے میڈم حیرت اور دلچسپی سے سنتی رہی۔

"مجھے تو ایسا لگ رہا ہے کہ آپ مجھے کوئی فلمی کہانی سنا رہے ہیں، بہرحال میں آپ کو لیلیٰ کے پیرنٹس کا ایڈریس نہیں

دے سکتی۔ یہ ہمارے اصولوں کے خلاف ہے۔"

"میڈم یہ کسی کی زندگی کا معاملہ ہے۔ ہوسکتا ہے اس طرح مجھے لیلیٰ کی تلاش میں کوئی مدد مل جائے۔ میں چاہتا تو سرکاری حیثیت سے بھی آپ سے پوچھ سکتا تھا، لیکن میں آپ سے ریکویسٹ کررہا ہوں پلیز! یہ میری زندگی اور موت کا معاملہ ہے۔" اس نے کچھ اس طرح عاجزانہ انداز میں التجا کی کہ میڈم کا دل پسیج گیا۔ میڈم نے کافی تلاش کے بعد ایک فائل کھولی اور اسے لیلیٰ اور لبنیٰ دونوں کے ایڈریس لکھ کردیئے۔

لیلیٰ کے باپ کا نام ہارون کمال جبکہ لبنیٰ کے باپ کا نام سجاد علی تھا۔

سب سے پہلے وہ لیلیٰ کے گھر پہنچا وہاں گیٹ پر لگا تالا دیکھ کراسے مایوسی ہوئی۔ اس نے قریب ہی دوسرے مکان کی ڈور بیل بجائی، دروازہ ایک بوڑھے شخص نے کھولا اور اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ "جناب میں آپ کے پڑوسی ہارون کمال صاحب سے ملنے آیا تھا، ان کے گھر پر تالا لگا ہوا ہے۔" خاور نے بوڑھے سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"بیٹا پچھلے ہفتے ہارون کمال صاحب کا انتقال ہوگیا تھا، ان کی اہلیہ اپنی اکلوتی بیٹی کو لے کر گاؤں چلی گئی ہیں؟" بوڑھے کا جواب سنتے ہی خاور حیران رہ گیا۔ لیلیٰ نے اس سے کہا تھا کہ اس کے والدین کا انتقال ہوگیا ہے لیکن اس نے جھوٹ کیوں کہا تھا۔ اور پھر یہ بزرگ بتا رہے تھے کہ ہارون کمال کی بیوی اپنی بیٹی کے ساتھ گاؤں چلی گئی ہے یہ گورکھ دھندا اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

"بیٹا شاید تم ان کے رشتے دار ہو۔" بوڑھے نے پوچھا۔

"جی میں ان کا داماد ہوں۔" خاور نے جواب دیا۔

"لیلیٰ بیٹی کی تو ابھی شادی نہیں ہوئی نہ ہی اس کی کسی سے نسبت طے ہوئی ہے۔" بوڑھے نے اسے مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا اور خاور کا دماغ چکرا گیا۔

وہ وہاں سے پلٹا، اب اس کا ارادہ لبنیٰ کے گھر جانے کا تھا۔ وہ ذہنی طور پر خاصا اپ سیٹ ہوچکا تھا۔ "اگر لیلیٰ اپنی مرضی سے اپنی ماں کے ساتھ گئی ہے تو پھر جوگی اور فیروز خان نے اس کی ماں اور چوکیدار کو کیوں بے ہوش کیا۔ اور لیلیٰ نے اتنے سارے جھوٹ کیوں بولے تھے؟" وہ جتنا سوچتا اتنا ہی الجھ جاتا۔ اسی الجھن میں وہ چلتا رہا۔ اس نے لبنیٰ کے گھر جانے کا ارادہ ترک کردیا تھا۔ لبنیٰ کے گھر والے خاور کو نہیں جانتے تھے۔ اس کا لبنیٰ کے گھر جانا لبنیٰ کے لئے مسائل پیدا کرسکتے تھے۔ وہ کافی فاصلہ طے کرچکا تھا۔

اچانک اس کی نظر ایک مزار پر پڑی، وہ ایک کامل ولی کا مزار تھا۔ وہ بلا ارادہ سیڑھیاں چڑھ کر مزار میں پہنچا اور فاتحہ پڑھنے کے بعد دعا مانگنے لگا۔ "یا اللہ تو بڑا غفور الرحیم ہے۔ میرے لئے کوئی ایسا وسیلہ بنادے کہ میں اپنی بیوی تک پہنچ سکوں۔" وہ کچھ دیر وہیں بیٹھا رہا، پھر اٹھا اور سیڑھیاں اترنے لگا مزار کی درمیانی سیڑھیوں پر ایک باریش ملنگ پاؤں پسارے بیٹھا تھا۔ اس کے گلے میں مختلف اقسام کی مالائیں اور جسم پر چوغہ موجود تھا۔ جس میں بے شمار پیوند لگے ہوئے تھے، وہ ایک دراز قامت شخص تھا آنکھوں میں بلا کی کشش اور چہرے پر اتنا جلال کہ اس کی طرف دیکھنا محال تھا، یہ وہی ملنگ تھا جس سے وہ کوہسار مری میں ٹکرایا تھا اور اس ملنگ نے اسے پتھر دیتے ہوئے کہا تھا کہ وہ عنقریب مشکلات کا شکار ہونے والا ہے۔

خاور سر جھکا کر ملنگ کے قریب کھڑا ہوگیا۔ "ادھر آ میری ٹانگیں دبا۔" ملنگ نے اسے حکم دیا نہ جانے اس کے لہجے میں کیا اثر تھا کہ خاور انکار کی ہمت نہ کرسکا، وہ کافی دیر تک اس ملنگ کی ٹانگیں دباتا رہا۔ اور ملنگ ٹانگیں پسارے آرام سے بیٹھا رہا۔ "بس کر تھک گیا ہوگا ویسے بھی پریشانی کے باعث تو کافی کمزور ہوگیا ہے، گھبرا مت اللہ بہتر کرے گا۔" ملنگ نے کہا۔

"بابا میری بیوی کہاں ہے؟" وہ رو دینے والے انداز میں بولا۔

"جا وہ کاغذ اٹھالا۔" ملنگ نے ایک طرف اشارہ کیا۔ خاور نے دیکھا کچھ فاصلے پر ایک اخبار پڑا تھا۔ خاور اخبار اٹھا لایا۔ وہ چار پانچ روز پرانا اخبار تھا جو نہ جانے کس نے پڑھ کر ایک طرف پھینک دیا تھا۔ "تجھے اپنی بیوی کا سراغ اس کاغذ میں ملے گا۔" ملنگ نے بارعب لہجے میں کہا اور اپنی جگہ سے کھڑے ہوکر گرجدار آواز میں اللہ ھو کا نعرہ بلند کیا اور تقریباً دوڑتا ہوا مزار کی سیڑھیاں اترتا چلا گیا۔

خاور سیڑھیوں پر بیٹھ گیا اور اخبار پڑھنے لگا مگر اس میں

اسے ایسی کوئی بات نظر نہ آئی جس سے لیلیٰ کا سراغ ملتا۔ اخبار سیاسی لیڈروں کے بیانات، ٹارگٹ کلنگ، ڈاکہ زنی کی وارداتوں اور کمرشل ایڈز سے بھرا ہوا تھا۔ اخبار کے ساتھ ایک ضمیمہ بھی تھا جس میں دور دراز کے ایک سرحدی علاقے سے متصل ایک وادی کا ذکر تھا۔

اس فیچر کے مطابق اس وادی میں رہنے والے لوگ اب بھی زمانہ قدیم کے طرز کی زندگی گزار رہے تھے۔ فیچر میں لکھا تھا۔ "اس وادی کے لوگ شیطان کی پوجا کرتے ہیں۔" اس فیچر میں ایک پہاڑ کی تصویر بھی تھی، اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ملنگ نے اس اخبار کی طرف اشارہ کیوں کیا؟

وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے پہنچا اور ملنگ کو ڈھونڈنے لگا مگر ملنگ کا کوئی سراغ نہیں ملا، وہ حیران تھا کہ وہ ملنگ منٹوں میں کہاں غائب ہوگیا، کافی کوشش کے باوجود جب وہ ملنگ اسے نہ ملا تو وہ مایوس ہوکر گھر لوٹ گیا۔

دوسرے روز بھی وہ اس ملنگ کی تلاش میں اس مزار پر گیا۔ مگر ملنگ اسے کہیں نظر نہ آیا۔ اس نے صاحب مزار کی قبر پر فاتحہ خوانی کی اور مزار کی سیڑھیاں اترنے لگا۔ "کسے ڈھونڈ رہا ہے؟" وہ عقب سے ملنگ کی آواز سن کر مڑا۔ ملنگ اس کے پیچھے موجود تھا۔ "میں آپ ہی کو ڈھونڈ رہا تھا۔ کل آپ نے کہا تھا کہ لیلیٰ کا سراغ اس اخبار میں پوشیدہ ہے مگر مجھے تو اس اخبار میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آئی جس سے لیلیٰ کا سراغ ملتا۔"

"لا دکھا مجھے وہ کاغذ۔" ملنگ نے اپنے مخصوص لب و لہجے میں کہا اور خاور نے وہ اخبار ملنگ کے سامنے کردیا۔ "یہ دیکھ تیری منزل یہاں ہے۔" ملنگ نے اخبار کے خصوصی ضمیمے کے فیچر پر انگلی رکھی اور بولا۔ "اب تو اللہ کا نام لے کر وہاں جا، وہی تیری مدد کرے گا۔" ملنگ نے پہلے کی طرح اللہ ھو کا نعرہ بلند کیا۔

"بابا جی لیلیٰ مجھے وہاں کیسے ملے گی؟" اس سے پہلے کہ ملنگ پہلے کی طرح اس کے ہاتھوں سے نکل جاتا اس نے ملنگ کا دامن تھام کر پوچھا۔

"زیادہ سوال جواب نہ کر سیدھا اس وادی میں جا، ہاں وہ پتھر جو میں نے تجھے پہلی ملاقات میں دیا تھا اسے سنبھال کر رکھنا اس کی وجہ سے اس روز بھی اس جادوگر کا جادو تجھ پر بے اثر رہا۔" ملنگ نے کہا اور اللہ ھو کا نعرہ بلند کرکے غائب ہوگیا۔

خاور کو یاد آگیا جب پہلی بار جوگی اس کے گھر میں گھسا تھا تو منتر پڑھنے کے باوجود بھی اس پر اس کا جادو بے اثر رہا تھا۔ خاور نے اپنی جیب سے پرس نکالا اور ملنگ کے دیئے ہوئے پتھر کو غور سے دیکھنے کے بعد دوبارہ پرس میں رکھ کر جیب میں ڈال لیا۔ اب اسے اس وادی کو تلاش کرنا تھا جس کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ اخباری رپورٹ کے مطابق ان کا رہن سہن زمانہ قدیم کے وحشی قبائل کی طرح تھا۔ یہ ایک پراسرار علاقہ تھا۔ فیچر میں لکھا تھا کہ "اس وادی میں داخل ہونے کے بعد آج تک کوئی بھی واپس نہیں آیا تھا۔"

سوچتے سوچتے اس کے ذہن میں خیال آیا اس اخبار کے اس رپورٹر سے ملا جائے جس نے اس وادی کے بارے میں فیچر لکھا تھا۔ وہ مذکورہ اخبار کے دفتر جا پہنچا۔ چپراسی اسے گائیڈ کرکے چیف ایڈیٹر کے کمرے میں لے آیا۔ جو میز کے پیچھے کرسی پر بیٹھا بکری کی طرح منہ ہلا رہا تھا۔ اس کے پھولے ہوئے گالوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کے منہ میں پان کا کیچرا اچھا خاصا جمع ہوچکا ہے۔ اس نے خاور کو دروازے سے اندر آتا دیکھ کر غوں غاں کی نما آوازیں نکالیں۔ جن سے خاور نے اندازہ لگایا کہ وہ اسے بیٹھنے کو کہہ رہا ہے۔ وہ اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ جب کہ چیف ایڈیٹر اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

"میرا نام خاور ہے اور تعلق پولیس ڈپارٹمنٹ سے ہے آپ کے اخبار میں اقبال صاحب کا فیچر شائع ہوا تھا، میں اس سلسلے میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔" خاور نے اپنا مدعا بیان کیا۔

ایڈیٹر چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر کرسی کو اسی زاویے کے رخ پر گھمایا۔ سلائیڈنگ ونڈو کو سرکایا اور سر باہر نکال کر پچکاری چھوڑی اور پھرتی سے سر اندر کرکے کھڑکی بند کی اور پنج سے مشابہہ آواز میں ہنسا۔

"میں اقبال سے ملنے آیا تھا۔" خاور نے تحمل کے ساتھ اپنا مدعا دوبارہ بیان کیا۔

"اقبال ہمیشہ دیر سے آتا ہے۔" ایڈیٹر نے سخت تیز لہجے میں کہا۔

"آپ ان کا موبائل نمبر مجھے دے دیں۔" خاور نے کہا

اور ایڈیٹر نے لیٹر پیڈ پر نمبر لکھ کر اس کو دے دیا۔

خاور اس کا شکریہ ادا کر کے آفس سے باہر نکلا اور ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر اقبال کا نمبر ڈائل کیا، تیسری بیل پر کال ریسیو کی گئی۔ "السلام علیکم! اقبال صاحب میں اے ایس آئی خاور بول رہا ہوں، اس روز ایک خصوصی ضمیمے میں ایک پراسرار وادی کے بارے میں آپ کا فیچر چھپا تھا، میں اس فیچر کے سلسلے میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔" خاور نے کہا۔

"کیوں کیا اس فیچر میں کوئی خلاف قانون بات ہے۔" دوسری طرف سے اقبال نے پوچھا۔

"نہیں یہ بات نہیں یہ ایک الگ معاملہ ہے ملنے پر تفصیل سے بتاؤں گا۔" خاور بولا۔

"آج تو میرے پاس بالکل وقت نہیں ہے۔ کل آپ تاج ریسٹورنٹ میں دن گیارہ بجے مجھ سے مل سکتے ہیں۔" اقبال نے جواب دیا۔ اور رابطہ منقطع کر دیا۔

دوسرے روز اقبال تاج ریسٹورنٹ میں اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ وہ چالیس سالہ ایک صحت مند شخص تھا، اس کے ساتھ ایک خوب صورت لڑکی بھی تھی، جس کا تعارف اس نے فریال کے نام سے کروایا۔ وہ اقبال کی ساتھی رپورٹر تھی۔ "میں فون پر اپنا تعارف آپ سے کروا چکا ہوں اور اس پراسرار وادی کے بارے میں آپ کا فیچر بھی پڑھ چکا ہوں اور آپ سے تفصیل سے اس وادی کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔" خاور نے اقبال کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"وہاں کے بارے میں تو تمام تفصیلات میرے فیچر میں موجود ہیں، شاید آپ نے وہ فیچر غور سے نہیں پڑھا۔" اقبال نے حیرت سے جواب دیا۔

"ہو سکتا ہے کچھ خاص باتوں کو مصلحت کے پیش نظر اس رپورٹ میں نہ لکھا ہو وہی باتیں میرے کام آ سکتی ہیں۔" خاور نے جواب دیا۔

"خاور صاحب آخر اس وادی کے بارے میں تفصیلات جاننے کے لئے آپ اس قدر بے چین کیوں ہیں؟"

یہ فیچر تو ملک بھر کے بے شمار لوگوں نے پڑھا ہوگا۔ لیکن کسی نے بھی آپ کی طرح ردعمل ظاہر نہیں کیا؟؟ آپ میری تلاش میں نیوز پیپر کے آفس گئے، آفاق صاحب سے میرا نمبر لیا اور اس سلسلے میں مجھ سے ملاقات کی۔" اس نے خاور کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے استفسار کیا اور خاور نے اپنی روداد اسے سنا ڈالی جسے وہ دونوں حیرت اور دلچسپی سے سنتے رہے۔

"آپ کی سرگزشت سن کر ایسا لگ رہا ہے جیسے میں طلسم ہوشربا کی کوئی کہانی سن رہا ہوں بالکل الف لیلیٰ کی طرز کی کہانی ہے۔ میں آپ کو نہ صرف تمام تفصیلات بتاؤں گا بلکہ آپ کی مدد بھی کروں گا، اس طرح ایک طرف تو آپ کو لیلیٰ کی تلاش میں مدد ملے گی دوسرا ہمیں اپنے اخبار کے لئے بہترین اسٹوری مل جائے گی، لیکن میری ایک شرط ہے کہ اس مہم کے دوران آنے والے تمام اخراجات آپ برداشت کریں گے۔" اقبال نے کہا۔

"ٹھیک ہے مجھے منظور ہے۔" خاور نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے حامی بھرلی۔

پھر اقبال گویا ہوا۔ "اس وادی کا پتہ چلتے ہی میں اور فریال دونوں وہاں گئے تھے یہ دور دراز کے ایک سرحدی علاقے سے کئی کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ یہاں پر راستہ دشوار گزار اور ناہموار ہے۔ جس کی وجہ سے سفر پیدل طے کرنا پڑتا ہے، راستے میں رپالہ نامی ایک گاؤں آتا ہے۔ ہم دونوں وہاں پہنچے اور مقامی لوگوں سے اس پراسرار وادی کے بارے میں جاننا چاہا مگر اس وادی کا نام سنتے ہی وہ لوگ خوفزدہ ہوگئے، ان کا کہنا تھا کہ "آج تک جو بھی اس وادی میں داخل ہوا، واپس لوٹ کر نہیں آیا اس وادی کو "موت کی وادی" کہا جاتا ہے۔" وہاں زمانہ قدیم کے وحشی قبائل کی طرح کے وحشی لوگ رہتے ہیں جو شیطان کی پوجا کرتے ہیں۔ ہم بڑی مشکل سے پیدل چلتے ہوئے اس وادی کی سرحد تک پہنچے، وہاں دھند کی دبیز تہہ چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی، کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں تو دھند کے اس پار جانا چاہتا تھا۔ مگر فریال خوف زدہ ہو چکی تھی، مجبوراً ہمیں واپس لوٹنا پڑا، پھر ہم نے سنی سنائی باتوں کی مدد سے فیچر تیار کیا۔" اقبال نے کہا اور گہری سانس لے کر تازہ ہوا پھیپھڑوں میں اتاری۔

"میں بھی تم لوگوں کے ساتھ چلوں گی۔" فریال خاور کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن وہاں جا کر پہلے کی طرح

دنا مت۔ اس بار ہم موت کی وادی کی حقیقت جانے بغیر واپس نہیں لوٹیں گے۔" اقبال نے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔

انہوں نے دوسرے روز علی الصبح اپنے سفر کا آغاز کیا، شام کے قریب وہ ریالہ نامی اس پہاڑی علاقے میں داخل ہو چکے تھے۔ انہوں نے رات ایک گیسٹ ہاؤس میں بسر کی اور صبح ناشتہ کرنے کے بعد پیدل ہی آگے بڑھ گئے۔ اقبال نے ایک بڑا سا بیگ اٹھا رکھا تھا۔ جس میں ڈیجیٹل کیمرے سمیت بہت سی اہم چیزیں تھیں۔ جبکہ خاور کے پاس کسی قسم کا سازوسامان نہ تھا۔ اس نے حفاظت کی غرض سے پسٹل بیلٹ میں اڑسا ہوا تھا اور پنڈلی سے تیز دھار خنجر بندھا ہوا تھا۔ ملنگ کا دیا ہوا وہ پراسرار پتھر بھی اس کی جیب میں موجود تھا۔

وہ واقعی دشوار گزار اور ناہموار پہاڑی علاقہ تھا۔ جہاں سینکڑوں فٹ گہری کھائیاں تھیں وہ محتاط انداز میں پھونک پھونک کر قدم اٹھا رہے تھے۔ چند گھنٹوں بعد وہ اس مقام پر موجود تھے جہاں ان کی نظروں کے سامنے دھند کی دبیز تہہ جمی ہوئی تھی۔ وہ متجسس تھے کہ دھند کی دوسری طرف کون سی انوکھی دنیا آباد ہے۔

تینوں نے اللہ کا نام لیا اور دھند کی سرزمین پر قدم رکھ دیئے۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کے باوجود اس دھند میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ان کا اس دھند میں سفر تقریباً پندرہ منٹ جاری رہا۔ اب وہ ایک سرسبز اور شاداب وادی میں موجود تھے۔ جس کے ایک طرف گھنا جنگل تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ سرد موسم میں بھی یہاں حدت تھی، انہیں گرمی لگ رہی تھی۔

"یہاں اس قدر گرمی کیوں ہے؟" خاور نے حیرت سے پوچھا۔ اس کی بات کا جواب دیئے بغیر اقبال پہاڑوں کے بیچ گھری اس وادی کا جائزہ لے رہا تھا۔ جسے موت کی وادی کہا جاتا تھا۔

وہ دھڑکتے ہوئے دل سے آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کے ذہنوں میں ایک ہی خیال گردش کر رہا تھا کہ اس وادی میں داخل ہونے والا یہاں سے زندہ واپس کیوں نہیں لوٹتا۔

اقبال اور فریال اسی معمے کو حل کرنے اس وادی میں داخل ہوئے تھے جبکہ خاور لیلیٰ کی تلاش میں آیا تھا۔ وہ کافی دیر تک چلتے رہے۔ جنگل اب ان سے کچھ ہی فاصلے پر تھا۔ پھر انہیں اچانک رکنا پڑا۔ ان سے کچھ فاصلے پر زمین سے دھوئیں کے بادل اٹھ رہے تھے اور گڑگڑاہٹ کی آواز آ رہی تھی، انہوں نے غور سے دیکھا ایسا لگ رہا تھا جیسے پانی میں چونا ڈالا گیا ہو اور وہ ابل رہا ہو۔ وہاں گرمی بہت زیادہ تھی۔ "یہ کیا چیز ہے؟" خاور نے استعجاب اور حیرت سے پوچھا۔

اقبال نے ایک طرف پڑا ہوا سا پتھر اٹھایا اور اس طرف پھینکا، پتھر وہاں گرتے ہی غائب ہو گیا اور گڑگڑاہٹ کی آواز میں اضافہ ہو گیا۔ "یہ دلدل ہے، آگ کی طرح کھولتی ہوئی دلدل جو شے بھی اس دلدل میں گرے گی اس میں دھنسنے سے پہلے جل کر راکھ ہو جائے گی۔" اقبال نے جواب دیا۔

وہ ادھر ادھر گھوم کر دیکھ چکے تھے اس دلدل کو پار کیے بغیر دوسری طرف جانے کا راستہ نہیں تھا۔ پھر بھی وہ گھوم پھر کر راستہ تلاش کرتے رہے، پھر تھک ہار کر ایک لمبے چوڑے درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ "سمجھ میں نہیں آتا اس دلدل کو کیسے پار کریں؟ کیا دوسری طرف جانے کے لئے کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے؟" خاور نے پوچھا۔

"دوسرا راستہ ہے لیکن وہ بہت دور ہے، ہمیں اس دلدل کے ساتھ ساتھ کم از کم چھ سات روز پیدل چلنا پڑے گا۔" اقبال نے مایوس لہجے میں جواب دیا۔

اچانک انہیں قریب ہی کہیں سے ایک شیر کے دھاڑنے کی آواز سنائی دی۔ وہ اپنی جگہ سے حیرت اور خوف سے اچھل پڑے۔ دلدل کی دوسری طرف ایک جسیم شیر کھڑا تھا۔ اس کی نگاہیں ان پر جمی ہوئی تھیں۔ انہوں نے بھانپ لیا کہ شیر اس خوفناک دلدل کو پھلانگ کر ان تک پہنچنا چاہتا ہے۔ اگرچہ یہ مشکل کام تھا، لیکن یہ بھی ہو سکتا تھا کہ شیر اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو جاتا، اگر ایسا ہو جاتا تو وہ لمحوں میں ان تینوں کو چیر پھاڑ ڈالتا۔

خاور نے اپنی بیلٹ میں اڑسا پسٹل نکال لیا۔ "تمہارا دماغ تو درست ہے اس معمولی پسٹل سے دلدل کی دوسری طرف کھڑے اس جسیم شیر کو مارنا ناممکن ہے، فائر کی آواز سے یہ شیر مزید بپھر جائے گا۔"

خاور نے اس کی بات پر کان نہیں دھرے شیر کا نشانہ لے کر ٹریگر پر انگلی رکھ دی۔

ادھر شیر چھلانگ لگا چکا تھا۔ وہ فضا میں دلدل کے اوپر

سے ہوتا ہوا کافی آگے آچکا تھا۔ اسی وقت خاور نے پے در پے کئی فائر کیے، گولیاں شیر کے جسم میں پیوست ہوگئیں اور وہ دھاڑتا ہوا ان سے کچھ فاصلے پر دلدل میں گر پڑا۔ شیر دلدل میں گر کر دھاڑا، اور انہوں نے رونگٹے کھڑے کردینے والا منظر دیکھا۔ شیر کے جسم کی کھال اتر چکی تھی۔ اس کا کھال کے بغیر خون آلود جسم نظر آرہا تھا۔ وہ دھاڑتا ہوا اس خونی دلدل میں دھنسنے لگا، اس کی دھاڑیں سنائی دیتی رہیں، پھر خاموشی چھا گئی، دلدل اس دیوہیکل شیر کو نگل چکی تھی۔

"اس کا مطلب ہے اس دلدل میں گرنے والا بری طرح جھلس کر دھنس جاتا ہے، شاید اس میں کوئی خطرناک کیمیکل، گندھک یا چونا، یا پھر تیزاب کی آمیزش ہے جو دلدل میں دھنسنے والی شے کو پگھلا دیتا ہے۔" خاور نے متفکر لہجے میں کہا۔

"اس کا مطلب ہے، دوسری طرف جانا ناممکن ہے۔" فریال بولی۔

اقبال دلدل کے قریب ایک اونچے درخت کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس دلدل کی چوڑائی زیادہ سے زیادہ پچیس فٹ ہے جبکہ یہ چوڑے تنے کا درخت میرے اندازے میں تیس فٹ سے زیادہ لمبا ہے اگر اسے دلدل کے رخ پر کاٹا جائے تو ہوسکتا ہے یہ سیدھا دلدل پر گرے اور ایک قسم کا پل بن جائے، پھر ہمارا دوسری طرف جانا آسان ہوسکتا ہے۔" اقبال نے کہا۔

"لیکن ہم اس درخت کو کاٹیں گے کیسے؟" خاور نے پوچھا۔

"اس کا حل بھی ہے میرے پاس، میں مہم جوئی اور ایڈونچر کا شوقین ہوں، میرے پاس بھاری بھرکم بیگ میں تقریباً ہر قسم کی ضرورت کی چیزیں ہر وقت موجود رہتی ہیں، میرے پاس ایک الیکٹرک آری بھی ہے اور اس میں بیٹری بھی فٹ ہے، یہ جدید ترین اور خالص دھات سے بنی ہوئی ہے۔" اقبال نے کہا اور بیگ سے الیکٹرک آری نکال کر درخت کے قریب آگیا۔

تقریباً نصف گھنٹے میں آری کی مدد سے درخت کا تنا کافی حد تک کٹ چکا تھا۔ "تم لوگ درخت سے کافی دور چلے جاؤ، میں درخت کٹتے ہی گرنے سے پہلے بھاگ کر تم لوگوں کے قریب پہنچ جاؤں گا کیونکہ درخت گرنے سے اس تیزابی دلدل کے چھینٹے دور دور تک جائیں گے۔" اقبال نے کہا تو خاور اور لڑکی دوڑ کر دلدل سے کافی فاصلے پر چلے گئے، درخت اب تین چوتھائی کٹ چکا تھا اور کڑکڑاہٹ کی آواز کے ساتھ دلدل کی طرف جھکنا شروع ہوچکا تھا۔ اقبال نے آری بیگ میں ڈالی اور بیگ اٹھا کر درخت سے دور بھاگنے لگا۔ ان دونوں کے قریب پہنچا تو درخت نیچے گر چکا تھا۔ خوش قسمتی سے درخت دلدل کی طرف ہی گرا تھا۔ کھولتی ہوئی دلدل کے چھینٹے کافی دور تک گئے۔ اقبال کا اندازہ درست نکلا تھا، درخت کافی لمبا تھا۔ اب دلدل پر اس لمبے چوڑے درخت سے پل بن چکا تھا۔

"اب ہمیں احتیاط سے اس درخت پر چل کر دوسرے کنارے پر پہنچنا ہے لیکن خیال رہے ذرا سی غفلت بھیانک موت سے دوچار کرسکتی ہے۔ یہ خونی دلدل اندر گرنے والے کی ہڈیاں تک پگھلا دے گی۔" اقبال نے تنبیہ کی۔

سب سے پہلے اقبال درخت کے تنے پر چلتا ہوا دوسری طرف جا پہنچا۔ اس کے بعد خاور کی باری آئی وہ بھی بآسانی دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔ فریال خوف زدہ کھڑی تھی۔ اس کی ہمت ہی نہیں ہورہی تھی کہ اس انوکھے پل پر چلتی۔ "چلو فریال ہمت کرو، تمہیں کچھ نہیں ہوگا، درخت کا تنا کافی چوڑا ہے، صرف کوشش یہ کرنا کہ دلدل کی طرف نظر بھٹکا کر مت دیکھنا۔" اقبال نے آواز لگائی۔

"نہیں اقبال یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔" وہ خوفزدہ لہجے میں بولی۔

"فریال درخت کی گھنی شاخوں کی وجہ سے یہ مضبوط تنا دلدل سے محض دو فٹ اونچا ہے یہ اس دلدل کی تپش زیادہ دیر تک نہیں سہہ پائے گا اور تنا جھلس کر دلدل میں گر جائے گا، وہیں پھنسی رہو گی، جنگل قریب ہے، یہاں شیر چیتے کے علاوہ وحشی قبائل بھی ہیں۔" اقبال نے اسے ڈرانے کے لئے نفسیاتی حربہ استعمال کیا۔ جو کارگر رہا۔

فریال نے چپلیں اتار کر ہاتھ میں لیں اور درخت کے تنے پر قدم رکھ دیا۔ دلدل کے عین وسط میں پہنچ کر وہ ڈگمگا گئی، انہیں ایسا لگا کہ فریال دلدل میں گرنے والی ہے لیکن خوش قسمتی سے اس نے بروقت خود کو سنبھال لیا، اور آہستہ آہستہ چلتی

ہوئی دلدل پار کر کے ان کے قریب پہنچ گئی۔ "یااللہ تیرا شکر ہے، میں تو سمجھ رہی تھی کہ اس پار زندہ پہنچوں گی بھی یا نہیں۔" وہ گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے بولی۔

اقبال اپنے بیگ سے ڈیجیٹل کیمرہ نکال چکا تھا۔ اب وہ گھنے جنگل میں داخل ہو چکے تھے، انہیں مختلف اقسام کے جانوروں اور چرند پرند کی آوازیں بخوبی سنائی دے رہی تھیں۔ کبھی کبھار دور سے شیر کے دھاڑنے کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔

اچانک ایک تیر سنسناتا ہوا خاور کے قریب سے گزرا۔ اور ایک درخت کے تنے میں پیوست ہوگیا۔ وہ ہراساں نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگے لیکن تیر انداز نظر نہیں آیا۔ وہ دوبارہ آگے بڑھے ہی تھے کہ سنسناہٹ کی آواز کے ساتھ کئی تیر مختلف درختوں کے تنوں میں پیوست ہوگئے۔ "ایک جگہ رک جاؤ اور ہلو جلو مت، یہ وحشی قبائل ہیں اور زبردست نشانہ باز ہیں یہ ہمیں صرف وارننگ دے رہے ہیں۔" اقبال نے کہا اور وہ رک گئے۔

اسی وقت مختلف درختوں کی آڑ سے درجنوں کی تعداد میں ننگ دھڑنگ افراد باہر نکل آئے ان میں سے بہت سوں نے نیزے اٹھا رکھے تھے اور کچھ کے ہاتھ میں تیر کمان اور کلہاڑیں تھیں، ان وحشیوں کے جسم پر کسی قسم کا لباس موجود نہ تھا ان تینوں نے شرم سے نظریں پھیر لیں۔ وحشی ان کے گرد گھیرا ڈالے خاموش کھڑے تھے۔ "ہم تمہارے دشمن نہیں، ایک لڑکی کی تلاش میں یہاں آئے ہیں۔" خاور ہمت کر کے بولا۔

ان میں سے ایک تیز ابرو دار آگے بڑھا اور گرجدار آواز میں نامانوس زبان میں ان سے کچھ کہا۔ جو ان کے پلے نہیں پڑا۔ "یہ ہماری زبان سے ناواقف ہیں۔" اقبال نے سرگوشی کی وہ وحشی پھر نامانوس زبان میں کچھ بولا اور ہاتھوں سے اشارے کئے۔ "یہ ہمیں چلنے کو کہہ رہا ہے۔" اقبال نے کہا اور وہ ان جنگلیوں کے گھیرے میں ایک طرف چلنے لگے۔

"ایسا لگ رہا ہے ہم ہزاروں سال پہلے کے زمانے میں موجود ہیں۔ لیکن نہ جانے یہ وحشی ہم سے کیا سلوک کریں گے؟" فریال بہت زیادہ ہراساں تھی۔

"یہاں سب سے بڑا مسئلہ ہے ہم ان کی زبان نہیں سمجھتے اور ہم ان کی زبان سے ناواقف ہیں، اب مجھے لگ رہا ہے کہ واقعی ہم نے موت کی اس وادی میں آ کر سنگین غلطی کی ہے۔" اقبال نے کہا۔

"خاور کے پاس تو پسٹل بھی موجود ہے، ہم مزاحمت کر سکتے ہیں۔" فریال بولی۔

"تمہارا دماغ تو درست ہے اس وقت بھی ان وحشیوں کی تعداد پچاس سے زائد ہے جبکہ خاور کے پسٹل میں چند گولیاں ہوں گی۔" اقبال نے کہا۔

ان کے سفر کا اختتام جھونپڑیوں سے بنی ہوئی بستی میں ہوا، ان جھونپڑیوں کی تعداد لگ بھگ سو سے زائد تھی، یہاں عورتیں اور بچے بھی تھے۔ یہ عورتیں اور بچے بھی عریاں تھے۔ ایک طرف بڑا سا سائبان بنا ہوا تھا۔ جہاں لکڑی کی چوکیوں پر دو افراد بیٹھے تھے۔ ان میں سے ایک ادھیڑ عمر اور کرخت شکل تھا جبکہ دوسرا اسمارٹ تیس سالہ شخص تھا۔ وہ ان وحشیوں سے مختلف لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے کی رنگت گوری نیلی آنکھیں اور بال براؤن تھے۔ ان تینوں کو کسی مجرم کی طرح ان کی طرف دھکیل دیا گیا۔ چند افراد کلہاڑیں سونت کر ان کے گرد گھیرا ڈال کر کھڑے ہو گئے جب کہ بہت سے دیگر افراد اس سائبان سے باہر موجود تھے۔ "آخر تم لوگوں نے ہمیں کیوں پکڑ رکھا ہے؟ اور ہمارا قصور کیا ہے؟" اقبال نے احتجاج کیا جبکہ خاور اور فریال خاموش کھڑے تھے۔

تیس سالہ شخص چوکی سے اٹھا اور ان کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا، اس کا رنگ گورا اور نقش و نگار خوب صورت تھے۔ "تمہارا سب سے بڑا قصور یہ ہے کہ تم بغیر اجازت اس وادی میں داخل ہوئے ہو اور تم نے درخت کاٹ کر دلدل کے اوپر عارضی پل بنایا۔" وہ شخص انگلش میں بولا تو وہ تینوں حیرت سے اچھل پڑے۔

"تمہارا لب و لہجہ رنگ اور روپ یہ ظاہر کر رہا ہے کہ تمہارا تعلق اس خطے سے نہیں ہے۔" اقبال نے انگلش میں جواب دیا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو، میرا نام چارلس ہے اور میرا تعلق برطانیہ سے ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"تم ان کے درمیان کیسے پہنچے؟" اقبال نے پوچھا۔

"یہ پھر کسی وقت تفصیل سے بتاؤں گا اس وقت تم لوگوں کی زندگی خطرے میں ہے، یہ وحشی شیطان کے پجاری ہیں

ہوسکتا ہے یہ تم تینوں کو شیطان گاہ میں لے جا کر ذبح کردیں۔" چارلس نے سرد لہجے میں کہا اور لکڑی کی چوکی پر بیٹھے وحشی سے اس کی زبان میں کچھ کہا تو اس نے اثبات میں سرہلاتے ہوئے جواب دیا اور باآواز بلند نیزہ بردار افراد کو پکارا وہ ان تینوں کے قریب آکر کھڑے ہوگئے۔

"تم تینوں ان کے ساتھ جاؤ، تمہارا فیصلہ سردار شام کو کریں گے جس سے میں تمہیں آگاہ کردوں گا۔" چارلس نے کہا۔ ان کے بیگ اور کیمرہ ان جنگلیوں نے اپنے قبضے میں لے لئے۔ اور نیزہ بردار انہیں دھکیلتے ہوئے کافی دور ایک لکڑی کی بنی مضبوط عمارت کے اندر لے گئے۔ اس عمارت میں کسی قسم کا سازوسامان نہیں تھا۔ انہیں اندر دھکیل کر دروازہ باہر سے مقفل کردیا گیا۔ انہوں نے لکڑی کی بنی اس عمارت کا جائزہ لیا عمارت کی چھت کافی بلندی پر تھی۔ جہاں ہوا کی آمدورفت کے لئے روشن دان بنے ہوئے تھے۔ وہ ایک کونے میں جا کر بیٹھ گئے۔ نادر کا پسٹل اور خنجر اب تک محفوظ تھے مگر وہ ان سے کوئی فائدہ اٹھا نہیں سکتا تھا۔ سینکڑوں کی تعداد میں اس وحشی قبیلے سے ان دونوں چیزوں کے بل بوتے پر لڑنا ناممکن تھا۔

"ہوسکتا ہے چارلس ہماری کچھ مدد کرے۔" نادر نے کہا۔

"مجھے یہ مشکل لگتا ہے کیوں کہ وہ انہی وحشیوں کے ساتھ رہتا ہے اور نہ جانے کتنے عرصے سے ان کے ساتھ ہے اس کا رہن سہن اور طرز زندگی بھی ان ہی کی طرح ہے۔ دیکھا نہیں وہ بھی اسی قبیلے کی طرح بے لباس ہے۔" اقبال نے کہا۔

اس طرح کی باتوں کے دوران کافی وقت گزر گیا۔ کچھ دیر بعد دو نیزہ بردار اندر داخل ہوئے اور ان کے سامنے کھانا اور پانی رکھ کر واپس لوٹ گئے۔ وہ بغیر مرچ مصالحے کے آگ پر بھونا گیا ہرن کا گوشت تھا۔ انہوں نے اپنی جسمانی قوت برقرار رکھنے کے لئے تھوڑا بہت کھایا۔

شام کے وقت چارلس عمارت میں داخل ہوگیا۔ اس کے دائیں بائیں دو نیزہ بردار تھے۔ چارلس نے ان سے قبائلی زبان میں کچھ کہا اور وہ واپس لوٹ گئے۔ چارلس ان سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا۔ "ہاں تو دوستو! سب سے پہلے تو اپنا تعارف کرواؤ اور یہاں آنے کا مقصد بتاؤ۔" چارلس نے بے تکلفی سے پوچھا تو نادر نے اپنا اور اپنے ساتھیوں کا تعارف کرواتے ہوئے اپنی سرگزشت اسے سنا ڈالی اور بولا۔ "تب تم اپنے بارے میں بتاؤ، تم ان وحشی لوگوں کے ساتھ کیسے رہ رہے ہو؟ جبکہ بقول تمہارے یہاں آنے والے اجنبیوں کو شیطان کے سامنے موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔"

"میرا نام چارلس ہے اور تعلق برطانیہ سے ہے۔ میں پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر تھا، روپے پیسے کی کوئی کمی نہ تھی، مجھے سیروسیاحت کا بہت شوق تھا، ایک روز دنیا کی سیاحت کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ میں دنیا کے تقریباً ہر ملک میں گھوما۔ شراب وشباب سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ پھر میں تمہارے ملک میں سیروسیاحت کی غرض سے آیا، سرحدی علاقوں اور یہاں کے دیگر تفریحی مقامات سے ہوتا ہوا اس علاقے میں پہنچا۔ دھند کی یہ دبیز تہہ میرے لئے انوکھی تھی۔ میں دھند کی دیوار سے ہوتا ہوا اس وادی میں داخل ہوگیا۔ راستے میں دلدل حائل تھی، میں دلدل کے ساتھ چلتا رہا۔ جب بھوک لگتی درختوں سے پھل توڑ کر کھالیتا۔ پانچویں روز دلدل کے پار جانے کا راستہ مل گیا، اب میرے سامنے گھنا جنگل تھا۔ یہاں درندوں سے سامنا نہیں ہوا لیکن ان جنگلیوں نے مجھے پکڑ لیا۔

میری خوش قسمتی، ان دنوں سردار کی اکلوتی بیٹی بیمار اور قریب المرگ تھی، میں نے اشاروں کی زبان میں انہیں بتایا کہ میں اس لڑکی کا علاج کرسکتا ہوں، کافی سوچ وبچار کے بعد سردار نے مجھے اس لڑکی کا علاج کرنے کی اجازت دے دی۔ میرے سفری بیگ میں ہمیشہ دوائیں موجود رہتی تھیں۔ خوش قسمتی سے میرے علاج سے وہ لڑکی صحت یاب ہوگئی، میں ان ہی کے ساتھ رہنے لگا تھا لیکن مجھ پر کڑی نظر رکھی جارہی تھی، ایک روز میں نے رات کے وقت فرار ہونے کی کوشش کی اور ان وحشیوں نے مجھے پکڑ لیا۔ ہوسکتا ہے اس جرم کی پاداش میں مجھے شیطان کے سامنے ذبح کردیا جاتا مگر سردار کی بیٹی ان کے آڑے آگئی وہ مجھے چاہنے لگی تھی۔

ایک روز وہ وادی کی جھیل میں نہا رہی تھی۔ اتفاق سے میں بھی وہاں جا پہنچا، اس نے مجھے اپنے ساتھ نہانے کی دعوت دی۔ میں اس کے ساتھ ہی نہانے لگا، ہم دونوں فطری لباس میں تھے، ہمارے جذبات بھڑک اٹھے اور پانی میں آگ لگ گئی، جذباتی طوفان تھم جانے کے بعد وہ بہت خوش

تھی، سردار کو اس بات کا پتہ لگا تو بجائے ناراض ہونے کے اپنے رسم و رواج کے مطابق اس نے ہماری شادی کردی، ان کا رسم و رواج اور بعض اصول مغربی تہذیب سے ملتے جلتے ہیں، یہاں بھی عورت اور مرد اپنی رضامندی سے آپس میں آزادانہ تعلقات قائم رکھ سکتے ہیں، تب سے اب تک میں ان کے ساتھ ہوں، اب تو ان کی زبان بھی سیکھ چکا ہوں۔"

"کیا تم یہاں سے جانا نہیں چاہتے؟" اقبال نے پوچھا۔

"نہیں اب میں اس ماحول کا عادی ہوچکا ہوں، مجھے بھی سردار کی بیٹی سے محبت ہے۔"

"سردار نے ہمارے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے؟" خاور نے پوچھا۔

"مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کل شیطان کے سامنے تمہاری قربانی دی جائے گی اور اس لڑکی کو سردار نے اپنے لئے پسند کرلیا ہے، وہ اسے اپنی آٹھویں بیوی بنائے گا۔" چارلس کی بات سن کر وہ خوف سے کانپ اٹھے۔

"کیا تم ہمارے لئے کچھ نہیں کرسکتے؟" اقبال نے اسے امید بھری نظروں سے دیکھا۔

"نہیں تمہارا زندہ بچنا ناممکن ہے اور کسی قسم کی حماقت کی کوشش بھی مت کرنا، اس وقت بھی اس عمارت کے گرد وحشیوں کا پہرہ ہے اور اگر کسی نہ کسی طرح یہاں سے نکل بھی گئے تو موت کی اس وادی سے نکلنا ناممکن ہے، ایک بات جو تم نہیں جانتے وہ یہ ہے کہ اس وادی میں شیطانی قوتوں کی حکمرانی ہے، دھند کی وہ دیوار عام دیوار نہیں، وہ ایک قسم کا طلسم ہے، ہر مہینے میں صرف ایک مقررہ وقت پر وہ راستہ چند گھنٹوں کے لئے کھلتا ہے۔ اس مقررہ وقت میں کوئی بھی جاندار اس وادی میں آ بھی سکتا ہے اور جا بھی سکتا ہے۔ اس کے بعد اس دھند کے راستے میں جو بھی داخل ہوگا۔ دھند میں بھٹکتا رہے گا۔ نہ وہ واپس لوٹ سکتا ہے اور نہ ہی منزل پر پہنچ سکتا ہے، وہ دھند کی بھول بھلیوں میں چلتا ہوا بھوکا پیاسا مرجائے گا۔" چارلس کے الفاظ سن کر ان کی سٹی گم ہوگئی، گویا ایک مہینہ انہیں موت کی اس وادی میں گزارنا تھا، اور یہ وحشی انہیں شیطان کے سامنے قربان کرنے والے تھے، بظاہر ان کے بچنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔

کچھ دیر بعد چارلس جاچکا تھا، وہ ڈر اور خوف کے باعث رات بھر جاگتے رہے۔ صبح سورج کی پہلی کرن نمودار ہوتے ہی چارلس چند وحشیوں کے ساتھ وہاں آ پہنچا، وہ ان تینوں کو نرغے میں لے کر ایک وسیع عریض میدان میں جا پہنچے، وہاں تقریباً بیس فٹ لمبا اور چوڑا پتھر کا خوفناک بت تھا، وہ اس قدر کریہہ الصورت تھا کہ نظر بھر کر دیکھنا ناممکن تھا۔ خاور نے محسوس کیا بت پلکیں جھپک رہا ہے یہ ناقابل یقین بات تھی، اس نے اقبال اور فریال کی توجہ اس طرف دلائی، واقعی پتھر کے اس بت کی آنکھوں میں زندگی کی جھلک نمایاں تھی۔ ایک وحشی آگے بڑھا اور ان تینوں کے ہاتھ پشت پر باندھ دیئے۔

سردار چند معمر وحشیوں کے ہمراہ بت کے قریب کھڑا با آواز بلند عجیب و غریب الفاظ دہرا رہا تھا۔ "خاور ہمیں ان وحشیوں سے کون بچائے گا۔" اقبال خوف سے لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔ "اللہ پر بھروسہ رکھو۔ وہی ہر مصیبت سے بچانے والا ہے۔" خاور پرسکون لہجے میں بولا۔

اسے نہ جانے کیوں اس وقت ان وحشی لوگوں سے ڈر نہیں لگ رہا تھا۔

"ناممکن یہاں ہمیں کوئی نہیں بچاسکتا۔" اقبال حد درجے مایوس نظر آرہا تھا۔

"مایوسی کفر ہے۔ اللہ پر بھروسہ رکھو۔" خاور بولا۔ اقبال اس کی نصیحت آموز باتوں کو سن ہی نہیں رہا تھا، اسے موت اپنے سر پر منڈلاتی نظر آرہی تھی۔

سردار نے اقبال کی طرف اشارہ کیا، دو تنومند افراد آگے بڑھے اور اسے گھسیٹتے ہوئے بت کے قریب لے جاکر زمین پر لٹادیا۔ خاور نے ہاتھ بندھے ہونے کے باوجود آگے بڑھ کر مزاحم ہونا چاہا تو دو وحشیوں نے اس کے دائیں بائیں پہلو پر تلوار رکھ کر اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ "چارلس انہیں روکو یہ ظلم ہے۔" خاور نے انگلش میں چیخ کر کہا۔

"میرے دوست انہیں روکنا ہم میں سے کسی کے بس میں نہیں۔" چارلس بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ وہ ان سے کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔ ان کے چاروں طرف وحشی عورتیں اور مرد عریاں حالت میں موجود تھے۔ ایک طرف سے ایک گرانڈیل وحشی آگے بڑھا، اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا تیز

دھار خنجر اٹھا تھا۔ دو وحشیوں نے اقبال کو قربانی کے جانور کی طرح پکڑ کر بے بس کر رکھا تھا، خنجر بردار نے خنجر اقبال کی شہ رگ پر رکھ کر پھیر دیا۔ خون فوارے کی طرح اقبال کی شہ رگ سے نکلا، خاور بدستور چیختے چلاتے ہوئے ان وحشیوں کو برا بھلا کہہ رہا تھا جبکہ فریال سکتے کے سے عالم میں کھڑی تھی۔ اب وہی دو تنومند افراد خاور کے قریب آئے اور اسے گھسیٹتے ہوئے شیطان کے اس خوفناک بت کے قدموں کے پاس لے جا کر لٹا دیا۔ خنجر لئے جلاد وحشی اس کے قریب ہی تیار کھڑا تھا۔

خاور نے آنکھیں بند کیں اور کلمہ پڑھ لیا۔ بھیانک موت اس کے سر پر کھڑی تھی۔ اچانک شور و غل کی آوازیں سنائی دیں، خاور نے آنکھیں کھول دیں اور دیکھا دو افراد ایک آٹھ سالہ چیختے چلاتے لڑکے کو اس بت کے قریب لا رہے تھے۔ خاور نے دیکھا سردار بت کے سامنے کھڑا گڑگڑا رہا تھا، اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے جبکہ لو عمر لڑکا درد کی شدت سے تڑپ رہا تھا۔ اس کے جسم پر نیلاہٹ کی آمیزش ہوتی جا رہی تھی۔ سب اس افراتفری میں خاور کو بھول چکے تھے۔

خاور اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور آگے بڑھ کر چارلس سے پوچھا۔ ”کیا معاملہ ہے؟“

”یہ سردار کا اکلوتا بیٹا ہے۔ اسے کسی انتہائی زہریلے سانپ نے ڈس لیا ہے۔ اب سردار اس کی زندگی بچانے کے لئے اس بت کے آگے گڑگڑا رہا ہے۔“ چارلس نے جواب دیا۔ اور خود بھی سردار کے بیٹے کی طرف بڑھ گیا۔

”میری بات غور سے سنو! اس انگریز سے کہو کہ تم اس لڑکے کو بچا سکتے ہو؟“ خاور کو ملنگ کی آواز سنائی دی، اس نے چاروں طرف دیکھا لیکن ملنگ کہیں نظر نہیں آیا۔ وہاں صرف ننگ دھڑنگ وحشی نظر آ رہے تھے۔

”ادھر ادھر مت دیکھو میری آواز صرف تم ہی سن رہے ہو اور یہ آواز تمہارے ذہن میں گونج رہی ہے۔“ ملنگ کی آواز دوبارہ سنائی دی۔

”مگر میں اس بچے کا علاج کیسے کروں گا، اسے سانپ نے ڈسا ہے۔“ خاور بولا۔

”مجھ سے بات کرنے کے لئے تمہارا بولنا ضروری نہیں، تم دل ہی دل میں جو کہو گے میں سن لوں گا، تمہیں یاد ہے میں نے تمہیں ایک پتھر دیا تھا وہ معمولی پتھر نہیں بلکہ سلیمانی پتھر ہے۔ اس پتھر کی بہت سی خصوصیات ہیں، ان میں سے ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اگر کسی کو سانپ ڈس لے تو اس سلیمانی پتھر کو متاثرہ جگہ پر رکھنے سے زہر کے اثرات زائل ہو جائیں گے۔“ ملنگ کی آواز گونجی۔

”بابا کیا آپ غیبی جانتے ہیں؟“ خاور نے دل میں سوچا، مگر اس بار جواب میں خاموشی چھائی رہی، خاور چارلس کی طرف پلٹا۔ ”سردار سے کہو میں اس لڑکے کو بچا سکتا ہوں، میرے ہاتھ کھول دو۔“

چارلس نے اسے بے یقینی سے دیکھا اور آگے بڑھ کر سردار سے کھسر پھسر میں بات کی۔ سردار نے خاور کی طرف دیکھا اور باآواز بلند کچھ کہا۔ ایک وحشی نے آگے بڑھ کر خاور کے ہاتھ کھول دیئے، خاور تڑپتے ہوئے لڑکے کی طرف گیا اور اپنی جیب میں سے پرس نکال کر سلیمانی پتھر نکالا اور اسے بچے کے متاثرہ مقام پر رکھ دیا، چند لمحے میں بچے کے چیخنے چلانے کی آوازیں بند ہو چکی تھیں اور اس نے تڑپنا بھی موقوف کر دیا تھا، کچھ ہی دیر میں وہ بھلا چنگا ہو کر اپنے پاؤں پر کھڑا ہو چکا تھا۔

سردار چیخ چیخ کر اپنی خوشی کے جذبات کا اظہار کر رہا تھا، پھر اس نے چارلس سے مقامی زبان میں کچھ کہا، چارلس خاور کی طرف مڑا۔ ”سردار کا کہنا ہے کہ تم اس کے محسن ہو۔ ایک ماہ بعد جب مقررہ وقت کے لئے طلسمی دروازہ کھلے گا۔ تم لوگ یہاں سے چلے جانا جب تک یہاں اس کے مہمان بن کر رہو۔“

”نہیں میرے دوست! اسی وادی میں لیلیٰ بھی ہے، میں اسے تلاش کئے بغیر واپس نہیں جاؤں گا، سردار سے کہو، جب تک میں واپس نہیں لوٹتا فریال امانت کے طور پر یہاں رہے گی۔“

چارلس نے خاور کی بات سردار تک پہنچائی اور بولا۔ ”خاور تمہارے لئے بہتر یہی ہے کہ یہاں سے آگے مت جاؤ آگے اس سے بڑھ کر خطرات ہیں، اس قبیلے کے لوگ بھی اس وادی سے آگے جانے سے ڈرتے ہیں۔“

”نہیں دوست ہم مسلمان، اللہ کے علاوہ کسی سے نہیں ڈرتے، موت کا ایک وقت مقرر ہے، جب تک وہ مقررہ وقت نہیں آ جاتا مجھے کوئی نہیں مار سکتا۔“ خاور کچھ دیر بعد اس سے

رخصت ہو کر آگے بڑھ گیا۔ کئی کلومیٹر چلنے کے بعد وہ ایک ایسے علاقے میں داخل ہو چکا تھا جو صحرا کی طرح ویران تھا۔ وہاں دور دور تک کسی بھی قسم کا پودا یا درخت نہیں تھا۔ اور زمین کی رنگت گہری سرخ تھی۔ اس نے آیت الکرسی پڑھی اور آگے بڑھنے لگا۔

رات کا وقت تھا ہر طرف اندھیرے کا راج تھا۔ اچانک اسے مختلف اطراف سے سانپوں کی پھنکاریں سنائی دیں۔ وہ ٹھٹک کر رک گیا اور اپنے چاروں طرف نظر دوڑائی، چاند کی روشنی میں اس نے دیکھا۔ اس کے چاروں طرف دور دور تک سانپ ہی سانپ دکھائی دے رہے تھے۔ سانپ مختلف اقسام کے تھے جو پھنکارتے ہوئے اس کی طرف آرہے تھے۔ سانپ اس کے قریب پہنچ کر رک گئے۔ وہ حیران رہ گیا اور سوچنے لگا۔ "یہ کیا چکر ہے؟ سانپ آگے کیوں نہیں بڑھ رہے؟ پھر اس نے سوچا کہیں یہ ملنگ کے دیئے ہوئے سلیمانی پتھر کا کمال تو نہیں۔" یہ سوچتے ہی اس کا حوصلہ بڑھا اور اس نے سلیمانی پتھر نکال کر اپنے دائیں ہاتھ کی مٹھی میں لے لیا اور بسم اللہ پڑھ کر قدم آگے بڑھا دیئے۔

سانپ تیزی سے ادھر ادھر بھاگنے لگے دور سے اسے پہاڑی سلسلہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے سوچا ملنگ نے شاید اسی وادی کی طرف اشارہ کیا تھا لیکن لیلیٰ اس خطرناک موت کی وادی میں پہنچی کیسے؟ اتنی مشکلات کے باوجود وہ لیلیٰ تک نہیں پہنچ سکا تھا البتہ اقبال جیسے مخلص ساتھی سے محروم ہو گیا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ اس بلند و بالا پہاڑ کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اب اس نے پہاڑ پر چڑھنا شروع کر دیا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ موت کی اس وادی میں لیلیٰ اسے کہاں ملے گی؟ بس اسی امید کے سہارے آگے بڑھ رہا تھا کہ جس اللہ نے اسے وحشی قبیلے سے بچایا ہے وہی اللہ اس کی ضرور مدد کرے گا۔ اگر اللہ پر یقین پختہ ہو تو منزل خود بخود آسان ہو جاتی ہے۔

پہاڑ کے عین وسط میں پہنچ کر اسے ایک غار کا دہانہ دکھائی دیا۔ وہ چند لمحے کھڑا سوچتا رہا پھر اندر داخل ہو گیا، وہ کافی لمبا چوڑا وسیع و عریض غار تھا۔ جس میں بہت سے سانپ پھنکارتے ہوئے ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ وہ ورد کرتے ہوئے دل سے آگے بڑھنے لگا۔

اچانک ٹھٹک کر رک گیا۔ اس کے سامنے جوگی کھڑا تھا۔ وہی جوگی جو اس کے گھر میں لیلیٰ کے پیچھے داخل ہوا تھا پھر اس کی غیر موجودگی میں ثریا بیگم اور چوکیدار کو بے ہوش کر کے نکل گیا تھا۔ تب سے لیلیٰ غائب تھی۔ اور لیلیٰ کا کہنا تھا کہ لیلیٰ اپنی ماں کے ساتھ گئی ہے۔ یہی بات لیلیٰ کے پڑوسی نے بھی کہی تھی جبکہ ملنگ نے اس وادی کی طرف اشارہ کیا تھا۔ لیلیٰ اصل میں کہاں ہے یہ اس کے لئے ایک معمہ تھا۔ اب وہ منحوس صورت جوگی اس کے سامنے موجود تھا۔

"جوان لیلیٰ کو ڈھونڈنے آئے ہو، بڑی محبت کرتے ہو اس سے، جو انجام سے بے پروا موت کی اس وادی میں پہنچ گئے ہو، مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ قاتل دلدل، وحشی قبیلے سے کیسے بچ نکلے اور پھر یہ وادی تو انتہائی خطرناک زہریلے سانپوں سے بھری پڑی ہے انہوں نے بھی تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔"

"جوگی میرے اللہ کی بابرکت ذات ہے جس نے مجھے ان آفات سے بچایا۔" خاور بولا۔

"تم نادان ہو اگر اس لیلیٰ کی اصلیت جان جاؤ تو میرا احسان مانو گے کہ میں اسے یہاں لے آیا، یہ انسان نہیں جن زادی ہے، جس نے تمہیں پانے کے لئے تمہاری محبوبہ کا روپ دھارا۔" جوگی بولا۔

"تم جھوٹ بول رہے ہو، میں تمہاری بے سروپا باتوں پر یقین نہیں کرتا۔" خاور نے کہا۔

"اچھا تو پھر میرے ساتھ آؤ، میں تمہیں اصلیت بتاتا ہوں۔" جوگی مڑا اور غار کی اندرونی سمت بڑھنے لگا۔

خاور بھی اس کے پیچھے چل رہا تھا۔ اچانک خاور کے جسم کو جھٹکا لگا۔ دوسرے پل غار کی چھت سے الٹا لٹک گیا۔ جوگی نے اپنی جگہ رک کر قہقہہ لگایا، خاور نے الٹا لٹکے ہوئے جائزہ لیا۔ اس کا بایاں پاؤں شکنجے میں جکڑا ہوا تھا یہ اس قسم کا شکنجہ تھا جو شکاری شکار پھانسنے کے لئے جنگل میں لگاتے ہیں۔ "تم دھوکے باز ہو پیٹھ پیچھے وار کرنے والے دغاباز۔" خاور نے کہا۔

"بے وقوف یہ دھوکہ نہیں پینترا ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے۔ بہر حال میں اپنی بات پر قائم ہوں، تمہیں تمہاری لیلیٰ کی اصلیت ضرور بتاؤں گا۔ وہ

غار کی اندرونی سمت چلتا ہوا غائب ہوگیا۔ کچھ دیر بعد واپس لوٹا تو اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی شیشے کی بوتل تھی، اس نے بوتل کا ڈھکن کھولا اور زمین پر رکھ کر کوئی منتر پڑھنے لگا۔

بوتل سے دھواں نکلا اور ایک جگہ جمع ہونے لگا۔ وہ کئی فٹ لمبی دیوہیکل عورت تھی۔ ”تمہارا محبوب آیا ہے تمہیں اس حال میں دیکھ کر ڈر رہا ہوگا، اس کے من پسند روپ میں آجاؤ۔“ جوگی نے تمسخر آمیز لہجے میں کہا۔

کچھ دیر بعد وہاں اس دیوہیکل جن زادی کے بجائے لیلیٰ کھڑی تھی۔ خاور ششدر ہوگیا۔ لیلیٰ حسرت بھری نگاہوں سے خاور کو دیکھ رہی تھی۔

”اب تم اس کی اصلیت جان چکے ہو، یہ جن زادی اب میرے پاس غلام ہے، اور میں تمہیں بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ جوگی نے قہقہہ لگایا۔

سلیمانی پتھر اب تک خاور کی مٹھی میں تھا، اس نے بے اختیار سلیمانی پتھر لیلیٰ کی طرف پھینکا، جسے اس نے بآسانی کیچ کرلیا۔ اس کی یہ حرکت جوگی کی نگاہوں سے چھپی نہ رہ سکی۔ سلیمانی پتھر لیلیٰ کی ہتھیلی پر چمک رہا تھا۔ لیلیٰ کے چہرے پر خوشی رقصاں تھی جبکہ جوگی ہراساں ہوچکا تھا۔ وہ لیلیٰ کی طرف مڑا۔ ”اسے میرے حوالے کردے ورنہ میں تیرے عاشق کو جان سے ماردوں گا۔“

خاور نے الٹا لٹکے ہوئے بل کھایا اور اوپر کی طرف اٹھ کر پنڈلی سے بندھا تیز دھار خنجر نکال لیا، ادھر جوگی لیلیٰ کی طرف قدم بڑھا رہا تھا اور لیلیٰ الٹے قدموں پیچھے ہٹ رہی تھی۔

خاور ایک بار پھر لہرایا اور ایک ہاتھ سے رسی کا سرا تھام کر دوسرے ہاتھ سے تیز دھار خنجر سے رسی کاٹ کر انتہائی مہارت سے نیچے کود پڑا، اس کے کودنے کی آواز سن کر جوگی مڑا اور اسے اپنے سامنے آزاد کھڑا دیکھ کر جہاں تھا وہیں تھم گیا۔

اسی وقت لیلیٰ اپنے اصل روپ میں آگئی، اس کے لمبے چوڑے ہاتھ نے جوگی کو اوپر کو اٹھایا اور جھٹکے سے زمین پر پٹخ دیا۔ جوگی زمین پر گرتے ہی پھرتی سے اٹھا، اتنے میں خاور نے اپنا خنجر والا ہاتھ بلند کیا اور پوری قوت سے جوگی کی طرف خنجر پھینک دیا۔ خنجر جوگی کے عین دل کے مقام میں پیوست ہوگیا تو جوگی پشت کے بل گر پڑا۔

جن زادی آگے بڑھی اور اپنی مٹھی میں دبا سلیمانی پتھر اس کے سینے سے لگادیا تو جوگی چند لمحے تڑپنے کے بعد ساکت ہوگیا۔

جن زادی دوبارہ لیلیٰ کا روپ دھار چکی تھی۔ ”تم میری اصلیت جاننے کے بعد مجھ سے نفرت کرنے لگے ہوگے لیکن سچ تو یہ ہے کہ میں تمہیں دل و جان سے چاہتی ہوں۔“ جن زادی نے کہا۔

”تم مجھے غلط سمجھ رہی ہو، تم میری محبت ہونے کے ساتھ ساتھ میری محسن بھی ہو۔ تم نے دو بار میری زندگی بچائی، اب میں سمجھا اس وقت حشمت بیگ اور فیروز خان نے اصل لیلیٰ کو اغوا کیا تھا، اسے بھی بچانے والی تم ہی ہو۔ یہ سچ ہے کہ میں لیلیٰ سے محبت کرتا ہوں، لیکن تم میری بیوی ہو، اور سچے دل سے مجھے چاہتی ہو، میں تم سے کیسے نفرت کرسکتا ہوں۔“ وہ آگے بڑھ کر اس سے لپٹ گیا۔

جن زادی نے اس کے گلے میں اپنی بانہیں حمائل کردیں، اور خاور کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیے وہ کچھ دیر تک یک جان دو قالب ہوئے چپکے کھڑے رہے۔ پھر ایک دوسرے سے الگ ہوگئے۔

”تم میرے بارے میں سب کچھ جانتی ہو اب اپنے بارے میں بھی کچھ بتاؤ۔“ وہ جوگی کی لاش سے کافی آگے آگئے تھے۔

جن زادی نے اپنی داستان شروع کی۔ بسم اللہ پڑھی اور بولنا شروع کیا۔ ”میرا تعلق قوم جنات سے ہے، جنات کے بھی انسانوں کی طرح قبیلے ہوتے ہیں، جنات میں کافر جن بھی ہوتے ہیں اور مسلمان جن بھی۔ میرے قبیلے کا تعلق مسلمان جنات سے ہے۔ میرے والد شاہ جنات کا نام عبدالرحمن ہے۔ میری پیدائش کے وقت میرے والد نے ایک عالم جن سے میرا حساب نکالنے کو کہا۔ تو عالم جن نے بتایا کہ میری شادی ایک آدم زاد سے ہوگی، ایک وقت ایسا آئے گا کہ ہمارا مخالف قبیلہ ہم پر حاوی ہوجائے گا۔ ہم اپنے علاقے سے بے دخل ہوجائیں گے تب وہی آدم زاد ہماری مدد کرے گا۔ شاہ جنات اس کی پیشن گوئی سن کر حیران رہ گئے، بھلا ایک عام آدم زاد ان کی کیا مدد کرسکے گا؟

اسی عالم جن کے مشورے پر میرا نام ملاس رکھا گیا۔ ہم اس بات کو بھول بھال گئے تھے۔ میں جوان ہو چکی تھی۔ ان ہی دنوں شاہ جنات کی سلیمانی انگوٹھی کا نگینہ کہیں کھو گیا۔ اور وہ ایک برا شگون تھا۔ وہ سلیمانی پتھر بہت سی خصوصیات کا حامل تھا۔ ہمارے مخالف قبیلے کے جنوں نے ہمارے علاقے پر حملہ کر دیا۔ ہمارے کئی جن مارے گئے اور ہمیں دربدر ہونا پڑا۔

تب شاہ جنات کو عالم جن کی پیشین گوئی یاد آئی۔ انہوں نے اس واقعے کا مجھ سے ذکر کیا۔ میں ان سے ضد کر کے تمہاری دنیا میں آئی۔ تم پر نظر پڑتے ہی میں سب کچھ بھول گئی اور تم پر فریفتہ ہو گئی۔ میں نے اپنے علم سے جان لیا کہ تم لیلیٰ سے محبت کرتے ہو۔ میں لیلیٰ کے روپ میں تم سے ٹکرائی اس طرح تمہاری مجھ سے شادی ہو گئی۔

جوگی کالے علم کا ماہر جادوگر تھا۔ وہ مجھے پہچان چکا تھا اور مجھ پر قابو پا کر موت کی وادی میں لے آیا۔ اس کا مقصد شیطانی تھا۔ وہ میرے ذریعے لڑکیاں اور دولت جمع کرتا رہا۔ لڑکیوں کو اپنی تسکین کے بعد گلا کاٹ کر ان کا خون پیتا۔ کالے جادو کا عامل انسانی خون بہا کر اپنی طاقت میں اضافہ کرتا رہتا ہے۔ تمہارے یہاں آنے اور سلیمانی پتھر کے میرے ہاتھ میں پہنچنے سے وہ بے بس ہو گیا۔ ہاں! تم ٹھیک سمجھے یہ وہی سلیمانی پتھر ہے۔ جس کے کھو جانے کی وجہ سے ہمیں دربدر ہونا پڑا۔ اب تمہاری وجہ سے یہ پتھر مجھ تک پہنچا ہے۔ یہ بہت ہی کراماتی پتھر ہے۔ یہ پتھر جس کے ہاتھ لگ جائے وہ بے انتہا طاقت کا مالک بن جاتا ہے۔ تم چاہو تو اس پتھر سے دنیا کے امیر ترین آدمی بن سکتے ہو۔"

"مجھے دولت اور طاقت کی ضرورت نہیں۔ میرے لئے اتنا ہی پیسہ کافی ہے جو میں اپنی محنت سے کما سکوں۔ تم یہ پتھر اپنے والد تک پہنچا دو تا کہ تمہارا قبیلہ اپنا علاقہ دوبارہ حاصل کر سکے۔"

خاور نے کہا اور اس کا ہاتھ تھام کر غار سے باہر نکل آیا۔

اب انہیں وحشی قبیلے تک جانا تھا۔ کئی گھنٹوں کے سفر کے بعد وہ اس قبیلے میں داخل ہو گئے۔ سردار اور چارلس انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ جن زادی اب تک لیلیٰ کے روپ میں تھی۔ انہیں دیکھ کر فریال کی جان میں جان آ گئی۔ وہ تو خاور کی غیر موجودگی میں یہ سوچ کر خوف سے لرزتی رہی کہ اگر خاور زندہ نہ لوٹا تو اسے ساری زندگی ان وحشی لوگوں کے درمیان گزارنی پڑے گی۔

اب انہیں مہینہ بھر اسی بستی میں گزارنا تھا۔ یہ مہینہ انہوں نے اسی قبیلے میں گزارا۔ آخر ایک روز چارلس نے انہیں بتایا کہ "وہ خاص وقت آ چکا ہے، جب دھند کے پار جانے والا طلسمی راستہ کھل جاتا ہے۔"

وہ چارلس اور سردار کے ساتھ اس دبیز دھند کی دیوار کے قریب پہنچ گئے۔

اور چلتے ہوئے دھند کی اس دبیز دیوار سے باہر نکل گئے۔

موت کی اس وادی سے باہر نکلتے ہی انہوں نے سکون کا سانس لیا۔ "خاور اگر تم اجازت دو تو میں یہ طلسمی پتھر اپنے والد تک پہنچا آؤں۔" جن زادی نے کہا۔

"ہاں بے شک تمہارا قبیلہ تمہاری راہ دیکھ رہا ہوگا اور میں تمہارا انتظار کروں گا۔" خاور نے مسکراتے ہوئے کہا اور جن زادی نے چلتے ہوئے فریال کے سامنے اس کا گال چوما اور پلک جھپکتے ہی غائب ہو گئی۔

فریال کو حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا۔ موت کی وادی کے پراسرار مناظر ہی کیا کم تھے کہ اس کی نظروں کے سامنے ایک جیتی جاگتی عورت غائب ہو گئی۔ "یہ سب کیا ہے؟" اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"یہ جن زادی ہے۔" خاور نے جواب دیا۔ تو فریال پھٹی پھٹی نگاہوں سے خاور کو دیکھنے لگی۔ "جیسے اسے شبہ ہو کہ خاور بھی کوئی جن یا بھوت نہ ہو۔"

وہ شام کے قریب اپنے شہر پہنچ چکے تھے۔ فریال اپنے گھر چلی گئی جبکہ خاور اپنے گھر لوٹ آیا۔ ثریا بیگم نے لیلیٰ کے بارے میں پوچھا تو اس نے بہانہ بنایا کہ "وہ اپنی ماں کے ساتھ گاؤں گئی ہے۔"

صبح اٹھ کر وہ حسب معمول پہلے کی طرح اپنی ڈیوٹی پر روانہ ہو گیا اور شام کے قریب وہ پولیس اسٹیشن سے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ سپر مارکیٹ کے قریب اسے سڑک کے کنارے لیلیٰ دکھائی دی تو اس نے بے اختیار بریک پر پاؤں رکھے اور کار ریورس کر کے لیلیٰ کے قریب لے گیا۔ "کہاں جا رہی ہو آؤ گاڑی میں بیٹھو۔"

لبنیٰ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی تو خاور نے گیئر لگایا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔ کچھ دیر وہ دونوں خاموش بیٹھے رہے پھر آخر دھڑکتے دل سے خاور نے پوچھا۔

"لیلیٰ کیسی ہے؟"

وہ لوگ پچھلے ہفتے گاؤں سے لوٹ آئے تھے۔ لیلیٰ تمہارے بارے میں سن کر مضطرب ہوگئی تھی۔ اس کی نیند اور چین سکون سب اس سے روٹھ چکا تھا۔ دو روز پہلے ہم تمہیں تلاش کرتے ہوئے پولیس اسٹیشن گئے، وہاں سے تمہارا ایڈریس لے کر تمہارے گھر گئے۔ تمہاری والدہ لیلیٰ کو دیکھتے ہی اس سے لپٹ گئیں اور کہنے لگیں۔ "دولہن تم کہاں چلی گئی تھیں۔ خاور تمہیں دیوانوں کی طرح ڈھونڈ رہا ہے اور کئی روز سے غائب ہے۔"

ہم ان سے بڑی مشکل سے اجازت لے کر نکلے اور سڑک پر پہنچے ہی تھے کہ ایک جیپ ہمارے قریب رکی۔ اس میں چار افراد سوار تھے ایک وہی جس نے مجھے اغوا کیا تھا، تین دوسرے تھے۔ لیلیٰ کا چہرہ خوف سے زرد پڑ چکا تھا۔ اس نے کہا۔ "یہ فیروز خان ہے۔" ہم ان سے جان بچانے کے لئے بھاگنے لگے کہ ایک جگہ لیلیٰ کو ٹھوکر لگی اور وہ گر پڑی۔ میں نے بھاگتے ہوئے دیکھا وہ درندے اسے پکڑ چکے تھے۔ پہلے میں نے سوچا رک جاؤں، پھر خیال آیا اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا وہ مجھے بھی پکڑ لیں گے، بہتر یہی ہے کہ پولیس تک مدد کے لئے پہنچوں اور میں نے یہی کیا۔

پولیس کو جیپ کا نمبر بتانے کے علاوہ فیروز خان کے بارے میں بھی بتایا مگر دو روز گزرنے کے باوجود لیلیٰ کا سراغ نہیں ملا۔" وہ افسردہ لہجے میں بولی۔ تو خاور کے سینے میں آتش انتقام بھڑک اٹھی، اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اڑ کر فیروز خان تک پہنچ جاتا۔

"گاڑی کا نمبر بتاؤ۔" وہ دانت بھینچتے ہوئے بولا اور لبنیٰ نے گاڑی کا نمبر بتایا۔ اس نے لبنیٰ کو اس کے گھر کے قریب اتارا۔ گاڑی کے نمبر سے مالک کا پتہ چلانا کوئی مشکل کام نہ تھا۔

گاڑی حشمت بیگ کے نام تھی۔ اب اسے جو کچھ بھی کرنا تھا جلدی کرنا تھا۔ لیلیٰ کے اغوا کو دو روز گزر چکے تھے "نہ جانے ان درندوں نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا ہو۔" یہ سوچتے ہی اس کا خون کھول اٹھا۔ وہ گاڑی میں بیٹھ کر حشمت بیگ کے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔

ابھی وہ اس کے گھر سے کچھ ہی فاصلے پر تھا کہ سامنے سے آنے والے موٹر سائیکل سوار کو دیکھ کر چونک پڑا کیونکہ وہ فیروز خان کے کارندوں میں سے ایک تھا۔

پہلے جب لیلیٰ کو اغوا کیا گیا تھا تب یہ فیروز خان کے ساتھ ہی تھا۔ اس نے اسٹیئرنگ موڑا اور ٹرن لے کر موٹر سائیکل کا تعاقب کرنے لگا۔ اس بار اس نے جذبات میں آکر پہلے کی طرح غلطی نہیں کی اور اس ہوشیاری سے موٹر سائیکل کا پیچھا کرنے لگا کہ اسے پتہ ہی نہ چلا کہ کوئی اس کے تعاقب میں ہے۔

رات کے آٹھ بج رہے تھے سڑک پر ٹریفک بھی کم تھا۔ اس لئے اس نے اپنی گاڑی کی ہیڈ لائٹس آف رکھی تھیں۔ موٹر سائیکل ایک عمارت کے دروازے پر جا رکی۔ خاور نے گاڑی عمارت سے خاصے فاصلے پر روکی۔ اسی وقت عمارت کا آہنی گیٹ کھلا اور ایک سیاہ شیشوں والی کار باہر نکلی۔ کار کے باہر نکلتے ہی موٹر سائیکل سوار اندر داخل ہوگیا۔ گیٹ دوبارہ بند ہو چکا تھا۔ سیاہ شیشوں والی کار اس کے قریب سے تیز رفتاری سے گزر چکی تھی۔

خاور گاڑی سے اترا اور عمارت کی عقبی سمت جا پہنچا۔ وہ پنجوں کے بل اچھل کر احاطے کی دیوار پر چڑھا اور جھانک کر جائزہ لیا۔ اس طرف کوئی بھی ذی نفس موجود نہ تھا۔ وہ پنجوں کے بل اندر کود گیا۔ اس کے کودنے سے ہلکی سی آواز پیدا ہوئی تو وہ چند لمحے اپنی جگہ دبکا رہا۔ جب اس نے دیکھا کہ کوئی اس طرف متوجہ نہیں تو اٹھا اور ہولسٹر سے پسٹل نکال کر احاطے کی دیوار کے ساتھ چلتا ہوا عمارت کے دائیں سمت جا پہنچا۔ یہاں کمروں کی کھڑکیاں تھیں، پہلی کھڑکی کا شیشہ سرکانے میں اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا، کیونکہ کھڑکی اندر سے لاک تھی، دوسری کھڑکی پر بھی طبع آزمائی بیکار ثابت ہوئی، تیسری کھڑکی خوش قسمتی سے کھلی ہوئی تھی۔ وہ کھڑکی کے راستے کمرے میں داخل ہوگیا، اس کمرے میں ایک ڈبل بیڈ پڑا تھا، ایک سائیڈ پر لکڑی کی بھاری بھرکم الماری تھی۔ وہ دبے پاؤں چلتا ہوا کمرے کے دروازے پر پہنچا اور دروازہ ہلکا سا

کھول کر جھانکا۔ کوریڈور میں کمرے سے کچھ فاصلے پر ایک رائفل بردار کرسی پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔

خاور نے پسٹل دوبارہ ہولسٹر میں اڑسا اور پنڈلی سے بندھا تیز دھار خنجر نکال کر ہاتھ میں لیا اور کمرے کا دروازہ آہستگی سے کھول کر باہر نکلا اور دبے قدموں چلتا ہوا رائفل بردار کی پشت پر جا پہنچا، وہ رائفل کندھے سے لٹکائے بے فکری سے سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ کوئی اس دیدہ دلیری سے اس عمارت میں گھس سکتا ہے۔

خاور برق سرعت سے اس پر جھپٹا اور اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اس کے نرخرے پر خنجر پھیر دیا۔ تو اس کا جسم ایک لمحے کے لئے تڑپا اور ساکت ہو گیا۔ خاور نے اسے گھسیٹا اور کمرے میں لے جا کر ایک طرف ڈالنے کے بعد اس کی رائفل اتار کر ہاتھ میں لی اور خنجر دوبارہ پنڈلی سے باندھ کر باہر نکلا اور کوریڈور میں چلتا ہوا آگے بڑھنے لگا، اسے اس بات پر حیرت تھی کہ اس عمارت میں اس کا سامنا اب تک صرف اسی ایک رائفل بردار سے ہوا تھا۔ جسے وہ موت کے گھاٹ اتار چکا تھا۔

اچانک ایک کمرے سے نسوانی چیخیں سنائی دیں۔ وہ چیخیں ایک محرابی دروازے سے آ رہی تھیں۔ خاور نے دروازے پر لات رسید کی اور اندر جا گھسا۔ وہ ایک وسیع و عریض ہال نما کمرہ تھا جس کے درمیانی حصے میں چھت تک آہنی سلاخیں تھیں، جن کے دوسری طرف بیس پچیس نوجوان لڑکیاں بھیڑ بکریوں کی طرح قید تھیں، جبکہ سلاخوں کے اس پار چار وحشت ناک گرانڈیل شخص عریاں حالت میں چار چیختی چلاتی لڑکیوں کو فرش پر گرائے، ان پر حاوی ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ لڑکیوں کے لباس جگہ جگہ سے پھٹ چکے تھے۔ ان میں سے ایک تو بالکل بے لباس ہو چکی تھی۔ وہ لڑکیاں مزاحمت کرتی ہوئی چیخ رہی تھیں۔

خاور کے دروازے پر لات مار کر اندر گھستے ہی وہ چاروں ہڑبڑا کر ان لڑکیوں سے الگ ہوئے اور خاور کو دیکھ کر نیچے پڑی اپنی رائفلوں کی طرف لپکے۔ خاور نے فائر کھول دیا، ان میں سے تین افراد کے جسم میں شہد کے چھتے کی طرح سوراخ ہو گئے، جبکہ چوتھے کی ٹانگوں میں گولیاں لگیں، وہ چیختا ہوا گرا اور تڑپنے لگا، خاور نے جست لگائی اور زخمی شخص کے قریب جا پہنچا۔ "اگر زندگی چاہتے ہو تو میرے چند سوالات کا سچ سچ جواب دو۔" وہ اس کی کنپٹی سے رائفل کی نال لگا کر سفاک لہجے میں بولا۔

"خدا کے لئے مجھے مت مارو، تم جو کہو گے میں وہی کروں گا۔" گرانڈیل شخص موت کو سامنے دیکھ کر بھیگی بلی بن چکا تھا۔ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا کہ خاور نے کسی لحاظ کے بغیر اس کے ساتھیوں کو گولی مار دی تھی۔

"اس وقت اس عمارت میں تمہارے کتنے ساتھی موجود ہیں؟" خاور نے پوچھا۔

"ہم پانچ افراد یہاں موجود تھے۔" گرانڈیل شخص نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔

خاور نے اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگایا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے۔ ایک کو وہ کوریڈور میں قتل کر چکا تھا تین یہاں جہنم واصل ہو چکے تھے اور یہ زخمی تھا۔ "اس عمارت میں اس وقت کتنی لڑکیاں قید ہیں اور تم لوگ ان کا کیا کرتے ہو۔"

"اس عمارت میں چالیس سے زائد لڑکیاں قید ہیں، باس انہیں عیاش امراء کے ہاتھوں منہ مانگے داموں فروخت کرتا ہے۔"

"فیروز خان کہاں ہے؟ اور لیلیٰ نامی لڑکی جو دو روز پہلے اغوا کی گئی تھی اسے کہاں رکھا گیا ہے؟" خاور نے پوچھا۔

"باس اسے آغا انٹرپرائز کے مالک ناصر آغا کے حوالے کرنے گئے ہیں، اس لڑکی کے عوض انہیں ناصر آغا نے پچیس لاکھ کی پیشکش کی تھی۔"

"فیروز خان اسے کہاں، ناصر آغا کے حوالے کرے گا؟" خاور نے پوچھا۔

زخمی نے اسے جگہ کا نام بتاتے ہوئے کہا، "وہاں ناصر آغا اپنے ذاتی بنگلے کا پتہ سمیت موجود ہوگا۔ وہیں فیروز خان لیلیٰ کو اس کے حوالے کر کے رقم وصول کرے گا۔"

آغا ناصر کے نام سے خاور واقف تھا۔ وہ انٹرنیشنل سرکل کی بہت بڑی کاروباری شخصیت تھی۔ آغا ناصر ایرانی شہریت کا حامل تھا۔ پاکستان میں بھی اس کا آغا انٹرپرائز کے نام سے بزنس تھا۔ بہت کم لوگ یہ جانتے تھے کہ وہ بہت بڑا اسمگلر تھا۔ وہ ایران میں ہی رہتا تھا۔ کبھی کبھار بزنس کی وجہ سے پاکستان

آجاتا تھا۔ اگر آغا ناصر لیلیٰ کو لے کر ایران چلا جاتا تو اس تک پہنچنا خاور کے لئے ناممکن ہو جاتا۔ خاور نے سلاخوں کے پیچھے قید لڑکیوں کو آزاد کیا۔ عمارت کے نیچے تہہ خانے میں بھی ملک بھر کے مختلف علاقوں سے اغوا کی گئی لڑکیاں موجود تھیں، انہیں بھی رہا کر دیا گیا۔ "اس وقت یہاں ان درندوں میں سے کوئی بھی موجود نہیں، آپ لوگ اپنی اپنی جان بچا کر یہاں سے نکل جائیں۔" خاور نے عجلت میں ان سے کہا اور دوڑتا ہوا عمارت سے باہر نکلا اور اپنی آلٹو تک جا پہنچا۔ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اس نے دیکھا لڑکیاں عمارت سے باہر نکل رہی تھیں، اسی وقت پولیس موبائل کے ہوٹرز کی آواز سنائی دی۔ شاید کسی نے فائرنگ کی آواز سن کر پولیس کو اطلاع کر دی تھی۔ لیکن خاور کے پاس وقت کی کمی تھی۔ اسے لیلیٰ کو بچانا تھا۔

گاڑی خطرناک حد تک تیز رفتاری سے دوڑ رہی تھی۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ اس علاقے میں پہنچ چکا تھا، جہاں کا ایڈریس فیروز خان کے ساتھی نے بتایا تھا۔ یہ دو پوش علاقہ تھا۔ اس نے گاڑی کو دائیں طرف ٹرن لیا۔ کچھ فاصلے پر وسیع و عریض گراؤنڈ تھا، خاور نے دیکھا گراؤنڈ کے عین وسط میں ایک ہیلی کاپٹر کھڑا تھا جس میں پائلٹ موجود تھا، ہیلی کاپٹر کے قریب ایک ادھیڑ عمر شخص قیمتی سوٹ میں ملبوس کھڑا تھا، اس سے کچھ فاصلے پر سیاہ شیشوں والی کار تھی جس سے فیروز خان اور دو رائفل بردار باہر نکل چکے تھے، رائفل برداروں کی رائفلیں ان کے کندھوں پر تھیں۔

فیروز خان لیلیٰ کے ساتھ جڑا ہوا چل رہا تھا، خاور اس کے ہاتھ میں موجود پسٹل کی جھلک دیکھ چکا تھا۔ جس کی نال لیلیٰ کے پہلو سے لگی ہوئی تھی۔ خاور نے گاڑی ان سے کچھ فاصلے پر روکی اور پسٹل ہاتھ میں لے کر گاڑی سے اترا، رائفل برداروں نے پھرتی سے کندھے سے رائفلیں اتاریں لیکن خاور پھرتی میں انہیں مات دے گیا، اس کے پسٹل سے پے در پے دو فائر ہوئے، ایک گولی ایک رائفل بردار کی پیشانی میں لگی جبکہ دوسری گولی دوسرے رائفل بردار کی گردن میں چھید کرتی ہوئی دوسری طرف نکل گئی، فیروز خان نے اس کی طرف پسٹل سیدھا کیا ہی تھا، کہ تیسری گولی اس کے پسٹل والے ہاتھ میں لگی اور پسٹل اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ فیروز خان نے بساط کو پلٹتا دیکھ کر لیلیٰ کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور اس کی گردن کے گرد بازو حمائل کر کے اپنے آگے کھڑا کر دیا، اب اگر خاور گولی چلاتا تو وہ لیلیٰ کو ہی لگتی۔

"خاور اپنا پسٹل پھینک دو ورنہ میں اس لڑکی کی نازک سی گردن توڑ دوں گا۔" فیروز خان سفاک لہجے میں بولا اور خاور آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھنے لگا۔ "میں کہتا ہوں رک جاؤ ورنہ؟" فیروز خان نے اسے دوبارہ دھمکی دی۔ خاور اس سے کافی قریب آچکا تھا۔

فیروز خان نے لیلیٰ کی گردن کے گرد اپنے بازو کی گرفت سخت کر دی، تکلیف کی شدت سے لیلیٰ اس کے بازوؤں میں پھڑ پھڑا رہی تھی۔

خاور نے اپنا پسٹل ایک طرف پھینک دیا۔ فیروز خان نے جھک کر اپنا پسٹل اٹھانا چاہا۔ خاور نے برق سرعت سے چھلانگ لگائی اور اس کے جبڑے پر زوردار گھونسہ رسید کیا، فیروز خان کی گرفت لیلیٰ کی گردن پر ڈھیلی پڑ گئی تھی وہ اسے دھکیل کر ایک طرف کھڑی ہو گئی جبکہ خاور نے آگے بڑھ کر اس کے چہرے پر پنچ رسید کر دیا۔ فیروز خان نے پیچھے ہٹ کر خود کو بچایا۔ اور زوردار فرنٹ کک اس کے سینے پر رسید کی، ابھی وہ سنبھلا بھی نہیں تھا کہ فیروز خان کسی سانڈ کی طرح اس پر پل پڑا، اس کی لاتیں اور گھونسے مشینی انداز میں خاور کے جسم پر پڑنے لگے۔ خاور کا سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ اور آنکھوں کے گرد اندھیرا چھانے لگا تھا۔ فیروز خان نے ایک ہاتھ اس کی گردن پر رکھا دوسرے ہاتھ کو اس کے سینے پر رکھ کر اسے پیچھے دھکیلتے ہوئے اڑنگا کر اسے گرا دیا۔

خاور پشت کے بل گرا اور اس کے سر کا پچھلا حصہ نیچے لگا تو اس کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے۔ فیروز خان اس کے سینے پر بیٹھ چکا تھا اس نے پے در پے کئی گھونسے خاور کے چہرے پر رسید کئے، درد کی ایک کٹیلی سی لہر خاور کے بدن میں دوڑ گئی، اس نے دھندلائی ہوئی نظروں سے خود پر سوار فیروز خان کو دیکھا۔ فیروز خان نے اپنے دونوں ہاتھ خاور کی گردن پر رکھ دیئے اور اس کا گلا دبانے لگا۔

لیلیٰ چیختی ہوئی لپکی اور اسے گھسیٹ کر خاور کے سینے پر سے اتارنا چاہا لیکن گرانڈیل فیروز خان کو اس کے اوپر سے

بٹانا نازک اندام لیلٰی کے بس سے باہر تھا۔ فیروز خان نے جھلاتے ہوئے اسے زوردار دھکا دیا تو وہ اچھل کر پیچھے جا گری۔

ناصر آغا خاور کو بے بس ہوتے دیکھ کر مطمئن ہو چکا تھا، خاور کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا، اس نے ڈوبتے ہوئے ذہن سے سوچا کہ "کیا وہ فیروز خان کے ہاتھوں مارا جائے گا اور یہ معصوم لڑکی ناصر آغا جیسے عیاش شخص کے سپرد کر دی جائے گی۔" اس نے آخری کوشش کے طور پر اپنی ٹانگوں کو لپیٹ لیا اور فیروز خان کی گردن کے گرد قینچی ڈال کر زوردار جھٹکا دیا۔

فیروز خان اڑتا ہوا سا ایک طرف جا گرا، خاور بمشکل لڑکھڑاتا ہوا اٹھا، ادھر فیروز خان کسی وحشی بیل کی طرح دوڑتا ہوا آیا اور اس کے سینے پر ٹکر مارنا چاہا کہ خاور نے جھکائی دے کر خود کو بچایا اور زوردار گھونسہ اس کے جبڑے پر رسید کر دیا تو وہ پیچھے کی طرف لڑکھڑا گیا۔ خاور فضا میں اچھلا اور قلابازی کھاتے ہوئے پے در پے کئی کک اس کے جسم پر رسید کر دیا، فیروز خان چکراتا ہوا ایک طرف گرا۔

اچانک اس کی نظر ایک طرف پڑے پسٹل کی طرف پڑی، اس نے اٹھ کر پسٹل کی طرف چھلانگ لگائی، خاور نے اپنی پنڈلی سے بندھا خنجر نکالا اور اس کی طرف پھینک دیا، فیروز خان ابھی پسٹل اٹھا کر کھڑا ہی ہوا تھا کہ خاور کا پھینکا ہوا خنجر اس کے سینے میں عین دل کے مقام پر پیوست ہو گیا تو وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح ایک طرف گر گیا۔

آغا ناصر اسے مرتا دیکھ کر ہیلی کاپٹر میں سوار ہو چکا تھا۔ لیلٰی دوڑتی ہوئی آئی اور خاور کے سینے سے لگ کر سسک پڑی۔ "تم مجھے چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے؟" لیلٰی کے جسم کے نرم و گرم لمس سے خاور کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئیں، وہ یہ بھول چکا تھا کہ وہ کہاں کھڑا ہے اور کس پوزیشن میں ہے۔ اس کے قریب ہی فیروز خان اور اس کے کارندوں کی لاشیں بکھری پڑی تھیں، آغا ناصر کا ہیلی کاپٹر فضا میں بلند ہو کر ایک طرف روانہ ہو چکا تھا کہ ایک گرجدار آواز سنائی دی۔

"بہت خوب! کیا فلمی سین ہے، ولن مر چکا ہے اور ہیرو ہیروئن ایک دوسرے کے سینے سے لگے پڑے ہیں۔"

وہ ہڑبڑا کر ایک دوسرے سے الگ ہو گئے، ان سے کچھ فاصلے پر حشمت بیگ ایک رائفل بردار شخص کے ساتھ کھڑا تھا۔ حشمت بیگ کے ہاتھ میں ریوالور موجود تھا، ان کے قریب ہی نئے ماڈل کی پراڈو کھڑی تھی۔ ہیلی کاپٹر کی گونجدار آواز میں انہیں حشمت بیگ کے یہاں آنے کی خبر نہ ہو سکی تھی۔ "خاور تم نے مجھے بہت سے ناقابل تلافی نقصان پہنچائے ہیں، تمہاری وجہ سے اس حرام زادی نے میرے بیٹے کو مارڈالا، تمہاری ہی وجہ سے فیروز خان کے لڑکے کا خاتمہ ہوا، اس لڑکی کا سودا میں نے آغا ناصر سے کیا تھا، وہ بھی تمہاری وجہ سے ہاتھ سے نکل گیا، فیروز خان سمیت میرے کئی اہم آدمی تمہارے ہاتھوں مارے گئے تو پھر تم کیوں زندہ ہو، تمہیں بھی مرنا ہوگا۔"

"حشمت بیگ تمہیں تمہاری موت یہاں کھینچ لائی ہے، تمہارے ہاتھ میرے بے گناہ باپ اور کئی مظلوم انسانوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔"

حشمت بیگ نے ہذیانی انداز میں قہقہہ لگایا۔ "موت کو سامنے دیکھ کر تم ہوش کھو بیٹھے ہو، اب اپنے باپ کے پاس جانے کے لئے تیار ہو جاؤ۔" حشمت بیگ اور رائفل بردار شخص نے ٹریگر پر انگلی رکھ دی۔

اچانک ان کی پشت پر عجیب سی آواز گونجی تو حشمت بیگ اور اس کا کارندہ مڑے، ان کے پیچھے ایک سیاہ رنگ کی بلی موجود تھی۔ بلی نے برق رفتاری سے چھلانگ لگائی اور رائفل بردار کے چہرے پر پنجے مارے تو رائفل بردار نے چیختے ہوئے اپنے چہرے پر ہاتھ رکھ دیئے۔ رائفل اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر گر چکی تھی۔ بلی اس پر جھپٹ پڑی اور اپنے نوکیلے دانتوں اور پنجوں سے رائفل بردار کو بھنبھوڑنے لگی، فضا اس کی چیخوں سے گونج رہی تھی۔ حشمت بیگ ساکت کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔

ادھر خاور نے زمین پر پڑا پسٹل اٹھایا اور حشمت بیگ کو للکارا۔ "میری طرف دیکھو حشمت بیگ" حشمت بیگ اس کی طرف مڑا اور خاور نے ٹریگر دبا دیا، گولی حشمت بیگ کے سینے میں لگی تو وہ دلدوز انداز میں چیختا ہوا زمین پر گر گیا، رائفل بردار مر چکا تھا، خونخوار بلی نے اسے ادھیڑ کر رکھ دیا تھا۔

پھر وہ بلی لیلٰی کے روپ میں بدل گئی اور ان کی طرف بڑھی، لیلٰی کے لئے یہ ناقابل یقین منظر تھا، اگرچہ اس سے

پہلے بھی اس کا واسطہ اس جن زادی سے پڑ چکا تھا مگر اس کے باوجود بھی اسے حیرت کا جھٹکا لگا۔ جن زادی ان کے قریب پہنچنے والی تھی کہ اچانک ٹھٹک کر رک گئی۔

زخمی حشمت بیگ پسٹل ہاتھ میں لئے کھڑا تھا۔ اس کے سینے سے خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ "خاور میں جاتے جاتے تجھے بھی ساتھ لے جاؤں گا۔" اس نے پسٹل کا رخ خاور کی طرف کر کے ٹریگر دبا دیا۔ پسٹل کی نال سے گولی نکلی، خاور کے قریب کھڑی لیلیٰ دوڑی اور خاور کے آگے آ گئی، گولی لیلیٰ کے سینے میں لگی، لیلیٰ کے حلق سے چیخ نکلی اور وہ گرنے لگی۔ پسٹل اب تک خاور کے ہاتھ میں تھا اس نے پے در پے کئی فائر کئے، گولیاں حشمت بیگ کے سینے اور سر میں لگیں اور وہ چیختا ہوا گر گیا، چند لمحے تڑپنے کے بعد ساکت ہو گیا۔

خاور لیلیٰ کی طرف لپکا اور اس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔ جن زادی بھی ان کے قریب آ چکی تھی۔

فضا میں پولیس کے ہوٹر کی آواز گونج رہی تھی، شاید کسی نے فائرنگ کی آواز سن کر پولیس کو اطلاع کر دی تھی۔

"لیلیٰ یہ تم نے کیا کیا؟" خاور بولا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"خاور میں تمہارے سینے پر گولی...... لگتے...... کیسے دیکھ سکتی...... تھی۔ میں...... تم سے...... پیار کرتی ہوں...... تمہارا...... ہر دکھ...... ہر تکلیف میری ہے......" وہ اٹکتے ہوئے بولی۔ "شاید...... ہماری...... قسمت میں ایک ہونا نہیں لکھا......"

"نہیں لیلیٰ میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا۔" خاور رو رہا تھا۔

پولیس کی دو موبائلز میدان میں داخل ہو چکی تھیں۔ ان سے پولیس اہلکار اتر کر تیزی سے ان کی طرف لپکے، خاور نے ڈی ایس پی رینک کے آفیسر کو اپنا سروس کارڈ دکھا کر مدد کی درخواست کی، لیلیٰ کو پولیس موبائل میں سوار کر دیا گیا اور پولیس موبائل تیزی سے اسپتال روانہ ہو گئی۔

تقریباً بیس منٹ بعد پولیس موبائل اسپتال کے ایمرجنسی تک پہنچ چکی تھی۔ لیلیٰ کو فوری طور پر آپریشن تھیٹرز میں منتقل کر دیا گیا۔ خاور آپریشن تھیٹرز کے باہر بنچ پر سر جھکائے بیٹھا لیلیٰ کی سلامتی کی دعا مانگ رہا تھا جبکہ جن زادی لیلیٰ کے روپ میں کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔

پانچ گھنٹوں کے بعد آپریشن تھیٹرز کا دروازہ کھلا اور ایک ڈاکٹر باہر نکلا، خاور اپنا سر جھکائے خدا سے دعائیں کر رہا تھا۔

"مبارک ہو مریضہ کے جسم سے گولی نکالی جا چکی ہے اور اب اس کی حالت خطرے سے باہر ہے۔" ڈاکٹر نے جن زادی سے مخاطب ہو کر کہا اور آگے بڑھ گیا۔

خاور نے اپنا سر اوپر اٹھایا تو جن زادی اس کی طرف بڑھی۔ "خاور میں نے سلیمانی پتھر اپنے قبیلے تک پہنچا دیا تھا۔ ہم مخالف قبیلے کو شکست دینے کے ساتھ ساتھ اپنے علاقے سے بے دخل کر چکے ہیں، افسوس مجھے پہنچنے میں دیر ہو گئی۔ اس لئے حشمت بیگ اور فیروز خان کامیاب ہو گئے تھے، لیکن تمہاری بہادری اور بے جگری کی وجہ سے انہیں جہنم رسید ہونا پڑا، خاور محبت تو میں نے بھی تم سے کی ہے اور کرتی رہوں گی۔ مگر محبت کی اس جنگ میں یہ آدم زادی لیلیٰ مجھ سے جیت گئی۔ اس نے تمہاری طرف آنے والی گولی اپنے سینے پر کھائی۔ واقعی سچ کہا گیا ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ لیلیٰ نے تمہارے عشق میں خود جان دے کر تمہیں بچانا چاہا۔

ہم جن ایسی محبت کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ میں لیلیٰ کی محبت کو سلام کرتی ہوں۔ اس کا خیال رکھنا، یہ تم سے بھی محبت کرتی ہے۔

بہر حال جب میرا دل تم سے ملنے کے لئے زیادہ بے چین ہو گا تو میں تم سے ملنے ضرور آ جایا کروں گی اور اس کی خبر صرف تمہیں اور مجھے ہو گی۔" جن زادی نے کہا اور اپنی جگہ سے غائب ہو گئی۔

چند دن بعد لیلیٰ صحت یاب ہو گئی۔ ثریا بیگم کو خاور سب کچھ بتا چکا تھا۔ چند ہفتوں بعد شہر کے شاندار میرج ہال میں ان کی شادی ہو رہی تھی۔ اسٹیج پر خاور اور لیلیٰ دولہا اور دلہن بنے موجود تھے۔ ان سے کچھ فاصلے پر ایک اسمارٹ سی لڑکی اداس نظروں سے اس خوب صورت جوڑے کو دیکھ رہی تھی۔ وہ جن زادی الماس تھی۔ اس کے ہونٹوں پر پژمردہ مسکراہٹ رینگ گئی اور پھر پلک جھپکتے ہی وہ اپنی جگہ سے غائب ہو گئی۔